

اخلاقِ قیامتِ نبوی
مقالات مذاکرۃ ملی اخلاقِ قیامتِ نبوی
کراچی ۱۴۰۲ ہجری

مرتبہ حکیم محمد سعید

ہمدرد فاؤنڈیشن پریس

✓ ۲۹۷۶۹۹۲۱

۲۸۵ راجل

جملہ حقوق محفوظ

25303

مرتب: _____ حکیم محمد سعید

ناشر: _____ ہمدرد فاؤنڈیشن پریس
ہمدرد سنٹر، کراچی ۱۵

طابع: _____ نوید پرنٹنگ پریس، ناظم آباد، کراچی

تاریخ اشاعت: _____ ۱۹۸۲ عیسوی

پہلا ایڈیشن: _____ ایک ہزار

قیمت: _____ ۲۵/۰۰ روپے

۳

_____ *

ترتیب

۶	مسعود احمد برکاتی	ش لفظ
۷	حکیم محمد سعید	طبہ آغاز و استقبال
۲۳	جناب مولانا محمد مالک کاندھلوی شیخ الحدیث، جامعہ اشرفیہ، لاہور	نظام معاشرت
۲۹	جناب مولانا محمد سعید	نظام تمدن و مدنیت
۳۸	ایڈیٹر ورلڈ اسلامک ٹائمز جناب ڈاکٹر سید محمد حیدر اسلامک یونیورسٹی، اسلام آباد	اسلامی نظام عدل و احسان
۴۵	جناب ڈاکٹر خالد علوی شعبہ اسلامیات، جامعہ پنجاب	ترتیب فدو کا نبوی طریق
۵۹	جناب ڈاکٹر محمد یوسف گورایہ ڈائریکٹر علما اکیڈمی، لاہور	فہرست نبوی کا نظام تعلیم و تربیت
۷۴	جناب ڈاکٹر نصیر احمد ناصر سابق وائس چانسلر جامعہ اسلامیہ بھا	سورہ رحمۃ للعالمین : خلق عظیم
۸۱	جناب مولانا سید محمد متین ہاشمی ریال سنگھ لائبریری، لاہور	اسلامی نظام عدل کا نفاذ — مشکلات اور ان کا حل
۱۰۴	جناب مولانا عبدالقدوس قاسمی جامعہ پشاور	محنت کا ضابطہ اخلاق سیرت نبوی کی روشنی میں
۱۱۴	جناب پروفیسر اسماعیل سیٹھی	اسلامی تعلیمات اور تربیت اساتذہ
۱۲۲	جناب ڈاکٹر سید معصوم علی ترمذی شیخ الجامعہ، جامعہ کراچی	نظام تعلیم و تربیت اخلاق نبوی کی روشنی میں
۱۳۱	جناب مولانا محمد طاسین مجلس علمی، کراچی	سیرت محمدیہ کا معاشی پہلو
۱۵۵	جناب مولانا عبدالقدوس ہاشمی	رسول اللہ کی معاشی اصلاحات

تزمین اخلاق میں تعلیم و تربیت کا مقام

اخلاقی تحریک۔ کیوں اور کیسے؟

عدل اجتماعی - تصور و نفاذ

✓ اخلاق : نبوت سے اکتساب فیض
کی شرط اور علامت

اجتماعی عدل

میدان جنگ اور اخلاقیات نبوی

معلم اور تعمیر کردار،
سیرت طیبہ کی روشنی میں

اخلاقیات نبوی

دعوت و تبلیغ : رسول اکرمؐ کا
عزم و استقامت
اخلاقی تعلیمات رسول اکرمؐ

محکومی اور آزادی

✓ اخلاق نبوی کی روشنی میں
اسلام کا سیاسی مزاج
اسلام کا نظام عدل

جناب الحاج کفایت اللہ

ڈاکٹر کٹر اسکول ایجوکیشن، پشاور

جناب پروفیسر رحیم بخش شاہین

گورڈن کالج راولپنڈی

جناب ڈاکٹر امان اللہ خاں

صدر اسلامیات، جامعہ پنجاب

جناب پروفیسر حافظ احمد یار

سابق صدر اسلامیات، جامعہ پنجاب

جناب ڈاکٹر سید معین الحق

جنرل سکرٹری پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی

جناب بریگیڈیئر گلزار احمد

جناب ڈاکٹر احمد محی الدین

شیخ الجامعہ، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی

جناب ڈاکٹر بہران احمد فاروقی

جامعہ پنجاب

جناب ڈاکٹر ایس۔ ایم زماں

سابق شیخ الجامعہ، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی

جناب پروفیسر اکرام الرحمن

پرنسپل اردو سائنس کالج، کراچی

جناب قدیر الدین احمد

سابق چیف جسٹس عدالت عالیہ، مغربی پاکستان

جناب ایس۔ ایم۔ ظفر

سابق وزیر قانون

جناب محمد افضل چیمہ

سابق صدر اسلامی مشاورتی کاؤنسل

- ۲۹۸ جناب ڈاکٹر بشیر احمد صدیقی
شعبہ اسلامیات، جامعہ پنجاب
- ۳۰۷ جناب مولانا محمد حنیف ندوی
ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور
- ۳۱۸ جناب قاضی مجیب الرحمن
صدر اسلامیات، جامعہ پشاور
- ۳۳۱ جناب ڈاکٹر جان ایل۔ اسپوزیٹو
ہارورڈ یونیورسٹی
- ۳۳۶ جناب محمد صلاح الدین
مدیر تجارت کراچی
- ۳۴۷ جناب مولانا غلام مصطفیٰ قاسمی
ڈائریکٹر شاہ ولی اللہ اکیڈمی - حیدرآباد سندھ
- آجر و اجیر - اخلاقیات نبوی
کی روشنی میں روابط
عدل اجتماعی اور اسلام
- اسلامی تعلیم و تربیت کی خصوصیات
- آنحضرتؐ اور مسلمانوں کا طرز زندگی
- حضور اکرمؐ کا عطا کردہ
نظام تعلیم و تربیت
اخلاقی انحطاط کا حقیقی سبب

حرفِ اول

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت پاک ہر دور میں بصیرت افروز اور حیات بخش رہی ہے موجودہ سخت اور پھپھورے دور میں بھی سیرت کو، خصوصاً اس سے مستفید ہونے والی اخلاقیات کو مختلف انداز سے اور مختلف سطحوں پر پیش کرنے کی ضرورت ہے۔ ہمدرد فاؤنڈیشن نے قومی پیمانے پر سالانہ سیرت کانفرنسیوں کا آغاز اسی جذبے سے کیا ہے۔ ربیع الاول ۱۴۰۲ ہجری میں ہمدرد کی سیرت کانفرنس کا موضوع اخلاقیات نبوی تھا۔ اس میں پاکستان بھر سے آئے ہوئے اہل علم و قلم نے مقالات پڑھے تھے۔ ان مقالات کی انادیت کو دوام بخشنے کے لیے جناب محترم حکیم محمد سعید صاحب نے "مذاکرہ ملی اخلاقیات نبوی" کے دوران ہی اعلان فرمایا تھا کہ ان کو کتابی شکل میں شائع کیا جائے گا۔ چنانچہ سوائے ان چند مقالات کے جو مقالہ نگار حضرات نے عنایت نہیں کیے، تمام مقالات کا یہ خوب صورت مجموعہ قارئین کرام کی خدمت میں پیش ہے۔

اس کتاب "اخلاقیات نبوی" کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں ملک کے ممتاز علما، ماہرین تعلیم، اساتذہ، ماہرین قانون اور اصحاب قلم نے تمدن و معاشرت، تعلیم و تربیت، عدل انصاف، معاش اور معاشی نظام، سرمایہ و محنت کے روابط، امن و جنگ اور زندگی کے مختلف میدانوں میں حضور کی اخلاقی تعلیمات پر اپنے وسیع مطالعے کی روشنی میں موجودہ حالات کو پیش نظر رکھتے ہوئے بحث کی ہے۔

کتاب میں مقالات اسی ترتیب سے پیش کیے جا رہے ہیں جس ترتیب سے مذاکرے میں پڑھے گئے تھے۔ ہم فاضل مقالہ نگار حضرات کے ممنون ہیں۔

۱۴۰۳ ہجری میں جناب حکیم محمد سعید نے ہمدرد سیرت کانفرنس کا موضوع تعلیمات نبوی کے ضمن میں خودی کا خصوصی مطالعہ منتخب کیا ہے۔ اس کے مقالات بھی انشاء اللہ ہمدرد فاؤنڈیشن پریس کتابی شکل میں شائع کرے گا۔

مسعود احمد برکاتی

ناظم مجلس تحقیق و تصنیف ہمدرد

خطبہ آغاز و استقبال

عزیزانِ محترم، دانشورانِ معظم، شرکائے مکرم و محترم!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

اللہ سبحانہ و تعالیٰ، نور السموات والارض، اول و آخر، ظاہر و باطن، قادر و قدیر اور اللہ رحمن و رحیم کا فضل و کرم ہے کہ ہم سب یہاں فضائے اخلاص و اخلاق اور ماحولِ مطہر و مقدس اور حالاتِ خلوص و انس میں جمع ہوتے ہیں اور یہاں موجود و شریک ذکور و اناث کا مقصد و حید اور منہما و منشا تے واحد یہ ہے کہ ہم سب حمدِ باری تعالیٰ کریں، اور پیروی سنتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں وہ راہِ علم و عمل اختیار کریں کہ جس پر صراطِ مستقیم کی تعریف صادق آسکے، وہ صراطِ مستقیم کہ جس کے لیے دعا سورۃ فاتحہ میں تعلیم کی گئی ہے اور اسی کی تعمیل میں ہم اپنی نمازوں کی ہر رکعت میں اللہ تعالیٰ سے ہدایت کی استدعا کرتے ہیں اور رہنمائی کے لیے دعا کرتے ہیں۔

علمائے دین، صاحبانِ قرطاس و قلم!

میں اپنی جانب سے اور اپنے رفقاءے مستعد و منظم اور بنیائے تحریک "آدابِ اخلاق" کی طرف سے قلوب کی گہرائیوں اور روح کی حرارتوں کے ساتھ آپ کا پُر خلوص اور پُر جوش استقبال کرتا ہوں اور خوش آمدید کہتا ہوں۔

اللہ ذو الجلال والاکرام کا شکر گزار ہوں کہ اس ذاتِ اقدس نے مجھے اور میرے رفقاءے محترم کو توفیق عطا فرمائی کہ ہم اس مذاکرۃ ملی اخلاقیات نبوی میں، کہ جو اپنی نوعیت کا اولین اجتماع ملی ہے، آپ کو دعوتِ شرکت دیں۔ اور اب میں یہ خلوص و احترام اور یہ صمیم قلب مندوبینِ ذوی احتشام اور شرکائے واجب الاحترام کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آپ نے ہماری دعوت الی الخیر کو قبول فرمایا۔ اللہ تبارک و تعالیٰ آپ کو جزائے خیر عطا فرمائیں۔

حاضرینِ محترم و خواتینِ مکرم!

آبلعبد، ہمارے اس اجتماع ملی و دینی کا مقصد و حید اور منشا تے ملی یہ ہے کہ ہم اسلامی مملکت پاکستان میں اخلاقِ ملت کا ایک حقیقت پسندانہ اور دیانت دارانہ جائزہ لینے کی خدمت سرانجام دیں۔ اور اس "مذاکرۃ ملی اخلاقیات نبوی" کا شہنائے مقصود بلا خوف و بلا تامل یہ فرض ادا کرنا ہے کہ آج اس مملکت اسلامیہ کے ہر شعبہ زندگی میں انحطاطِ طاقتِ اخلاق اور اس کی کیفیات و کمیات اور اس کے اسباب کا جائزہ لے کر اس کا علاج تجویز کیا جائے اور یہ علاج جامع و

مانع ہو اور کلیتہً اور لفظاً و معنیاً ہدایات قرآن کا آئینہ دار ہو اور سنت نبوی کا عکاس ہو اور ایسا عمل ہو کہ اس سے ملت کا ہر فرد فیض حاصل کر سکے۔ اس سے فزاری جرات نہ عالم کر سکے اور نہ جبیل۔ مختار ہو کہ مجبور ہو، فرزند بشر اس کا پابند ہو۔
 ایہ ایک مسئلہ حقیقت ہے کہ ملت پاکستانی بہ حیثیت مجموعی انحطاط اخلاق کی شدید و آہنی گرفت میں ہے۔ میں فی الوقت اس سے بھٹ نہیں کروں گا کہ اس صورت حال کے اسباب و علل کیا ہیں اور وہ ملت کو قیام پاکستان کے وقت اور اس کے بعد بھی کچھ عرصے تک ایثار و قربانی اور پابندی احکام ربانی کا نمونہ بنی رہی، اور تعمیر وطن کے جذبات مقتدر سے سرشار اور تشغیل کی تحریک کے لیے مستعد و متحرک اور طرز اسلامی کے لیے جان نثار، وہ رفتہ رفتہ کیسے اسلامی اخلاق کو خراب و گدگدائی اور زوال اخلاق کو کیسے اس نے اپنایا اور فرائض ملی سے وہ کیسے غافل ہو گئی اور نظریہ حیات ملی سے کیوں کنارہ کش ہو گئی؟ آپ خوب جانتے ہیں کہ یہ داستان طویل ہے اور بڑی تلخ۔ اس صورت حال کے اسباب میں نہ ہم نظام تعلیم کی صریح خرابیوں کو نظر انداز کر سکتے ہیں اور نہ یہ ممکن ہے کہ ہم ارباب بست و کشاور کی واضح و صریح کوتاہیوں سے صرف نظر کر سکیں۔ اسباب فاسدہ کا ایک نتیجہ یہ ہے کہ ایک عظیم و شجاع ملت کو جو سر بلند ری اسلامی اور سر فزائی مسلمین کے لیے عزیز بلندا و تصدیقوی کے ساتھ میدان عمل میں اتری تھی وہ پسا ہو کر نکبت و ناکامی کے قعر مذلت میں جا گری، اور اس پر سترا دیکر اپنے اس حال پر شرم سار ہے نہ شرمندہ و آزر دہ۔ اسے نہ یہ رنج ہے کہ حالات نے اور اس کے منفی طرز فکر نے اس سے اس کا مقام بلند چھین لیا ہے اور نہ اسے یہ فکر دامن گیر ہے کہ اس کے انتشار ذہنی و فکری اور اس کے لازمی نتیجے میں انتشار و افتراقی عملی نے اس سے فکری آزادی چھین لی ہے اور قومی آزادی کے لیے شدید خطرات پیدا کر دیے ہیں اور صرف اقوام و ملل عالم میں پاکستان کا مقام خیر متعین کر دیا ہے اور غیر مشخص۔ صاحبان فکر و نظر اس کے شاہرہ شہ اور گواہ، اور عام افراد ملت بھی واقف کریں اس صورت حال کو جو صر دراز سے اور بڑی شدت کے ساتھ محسوس کرتا رہا ہوں۔ نہ صرف یہ بلکہ اُن سے درخواست کرتا رہا ہوں کہ ان مرض شناسان ملت کو چارہ گری کے لیے آگے بڑھنا چاہیے اور ذمہ داری کا سامان کرنا چاہیے۔ اہل فکر و نظر اور صاحبان قریاس و قلم کو حقیقت پسندانہ جائزہ لینا چاہیے اور پوری گہرائی اور گیرائی کے ساتھ محاسبہ کر کے فکر و نظری پوری تو انہیوں کے ساتھ اور قلم کی پوری طاقت کے ساتھ اس عظیم ملت کو قعر مذلت سے اور تاریکی سے نکال کر روشنی میں لانا چاہیے اور آرا شن کرنا چاہیے۔

۱ حالات ہیں کہ دن بدن خراب ہو رہے ہیں، اخلاقی مسائل ہیں کہ روز بروز بدزل کر شدت اختیار کر رہے ہیں۔ بدی کی طاقتیں سر اٹھا رہی ہیں اور فزوانی سامان کے ساتھ اخلاقی ملت کے تار و پود بکھیر دینے کا فیصلہ کر چکی ہیں بہت

سے قلم اپنی عصمتوں کو پامال اور فروخت کر چکے ہیں اور بہت سے اذہان کا سر عام نیلام ہو چکا ہے۔ دنیائے علم و ادب مملوٹ بے ادبی ہو رہی ہے اور میدان صحافت میں باغیانہ اور غیر دانش مندانہ اور سو قیانہ انداز دیکھے جا رہے ہیں اور ذرائع ابلاغ میں منفی مظاہر صاف طور پر محسوس کیے جا رہے ہیں۔ پاکستانی مدارس میں ایک دو نہیں متحد کتابیں، اردو ہی میں نہیں، ملک کی ہرزبان میں خلاف شرع و اسلام اور خلاف نظریہ حیات ملی سالہا سال سے پڑھائی جاتی رہی ہیں۔ یہ کتابیں لکھنے والے کون تھے یا کون ہیں؟ ان کو داخل نصاب کرنے کے لئے کون تھے یا کون ہیں؟

کیا اخلاقی محاسبے اور تجزیے کا اصل و صحیح میدان اس کے سوا کوئی دوسرا ہو سکتا ہے؟ میں جانتا ہوں اور آپ بھی جانتے ہیں، اور میں یقین محکم رکھتا ہوں اور آپ بھی کہ محاسبے کا یہ فرض صرف وہی ارباب فکر و نظر ادا کر سکتے ہیں کہ جو نظریہ حیات ملی پر یقین محکم اور ایمان کامل کے ساتھ قائم ہیں۔ اور یہ محاسبہ وہی قلم کر سکتا ہے جس کو ہاتھ میں رکھنے والا پاکستان کا دوست ہو اور اسلام کا بے خوف اور بہادر سپاہی ہو اور یہ محاسبہ ہر وہ فرد ملت کر سکتا ہے کہ جو صرف اللہ سے ڈرتا ہو اور پھر دنیا کی ہر طاقت کا باغی ہو۔ اور یہ محاسبہ وہی اہل دل اور صاحبانِ ایمان کر سکتے ہیں کہ جو سر بلندی اسلام اور سرفرازی مسلمان کے جذباتِ مقدسہ سے سرشار ہیں۔

من حیث المجموع ملت طاؤس در باب اول و آخر کی قائل نظر آتی ہے۔ اندرون ملک جو سیاسی خلفشار اور جو ملی انتشار ہے اور جو ذاتی اختلافات ہیں اُس پر متزاد وہ بدیہی خطرات ہیں کہ جو پاکستان کی سرحدوں کے چاروں طرف سر اٹھا رہے ہیں۔ یہ وہ سیاسی و نظریاتی سرحدیں ہیں جن کی حفاظت کی ہم پر ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔

پاکستان میں خیر کی طاقتیں ہیں مگر خفتہ و خوابیدہ ہیں۔ باور کرنا چاہیے کہ روپوشی اور گراں خوابی کا یہ وقت نہیں ہے بلکہ خیر کی ہر طاقت کو عقل و خرد کی طاقتوں کے ساتھ اور فکر و نظر کی پوری بالیدگی کے ساتھ اور قلم کی پوری توانائیوں کے ساتھ برسرِ عمل ہو جانا چاہیے۔ میں اسلام و سیاست کو جدا نہیں کرتا، مگر جو سیاست اخلاق سے عاری ہو اور کردار سے محروم، میرے نزدیک وہ سیاست نہیں ہے، کثافت ہے۔ ہم نے دیکھ لیا ہے کہ گزشتہ ۳۵ سالوں سے سیاست پاکستان کے مرض کی دوا بن سکی اور وہ سیاست بھی بُری طرح مات کھا گئی ہے کہ جو اقتدار اور اسلام کو ہم معنی بنانے پر مہر رہی ہے، اور وہ سیاست بھی پٹ چکی ہے کہ جو مذہبی فرقہ بندیوں پر پروان چڑھی تھی۔ اس سیاست کا بھی تیا پانچا چشمِ فلک نے دیکھ لیا ہے کہ جو نظریہ حیات ملی کے پرچھے اڑا دینے کے درپے تھی۔ میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ پاکستان میں ہر سیاسی بازی گری ناکام ہو چکی ہے اور اب تقاضائے وقت یہ ہے کہ عاری از کردار سیاسی بازی گری کو خیر باد کہہ دیا جائے اور سلامت روی کو اختیار کیا جائے اور دیانت و امانت کی حکم رانی کو اپنایا جائے۔ اور تعمیرِ وطن اور تعمیرِ اذہانِ اہل وطن پر توجہات اور توانائیاں

مرکز کی جائیں۔

یہ بنیادی نکتہ تو طے ہے کہ پاکستان کو لازماً ایک مملکتِ اسلامیہ رہنا چاہیے اور ایسی مملکتِ اسلامیہ کہ جس کا دستور قرآن ہو اور جس کا اصول سنتِ رسول ہو۔ حاکمیت بس اللہ کی ہو اور اس کرۂ ارض کی ہر شے کو اللہ کی ملک تسلیم کر لیا جائے۔ پاکستان کی اس حیثیت کو تسلیم کرنے کے بعد یہ بات خود بہ خود طے ہو جاتی ہے کہ پاکستان کے ہر فرد بشر کو اسلامی زندگی گزارنی ہے۔ قرآن و سنت کے مطابق اپنے اعمال و کردار کو ڈھالنا ہے۔ اخلاق کو سب سے بڑا مقام پاکستانی کی زندگی میں حاصل ہونا چاہیے۔ جو افراد ملت اس راہ سے بھٹکے ہوتے ہیں ان کو راہِ راست اور صراطِ مستقیم پر لانے کا فرض بھی ادا کرنا چاہیے۔ اس مسئلہ اور قطعی غیر اختلافی اصول کی روشنی میں اور پاکستان میں شدید زوالِ اخلاق کے پیشِ نظر ملت کے ہر فرد کو فکر کرنا چاہیے اور سوچنا چاہیے کہ اس کے فرائض کیا ہیں؟

خیانت و کذب اور حرص و حسد، غرور و نخوت، نفاق و غیبت، بدگمانی اور عیب جوتی جیسے آلام و امراضِ امت کا علاج کیا ہے۔ میرا تلی فرض مجھ سے مطالبہ کرتا ہے کہ میں ان آلام پر اختصار کے ساتھ اظہارِ رائے کر دوں۔ اور یہ بتاؤں کہ جب اخلاقی امراض کسی فرد یا کسی جماعت میں پیدا ہو جاتے ہیں تو اس کے اثرات و نتائج کیا نکلتے ہیں اور ان سے فرد و معاشرہ کس کس طرح متاثر ہوتا ہے۔ اس تجزیے کے بعد میں توقع رکھتا ہوں کہ صاحبانِ نظر یہ فیصلہ خود فرمائیں گے کہ ان امراض کی موجودگی میں پاکستانی معاشرہ کن خطرات سے دوچار ہے۔

چند اخلاقی امراض

خیانت

آج کے معاشرے کے انحطاطِ اخلاق اور انتشار و پراگندگی کے اسباب و محرکات کی فہرست میں خیانت بے حد اہم سبب ہے، یہ انسانی روح کو مکدر اور فکر کے سرچشموں کو خشک کر دیتی ہے۔ معاشری اور اجتماعی قوانین کی عمارت کو منہدم کر دیتی ہے۔ تعاون اور حقوقِ باہمی کی نگہداشت سے حسنِ معاشرت ابھرتا ہے۔ اجتماعی نظام کی بنیاد حقوق اور فرد و جماعت کے ربطِ باہم پر ہے۔ خیانت کرنے والا ان سارے حقوق کو پاؤں سے اٹھا کر باہر پھینک دیتا ہے اور معاشری قوانین کی خلاف ورزی کر کے اپنے غیر تربیت یافتہ ہونے کا اعلان کرتا ہے۔ خائن ذلت، رسوائی اور پستی کو قبول کرنے سے بھی دریغ نہیں کرتا۔ ایک تاجر خیانت کی راہ سے ذلت کی منزل کو پہنچ جاتا ہے۔ مزدور و ملازم خیانت کی وجہ سے اپنا اعتماد کھو بیٹھتے ہیں۔ ذمہ داریوں کے احساس کے بغیر عظمت اور سعادت حاصل نہیں ہو سکتی۔ ہماری اہم ترین ذمہ داری محنت و مشقت کے ساتھ ساتھ دیانت ہے اور خیانت اس کی ضد!

کذب

سچائی کی طرح جھوٹ کے بھی مختلف روپ ہیں۔ اگر انسان کی روح اس گندگی میں مبتلا ہو جاتی ہے تو اس کے فضل و کمال کا تناور درخت بے برگ و ثمر ہو جاتا ہے، اس کے اخلاق کی ساری پتیاں اس کی شخصیت کے شجر سے اس طرح گر کر بکھر جاتی ہیں جیسے موج خزاں سے تخریب چمن ہوتی ہے۔

جھوٹ تنہا ایک بُرائی نہیں ہے، بلکہ بہت سی دوسری برائیاں بھی اس کے بطن سے جنم لیتی ہیں۔ بیشتر اخلاقی برائیوں کے بے شمار نام دراصل جھوٹ ہی کے مختلف روپ ہیں۔ خیانت جھوٹ ہی سے پیدا ہوتی ہے۔ کذب سے ضمیر مُردہ ہو جاتا ہے، محبت و یگانگت کے رشتے ٹوٹ جاتے ہیں اور نفاق کے زہریلے ناگ چاروں طرف پھنکارنے لگتے ہیں۔ جھوٹ بولنے والے سچائی اور سادگی کو مغلوب کرنے کے لیے بلند بانگ دعوے، خوش نما الفاظ، چرب زبانی اور مصنوعی شیریں بیانی سے کام لیتے ہیں۔ وہ سادگی اور حقیقت کو اپنے سحر انگیز اسلوب سے مرعوب کرنا چاہتے ہیں، حال آنکہ سادگی کا جمال ابدی ہے۔

جھوٹ بولنے والا اپنے انجام کار پر غور نہیں کرتا۔ وہ سمجھتا ہے کہ اُس کے پُرفن ہونے کی خبر کسی کو نہیں، حال آنکہ اپنی باتوں کے تضاد اور اپنی دروغ بانی کی وجہ سے رسوائی، ندامت، اور عبرت انگیز ذلت کے لیے اسے تیار رہنا چاہیے۔

حرص و طمع

جس دن سے انسان اس دنیا میں قدم رکھتا ہے ضرورتوں کا حصار اس کے گرد وسیع اور طویل ہوتا جاتا ہے بعض ضرورتیں تو ایسی ہیں کہ اُن کا تعلق بقا اور زندگی کے تحفظ سے ہے، انہیں فطری ضروریات سے تعبیر کیا جاتا ہے اور ان پر کوئی پابندی نہیں عائد کی جاسکتی، لیکن بعض ضرورتیں ایسی ہیں جن کی تکمیل کی کوئی منزل نہیں، ان کی نہ کوئی حد ہے نہ غایت۔ ان کو خواہش بے جا کہنا چاہیے۔ انسانی تاریخ یہ بتانے سے قاصر ہے کہ آج تک کسی کی ایسی ساری خواہشات پوری ہوئی ہوں۔ اسی آرزوئے بے نہایت کو حرص کہتے ہیں، تشنگی اس کا انجام اور ناآسودگی اس کی تقدیر ہے۔ دنیا کے کسی بلند ہام پر اس کا کوئی آشیانہ نہیں۔

حرص انسان اور حرص معاشرہ مادی دولت حاصل کرنے کے لیے اخلاقی قدروں کو پامال کرتا ہوا دیوانہ دلر بھاگتا چلا جاتا ہے۔ اسے شاید یہ نہیں معلوم کہ فلاح و کامرانی یہ نہیں ہے کہ ایک فرد دوسرے پر یا ایک معاشرہ دوسرے معاشرے پر مادی اعتبار سے سبقت حاصل کرے، تاریخی فلاح یہ ہے کہ فرد اور معاشرہ ایک دوسرے کی سلامتی کا ضامن بن جائے اور حرص و طمع سے بلند ہو کر اجتماعی مفاد کا پاسبان بن جائے۔

حسد

حسد ایسا بدترین جذبہ ہے کہ اس کے اثرات کا جائزہ لینا دشوار ہے۔ معاشرے کے استیغاب جراثیم کا محرک یہی سیاہ جذبہ ہے جس کو حسد کہتے ہیں، اگر آپ غور کریں تو قلبِ انسانی کی مثال صحرا میں ایک ایسے چھوٹے شہر کی سی ہے جس کے گرد کوئی فصیل یا قلعہ نہیں، نیکیوں کا ہرن اپنی غارتگری سے اس شہر کو چشمِ زدن میں تاراج کر سکتا ہے۔ شہرِ دل کی رونق کے اور جمال کے دشمنوں میں حسد سب سے زیادہ اہم ہے۔ اس کے وجود سے دل دیران و تباہ ہو جاتا ہے، عمل کی قوت سلب ہو جاتی ہے۔ ناکامی و محرومی کی آتش سوزاں حاسد کی تقدیر بن جاتی ہے۔

غور و نحوث

انسانی اخلاق کا مذموم پہلو غور و نکبت ہے۔ یہ انفرادی اور اجتماعی دونوں ہوتا ہے۔ کبھی کبھی افراد ہی نہیں پورا معاشرہ نشہِ نحوث سے مرشار ہوتا ہے۔ عام طور پر غور و نکبت کے مرض میں وہ لوگ گرفتار ہوتے ہیں، جن کی پرورش و پرداخت تنگ و تاریک ماحول، اور غیر اخلاقی روایات کے گہوارے میں ہوتی ہے۔ وہ جب باہر کی دنیا میں، صاف ستھرے ماحول اور پاکیزہ اخلاق کی فضا میں آتے ہیں تو انھیں کوئی مقام نہیں ملتا۔ وہ اپنی اس محرومی کے لیے اپنی سیرت و کردار کی مناسب تعمیر کے بجائے غلط طور پر اپنے شرف و برتری کا پردہ پیگنڈا کرتے ہیں۔ حال آں کہ جسے واقعی فضل و شرف حاصل ہے، اُسے اس کے اعلان و اظہار کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ غرور کا عجیب و غریب پہلو یہ ہے کہ لوگوں کو مجبور کیا جاتا ہے کہ وہ معدوم کو موجود سمجھیں۔ صحت مند ذہن کی علامت یہ ہے کہ وہ خیالی حدود و قیود سے آزاد ہو، خواہشات اور توقعات کا اسیر نہ ہو، اس لیے کہ یہی راستے کبر و غرور کی طرف جاتے ہیں۔

نفاق

ہمارا معاشرہ ریا اور نمائش کے ہلکے مرض میں گرفتار ہے اور یہ نفاق ہی کا ایک پہلو ہے، اس لیے کہ ظاہر و باطن میں جب مطابقت نہیں ہوتی تو قول و عمل اور فکر و کردار میں تضاد پیدا ہوتا ہے۔ ہم کہتے کچھ ہیں اور کرتے کچھ۔ نفاق کی دیمک جب نظامِ اجتماعی کے ستونوں کو چاٹنے لگتی ہے تو ساری عمارت منہدم ہو کر نمونہ عبرت بن جاتی ہے۔ افراد کا افراد سے تصادم، اقوام کا اقوام سے تصادم، یہ جنگ و پیکار، اور رست و خیز سب کچھ نفاق ہی کا نتیجہ ہے۔ نفاق قوموں کے لیے پیامِ مرگ ہے۔

غیبت

غیبت انسانی خوبیوں کی عمارت منہدم کر دیتی ہے، اور اخلاق کے سارے ستونوں کو خشک کر دیتی ہے۔ معاشرے پر اس کے ہولناک اثرات ہیں یہ بھی ہے کہ افراد کے درمیان بغض و عداوت کی آگ بھڑک اٹھتی ہے اور کبھی کبھی اس

کے شعلے سارے معاشرے اور بسا اوقات پوری قوم کو اپنی لپیٹ میں لے لیتے ہیں، غیبت کے اسباب مختلف ہوتے ہیں، حسد، تکبر، سوتے ظن کی ذبی ہوئی چنگاری غیبت پر ابھارتی ہے، لیکن ترغیب کرنے والا شاید نہیں جانتا کہ اس کا ہر لفظ خود اس کی شخصیت اور اس کے شیشہ عظمت کے لیے تیشہ ثابت ہوتا ہے اور وہ لوگوں کی نظروں میں خنیف ہوتا ہے۔

عیب جوئی

جس طرح حسن ظن ایمان کی شاخ ہے، تجسس نفاق کی شاخ ہے۔ منافق کو اپنے بھائیوں کے رنج و غم کی پروا نہیں ہوتی۔ اور ذمہ دار انسان اپنے بھائیوں کے ساتھ حسن ظن رکھتا ہے اور ان کے مفاد کی نگرانی کرتا ہے۔ دوسروں کی عیب جوئی کرنے والا منافق یہ نہیں جانتا کہ اس طرح وہ اپنے عیوب سے صرف نظر کر رہا ہے، اپنے دل کو اندھا اور جسم کو خستہ و مضحل کر رہا ہے۔ سب سے کم زور انسان وہ ہے جو دوسروں کی عیب جوئی کرتا ہے اور اپنی اخلاقی برائیوں کو چھپانے کا ایک بہانہ تراشتا ہے۔ وہ انسان بدترین ہے جو دوسرے افراد کی سیرت و کردار کی تہوں میں جھانکنے اور عیب نکالنے کی کوشش کرتا ہے۔

بدگوئی

بعض افراد باختیار شخصیتوں کے سامنے دوسروں کی برائیاں کرتے ہیں۔ ان کی بدگوئی کا مقصد اس باختیار شخصیت کو منحرف کرنا اور دوسروں کو اس کی نظروں میں حقیر و رسوا کرنا ہوتا ہے۔ یہ باتیں پہلے تو لطف مجلس کے طور پر شروع ہوتی ہیں، لیکن آگے چل کر بہت سے فسادات کا پیش خیمہ بنتی ہیں۔ سب سے زیادہ قابل توجہ یہ بات ہے کہ بدگوئی اخلاقی پستی اور انحطاط کے دور سے تو گزر رہا ہے، لیکن اس سے بھی زیادہ افسوس ناک اخلاقی انحطاط اس باختیار شخص کا ہے، جو چغل خوردوں کی باتیں سنتا ہے اور بدگوئیوں کو اذن باریابی عطا کرتا ہے۔

بدگمانی

ہر انسان کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی ہیں۔ آنکھوں سے وحشت اور رفتار و گفتار سے سراپنگی نمایاں ہے۔ ذہن اعتماد سے خالی، شیشہ قلب سوتے ظن سے مکدر۔ اپنے سائے سے ڈرنے والا انسان، شاید اپنی کم زوریوں کے تجزیہ سے قاصر ہے، اسے اعتراف نہیں کہ اپنے ذہنی و فکری انتشار کا ذمہ دار وہ خود ہے۔ وہ ہر شخص سے بدگمان ہو کر اپنی متاع حیات لٹا بیٹھا ہے، اب اس کی شخصیت اور قامت نامکمل رہے گی اور نشاط و مسرت کے جذبے سے اس کا دل کبھی آشنا ہو سکے گا، اس لیے کہ یہ پھول حسن ظن اور اعتماد کی شاخ رعنا پر کھلتے ہیں۔ بدگمانی اور سوتے ظن کے

ریگستانوں میں تو چنگاریوں کے سوا کچھ بھی نہیں۔ انتشارِ شخصیت تہذیب کا سب سے بڑا سماجی مسئلہ ہے، مگر کھل کر یہ نہیں کہا جا رہا کہ یہ انتشار اس بدگمانی اور اعتمادِ باہمی کے فقدان کا نتیجہ ہے جو جدید عالمی تہذیب کا بدترین مرض ہے۔ ہر شخص اپنے آپ کو غیر محفوظ سمجھنے اور دوسرے کو شک و شبہ کی نگاہ سے دیکھنے کا عادی ہوتا جا رہا ہے، وہ اپنے عدم تحفظ کے احساس کی یہ توجیہ کرتا ہے کہ زمانہ بربر پیکار ہے، حال آنکہ دوسروں سے بدگمانی خود اس کی جارحیت کا سب سے بڑا ثبوت ہے۔

جس قدر ملت کو گھٹن کی طرح اندر ہی اندر کھوکھلا کر دینے والی یہ اخلاقی بیماریاں جن میں سے بعض کا ذکر میں نے کیا ہے۔ انھوں نے ہماری انفرادی اور اجتماعی زندگی کو جو جو اور جس جس طرح نقصانات پہنچاتے ہیں اور ان نقصانات کے جو اثرات ہوتے ہیں وہ تو سب اہل دانش پر عیاں ہیں اور سب ہی ان کا احساس رکھتے ہیں، لیکن میں سمجھتا ہوں ان اخلاقی بیماریوں نے ایک مجموعہ بن کر جو ایک عام مرضی کیفیت ہمارے معاشرے پر طاری کر دی ہے اور ایک بیمار فضا ہم پر حاوی ہو گئی ہے وہ ہے انتشار و افتراق کی۔ ایک ملت کے افراد ہونے کے باوجود ہم منتشر ہیں، جب کہ اس ملت کا مقصد وجود یہ بتایا گیا ہے کہ سارے عالم انسانیت کی شیرازہ بندی کرے گی۔ اپنے مقصد حیات سے بحیثیت مجموعی ملت کے اور انفرادی طور پر افرادِ ملت کے دور ہو جانے کا نتیجہ یہ ہے کہ ملت گرد ہوں، بس بٹا گئی ہے اور ہر گروہ بلکہ ہر فرد خود کو تنہا محسوس کرنے لگا ہے۔ وہ ملت کہ جو سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی مانند کسی جاتی تھی اس کا شیرازہ اس طرح بکھر گیا ہے کہ اس کا ہر فرد شدید احساسِ تنہائی کی گرفت میں ہے۔ تنہائی کا احساس ایک نفسیاتی مرض ہے جو طرح طرح کے اخلاقی اور سماجی مسائل پیدا کرتا ہے، اور آج ہم مسائل کی آماجگاہ بنے ہوئے ہیں۔

تنہائی ایک اہم معاشری مسئلہ ہے۔ یہ انسان کی بد نصیبی ہے کہ اس بھری دنیا میں وہ اپنے آپ کو تنہا محسوس کرے، لیکن انسانی تاریخ یہ بتاتی ہے کہ فرد کا گلشنِ اخلاق جب ویران ہوتا ہے تو محبت، وفا، دوستی اور اعتماد کی ساری شاخیں بے برگ و ثمر ہو جاتی ہیں اور گلشن کی تباہی اور تاراجی کا اعلان کرنے لگتی ہیں۔ آسمانوں پر کندھ پھینکنے والے انسان کو قوت اور عجز و درماندگی کا مفہوم سمجھنا چاہیے۔ حضرت علیؑ فرماتے ہیں کہ دنیا میں اُس شخص سے زیادہ عاجز اور بے بس کوئی نہیں جس کا کوئی دوست نہ ہو۔ یہ انسان کے سوتے خُلق کی علامت ہے اور اخلاق کی بھیانک تباہی یہ ہے کہ وہ دوست کو پا کر ضائع کر دے۔

حاضرینِ کرام!

میں نے اظہارِ خیال کرتے ہوئے ابتدا میں پاکستان کا جو نقشہ اخلاق پیش کیا اس کا بدیہی تقاضا یہی تھا کہ میں

احتیاط و اختصار کے ساتھ ان عوامل کا بھی ذکر کروں کہ جو پاکستان میں انحطاطِ اخلاق کے ذمہ دار ہیں، اور یہ بتاؤں کہ ان عوامل نے چین پاک کو کس طرح خزاں رسیدہ کیا ہے۔ اہل دل کے سامنے میں نے حالِ دل کہنے سے گریز نہیں کیا ہے۔ میرے مخاطب فقط وہی نہیں ہیں کہ جو یہاں موجود ہیں، میں ان زعمائے بھی مخاطب ہوں کہ جن کو دعواتے رہنمائی ملت ہے اور میرا خطاب اس گروہ سے بھی ہے کہ جس نے اس وطنِ پاک میں بارہا ہیبتِ اقتدار کا روپ دکھارا ہے اور اس مملکتِ پاک میں خرمین امن و راحت کو تاراج کیا ہے۔ اس کے نتیجے میں چشمِ فلک زندگی کی جگہ سکوت، سلامتی کی جگہ اضطراب، نغمہ نشاط کی جگہ شورِ ماتم، زمزمہ سنجی کی جگہ نوحہ خوانی دیکھ رہی ہے۔

تہذیب و تمدن کی بہشت اور علم و حلم کے مرغزار معدوم ہوتے ہیں۔ اور پھر قیامت یہ برپا ہوتی کہ ہم نے افرادِ ملت کو تذبذب کے راستے پر ڈال دیا، شک میں مبتلا کر دیا اور بد عملی کے جال میں پھنسا دیا۔ یہ تین دھاری انوکھا سفر اُس دو دھاری تلوار سے زیادہ کاری ثابت ہوا جس کے گھاؤ کی کہانیاں ہم سُنتے رہتے ہیں۔ حالات تو ایسے پیدا ہوتے کہ قرآن سے فرار اور سنت سے انماض معمولاتِ حیات میں شمار ہوتے۔ فکری آزادیاں سلب ہوتیں اور قومی آزادی کے لیے ہزار خطرات پیدا ہوتے۔ صنعت و حرفت کو چُن چُن کر برباد کیا تو اس کا نام بت شکنی رکھا گیا۔ انسان سوزی کا نام حیاتِ نو قرار پایا۔ جیسا سوزی کا عنوان عصمتِ وطن پڑا۔ آزادی کا تصور منسوخ ہو گیا اور عزت و شرفِ انسان معدوم ہوا۔ مسجدوں کے مینار جھک کر سوال کرنے لگے کہ اے اہلِ پاکستان اور اہلِ اسلام! تم نے اپنے تاریخ کے صفحات کو کہاں گم کر دیا ہے؟ ہمارا ان حرمِ اکیا تم نے پاکستان اس لیے بنایا تھا کہ تم اس قلعہٴ اسلام کو اپنے ہی ہاتھوں مسمار کر دو؟

آوازِ حق

ایسے سخت حالات میں ایک ایسی آوازِ اخلاق کی ضرورت ہے کہ جو ہم نیند کے ماتوں کو جگا دے اور آواز دے:

اے مسلمانانِ پاکستان!

سُحرا تمہارے لیے منزل ایک ہی ہے، راہ بھی ایک ہی ہے۔ یہی راہ تم کو لغزشوں سے بچا سکتی ہے، یہی راہ چشمِ نگران کا کام کر سکتی ہے۔ جب کبھی تمہارے دلوں میں شکوک و شبہات کے کانٹے چبھنے لگیں اور تمہارے قدم لڑکھڑانے لگیں تو اس چشمِ نگران کا تصور کرو۔ بصیرت کی آنکھیں کھولو اور یاد کرو انسانیت کے اُس قافلہٴ عظیم کو جو غرب کی بے آب و گیاہ دادی سے چلا تھا، جس نے بد اخلاقی کے گھٹا ٹوپ اندھیرے میں ایمان کی شمعیں جلاتیں اور دیکھتے ہی دیکھتے دنیا کو صداقت کی روشنی سے متور کر دیا۔ مسلمان جب بھی مصائب و آلام کا شکار ہوتا ہے قرآن کی یہ صدا اس کی سماعت کو سکون و مردرد بخشتی ہے:

امن يجيب المظطر اذا دعاه ويكشف السوء ويجعلكم خلفاء الارض

اللهم مع الله قليلا ما تذكرون امن يهديكم في ظلمات البر

والبحر ومن يرسل الرياح بشرا بين يدي رحمته اللهم مع الله

یعنی: کون ہے کہ جب ایک مضر اور بے قرار روح اس کو پکارتی ہے تو اس کی فریاد سنتا ہے، اور اس کی مصیبت کو دور کرتا ہے؟

کون ہے کہ جس نے تم کو زمین پر اپنا نائب بنایا اور اس کی وراثت بخشی؟

کیا خدا کے سوا کوئی اور ہے؟

پھر بتاؤ کون ہے جو خشکی اور تری کی تاریکیوں میں ہدایت کرتا ہے اور بارانِ رحمت سے پہلے ہواؤں

کو بشارت کے لیے بھیج دیتا ہے۔

کیا خدا کے سوا کوئی اور ہے؟

اس دارِ فانی میں جب کبھی کسی بنی آدم نے اصلاحِ حیات کی کوئی منزل طے کی ہے تو صرف اس ہاتھ کی رہنمائی

سے اور جو اس کی رہنمائی میں آگیا پھر اس کے لیے گمراہی نہیں۔

فمن يرد الله ان يسهل له صوره للاسلام فهو على نور من

ربه فويل للقاسية قلوبهم من ذكر الله

یعنی: اللہ جب کسی شخص کو راہِ راست پر چلانا چاہتا ہے تو اس کا دل اسلام کے لیے کھول دیتا ہے۔ اور

جس کا دل کھول دیا گیا تو پھر وہ اپنے پروردگار کی روشنی کی ہوئی مشعلِ ہدایت اپنے سامنے پاتا ہے۔ مگر

افسوس ان لوگوں پر جن کے دل ذکرِ الہی سے غافل ہو کر سخت ہو گئے ہیں۔

پاکستان میں زندگی کے مہ دو سال انتہائی کشمکش میں گزارنے کے بعد اور ان تمام حالات سے گزرنے کے بعد

جن کا میں نے ابھی اوپر حوالہ دیا ہے۔ اگر آج امید کی کوئی کرن پھوٹی ہے اور انقلابِ فکر اور تبدیلی کے آثار

نظر آتے ہیں تو ان پر احتیاط کے ساتھ غور کرنا چاہیے۔ اسلام کے لیے جو تبدیلیاں لائی جا رہی ہیں ان کے ساتھ چل کر

دیکھنا چاہیے۔ بے شک ستارے ٹوٹ گئے ہیں مگر سورج تو چمک رہا ہے۔ اس سے کرنیں مانگ لینی چاہیں اور ان کو

اندھیری راتوں میں بچھا دینا چاہیے۔

میں یہ نہیں کہتا کہ ہم حاکمانہ اقتدار کے مدرسے سے وفاداری کا سرٹیفکیٹ حاصل کریں اور کاسہ لسی کی زندگی اختیار کریں۔ مگر کچھ اچھے نقش و نگار نظر آ رہے ہیں۔ اگر نفاذِ شریعتِ اسلامی کا آج غلغلہ بلند ہوا ہے تو اس کی حقیقتوں کا دیانت دارانہ جائزہ لینا چاہیے اور قافلے کو صراطِ مستقیم پر ڈال دینے کا فیصلہ کرنا چاہیے۔

اخوانِ عزیز!

ہمیں آج ایک عہد کرنا چاہیے کہ یہ ملک ہمارا ہے، ہم اس کے لیے ہیں۔ باد کرنا چاہیے کہ اس وطنِ پاک کی تقدیر کے بنیادی فیصلے ہماری آواز کے بغیر ادھورے رہیں گے۔ میں آپ کو یاد دلاتا ہوں کہ آج ہم زلزلوں سے ڈرتے ہیں، مگر کبھی ہم خود زلزلہ تھے۔ ہم آج اندھیروں سے کانپ رہے ہیں مگر کبھی ہم اجالا تھے۔ آج ہم بھیگ جانے کے خدشے سے احتیاطیں برت رہے ہیں، ہم ہی تھے کہ سمندروں میں اتر گئے تھے، پہاڑوں کی چھاتیوں کو ہم ہی نے روند ڈالا تھا، بجلیاں جب آتیں تو ہم ان پر مسکراتے۔ بادلوں کی گرج کا مقہوں سے ہم نے جواب دیا تھا۔ صرصر اٹھی تو اس کا رخ پھیر دیا۔ ذرا غور تو کیجیے کہ یہ ایمان کی کیسی جاں کنی ہے کہ شہنشاہوں کے گریبانوں سے کھیلنے والے آج خود اپنے ہی گریبانوں کے تارِ فروخت کر رہے ہیں! اور اللہ سے اس درجہ غافل کہ جیسے اُس پر کبھی ایمان ہی نہ تھا۔

تلاشِ حق

باطل، فعال اور تعمیری ذہن رکھنے والی شخصیتیں لایعنی اور غیر مفید کاموں میں اپنی قوت ضائع نہیں کرتیں، انہیں اپنی عظمت کا خود بھی شعور ہوتا ہے۔ وہ جانتی ہیں کہ کون سا کام ان کے شایانِ شان ہے اور کون سا کام ان کے مقام و رتبہ سے فرتر۔ ان کی تنقیدوں میں متانت ہوتی ہے، وہ دوسروں کا مذاق نہیں اڑاتیں، انہیں معلوم ہے کہ تمسخر ایجابی طرزِ عمل نہیں، بلکہ منفی انداز ہے، مثبت طرزِ عمل غلطیوں کی درد مندانہ اصلاح ہے۔ اس حقیقت کی ترجمانی کرنے والی شخصیت ایجابی کسی جاتی ہے مگر ہمارے معاشرے میں انفرادی اور اجتماعی دونوں سطحوں پر مثبت طرزِ فکر اور ایجابی طرزِ عمل کے مقابلے میں منفی طریق کار، اور منفی نقطہ نظر رکھنے والی شخصیتیں ہی زیادہ حاوی ہیں، یہ فرد کا نہیں بلکہ معاشرے کا ذہنی افلاس ہے۔ ہمیں اس صورتِ حال کا مدد کرنا چاہیے۔

اس ہنگامہ ہستی میں انسان کو سکونِ قلب کی سب سے زیادہ ضرورت ہے۔ یہ وہ ہتھیار ہے جس کے بغیر معرکہٴ حیات مہر کرنے کی کوششِ ذلت انگیز شکست کے سوا کچھ نہیں، آج انسان اپنے ذہنی طوفان کی موجِ مضطرب میں اسیر ہو کر دیوانہ وار چیخ رہا ہے کہ مجھے بچاؤ۔ سکون و طمانیت کے چمن کی جستجو ہر انسان کی ضرورت بن چکی ہے مگر اسے گلستانِ

امن تک رسائی نہ دولت و ثروت سے ہو سکتی ہے نہ شہرت و اختیار سے، بلکہ صرف اخلاقی اور انسانی خوبیوں سے۔ سکون کا سرچشمہ اخلاق ہی ہے اور اس کے انحطاط نے تہذیب و تمدن کی حیرت انگیز ترقیوں کے باوجود ہمارے دل کا قرار چھین لیا ہے۔ وقت آگیا ہے کہ انسان اپنے طرزِ حیات پر ناقدانہ نظر ڈالے اور یہ سوچے کہ اُس نے کیا کھویا، اور کیا پایا؟

۲ صداقت اور خلوص روح و قلب کی جگمگاتی دنیا کی بڑی دل کش شعاعیں ہیں اور جو شخصیت اپنے دامن میں ان پھولوں کی دھک رکھتی ہے وہ بے حد جاذب ہوتی ہے۔

کسی فرد کی سچائی اور اس کا خلوص کسی ویرانے میں کھلنے والا پھول نہیں ہے بلکہ چمنستانِ عالم کا وہ پھول ہے جس کی شگفتگی اور رعنائی سب کے لیے جنت نگاہ ہوتی ہے۔ صدق و صفا سے صلح کی فضا پیدا ہوتی ہے، باہمی تقاریر پیدا ہوتا ہے اور اس اخلاقی صفت کی بنا پر ساری قوم ایسی ناقابلِ تسخیر فصیل بن جاتی ہے کہ وہاں کسی موجِ بلا کی رسائی نہیں ہو سکتی۔

ہر فرد کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ اصولِ اخلاق کو اپنی عملی زندگی پر منطبق کرے، کیوں کہ اخلاق کے بغیر نہ کسی فرد کو معاشرے میں رہنے کا حق حاصل ہے نہ کسی معاشرے کے تحفظ کی ضمانت دی جا سکتی ہے۔ جو شخص دولتِ اخلاق سے بہرہ ور ہوتا ہے اس کی شخصی و انفرادی سطح بلند ہوتی ہے، اس کا دائرہ سعی و عمل وسیع و لامتناہی ہوتا ہے، اس لیے کہ وہ اپنے اخلاق کی بنا پر زندگی کے سارے وسائل سے استفادہ کرتا ہے اور ہر دروازہ اس کے لیے باپ مفتوح ہوتا ہے۔

عقل، فطرت اور مذہب نے انسانِ زندگی کے فرائض کا تعین کیا ہے، معاشرتی زندگی تقاضائے فطرت کے عین مطابق ہے، لیکن فرد و جماعت کی وابستگی کے پہلے ہی مرحلے پر فرائض کے ساتھ حقوق کا بھی تعین ہوتا ہے، فرائض و حقوق کے اس مجموعے کو اخلاق کہتے ہیں۔ معاشرے اور افراد کے درمیان اس کے بغیر ہم آہنگی نہیں پیدا ہو سکتی۔ اخلاق کے بغیر بڑے سے بڑا شخص خنزف ریزہ ہے اور معاشرہ ایک خزاں رسیدہ چمن۔

بزرگ (یہ انسان کی سب سے بڑی غلط فہمی ہے کہ وہ سکون و طمانیت کے لیے دولت، شہرت، اقتدار اور مادی ترقی کے حصول کی جہد مسلسل میں دیوانہ وار مصروف رہتا ہے، حال آنکہ ان میں سے ہر چیز ایک نئی تشنگی اور نئی بے قراری پیدا کرتی ہے۔ یہ سعی و کاوش ایسی ہے، جیسے آب کی جستجو میں سراب کے پیچھے دوڑنا۔)

حقیقت یہ ہے کہ جس چیز کی جستجو انسان کر رہا ہے اس کا وجود خارجِ دنیا میں نہیں ہے، بلکہ اس کا اپنا باطن

سکون و طمانیت کا سب سے بڑا سرچشمہ ہے، اس لیے کہ اخلاق کا تعلق انسان کے باطن ہی سے ہے۔

قرآن اور اخلاق

کوئی قوم اور کوئی جماعت ترقی کرنا تو بڑی بات ہے اپنے وجود کو بھی برقرار نہیں رکھ سکتی اگر وہ اخلاق کے کم سے کم معیار کو ملحوظ نہ رکھے۔ افراد کے مجموعے کو قومی شخصیت بخشنے والی طاقت اور جوڑنے والی قوت اخلاق ہی کی قوت ہے۔ اخلاقی اقدار کے پاس ولحاظ کے بغیر افراد کے مجموعے کو بھیر تو کہا جاسکتا ہے قوم یا ملت نہیں کہا جاسکتا۔ یہی وجہ ہے کہ تاریخ کا مطالعہ ہمیں بتاتا ہے کہ جو قومیں اپنے اخلاق کو معیار سے گرا لیتی ہیں اور اپنے افکار و اعمال میں اخلاقی قدروں کو ملحوظ نہیں رکھتیں ان کو تاریخ کا متلاطم سمندر ہچکولے دیتا ہے اور اگر پھر بھی وہ عبرت حاصل نہیں کرتیں تو بالآخر مذلت کے بحر عمیق میں تہ نشین ہو جاتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہر معقول نظام حیات اخلاقی اقدار پر سب سے پہلے متوجہ ہوتا ہے اور ان کے استحکام کو بنیادی اہمیت دیتا ہے۔ اخلاق کی آب یاری کے بغیر کوئی نظام کوئی معاشرہ بقا و ترقی کے مراحل سے نہیں گزر سکتا۔ اسلام ایک مکمل نظام حیات کی حیثیت سے جس قسم کے انسان تیار کرنا چاہتا ہے اور جس قسم کی سیرتیں اس کو مطلوب ہیں اس کے لیے نیک و بد اور خوب و ناخوب کا ایک مکمل نظام اقدار فراہم کرتا ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ اسلام میں ایمان کے ساتھ عملی صانع کو ضروری قرار دیا گیا ہے۔ اور صالح اعمال کی وضاحت میں کوئی کمی نہیں چھوڑی گئی ہے۔ عمل کے صالح ہونے کا پیمانہ اخلاق ہے، اخلاق ایک جزو ہے تقویٰ کا۔ اسلام نے انسان کی بڑائی اور عظمت کا جو واحد معیار مقرر کیا ہے وہ تقویٰ ہے:

ان اکرم عند اللہ اتقاکم

”بلاشبہ تم میں سب سے مکرم وہی ہے جو سب سے زیادہ تقویٰ والا ہے۔“

قرآن حکیم کے ان چند الفاظ کی جامعیت پر آپ جتنا غور فرمائیں گے ان کی اہمیت اور معنویت آشکار ہوتی جائے گی۔ دولت، شہرت، حکومت، قابلیت کسی چیز کو معیار نہیں بتایا گیا۔ برتری، احترام اور بلندی کا صرف ایک ہی پیمانہ رکھا گیا ہے اور وہ ہے اخلاق عالیہ۔ ظاہر ہے کہ اگر کسی معاشرے میں برتری کا معیار نیکی ہو تو اس معاشرے میں نیکیاں ہی فروغ پائیں گی اور نیکیوں کو ہی اقتدار حاصل ہوگا۔ اخلاق کی اہمیت اس سے زیادہ اور کس طرح ظاہر کی جاسکتی ہے کہ رحمت عالم سرور کونین نور مجسم نے فرمایا کہ میں اس لیے بھیجا گیا ہوں کہ اخلاقِ حسنہ کی تکمیل کروں۔“

اور یہ بھی شارع اسلام ہی کا ارشاد ہے کہ ”مسلمانوں میں کامل ایمان والا وہ ہے جس کے اخلاق سب سے اچھے

ہوں“ اور ایک بار فرمایا کہ ”تم میں سب سے اچھا وہ ہے جس کے اخلاق سب سے اچھے ہوں“

غرض اخلاق اور محاسن اخلاق کے سلسلے میں ہمیں قرآن حکیم اور احادیث و سیرت پاک سے مکمل روشنی اور رہنمائی ملتی ہے اور ہمیں اس باب میں کسی دوسری طرف دیکھنے کی قطعاً ضرورت نہیں ہے۔

جب ہم مطالعہ قرآن حکیم کرتے ہیں اور حیات سرور کائنات کو سامنے رکھتے ہیں تو بالآخر ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ تعلیمات اسلام کی بنیاد اخلاق پر رکھی گئی ہے اور اس میں اس درجہ وضاحت و صراحت ہے کہ ہمیں اسلام اور اخلاق ہم معنی ملتے ہیں۔ قرآن اور اخلاق، اخلاق اور حیات فخر موجودات اور اسلام و اخلاق ہمہ وجہ اور ہر طور ہم معنی ہیں۔

مذکرۃ ملی اخلاقیات نبوی

پاکستان اسلام کے نام و عنوان پر عالم وجود میں آیا تھا۔ یہ ملک منصفہ شہود پر اس لیے جلوہ گر ہوا تھا کہ ہر صیغہ پاک و ہند کے مسلمان اپنے دینی فرض سے عمدہ برآہونے کے آرزو مند تھے اور انھوں نے بے اندازہ قربانیاں دے کر ایک اسلامی مملکت قائم کر دی کہ جہاں وہ قرینہ اسلامی کے مطابق زندہ رہیں گے اور دنیا کے لیے وہ نمونہ حیات پیش کریں گے کہ جو ایک مسلمان کا طرہ امتیاز ہے اور جو قرآن و سنت کا عکاس و آئینہ دار ہے۔ اگر یہ منشائے حقیقی نہ ہوتا تو آرزو تھے دلِ مسلم اور تمنائے قلبِ مسلم میں وہ درد و سوز پیدا نہیں ہو سکتا تھا کہ شانِ کبریائی جوش میں آتی اور ایک ریاستِ اسلامی کا محیر العقول وجود ممکن ہوتا۔

ہمیں یہ فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ پاکستان اسلام کے عبارت ہے اور اس کے بغیر اس کا وجود و قیام ممکن نہیں ہے۔ ماضی کے تجربات ہمارے سامنے ہیں۔ اسلام ایک مکمل ضابطہ حیات ہے اور یہ وہ دین ہے کہ جس نے تمام اقوام عالم کو اپنی روشنی سے منور کیا ہے اور تمام تاریکیوں کو اجالا بخشا ہے۔ ہم اس دینِ متین کے نام لیوا و حامل اور پیرو ہیں۔ مگر کیا اس سے بڑی غفلت بھی کوئی اور ہو سکتی ہے کہ ہمیں اس مقام کا احساس نہ رہے۔

میرے نزدیک اسلام کے دامنِ تقدس پر اس سے بڑھ کر اور کوئی بدنامی اور دھبہ نہیں ہو سکتا کہ آج انسانِ حریت اور ملکی فلاح کا سبق مسلمان دوسری قوموں سے لیں۔ عقیدہ مسلم یہ ہے کہ جس طرح خالق کائنات اپنی ذات و صفات میں وحدہ لا شریک ہے، کوئی ہستی اور وجود اس میں شریک نہیں اسی طرح قرآن کریم اپنی جامعیت اور کمال میں وحدہ لا شریک ہے اور بالکل اسی طرح اس کا لانے والا رسول کمالِ انسانیت و تعبد اور قوائے نبوت و اصلاح میں بھی وحدہ لا شریک ہے۔

اس لیے ضروری ہے کہ جو امت اس خدائے واحد، اس قرآنِ واحد اور اس رسولِ واحد کے دامنِ تعلیم سے وابستہ ہو وہ بھی اپنے اندر شانِ وحدت و یکتائی کا جلوہ رکھے۔ وہ بھی اپنے اعمالِ زندگی کی ہر شاخ میں بے مثال ہو اور شانِ

وحدت کی حامل ہو۔ اس کے اعمال و اخلاق غلط انداز عالم ہوں۔ اقوام و ملل عالم اس کے اعمال کا اتباع کریں۔ زندگی کے ہر حسن و جمال میں اس کے خط و خال مرقع عالم کے لیے نمونہ بنیں۔ وکنالک جعلنا کرامۃً قسطاً کے یہی معنی ہیں اور اسی لیے مسلمانوں سے وعدہ کیا گیا تھا۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِن تَتَّقُوا اللَّهَ يَجْعَلْ لَكُمْ فُرْقَانًا.

”مسلمانو! اگر تم اللہ کا خوف اپنے اندر پیدا کر کے متقی بن جاؤ گے تو وہ تمہارے لیے تمام دنیا میں ایک خاص

امتیاز اور خصوصیت پیدا کر دے گا“

اخوانِ پاکستان!

ذرا غور کیجیے کہ جس قوم کو اس صدائے الہی نے مخاطب بنایا ہو اس کے لیے اس سے بڑھ کر کیا بدبختی ہو سکتی ہے کہ وہ اپنی زندگی کی ہر شاخ میں غیروں کے لیے نمونہ بننے کی جگہ خود دوسروں کو اپنا کعبہ مقصود اور قبلہ بنانے کی غلطی کرے کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ پاکستان میں ہم نے تعلیم و صحت، اخلاق، معاشرت و معیشت، سیاست یہاں تک کہ مدنی زندگی کے ہر شعبے میں دوسری قوموں کے اعمال کو نمونہ بنایا، تہذیب و تمدن میں یورپ کی شاگردی کی۔

کسی وہ بنیادی گمراہی ہے کہ جس نے تعمیر ملت کے ستونوں کو منہدم کر دیا ہے اور سب سے بڑا خسراں یہ ہے کہ من حیث المجموع ملت طاقتِ اخلاق سے محروم ہو چکی ہے اور بد اخلاقی کی وادیوں میں گمراہ ہو چکی ہے۔

پستیِ اخلاق کی جس صورت حال پر میں نے روشنی ڈالی ہے اس کا مقصد کسی خاص گروہ، کسی خاص طبقے، کسی خاص جماعت کی تنقیص یا اس پر تنقید ہرگز نہیں ہے، بلکہ ملت کے ایک فرد کی حیثیت سے جائزہ لینا ہے۔ اسے آپ خود تنقیدی بھی کہہ سکتے ہیں کہ یہ عاجز بھی اسی ملت کا ایک فرد ہے اور جو صورت حال ہو اس کی ذمہ داری میں ہم سب شریک ہیں۔ ایک آزاد ملک کے شہری کی حیثیت سے اس کے سیاہ و سفید میں ہم سب شامل ہیں اور خرابی احوال میں کم و بیش شرکت سب ہی کی ہے۔ میری گزارشات کا منشا صرف یہ ہے کہ خرابی چاہے کسی میدان میں ہو اس کی جڑ اخلاقی انحطاط میں ہے۔ سیاست ہو کہ معیشت، معاشرت ہو کہ تجارت، صنعت ہو کہ تعلیم، بگاڑ جہاں بھی پیدا ہو رہا ہے، جس حد تک بھی ہو رہا ہے، اس کی وجہ اخلاق کا فقدان ہے۔ جب افراد کے اخلاق میں کمزوری در آئے تو زندگی کا ہر شعبہ متاثر ہوتا ہے ہر شعبہ حیات کے افراد اپنے پست اخلاق کی وجہ سے اس شعبے میں اپنی صلاحیت و صلاحیت سے بہار لانے کے بجائے اس کو خزاں رسیدہ کر دیتے ہیں، الغرض خرابی جب بھی ہوتی ہو جس نے بھی کی ہو اس کی پشت پر اخلاقی اضمحلال ہی کار فرما رہا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ ہم تھوڑی دیر کے لیے اپنی ذہنی وابستگیوں اور ذاتی، گمراہی اور

جماعتی نقطہ نظر سے بلند ہو کر اس صورت حال پر غور کریں اور کسی ایک فرد، گروہ یا جماعت کو ہدف بنانے کے بجائے اخلاق کی گرتی ہوئی دیواروں کو سنبھالنے کی سعی کریں، کیوں کہ جب سیلاب آتا ہے تو وہ اپنے پرانے کی تفریق نہیں کرتا سیلاب اندھا ہوتا ہے اور وہ سب کو بہا کر لے جاتا ہے

محبانِ گرامی!

اس سیلاب پر بند باندھنا چاہیے، فوری باندھنا چاہیے اور ہم سب کو مل کر باندھنا چاہیے۔ اس سیلاب کو روکنے کے لیے ہمارے پاس طاقت موجود ہے اور وہ طاقت ہے اخلاقِ نبوی کی۔ اخلاقِ نبوی کی پیروی ہی ہمیں خس و خاشاک کی طرح بہر جانے سے بچا سکتی ہے۔ سرکارِ دو عالم، نبی اکرم، نور مجسم صلی اللہ علیہ وآلہ وصحبہ وسلم نے جب ظہور فرمایا تھا تو دنیا کی حالت اس سے بھی زیادہ خراب تھی۔ آپ کے نسخہ کیمیا نے ایک ایک مرض کا علاج کیا اور دیکھتے ہی دیکھتے حیاتِ اجتماعی کا بیمار ڈھانچہ مضبوط اخلاقی بنیادوں پر کھڑا ہو گیا اور دنیا میں ایک بے مثال انقلاب کا باعث بنا۔ ضرورت ہے کہ آج بھی ہم اسی نسخہ کیمیا سے اپنے امراض کا علاج کریں اور شفا حاصل کریں۔ یہی وہ ضرورت ہے کہ جو ”مذاکرۃ ملی اخلاقیاتِ نبوی“ کی محرک ہوئی اور ہم نے ماہِ ربیع الاول کو اس آوازِ اخلاق کو بلند کرنے کے لیے اس لیے منتخب کیا ہے کہ یہ ماہ مبارک مسلمانانِ عالم کے لیے جشن و مسرت کا پیام ہے اور اس لیے ہے کہ اس مہینے میں اللہ کا وہ فرمانِ رحمت دنیا میں آیا جس کے ظہور نے دنیا کی شقاوت و حرمانی کا موسم بدل دیا۔ ظلم و طغیان اور فساد و عصیان کی تاریکیاں مٹ گئیں۔ اللہ اور اس کے بندوں کا ٹوٹا ہوا رشتہ جڑ گیا۔ انسانی اخوت و مسابغات کی یگانگت نے دشمنوں کو نابود کر دیا اور کلمہ کفر و ضلالت کی جگہ کلمہ حق و عدالت کی حکم رانی کا اعلان عام ہوا۔

آخر میں آئیے دستِ دعا دراز کریں۔

اے باری تعالیٰ! ہم اخلاقی زوال کی جس دلدل میں پھنس گئے ہیں، اس سے ہمیں صرف اور صرف تیرے حبیبِ پاک کے اسوۂ حسنہ کی پیروی ہی نکال سکتی ہے، تو ہمیں اِثم و عُدوان کے بھنور سے بچا اور افعالِ حسنہ کی توفیق عطا فرما۔ اس ذکرِ جمیل کو قبول فرما جو یہاں ہوا ہے اور ہوگا۔ اور اس کے طفیل ہمیں اخلاقِ نبوی سے قریب کر دے۔ اے خالق کائنات! ہم گنہگار سہی، مگر تیرے بندے ہیں، تیرے رسول کے نام لیوا ہیں، جس نے ہمیں اخوت و اتحاد کا سبق دیا اور تیری یہ آیت و ہدایت سنائی کہ ”وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللَّهِ جَمِيعًا وَلَا تَفَرَّقُوا“۔ مگر ہم نے تیری رسی کو چھوڑ دیا اور شیرازہ ملت کو پارہ پارہ کر دیا۔ ہمارے ہاتھوں میں اتنی طاقت عطا فرما کہ ہم حبل اللہ کو مضبوطی سے تھام لیں اور ایک دل، ایک جان ہو کر تعمیرِ جہاں کے لیے اکٹھے کھڑے ہوں۔ آمین، ثم آمین

نظام معاشرت

جناب محترم مولانا محمد مالک کاندھلوی

الحمد لله رب العالمين والعاقبة للمتقين والصلوة والسلام على خير خلقه
سيدنا ومولانا محمد وآله واصحابه اجمعين۔

اعوذ بالله من الشيطان الرجيم

بسم الله الرحمن الرحيم

هو الذي ارسل رسوله بالهدى ودين الحق ليظهره على الدين
كله وكفى بالله شهيدا محمد رسول الله والذين معه اشداء على
الكفار رحما بينهم تراهم ركعا سجدا يبتغون فضلا من الله
ورضوانا سيماهم في وجوههم من اثر السجود

صدق الله العظيم

مذاکرہ ملی اخلاقیات نبوی کے سلسلے میں اس وقت موضوع بیان نظام معاشرت ہے۔
اسی کے متعلق کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔ یہ آیات جو تلاوت کی گئیں اگرچہ سرور کائنات جناب رسول
اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت اور آپ جس دین حق و ہدایت کو لے کر مبعوث ہوئے اُس کا بیان ہیں
اور آپ کے صحابہ کی ایمانی، عملی، اخلاقی اور معاشرتی خوبیوں کا ذکر ہے جن کے اخلاق و معاشرت کی
ظہارت و عظمت حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم و تربیت کا نتیجہ تھا۔ مگر آیات مبارکہ کے اس
اصل موضوع پر اجمالی نظر ڈالنے ہی سے نظام معاشرت کے بنیادی اصول سمجھ میں آ رہے ہیں، کیوں کہ
یہ بات ظاہر ہے کہ انسانی حیات اور مقاصد حیات کی تکمیل اور رشد و فلاح کی منازل طے کرنا ہدایت اور
حق کا محتاج ہے۔ بغیر ہدایت انسان گمراہی میں پڑے گا، اور حق کے بغیر باطل نظام کی تباہ کاریاں عالم
انسانیت کے سارے نظام کو درہم برہم کر ڈالیں گی۔ تو سب سے پہلے تعلیمات نبویہ کی بنیاد حق و ہدایت
ہوتی۔ اور اس حق و ہدایت کی بنیاد پر قائم ہونے والی عملی عمارت، اخلاق و معاشرت کی جملہ خوبیوں پر
مشتمل ہونے کے باعث اس طرح ظہور پذیر ہوئی کہ آپ کے صحابہ اشداء علی الکفار رحما، بینہم کا
منظر کامل بن کر دنیا کے سامنے رونما ہوئے۔

شدت و رحمت یعنی سختی و نرمی ہی ایسی دو قوتیں ہیں جو نظام کو چلاتی ہیں، اور سعادت و شقاوت کی منزل پر پہنچانے والی بھی یہی دو طاقتیں ہیں۔ اگر ان کا رُخ صحیح ہے تو انسانی حیات اخلاق و معاشرت کی ہر خوبی کو حاصل کرے گی۔ اور اگر رُخ غلط ہے تو تباہی اور بربادی کے سوا کوئی چارہ کار نہیں۔

(اس کی وضاحت کے لیے میں آپ کی توجہ تخلیقِ آدم کے ارادہ تکوینی پر فرشتوں کے ایک اشکال اور اُس کے جواب کی جانب مبذول کر دوں۔ حق تعالیٰ شانہ نے جب یہ فرمایا انی جاعل فی الارض خلیفہ کہ میں زمین میں اپنا ایک خلیفہ بنانے والا ہوں تو فرشتوں نے عرض کیا اتجعل فیہا من یفسد فیہا ویسفک الدماء کہ اے پروردگار! کیا آپ ایسی مخلوق پیدا کرنے والے ہیں جو زمین میں فساد مچائے اور خون ریزی کرے۔ اور ظاہر ہے کہ یہ دونوں باتیں معاشرت کے بگاڑ اور تباہی کی باعث ہیں۔

حضرات مفسرین نے فرشتوں کے اس اشکال کی متعدد وجوہ بیان کی ہیں۔ امام رازی ان وجوہ کا ذکر کرتے ہوئے اصل سبب یہ بیان کرتے ہیں کہ فرشتوں نے یہ بات انسان کے اجزائے ترکیبیہ پر نظر کرتے ہوئے کہی، کیوں کہ انہوں نے دیکھا کہ تخلیقِ انسان میں جو اجزا ہیں یعنی پانی، مٹی، آگ اور ہوا، یقیناً ان کے آثار اُس کی عملی زندگی میں رونما ہوں گے۔

۱ ہر نسخہ مرکب اپنے اجزا کی تاثیر اور اُس کے خواص پر مشتمل ہوتا ہے تو پانی سے حرص و لالچ جیسی خصلتیں پیدا ہوں گی، اور مٹی کی خاصیت جذب و انقباض ہے تو اُس سے بخل پیدا ہوگا، اور آگ کی تاثیر و خاصہ حرارت و اشتعال ہے تو اس سے برا فروختگی اور غصہ ہوگا اور ہوا کا خاصہ بلندی و اُبھار ہے تو نخوت و غرور اور سرکشی جیسی چیزیں واقع ہوں گی۔ اور یہ جملہ چیزیں عالم میں فساد و خون ریزی کا سبب بنیں گی۔ حق تعالیٰ نے جواب اپنی شانِ عظمت کے مناسب یہ دیا کہ انی اعلم بما لا تعلمون جس سے فرشتوں کو اس بات پر متنبہ کرنا تھا کہ تم نے انسانی قوائے عملیہ کا ایک رُخ دیکھ کر ایسا اندازہ کیا، لیکن اس حقیقت کو اب واضح کر دیا جائے گا کہ یہی قوتیں جو انسانی معاشرے کو تباہ کر دینے والی ہیں اگر ان کا رُخ صحیح کر دیا جائے گا تو بے جائے فساد معاشرہ کے صلاح و کمال کی اعلا منزلوں پر انسانی زندگی پہنچ جائے گی۔

حدیث میں ہے کہ آن حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا من اعطی اللہ و منع اللہ و احب اللہ و ابغض اللہ یعنی جس نے جو عطا و سخاوت کی وہ بھی اللہ کے لیے اور جو کچھ بخل و تنگی کی وہ بھی اللہ کے لیے اور جو کچھ محبوب رکھا وہ بھی اللہ کے لیے اور جس چیز سے بغض و

نفرت کی وہ بھی اللہ کے لیے، تو بے شک ایسے شخص نے اپنا ایمان کامل کر لیا۔
 اور یہ ظاہر ہے کہ انسانی حیات میں سخاوت و بخل اور محبت و نفرت کے جذبات پائے
 جاتے ہیں۔ اور یہ ممکن نہیں کہ ان میں سے کوئی چیز بھی عملی زندگی میں ناپید ہو جائے، لیکن یہی
 وصف سخاوت اگر خیر کے کاموں میں ہو تو ایثار و ہمدردی اور خدمتِ خلق کی صورت میں رونا ہوگا۔
 اور یہ وصف اگر برائیوں میں ہو تو اسراف اور فضول خرچی اور تعیش جیسی مذموم حاصلت بن کر
 سامنے آئے گا۔

علیٰ بن ابی القیاس بخل و تنگی اگر برائیوں سے ہو تو معاشرے کو بہتر بنانے کا سامان ہوگا اور اگر
 خیر اور بھلائیوں میں ہو تو محمدی اور بد نصیبی میں مبتلا ہونا پڑے گا۔ شوق و محبت کے جذبات
 خیر میں ہوں تو معاشرہ محاسن اعمال و اخلاق کا مظہر بن جائے گا، اور اگر یہ جذبات نفس کے تقاضوں کے
 تابع ہو جائیں تو شر و فساد اور بے حیائی کے سوا کچھ نظر نہ آئے گا۔ اسی طرح بغض و نفرت اگر اپنوں سے ہو
 تو دنیا میں انسان درندوں کی شکل میں نظر آنے لگیں گے اور یہ بغض دشمنوں سے ہو اور بُری باتوں سے
 ہو تو قوم کے لیے بقا و سلامتی اور عزت و عافیت کا سامان ہوگا اور عفت و پاک دامنی اور تقویٰ سے
 معاشرہ مزین ہوگا۔ امام احمد بن حنبلؒ نے مسند میں ایک روایت ذکر کی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ
 وسلم نے فرمایا، اللہ رب العزت نے جب آدم علیہ السلام کو پیدا فرمایا تو اللہ نے آدم میں ایک چیز رُوح
 پیدا کی اور ایک چیز نفس بھی اس میں پیدا کیا۔

تو اب انسانی زندگی میں عفت و تقویٰ، ایثار و سخاوت اور ہر فلاح و سعادت کی چیز جو ظاہر
 ہوتی ہے وہ رُوح سے ہے، کیوں کہ وہ ملائعہ اعلیٰ سے ہے اور امر رب ہے۔ اور جو چیز بھی شر اور بُرائی کی
 انسان میں ظاہر ہو وہ اس کے نفس سے ہے۔ آپ کے اس ارشاد مبارک نے انسان کی عملی قوتوں کے
 دو رخ ظاہر کر دیے اور یہ بتا دیا کہ خیر کے محرکات رُوح سے ہیں اور شر کے محرکات نفس سے ہیں۔

امام بیہقی نے ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے ایک حدیث روایت کی ہے جس کا مضمون یہ ہے کہ
 حق تعالیٰ نے جب عقل پیدا فرمائی تو اُس سے فرمایا اَقْبِلْ فَاَقْبِلْ ثُمَّ قَالَ اَدْبِرْ فَاَدْبِرْ ثُمَّ قَالَ
 قُمْ فَمَا تُمْ قَالَ اُقْعِدْ فَقْعِدْ كَمَا اَنْتَ عَقْلٌ تُوْا اَكْغَا تُوْا اَكْغَا تُوْا اَكْغَا تُوْا اَكْغَا تُوْا اَكْغَا تُوْا اَكْغَا
 جاتو وہ پیچھے ہٹ گئی۔ اُس سے فرمایا اَتُوْا اَطْهَ كَهْطَى هُوْوَ كَهْطَى هُوْوَ كَهْطَى هُوْوَ كَهْطَى هُوْوَ كَهْطَى
 گئی۔ بد و تخلیق میں عقل کے ان احوال کو مقدر فرما کر یہ ظاہر کر دیا گیا کہ انسان کی زندگی میں یہ عملی پہلو
 درایت کر دیے گئے کہ کسی کام کی رغبت تو کسی سے نفرت، کسی کی طرف دوڑ اور مسابقت تو کسی سے پرہیز
 اور بُعد، اور عقل ہی مدبّر اور حاکمِ بدن ہے۔ اگر اس عقل کی حکم رانی اپنے اعضائے بدن پر نفس کی

تحریک سے ہے تو نتیجہ شر و فساد، اور اگر روح کی تحریک پر ہے تو صلاح و خیر۔

امام ربانی شیخ مجدد الف ثانی اپنے ایک مکتوب میں فرماتے ہیں: کمال ایمان یہ ہے کہ بندہ اپنی قوت غضبیہ کو اور قوت شہویہ کو احکام خداوندی کے تابع کرنے اور اس مقام تک پہنچ جائے کہ مقتضائے طبیعت مقتضائے شریعت بن جائے۔ اسی حقیقت کو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد واضح کر رہا ہے۔ الا ان فی الجسد مضغۃ اذا صلحت صلح الجسد کلہ واذا فسدت فسد الجسد کلہ الا وہی القلب: یعنی آگاہ ہو جاؤ انسانی جسم میں ایک گوشت کا ٹکڑا ہے۔ وہ اگر درست ہو تو تمام بدن درست ہوگا۔ اور وہ اگر بگڑ جائے تو تمام بدن بگڑ جائے گا۔ خبردار ہو جاؤ وہ قلب ہے۔ گو یا قلب انسانی اور قالب دونوں اس طرح مربوط ہیں کہ صلاح و خیر اور فساد و شر میں ایک دوسرے کے ساتھ وابستہ ہیں۔ تو عقل انسانی جو اپنے بدن پر قوت حاکم ہے اگر وحی الہی اور تعلیم ربانی سے نور حاصل کرے گی تو اپنے جسم کو خیر میں مصروف کر سکے گی۔ اور اگر اس نور الہی سے محروم رہتے ہوئے ظلمت و تاریکی میں پڑی رہی تو شر و فساد اور گمراہی کی تاریکیوں ہی میں اپنی مملکت برباد کر ڈالے گی۔

یہ بات بالکل اسی طرح ہے جیسے حضور نے ارشاد فرمایا: المعدة حوض البدن ومنہ تصدیر العروق بالصحة والمرض، یعنی معدہ بدن کے لیے ایک حوض ہے وہیں رگیں تمام بدن انسانی کی طرف تن درستی و بیماری لے کر لوٹتی ہیں۔

الغرض معاشرہ اور انسان کی عملی زندگی میں اگر نفس کے محرکات ہوں تو نتیجہ شر و فساد اور قتل و خون ریزی ہی ہوگا جیسے کہ فرشتوں کو اشکال ہوا تھا، چنانچہ ایسے انسان کا طرز زندگی قرآن حکیم نے بیان فرمایا: واذ اتولى سعى فى الارض لىفسد فيها ويهلك الحرث والنسل والله لا يحب الفساد، یعنی کہ جب بھی وہ پیٹھ پھیر کر واپس جائے تو زمین میں فساد برپا کرتا ہوا اور کھیتوں اور نسل کو تباہ و برباد ہی کرنے میں کوشاں ہوتا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ اللہ فساد کو پسند نہیں کرتا۔ اور نفس کی تباہ کاریاں اُس کو ایسا مغرور و بدست بنا دیتی ہیں کہ واذ اقبل لى اتق الله اخذنا العزة بالاثم فحسبه جہنم۔ یعنی جب اس کو کہا جائے کہ خدا سے ڈر تو غرور و تکبر اُس کو اور گناہ و سرکشی پر آمادہ کرتا ہے، لیکن روح کے محرکات اُس کی قوت غضبیہ کا رخ مجرمین کی سرکوبی کی طرف پھیر دیتے ہیں اور وہ مجرمین پر قہر خداوندی بن کر برستا ہے۔ اور جذب و شوق کی طاقتیں اُس کو تقویٰ اور طاعت کی طرف کھینچ لاتی ہیں۔ اب اس کو عبادت اور محاسن اعمال و اخلاق اس قدر لذیذ و مرغوب معلوم ہونے لگتے ہیں کہ اس سے زائد کوئی چیز زندگی میں مرغوب نہیں رہتی۔ پہلا رخ معاشرے کے فساد کا تھا تو یہ رخ معاشرے کی صلاح و فلاح کا ہوا۔

یہی وہ چیز ہے جس کو حق تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے: **وَمِنَ النَّاسِ مَن يَشْرِي نَفْسَهُ**
ابْتِغَاءَ مَرْضَاةِ اللَّهِ، یعنی انسانوں میں بہت سے وہ ہوتے ہیں جو اپنے نفس کو فروخت کر ڈالتے ہیں
اللہ کی رضامندی حاصل کرنے کے لیے۔ یعنی اپنے نفس کے تقاضوں کو مٹا کر رُوح کے تابع کر لیتے ہیں۔
نفس اپنی ذات اور فطرت سے امارۃ بالسوء برائیوں پر آمادہ کرنے والا ہے۔ ضرورت
ہے کہ تعلیم و تربیت کے ذریعے سے اس کے زہر کو مُدبّر کر کے اس کو کُشتہ بنا لیا جائے۔ اگر نفسِ امارہ کو
تعلیماتِ نبویہ سے مُدبّر کر لیا گیا تو پھر یہ نفسِ امارہ اور لوامہ کے بجائے نفسِ مطمئنہ بن جائے گا۔ اور
رُوح کے لیے ایک شکاری کتے کی طرح بڑے قیمتی اعمال و افعال اور خصائل کا شکار لالا کر انسانی حیات کو
سُود مند و منتفع کرنے لگے گا۔

امام غزالیؒ نے احوالِ العلوم میں احوالِ قلب پر بحث کرتے ہوئے ایک موقع پر فرمایا کہ بدنِ
انسانی کو ایک شہر یا ملک کی طرح سمجھ لینا چاہیے اور عقل کو بہ منزلہ حاکم کے۔ اور اُس کے مددگار و قوی
خواہ جو اس ظاہرہ میں سے ہوں یا باطن سے اس کے اعوان و مددگار اور لشکر ہیں۔ اور اس کے اعضاء
بدنیہ گویا اس کی رعیت ہیں۔ اور نفسِ امارہ بالسوء جو اُس کے جذباتِ شہوت و غضب ہیں اس کا
دشمن ہے جو اس کے ساتھ برسرِ پیکار ہے اور اس کی سلطنت کو تباہ و برباد کرنے اور اس کی رعیت
کو ہلاک کرنے پر تلا ہوا ہے تو اب اگر اس ملک کا بادشاہ اس دشمن کے ساتھ مقابلہ و جہاد کر کے اس
کو شکست دے دے گا تو اپنی سلطنت بھی محفوظ رکھ سکے گا اور اپنی رعیت کو بھی ہلاکت سے بچالے گا۔
یعنی اس کی زندگی نجات و کامیابی حاصل کر لے گی۔ اور وہ اپنے وجود کو دنیوی ذلت اور اخروی عذاب
سے بھی بچالے گا۔ دنیا میں کوئی بادشاہ اپنی سرحدوں کو دشمن کے حملے کے لیے خالی نہیں چھوڑا کرتا۔

اس مقالے کی محدود گنجائش ان نکات کی توضیح کی اجازت نہیں دیتی جن کی طرف اشارہ کیا
گیا۔ البتہ صرف ایک حدیث کا مضمون محض حوالے کے طور پر پیش کرنے پر اکتفا کرتا ہوں جس سے بخوبی
یہ بات ظاہر ہو سکے گی کہ تعلیماتِ نبویہ نے دنیا کے انسانوں کے لیے کیسا پاکیزہ نظامِ معاشرت عطا فرمایا؛
امام بخاری اور امام مسلم نے صحیحین میں حدیث تخریج فرمائی ہے۔ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ
وسلم نے ارشاد فرمایا: **سَبَعَتْ لِي ظِلْمَةُ اللَّهِ يَوْمَ لَا ظِلَّ إِلَّا ظِلُّ اللَّهِ**۔ یعنی سات آدمی ایسے ہیں جن
کو اللہ تعالیٰ اپنے خاص سایہ رحمت میں جگہ دے گا اُس روز جب کہ کوئی سایہ اُس کے سائے کے
علاوہ نہ ہوگا۔ فرمایا: ایک عدل و انصاف قائم کرنے والا حاکم۔ دوسرا وہ نوجوان جو اللہ کی عبادت میں
سرشار و مست ہو اور اسی میں نشوونما پارہا ہو۔ تیسرے وہ دو شخص جو باہمی محبت صرف اللہ کے لیے
رکھتے ہوں، اُسی پر جمع ہوتے ہیں اور اُسی پر جُدا ہوتے ہیں۔ چوتھا وہ شخص جو مسجد سے فارغ ہو کر

نکلا، لیکن اُس کا دل مسجد ہی میں اٹکا ہوا ہے تا وقتے کہ وہ پھر مسجد میں آجائے۔ پانچواں وہ جس نے تنہائی میں اللہ کو یاد کیا اور خشیت و تقویٰ سے اُس کی آنکھ سے آنسو جاری ہو گئے۔ چھٹا وہ جس کو کسی نے نفس کی شہوتوں کی دعوت دی اور اُس نے یہ کہہ کر ٹھکرا دیا انی اخاف اللہ کہ میں تو اللہ سے ڈرتا ہوں۔ ساتواں وہ شخص جو اس طرح کسی کو صدقہ کرتا ہے کہ باتیں ہاتھ کو بھی خبر نہ ہو کہ دائیں ہاتھ نے کیا دیا۔ تو اس حدیث میں نظامِ حیات کو ہر خیر و سعادت سے آراستہ کرنے کے تمام پہلو واضح فرما دیے گئے یعنی حاکم عدل و انصاف قائم کریں، باہمی معاشرت ایسے اخلاص اور پائیدار جذباتِ محبت پر قائم ہو کہ اسی پر ملنا ہو اور اسی پر ایک دوسرے سے جدا ہوں، غیبت و حضور کا فرق نہ رہے۔ ذوقِ عبادت اس قدر قوی ہو کہ وہ جوانی کا دور جس میں طبعی خواہشات اور لہو و لعب انسان کو غافل و لاپرواہ بناتے رکھتا ہے، وہ نوجوان عبادتِ خداوندی ہی میں مست رہے۔ خوفِ خدا اس قدر ہو کہ تنہائیوں میں اللہ کو یاد کر کے روتا ہو۔ عفت و پاک دامنی کا یہ مقام ہو کہ نفس کے بڑے سے بڑے دواعی اور تقاضوں کو ٹھکرا دے۔ ایثار اور خدمت کا یہ رنگ ہو اور ایسے اخلاص و تواضع کے ساتھ ہو کہ گویا باتیں ہاتھ کو بھی خبر نہ ہو کہ دائیں ہاتھ نے کیا کیا ہے۔ یہ سات شعبے ہیں جو تمام نظامِ حیات پر محیط ہیں۔ ان کی تکمیل و تحسین کی یہ تعلیم بتا رہی ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے انسانی زندگی کے دونوں رخ نہایت اعلا و مکمل فرمائے۔ زندگی کا وہ رخ جو خالق کی طرف ہے وہ ایسا اعلا و اکمل ہو کہ ایمان و تقویٰ کا پیکر بنا ہوا ہو۔ اور مخلوق کی طرف جو رخ ہے وہ ایسا پاکیزہ ہو کہ اخلاص، ایثار و محبت اور اعانت و خدمت کا مجسم پیکر بنا رہے۔

بلاشبہ کہا جاسکتا ہے کہ یہی وہ نظامِ حیات ہے جو انسانوں کو مادی کثافتوں سے پاک کر کے ملائکہ مقربین کے زمرے میں داخل کر دیتا ہے، بلکہ اُس عالی مقام پر پہنچاتا ہے کہ فرشتوں کو اُن پر رشک ہوتا ہے اور بارگاہِ خداوندی میں اُن کے اعمال پیش کرنے میں فخر کرتے ہیں۔

خداوندِ عالم تعلیماتِ نبویہ سے ہمیں ایسے ہی نظامِ حیات سے آراستہ و مزین فرمائے اور دنیا و آخرت کی سعادتوں سے ہم کنار فرمائے، آمین۔

وَأفرد عوانا ان الحمد لله رب العالمین

نظام تمدن و مدنیت

جناب محترم مولانا محمد سعید

(جب بنی نوع انسان میں ظلم و عدوان اپنی انتہا کو پہنچ جاتے ہیں اور اللہ کی مخلوق کے اپنے بٹے ہوئے جال ہر جنبش تازہ کے ساتھ اُس کی کھال میں گھستے چلے جاتے ہیں اور جس مقصد کے لیے تخلیق آدم ہوئی، اولادِ آدم اُس سے دُور ہٹتی چلی جاتی ہے تو اللہ اپنی مخلوق میں سے کسی خاص بندے کو منتخب کرتا ہے کہ وہ بھنگے ہوئے ہجومِ خلق کو پھر سیدھی راہ پر لے آئے) ایک ایسی زندگی جب حرا کی تنہائیوں میں سے نکلی کر تاریخ کے دھارے میں قدم رکھتی ہے اور وہ لمحہ یاد رکھیے تاریخِ انسانی کے لیے بڑی خوش بختی کا ہوتا ہے تو اس کے پیش نظر ذاتی علو یا منفعتیں نہیں ہوتیں بلکہ دوسروں کو اپنے روپ میں ڈھالنے کی تمنا ہوتی ہے۔

پیغمبرانہ زندگی ہر شاہکار کی طرح خونِ جگر کی طالب ہوتی ہے۔ اس میں درد و کرب، حزن و یاس، بیم ورجا، کوششِ پیہم، شبِ بیداری اور نالہ نیم شبی سبھی کچھ ہوتے ہیں یہ زندگی خدائی کا دردِ سر نہیں ہوتی، بندگی کا دردِ جگر ہوتی ہے۔ اور بندگی ہی کو انسان کی تقدیر بنایا گیا ہے۔

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونَهُ الذاریات: ۵۶

”جن و انس کو پیدا ہی عبادت کے لیے کیا گیا ہے“

جب زندگی کا مقصد اولیٰ ہی ٹھہرایا گیا ہو پھر زندگی کا ہر بندھن اس مقصد کا تابع ہو جاتا ہے۔ رہن سہن، لین دین کا تمام کار بار، تعلقاتِ باہمی کا پورا تانا بانا، محبت و نفرت کی پوری دنیا۔ غرض یہ کہ پورا تمدن ایک ہی جذبے کے تحت ہو گیا اور وہ جذبہ ہے خدا کی بندگی کا اور اس کے لیے بہترین نمونہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی ہی مقدر ہوئی اور پھر نبیؐ نے زندگی کو سنوارنے کے کام میں محض دو چار باتیں ہی نہیں کہیں کسی چھوٹی بڑی تفصیل کو نظر انداز نہیں کیا۔ ایک اچھا مصوّر صرف قد و قامت یا دست و بازو کے حُسنِ تناسب ہی کو کاغذی پیرہن نہیں پہناتا بلکہ ابرو و شکرگان تک کا ہر ہر بال اُس کے مٹوئے قلم کے پیچ و خم کی رعنائی کا منظر ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ زندگی کا کوئی گوشہ، نگاہِ نبویؐ سے اوجھل نہیں رہا۔

اچھا تمدن بے کیا چیز؟ انہیں جزئیات کی نگہ داری۔ معاشرتی زندگی ہر قدم پر دوسروں کی احتیاج اور ان سے تعاون کا نام ہے۔ ہر شخص دوسرے کا محتاج ہے اور کوئی قدم بغیر تعاون کے ممکن نہیں۔

دیکھا جائے تو انسان، اپنی پیدائش سے موت تک، محتاجیوں کے ایک طویل سلسلے میں سے گزرتا چلا جاتا ہے۔ پیدا ہوتا ہے تو بقائے حیات کے لیے ماں کے دودھ کا محتاج ہوتا ہے، آگے بڑھتا ہے تو باپ کے کمائے ہوئے رزق کا محتاج۔ علم حاصل کرنا چاہتا ہے تو اساتذہ کے علم کا محتاج، بیمار ہو تو طبیب کے دستِ شفا بخش کا محتاج۔ اور جب کارِ بارِ حیات میں اترتا ہے تو پھر تو اس کی محتاجیوں کا کیا پوچھنا! پھر احتیاج کم اور ہوس زیادہ۔ الغرض، کوچے کوچے، گلی گلی رسوا ہوتا پھرتا ہے۔ تا آنکہ اس کے قلب و ذہن پر خواہشاتِ نفسانی کے اندھیرے چھانے لگتے ہیں، اور وہ اشرف المخلوقات ہونے کے باوصف شجر و حجر کے سامنے سرفاگندہ ہو جاتا ہے۔

ایسے میں ایک آواز گونجتی ہے۔ کہو!

إِيَّاكَ نَعْبُدُ وَإِيَّاكَ نَسْتَعِينُ ۝ الفاتحہ: ۴

کیا کر رہے ہو؟ مانا احتیاج ہے۔ پھر بھی حاجت روا تو ہم ہیں۔ حاجتیں ہم پوری کریں گے۔ تمہیں ہر قدم پر جوشِ بندگی میں خدا تراشنے کی ضرورت نہیں۔ تمہارے کرنے کا کام البتہ باہمی تعاون ہے اور تعاون بھی نیکی اور خدا خوفی پر، نہ کہ بُرائی اور عصیان پر۔

تَعَاوَنُوا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوَىٰ وَلَا تَعَاوَنُوا عَلَى الْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ ۝ المائدہ: ۲

اب تعاون کا انحصار کس شے پر ہے؟ یاد رکھیے تعاون سے زیادہ نازک اور کوئی معاملہ نہیں۔ یہ جذبہ دودھ کی طرح ہے جب تک خالص ہے، جب تک برتن صاف ہے، جب تک گندے ہاتھوں سے محفوظ ہے یہ زندگی بخش اجزا کا بے مثال مجموعہ ہے جو رگ و پے کو تروتازہ کرتا چلا جاتا ہے، لیکن جوں ہی اس میں کھٹائی پڑی یہ پھٹ گیا۔ چنانچہ تعاون کے شیرِ جان بخش کو کھٹائی سے بچانے کی بہترین صورت وہ ہے جس کا حکم یوں قرآنِ کریم میں دیا گیا ہے۔

إِنَّ السُّلْطَانَ يُؤَمِّرُكُمْ أَنْ تَوَدُّوْا وَالْأَمَانَاتِ إِلَىٰ أَهْلِهَا ۝ النسا: ۵۸

”امانتیں حق داروں کو لوٹا دیا کرو“

میرے علم میں مدینت کے قیام اور اس کے فروغ کے لیے اس سے زیادہ جامع اور کوئی حکم یا نصیحت انسان کے پورے علمی سرمایے میں نہیں اور پھر لطف یہ ہے کہ اس حکم کے تحت ہم سب کے اعزاز میں گراں قدر اضافہ ہو جاتا ہے۔ ہم سب ایک دوسرے کے امانت دار ٹھہرائے گئے ہیں۔ آپ کی

کچھ امانتیں مجھے ادا کرنا ہیں اور میری کچھ امانتیں آپ کے ذمے ہیں، ہم میں کا ہر شخص مناسب امانت ہے۔ گویا ہر جج کی دگ، ہر قاضی کا عمامہ، ہر معلم کی مسند، ہر تاجر کا ترازو، ہر سرمایہ دار کی تجیری، ہر مزدور کا کدال، ہر کسان کا ہل، ہر سپاہی کی تیغ، ہر قلم کار کا قلم، ہر خطیب کا نطق، ہر طبیب کی میخانہ، ہر شوہر کی وفاداری، ہر بی بی کی عصمت، ہر باپ کا جذبہ پداری اور ہر فرزند کے آدابِ فرزندگی، اسی امانت کے مختلف روپ ہیں جو ہمیں، جہاں کہیں ہم ہیں، متواتر ادا کرتے رہنا ہے۔ یہ امانتیں ادا ہوتی رہتی ہیں تو معاشرتی نظام چلتا رہتا ہے۔ تمدن نمودیر ہوتا رہتا ہے۔ جہاں نیتوں میں فتور آیا، وہیں نساد کی صورت پیدا ہو گئی۔

اب ذرا حضورؐ کے زمانے کو پیش نظر رکھیے۔ مکی زندگی میں اسلام یوں رونما ہوا تھا کہ جیسے خشک سالی کے بعد رحمتِ خداوندی کا چھینٹا۔ مکے کی سنگلاخ وادیوں میں دور و نزدیک اکاد کا پھول کھل اٹھے۔ ان کی بہار اپنی جگہ، ان کی باصرہ نوازی اپنے مقام پر لاجواب، لیکن جس بستی کو دامانِ باغ بان بنتا تھا وہ یثرب کی بستی تھی جہاں سب کے پھول ایک ہی دامن میں بھر گئے اور ان میں گلِ سرسبز حضورؐ کا اپنا گھرانہ تھا اور یہی وہ سرچشمہ تھا جہاں سے تمدنِ اسلام کے سوتے پھوٹنے والے تھے۔ یہیں سے امت کی شیرازہ بندی ہونا تھی اور یہی مقام اسلام کی پوری کائنات تھا۔ ادا ئے امانت کے سب آداب یہاں سکھائے جانے والے تھے۔

رہنما
Engl
ہر

اب ذرا اگر دو پیش کے معاشرہ پر بھی نظر ڈالیے۔ انسان تمدن کی زندگی کئی صدیوں سے گزار رہا تھا۔ مشرقِ بعید میں دیوار چین، ہندستان میں ایجنٹا کے غار، افریقہ میں اہرامِ مصری، بابل و نینوا میں قصرِ شیریں۔ اور انہار کا سلسلہ اور ان سے قبل، سرزمینِ پاکستان پر موجود روادور ٹیکسلا سب انسان کے تمدن کی دلیلیں تھیں۔ فکری اور روحانی دنیا میں ہومر کا ایلیڈ، کالی داس کے ڈرامے، زرتشت کے ملفوظات، بدھ کی تعلیمات، منو کی سمرتیاں، افلاطون اور ارسطو ایس کے رشحاتِ قلم سب انسانی تمدن کے شاہکار تھے، لیکن ان سب کو یکے بعد دیگرے کھنگال جاتیے اپنی تمام رعنائیوں کے باوجود ان کے خیال کی حد یا ذاتِ شاہ تھی یا سنگِ صنم۔ یا نمرود و فرعون کی طرح بادشاہ تھے۔ یا بندرا بن اور اولیپا پر بسنے والے کھلندرے دیوتا۔ اور ان کے درمیان انسانیت جو اشرف و رذائل میں منقسم تھی برابر پس رہی تھی۔

افلاطون، یونان کا نام و فلسفی، اور منو، ہندستان کا نام و مہقن۔ انسانوں کو تہ در تہ بانٹتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ افلاطون کا عمرانی فلسفہ تو مدت ہوئی ختم ہو گیا، لیکن منو کے نیچر آج بھی سوادِ بند میں انسانی شرف کو ترس رہے ہیں۔

چنانچہ اسلام کے تمدن کی بنیاد، دو چیزوں پر رکھی گئی۔ خداوند تعالیٰ کی وحدانیت پر اور اُس کے بندوں کی تکریم پر۔ اپنے بارے میں ذاتِ خداوندی نے کہا "لا الہ الاہو" اور اس کا اعلانِ کامل ہوا اُس روز جب کعبہ بتوں سے پاک کیا گیا۔ اور بندوں کے بارے میں کہا "وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِي آدَمَ الْاِسْرَاءِ: ۷۰۔ تکریمِ آدم کی تکمیل جب ہوئی جب جیلِ رحمت کی بلندیوں پر سے ہر بلند دست کو برابر کر دیا گیا۔ گورے کالے، عربی عجمی کی تفریق مٹادی گئی۔

یہ ہر کیف حاکمیتِ حق اور تکریمِ آدم دو ایسے بنیادی اصول تھے کہ جن پر اسلامی تمدن کی عمارت اٹھاتی گئی۔ شخصی جواب دہی، اور قومی مشورت کا پورا نظام اسی بنیادی فلسفے کی ایک جھلک ہے۔

تکریمِ آدم کی ضمناً ایک بات یاد آگئی ہے آج متمدن دنیا میں اگرچہ نسلی تفاخر کے مٹنے کے نعرے لگ رہے ہیں اور اقوامِ متحدہ کو خلیقِ خدا کے سامنے مساواتِ بشر کے عملی نمونے کے طور پر پیش کیا جا رہا ہے تاہم اقوامِ غالب کی تجربہ گاہوں میں کچھ اور ہی نوع کے علوم ایجاد ہو رہے ہیں۔ جہاں کل تک کتابوں کی دکانوں کے شیلفوں میں GENETIC. ENGINEERING کی دو چار کتابوں کے علاوہ کچھ نظر نہیں آتا تھا آج وہاں الماریوں پر الماریاں اس علم کی کتابوں سے بھری جا رہی ہیں۔ اور یہ علم ہے کیا؟ سادہ الفاظ میں یوں سمجھیے کہ انسانی جسم سے بیماری خارج کرنے کے بہانے انسانیت کو ابدی آقاؤں اور ابدی غلاموں میں تقسیم کرنے کا منصوبہ۔ خدشہ ہے کہ اقبال کا شاہین تو منقار زیر پر رہ جائے گا اور نیٹھے کا سپر مین کیلے فورنیا کی لیبارٹریوں میں تیار ہو جائے گا۔

آج کوشش ہو رہی ہے کہ انسانی جسم کی ساخت میں ایسی تبدیلی لائی جائے کہ ایک نسل کے اندر آقاؤں کی بلند نگاہی، اور دوسروں میں غلاموں کی خاک بصری بھر دی جائے۔ کچھ لوگ مستقل آقا ہوں اور کچھ مستقل غلام۔ جب سرشت بدل گئی۔ جبر و تعلیم سے نہیں بلکہ جسمانی ساخت سے تو پھر تسخیرِ آدم کا کام مکمل ہو گیا۔ خدائے کعبہ نے تکریمِ آدم کی بشارت دی۔ اور خداوندانِ مغرب نے تسخیرِ آدم کی۔

اب پھر آئیے ارضِ مدینہ کی جانب حضورؐ کے مدینہ منورہ تشریف لانے پر جب اسلام کو ایک خطہٴ ارضی میسر آ گیا اور لفظ مدینہ خود مدینت کا ضامن ہے) تو اس کی ہنیت کا تعین ان ہی دو جذبوں کے تحت کیا گیا۔ عربستان کا قبائلی معاشرہ چند خوبیوں کے ساتھ ساتھ جس سب سے بڑی لعنت میں گرفتار تھا وہ ان کی خود مبری تھی۔ لاقانونیت۔ چند رسمیں اور روایات ضرور قائم تھیں، لیکن سب کی سب ان کی خواہشات کے تابع۔ یہاں تک کہ جب لوٹ مار منظور ہوتی یا دشمن سے انتقام

میںا ہوتا تو مقدس مہینوں کو آگے پیچھے کر دیتے۔ خود سری کا یہ عالم تھا کہ جب قبیلے کا بت کہ جس کے سامنے شب و روز سجدہ ریز رہتے اُن کی منشا کے مطابق فال نہ نکالتا تو تیروں کا مٹھا اُس کے منہ پر بے مارتے بھائی بھائی کا دشمن۔

مدینے کے اندر یہود اپنے سرمایہ داری نظام کے تحت بس رہے تھے۔ بخت نصر کی گرفت سے بھاگے ہوئے تھے۔ انہیں جب نخلستانِ یثرب میں پناہ ملی تو اُن کی ریشہ دو انیاں پھر سے جاگ اُٹھیں۔ اوس و خزرج مدینے کے دو مشہور قبیلے یمن کے مارب بند کے بے قابو پانیوں سے بچ کر یہاں پناہ گزیں ہو چکے تھے۔ یہ سب عناصر باہم بس تو رہے تھے، لیکن ان کے اندر ایک ترقی یافتہ تمدن کا تصور قطعی نہیں تھا۔

چُنناں چہ اُن کی وحشت پسندی اتنی رُسا ہو چکی تھی کہ جب عرب سے نکل کر ہرچم اسلام ایران کی سرحدوں کی جانب بڑھا تو فردوسی کی زبان میں وہاں کے باشندے پُرانے تعصبات کی بنا پر پکار اٹھے۔ عے تفو بر تو اے چرخِ گرداں لغو۔

ایسے معاشرے کو تمدن کرنے کے لیے دو باتوں کا اہتمام کیا گیا۔

امن اور تعلیم

امن کے لیے حضورؐ نے اوس و خزرج کے صدیوں پُرانے بیزختم کرا دیے اور یہود سے وہ مشہورِ انام معاہدہ کیا جسے تاریخِ تمدنِ مینشاقِ مدینہ کے نام سے یاد کرتی ہے اور جو نمونہ بنا بعد میں آنے والے تمام بین الاقوامی معاہدات کا۔ اس معاہدے کے تحت یہود کو مذہبی آزادی اور جان و مال کی حفاظت دی گئی۔

- (i) مدینے پر حملے کی صورت میں دفاع کے لیے یہود اور مسلمانوں کا مشترکہ محاذ تجویز ہوا۔
- (ii) اگر جنگِ مدینے سے باہر ہو تو یہود کو لشکرِ اسلام کے ساتھ جانے پر مجبور نہیں کیا جائے گا۔
- (iii) ہر فریق کی خواتین کی عفت و عصمت کی حفاظت کی جائے گی۔
- (iv) اور جب کوئی تنازعہ پیدا ہو تو وہ پیغمبرِ اسلامؐ کے احکام کے مطابق طے ہوگا۔

تعلیم کے لیے مسجدِ نبویؐ مرکز بنی۔ اور یہ مقام محض عبادت گاہ نہیں تھا اسے ایک چانسری کی حیثیت بھی حاصل تھی۔ یہیں سے وفود باہر بھیجے جاتے۔ یہیں سے شاہانِ وقت سے نامہ و پیام ہوتا۔ یہیں لشکروں کی ترتیب طے پاتی۔ اور یہیں باطن کے وہ پردے چاک ہوتے جن کا دور کرنا اسلامی تصوف کا مطحِ نظر ٹھہرا۔ اسی مسجد کا گارا، بالآخر مغرب میں جامعہ قرطبہ اور مشرق میں جامعہ شاہِ جہانی

کاغزہ بنا۔ مسجد نبویؐ گویا تمدنِ اسلام کا اولین گہوارہ بنا۔ خدا کی قدرت ملاحظہ ہو کہ جس سرزمین کو اسکندر کی ہوسِ ملک گیری نے اپنے لیے سزا دارانہ سمجھا ہوا اور وہ اس سے دامن بچا کے نکل گیا وہیں سے شاہانِ وقت کے نام پیغامِ ہدایت جاری ہوتے۔ یہ مکتوبات ایک بشارت تھی کہ ایک نیا دین ایک نیا تمدن، ہدایتِ خداوندی پر مبنی، اُبھرنے والا ہے۔ جس کے دائرہ اثر و نفوذ میں محض قبائلی بندیاں ہی نہیں ہوں گی قیصر و کسریٰ کی مملکتیں بھی ہوں گی۔

چنانچہ بعید نہیں تھا کہ مخالفت اور دشمنی کے جھکڑ بھی اِغیار ایسے مثالی گھر کے سقفِ دہانہ کو اڑانے کے لیے چلائیں۔ اس بستی کے یہودیوں یا منافقین۔ اس کے پڑوس کے رُوسا ہوں یا فرماں روا سب کی نگاہیں کا شانہ نبوت پر مرکوز تھیں اس لیے کہ یہاں سے ادا تے امانت کی جو روشنی پھوٹ رہی تھی وہ ان اندھیروں کو پسا کرنے والی تھی جو ان مفادات نے اپنے گرد و پیش اس غرض سے پھیلا رکھے تھے کہ وہ ان کے اندر انسانوں کے ضمیروں کا بے باکانہ شکار کرتے رہیں۔ امانتِ غضب ہوتی رہیں اور شرفِ انسانیت پامال ہوتا رہے۔ بقائے تکریم کے لیے ضروری تھا کہ ان اندھیروں کو شکست دی جائے اور اپنی شمع کی حفاظت کی جائے۔ اس کے لیے معاشرتی نظام میں ایک اور پہلو کا از خود اضافہ ہو گیا اور وہ مستعدی اور عسکریت کا پہلو تھا۔

آج کل اکثر لوگ یہ کہتے ہوتے سُننے لگتے ہیں کہ ہم مصائب میں گھرے ہوتے ہیں۔ ہمارے معاشرے کے اندر اور باہر ہم پر فکری یورشیں ہو رہی ہیں اور عسکری یورشوں کی دھمکیاں برابر چل رہی ہیں۔ میں پوچھتا ہوں کہ اسلام کو کب دھمکیاں نہیں دی جاتی رہیں۔ مکے میں طوفانِ سب ڈھکھا تھا۔ مدینے میں سازشیں تھیں۔ پھر قیصر و کسریٰ کے عساکر کا ہجوم۔ پھر اندرونی خلفشار۔ پھر حروبِ صلح۔ پھر فتنہ تاتار۔ پھر مغربی استعمار۔ غرض یہ کہ ہمارے چرانوں کو گل کرنے کے لیے کیا کیا آندھیاں نہیں اٹھائی گئیں۔

ان پلے پہلے اُبھرنے والی آندھیوں کا مقابلہ ناممکن ہو جاتا اگر امت کے روبرو حضورؐ کا اسوۂ حسنہ ہوتا۔ اس لیے کہ اگر ایک طرف انسان کے دل میں جستجوئے حق کا جذبہ ہے تو دوسری طرف اسی دل کے اندر جستجوئے عاقبت بھی ہے بلکہ عامۃ الناس کی اکثریت دوسری نوع کی جستجو کی جانب زیادہ رغبت رکھتی ہے اور جب بھی حق جوئی اور عاقبت کوشی کے تقاضوں میں تصادم ہوا ہم میں سے اکثر نے گوشہ عاقبت کو ترجیح دی۔ لیکن قدرت کی ستم ظریفی ملاحظہ ہو جب بھی کسی معاشرے نے عاقبت کوشی کو اپنا مطمح نظر بنایا اسے عاقبت کہیں میسر نہ آتی۔

مدنی معاشرے کی پہلی صفت چنانچہ یہ مقرر کی گئی کہ وہ ہمہ وقت مستعد رہے۔ نفسیاتی طور

پر بھی اور بدنی طور پر بھی۔ نفسیاتی طور پر اندرونی ریشہ دوانیوں اور وساوس کے خلاف اور بدنی طور پر خارجی جارحیت کے خلاف۔ جنگِ احزاب، میں سمجھتا ہوں، اسلام کا شدید ترین معرکہ تھا۔ اس سے بدرجہا اہمیت کو کم کرنا مقصود نہیں جب اصحابِ بدر کے مدارج کی گواہ خود ذاتِ خداوندی ہو اُس کی اہمیت کیوں کر کم ہو سکتی ہے؟ میں افواج کی تعداد، حالات کی ناسازگاری اور کفر کی آخری بڑی کوشش کے پیش نظر جنگِ احزاب کو شدید ترین معرکہ کہہ رہا ہوں۔ افواج کی تعداد پر خود لفظ ”احزاب“ گواہ ہے۔ محاصرہ، سردی کا موسم، یہود کی اندرونی فتنہ انگیزیاں، مسلمانوں کی بے سرو سامانی، ان سب نے مل کر جو کیفیت پیدا کر دی تھی وہ خود قرآنِ حکیم کی زبان میں یوں بیان ہوئی ہے۔

”جب لشکر تم پر چڑھ آئے تو ہم نے اُن پر ایک سخت آندھی بھیج دی اور ایسی قوجیں بھیجیں جو تم کو نظر نہ آتی تھیں۔ اللہ وہ سب کچھ دیکھ رہا تھا جو تم لوگ اس وقت کر رہے تھے اور جب وہ اوپر سے اور نیچے سے تم پر چڑھ آئے۔ اور جب خوف کے مارے آنکھیں پتھر اگئیں۔ کلیجے مُنہ کو آگئے اور تم لوگ اللہ کے بارے میں طرح طرح کے گمان کرنے لگے۔ اس وقت ایمان لانے والوں کا خوب امتحان ہوا۔ بڑی ابتلا میں ڈالے گئے اور بڑی طرح پلا مارے گئے“ (۱۰، ۹، ۸، ۳۳)

جب حالت یہ تھی تو اس وقت ارشادِ خداوندی ہوا کہ نبیؐ کے اسوہ کو پیش نظر رکھو۔ تمہاری تقلید کی وہ شے۔ دیکھتے نہیں کہ نفسیاتی طور پر وہ یقین و ثبات کا پہاڑ ہیں اور بدنی طور پر ہر دشوار چٹان اُن کی ضرب کے تحت ریزہ ریزہ ہو رہی ہے۔ پُر امید اتنے کہ سنگ و آہن کے تصادم سے بکھرنے والی چنگاریوں کے درمیان قیصر و کسریٰ کے در و بام کو زمین بوس ہوتے ہوئے دیکھ رہے ہیں، پُر ہمت اتنے کہ پورے شہر کو اپنی آغوش میں لے لیا ہے کہ دشمن کسی ناکے سے لقب نہ لگا سکے۔ مسلمان معاشرہ گویا ایک امانت تھی جس کی نگہداشت اُن کا فرض تھا۔ رُوحانی طور پر بھی، جس امت کے لیے وہ دعائے تیم شبی میں آنسو بہاتے ہوں اُس پر دشمن کا شب خون پڑتا ہوا کیسے گوارا کر سکتے تھے؟

کیا جنگِ احزاب سے بڑی دشواریاں آج ہمارے معاشرے کو درپیش ہیں؟ معاف کیجیے گا، دشواریاں بڑی نہیں۔ بہتیں پست ہیں۔

اخلاقِ نبویؐ پیشِ نگاہ نہیں۔ یاد رکھیے اخلاقِ نبیؐ کا ایک اہم جزو، عسکریت تھی۔ آج ”جنگِ ہمہ گیر“ (TOTAL WAR) کا تصور عام مُسننے میں آتا ہے کہ کس طرح قوم کا ہر فرد اپنے اپنے رنگ میں اور اپنے اپنے دائرہ عمل میں شریکِ حرب و ضرب ہوتا ہے۔ بتائیے کہ ابتدائی دور میں اسلام کی کون سی جنگ ہمہ گیر نہیں تھی۔ کیا بچے اور خواتین گھروں کی زینت بنے رہے؟ کیا نبیؐ کے اپنے گھرانے کی خواتین پیش پیش نہیں تھیں؟

کہتے ہیں کہ نیپولین کے خلاف وائٹ لوکی جنگ ایٹن اور میرو کے کرکٹ کے میدانوں میں جیتی گئی یعنی جوڈ سپن ان درس گاہوں کے کھیل کے میدانوں میں سیکھا گیا وہ ضبط و نظم جنگ کے میدان میں کام آیا۔ تو کیا یہ نہیں کہا جاسکتا کہ بدر و احزاب کے معرکے، مسجد نبویؐ میں جیتے گئے کہ وہاں کی تربیت، مسلم معاشرے کو اتنا مستحکم و مربوط بنا گئی کہ پھر کوئی معرکہ ناقابلِ تسخیر نہ رہا؟ معاشرہ جتنا مربوط ہوگا اُس کی ضرب اتنی کاری ہوگی۔ مربوط معاشرے سے مُراد تنگ و محبوس معاشرہ نہیں۔ تنگی اور حبس نشوونما کی دشمن ہوتی ہے مربوط سے مراد ایک قدم و یک منزل ہونا ہے ”قبیلے کے خیمے خواہ جُدا جُدا ہوں دل یکجا ہوں“ دلوں کو یکجا کرنے کی منجملہ اور کے ایک سبیل اسلام نے جو پیش کی ہے وہ یہ ہے کہ خُلق کو دو قسموں میں بانٹ دیا ہے۔ انفرادی خُلق اور اجتماعی خُلق۔

انفرادی خُلق کا تقاضا یہ ہے کہ انسان، زندگی کو عطیہ خداوندی سمجھے۔ زندگی کا احترام کرے۔ اس کی حفاظت کرے بھی اور اسے کسی ارفع و اعلا مقصد پر قربان کر کے بھی۔ اور چوں کہ یہ بات اٹل ہے کہ زندگی ہوگی تو مقصد حاصل ہوگا، اس لیے انسان کے لیے ضروری ہے کہ جسم کی حفاظت اور اس کی تربیت کرے تاکہ فعال زندگی بسر کر سکے۔ مختلف علتوں کا شکار ہو کے صحت تباہ کرنے کو اسلام نے سخت ناگواری سے دیکھا ہے۔ اسی طرح غارِ دکوہ کی زندگی اختیار کرنے کو منع کیا ہے، اس لیے یہ دونوں طرح کی زندگیاں ادائے امانت سے فرار ہیں۔ انسان اگر کیلاش پر بت پر سمدھی لگا کے بیٹھ جائے اور خود گیان دھیان کا اتنا اٹھا مارے تو یہ خود غرضی کے سوا کچھ نہیں۔ ایسا شخص نیچے میدانوں میں ریٹگنے والی دکھی مخلوق کے کسی کام کا نہیں۔ ایسا شخص بہ ظاہر اپنی اغراض سے قطع تعلق کیے ہوتا ہے، لیکن یہی شخص جو بیوی بچوں کے تعلق کو موہ مایا سمجھتا ہے صرف اپنی ہی جیو کی مکتی کے لوبھ میں پھنسا ہوتا ہے۔

اجتماعی خُلق سے رُلبہ و ضبط اور نظم دہم آہنگی آتی ہے اور یہ صفات پیدا ہوتی ہیں مساوات سے، اسلام فی الواقعہ فرد کے کمال کے ساتھ ساتھ سوسائٹی کا کمال بھی چاہتا ہے، کیوں کہ اسے ایک ہمہ گیر اور عالمی مشن لے کے آگے بڑھنا ہے اور یہ کام جیسا انجام پاسکتا ہے جب انسان جماعت کا رکن ہو۔ اور یہ رکنیت ایمان پر مبنی ہو۔

ایمان ابدیت کے ابعاد (DIMENSIONS) کو پھیلا دیتا ہے اور جماعت کے ساتھ ایمان کی بہ دولت جو نسبت انسان کو حاصل ہوتی ہے وہ انسان کو ایک ہمہ گیر پیغام کی رو میں شامل کر دیتی ہے۔ چنانچہ ایمان انفرادی اور اجتماعی دونوں طرح کے خُلق کا بنیادی عنصر بن کر مختلف نوع کے

انسانوں کو ایک معاشرے میں پروتا چلا جاتا ہے۔ اور پھر ایمان چوں کہ خود ناقابل تقسیم ہوتا ہے۔ اس لیے اس کے احاطے میں داخلہ نیم دلانہ نہیں ہوتا، چنانچہ مکمل طور پر ایمان لانے کا حکم ہے اس معاشرتی نظام کی جو اخلاقِ نبویؐ کی روشنی میں تشکیل پاتا ہے چند خصوصیات یہ ہیں۔

(i) ہر شخص عبودیت کا پیکر ہوتا ہے۔

(ii) اس کا دائرہ محبت پوری نوعِ انسان پر حاوی ہوتا ہے۔ وہ ہر کافر کو بھی ہونے والا مسلم سمجھتا ہے۔

(iii) ہر شخص خود کو امین سمجھتا ہے اور ادا تے امانت میں ہمہ وقت کوشاں ہوتا ہے۔

اس میں حضورؐ کا امین کا لقب پانا، دلیلِ راہ ہے۔

پھر حضورؐ کی ہجرت کی رات اور ان کا عہدہ کا دن کسے یاد نہیں۔ علی المرتضیٰؑ سے فرمایا کہ بھائی

یہ امانتیں ادا کرتے آنا۔ انمانتیں ایسے لوگوں کی جنہوں نے ترکِ وطن پر مجبور کیا اور جو خون کے پیاسے تھے۔ یہ ایفائے عہد کی لاثانی مثال ہے، لیکن ایک بات اور ذہن میں رکھنے کے قابل ہے۔

درست ہے کہ حضورؐ، چاندی اور سونے کے کچھ سکوں کو ان کے حق داروں تک پہنچانے کا حکم

دے آتے تھے، لیکن خود سب سے بڑی امانت ادا کر کے تشریف لے جا رہے تھے، اور وہ امانت تھی

پیغامِ خداوندی کی ترسیل، اس لیے کہ جب دس برس بعد عرفات کے میدان میں ایک جم غفیر سے پوچھا

کہ کیا میں نے امانت ادا کر دی ہے تو لوگوں نے گواہی دی کہ ہاں حضورؐ کر دی ہے۔ اس کے بعد اللہ کو گواہ بنایا۔

سبحان اللہ! ادا تے امانت میں یہ ذمہ داری، یہ لگن، یہ اضطراب، ان میں کے ہر جذبے کا

یوں حسین ہونا کہ کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا این شجاست۔

ادا تے امانت کے عمل میں ہر شخص یوں مستعد ہوتا ہے کہ بدن ملت کی امانت ہوتا ہے اور

یوں جاں سپار کہ جان، مولیٰ کی امانت ہے۔ یہاں تک کہ جب انسان جان سے بھی گزر جائے تو یہ کہتا

ہوا جائے۔

جان دی، دی ہوئی اسی کی تھی

حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا!

غرض یہ کہ، اسلامی تمدن تمام تر ایک ہی نیکے کی تفسیر ہے۔ ادا تے امانت کی۔

اسلامی نظامِ عدل و احسان

جناب محترم ڈاکٹر سید محمد حیدر

اسلامی نظریہ عدل کا افہام اُس وقت تک ممکن نہیں جب تک خالق و مخلوق اور حیات و ممات کا ادراک نہ کیا جائے۔ اسلامی فلسفے نے صحیح اور جامع طور پر ان رشتوں کا تجزیہ کیا ہے جو عباد و معبود کا ثنات و افراد کو مربوط کرتے ہیں۔ اس فلسفے سے ان رشتوں کی بھی عکاسی ہوتی ہے جو ہر مملکت کے شہریوں کے آپس کے تعلقات اور بین الاقوامی تنظیم کی نشاندہی کرتے ہیں۔ ان رشتوں کے مطالعہ سے یہ بات بھی واضح ہے کہ اسلامی نظریہ عدل میں ویسی ہی جامعیت اور وضاحت موجود ہے جو فلسفہ اسلام کے تحت تمام زندگی کا احاطہ کرتی ہے۔

اسلامی نظامِ عدل زندگی کے تمام شعبوں سے متعلق ہے۔ یہ محض اقتصادی امور کو زیرِ بحث نہیں لاتا بلکہ اس کے دائرہ کار میں وہ خیالات اور احساسات و رجحانات بھی شامل ہیں جو بنی نوع انسان کو اشرف المخلوقات کا درجہ و رتبہ دے کر تمیز و ممتاز کرتے ہیں۔ دراصل اسلامی نظامِ عدل مختلف اقدار کے امتزاج سے معرف و وجود میں آیا ہے جو دنیوی و دینی زندگی، روحانیت و مادیت، اخلاقیات و معاشیات کو مربوط کرتا ہے۔ اسلامی تصورات کے تابع انسانی زندگی حقیقی معنوں میں ایک وحدت ہے جس میں جسمانی خواہشات و روحانی ضروریات ایک دوسرے سے اس طرح منسلک ہیں کہ ان کو کسی صورت میں علاحدہ نہیں کیا جاسکتا۔ اسلامی نقطہ نظر سے محبت و یگانگت، تعاون و اشتراک کے خیالات و رجحانات انسانی زندگی کی اساس ہیں۔ اسلامی فلسفہ انفرادی و اجتماعی مفادات میں توازن پیدا کرتا ہے۔ انسانی آرزوؤں، تمناؤں اور حوصلوں کے ساتھ ساتھ فلاحِ عامہ کی منصوبہ بندی اسلامی سماج میں ہم آہنگی پیدا کرتی ہے۔ اسلامی اعتقادات نہ تو افراد کو اس بات کی اجازت دیتے ہیں کہ اپنی حرص و طمع سے سماجی زندگی کے شیرازہ کو درہم برہم کر دیں نہ سماج کو اس بات کی اجازت دیتے ہیں کہ انفرادی قابلیت و اہلیت، ذکاوت و ذمہ داری کو کچل کر ان کی شخصیات کو غیر موثر بنا دیا جائے۔

اسلام عبادت اور کاروبار، عقیدہ اور عمل، روحانیت اور مادیت، دنیا اور آخرت
 زمین و آسمان سب کے درمیان وحدت کا قائل ہے۔ اسی عظیم وحدت سے اسلام کے
 القرض و قوانین، ہدایات و حدود کی راہیں ابھرتی ہیں۔ اس کی روشنی میں حقوق و فرائض
 تعیین ہوتا ہے۔ نفع و نقصان کی تقسیم عمل میں آتی ہے۔ الغرض اس کے سارے اجزائے
 کیسی و اصول اسی اصل میں پنہاں ہیں۔

اسلامی نظام عدل مساوات کا نام ہے جس میں تمام اقدار حیات کی متوازن اور
 ہم آہنگ تحصیل عمل میں آتی ہے۔ البتہ فطری صلاحیتوں میں عدم مساوات ایک ایسی
 حقیقت ہے جسے جھٹلایا نہیں جاسکتا۔ بعض افراد جسمانی و دماغی صحت، قوت برداشت
 اور جسمانی و ذہنی معراج حاصل کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں جبکہ کچھ لوگ لاغر و نحیف، کمزور
 و بیمار پیدا ہوتے ہیں۔ تمام صلاحیتوں اور ہر طرح کی استعداد کو مساوی کرنے کی کوئی صورت
 ممکن نہیں۔

غیر معمولی بلند اور اعلیٰ ذہنی و جسمانی صلاحیتوں کے وجود سے الکار بے معنی
 ہے۔ اسلام ان کی پوری رعایت ملحوظ رکھتا ہے۔ لہذا غیر معمولی صلاحیت رکھنے والے افراد
 کو مواقع ہم پہنچاتا ہے کہ اپنے ثمرات بروئے کار لائیں۔ ان ثمرات میں سے اجتماعی مفادات
 کی خاطر جن اشیاء کی ضرورت ہو انہیں حاصل کیا جاسکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ تمام اطباء حکیم محمد
 سعید نہیں بن سکتے، البتہ جن اطباء میں حکیم سعید بن جانے کی خواہش رہنم ہو انہیں تقویت
 اور سازگار ماحول ہم پہنچایا جاسکتا ہے تاکہ وہ فلاح عامہ کے لیے زیادہ موثر کردار ادا کر سکیں۔
 اسلامی نقطہ نظر نے سعی پیہم اور جدوجہد کے ذریعہ سے ایک دوسرے سے سبقت لے جانے
 کے کھلے مواقع فراہم کیے ہیں۔ البتہ یہ بھی ہدایت کی گئی ہے کہ ترقیاں و کامرانیاں حاصل کرنے
 کی یہ پرواز اس طور پر جاری رہے کہ انسان غیر متقی نہ بننے پائے، کیونکہ اللہ ان ہی کو بلند مراتب
 سے سرفراز فرماتا ہے جو متقی ہوتے ہیں۔ یہ مال اور یہ اولاد محض دنیوی زندگی کی ہنگامہ آرائی
 ہیں۔ اللہ کے نزدیک باقی رہ جانے والی نیکیاں و تقویٰ ہی بہتر ہیں اور انہیں سے معقول
 امیدیں وابستہ کی جاسکتی ہیں۔

اسلامی نظام عدل کی لازمی شرط یہ ہے کہ سب کو یکساں مواقع حاصل ہوں۔ کسی
 شخص کی راہ میں حسب و نسب، رنگ و نسل، ذات و جماعت سے متعلق خیالات رکاوٹیں پیدا
 نہ کریں۔ منہیر انسانی کو خالص مادی و معاشی اقدار کی خلاف عقل پیروی سے آزاد کر دیا جائے۔

مال و دولت کو قدرِ اعلا یا قدرِ کل کی صورت میں پیش کرنے کی اجازت نہیں زندگی محض روٹی پر اور مکان کے گرد طواف نہیں کرتی۔ انسانی زندگی کا نصب العین معاشی ذمہ دار لویل کو قبول کرتے ہوئے کسی بالاتر منزل کی جانب گامزن ہونے کی رہبری کرتا ہے۔

اسلام دولت کے سلسلے میں مالداروں پر غریبوں کا ایک حق واجب کرتا ہے۔ ہر حق کا تعین سوسائٹی کے مفادات و مصالح کو سامنے رکھتے ہوئے کیا جاتا ہے۔ مقصد یہ ہے کہ سماج میں عدل قائم ہو۔ ایک حد تک مساوات کے قیام کے لیے فضا ساز کار ہو۔ ترقی کی نئی شاہراہیں کھلیں۔ اس طور پر اسلام مادی و معنوی، دینی و دنیوی تمام پہلوؤں کی پوری طرح رعایت ملحوظ رکھتا ہے۔

اسلام دنیا میں مکمل طور پر نظامِ عدل قائم کرنے کا آرزو مند ہے لہذا کسی نوبت پر محض اقتصادی عدل کو فوقیت نہیں دی گئی، اور یہ بھی مناسب متصور نہیں کیا گیا ہے کہ قانونی ذمہ داری ہی اس عدل کے قیام کا واحد ذریعہ بنے۔ چنانچہ اسلام نے اس نظامِ عدل کو ایک وسیع اور ہمہ گیر انسانی نظامِ عدل کی شکل دی۔ فرد کی سطح پر انسانی ضمیر اور سماج کی سطح پر قانونی ضابطہ بندی، اسلامی نظامِ عدل نے دونوں کو مربوط کیا اور ان دونوں سے کام لیتے ہوئے ایک طرف تو وہ آدمی کے وجدان میں راسخ تاثرات اور جذبات کو ابھارتا ہے اور دوسری طرف وہ انسان کی فطری کمزوری سے بھی غافل نہیں رہتا۔

اصول

اسلام نے بنی نوع انسان کو ہدایت کی ہے کہ جس طرح اللہ نے ان کے ساتھ احسان کیا ہے اسی طرح وہ بھی آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ احسان کریں۔ والدین سے نیک برتاؤ، قرابت داروں، مسکینوں اور یتیموں کے ساتھ حسن سلوک کی تلقین قرآن حکیم میں مندرج ہے۔ ہمسایوں سے، رشتہ داروں سے اور مسافروں سے احسان کرنے کا مشورہ دیا گیا ہے۔ اللہ کسی ایسے شخص کو محبوب نہیں رکھتا جو اپنے پیارے میں مغرور ہو اور اپنی برائی پر فخر کرے۔ جو کججوئی کرے اور دوسروں کو بھی کججوئی کی ہدایت کرے۔ حکم ربی ہے کہ: ”تم میں بن لوگوں کو مال اور مالی فراخی نصیب ہے ان کے لیے مناسب نہیں کہ قرابت داروں، مسکینوں اور راءِ خلاء میں ہجرت کرنے والوں کی مدد نہ کرنے کی قسم کھا بیٹھیں۔“ (النور: ۲۲)

اسلام انسانی شعور کو عدل کے علاوہ احسان کے اعتبار سے بھی ایک بلند سطح پر پہنچا دیتا ہے۔ یہ شعور ہمیشہ ہمیشہ کے لیے انسانیت کے عز و شرف کا باعث بن جاتا ہے۔

تعالیٰ احسان کے تصور میں بھی بلندی پیدا کرتا ہے اور اسے خود اللہ کے ساتھ احسان قرار دیتا ہے۔ صدقہ کے لیے ایسے آداب مقرر کیے گئے ہیں کہ وہ صاحب مال کی طرف سے غریب پر تفوق و برتری کا اظہار نہیں بننے پاتا۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر صدقہ کے محرکات لپست ہوں اور جو شخص صدقہ قبول کرے اس کو احسان کا احساس دلایا جائے تو صدقہ بے معنی بن کر اپنے نیک اثرات زائل کر دیتا ہے۔ اسلام، دینے والوں اور لینے والوں دونوں کی طبیعت میں علو پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ رب العزت قرآن حکیم میں ارشاد فرماتا ہے: (ترجمہ) جو لوگ اپنے مال اللہ کی راہ میں صرف کرتے ہیں ان کے خرچ کی مثال ایسی ہے جیسے ایک دانہ بویا جائے اور اس سے سات بالین نکلیں اور ہریالی میں ستو دانے ہوں۔ اسی طرح اللہ جس کے عمل کو چاہتا ہے انزالش عطا فرماتا ہے۔ وہ فراخ دست بھی ہے اور علیم بھی۔ جو لوگ اپنے مال اللہ کی راہ میں خرچ کر کے پھر احسان نہیں بتاتے (اور) نہ دکھ دیتے ہیں ان کا اجر ان کے رب کے پاس ہے اور ان کے لیے کسی رنج و خوف کا موقع نہیں۔ ایک میٹھا بول اور کسی ناگوار بات پر ذرا سی چشم پوشی، اس خیرات سے بہتر ہے جس کے پیچھے دکھ ہو۔ اللہ بے نیاز ہے اور بڑبڑا رہی اس کی صفت ہے۔ اے ایمان لانے والو! اپنے صدقات کو دکھ دے کر اور احسان بتا کر اس شخص کی طرح خاک میں نہ ملا دو جو اپنا مال محض نمائش کی خاطر لوگوں کو دیتا ہے اور نہ اللہ پر ایمان رکھتا ہے

نہ آخرت پر۔ (البقرہ ۲۶۴-۲۶۱)

غرضیکہ اسلامی نظام عدل کا تعلق زندگی کے ہر پہلو اور ہر طرح کے اعمال سے ہے جن میں نظریات احسان بھی شامل ہیں۔ یہ نظام روحانی اور مادی دونوں طرح کی قدروں پر حاوی ہے اور دونوں کو ایک دوسرے سے ہم آہنگ کر کے نافذ کرتا ہے۔ یہ نظام قوانین کو ان کی اصل شکل میں نافذ کرتا ہے، معاشرے کے مختلف پہلوؤں کی نگرانی کرتا ہے، اسلامی اصولوں کے مطابق دولت کی تقسیم کرتا ہے۔ اسلامی نظام عدل کی بنیاد صرف اس اصول پر ہے کہ حاکمیت صرف اللہ کی ہے اور وہی شریعت وضع کر سکتا ہے جبکہ اسلام کے علاوہ دوسرے نظام نائے عدل کی اساس اس اصول پر قائم ہے کہ حاکمیت انسان کی ہے اور وہ اپنے لیے شریعت وضع کرنے کا مجاز ہے۔

اسلامی نظام عدل کا گہرا تعلق تحفظ عزت نفس سے ہے یہ وہ نظریہ ہے جس نے

تمام اقوام عالم کو متاثر کیا ہے۔ دنیا میں اسلام کا وقار بڑھانے میں اس خیال نے بہت اہم کردار ادا کیا ہے۔ اسلامی فلسفہ سے ماخوذ تحفظِ عزتِ نفس کے نظریہ نے ثابت کر دیا ہے کہ دنیا میں بیشتر مسائل اور تعلقات میں کشیدگی صرف اس لیے پیدا ہوئی ہے کہ اکثر ممالک نے قومی اور بین الاقوامی سطح پر تحفظِ عزتِ نفس کا خیال نہیں کیا۔ اب باوجود اس کے کہ مالی و اقتصادی وسائل میں کمی گنا اضافہ ہوا لیکن عزتِ نفس کے مجروح ہونے سے ذہنی انتشار اور الجھنیں بھی بڑھ گئیں، نہ صرف مختلف ممالک، ایک دوسرے کے درپے آزار ہو گئے بلکہ ترقی پذیر ممالک کے شہری بھی یہ محسوس کرنے لگے کہ اندرونی طور پر ان کی عزتِ نفس کا معقول خیال نہیں رکھا جاتا۔ اسلامی حکومتوں نے ایسی صورت میں موثر نظام عدل سے معاملات پر قابو حاصل کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ اس نظام عدل کو دیر پا بنانے کے لیے کمشنران برائے تحفظِ عزتِ نفس کے تقرر کی فوری ضرورت محسوس کی جا رہی ہے۔

کمشنران برائے تحفظِ عزتِ نفس پاکستان میں ضلع کی سطح پر مقرر کیے جاسکتے ہیں۔ یہ مستقل سرکاری ملازم نہیں ہوں گے بلکہ اعزازی طور پر کام کریں گے۔ ان کی خدمات کے صلے میں انہیں معقول الاؤنس دیا جاسکتا ہے۔ کمشنران کا انتخاب عوام الناس کریں گے جو اس ضلع کے مستقل باشندے ہیں جہاں انتخاب عمل میں آتا ہے۔ وہی شخص بحیثیت کمشنر منتخب ہو سکے گا جو اپنی دیانتداری، غیر جانبداری، منصف مزاجی، حب الوطنی، اسلام دوستی اور شہری حقوق کے احترام کے لئے مثبت شہرت رکھتا ہو۔ بالغ ہو، صاحبِ نظر ہو، مجرم نہ ہو، ملزم نہ ہو، عوام اور انتظامیہ دونوں سے معقول رشتہ رکھتا ہو اور دونوں کے مسائل پر اسے دسترس حاصل ہو۔ کمشنر کے فرائض منصبی میں یہ بات شامل ہوگی کہ وہ مواعظ اور ضلع کے قصبات کا دورہ کر کے معلوم کرتا رہے کہ اس علاقے میں عوام کے بنیادی حقوق کو تو کوئی صدمہ نہیں پہنچا۔ اگر بنیادی حقوق تلف ہوئے ہیں تو کیا کسی شخص کے اختیار تمیزی کے غلط استعمال سے یہ صورت ظہور پذیر ہوئی ہے؟

کمشنران کو اس بات کی تحقیق کا بھی حق ہونا چاہیے کہ وہ یہ معلوم کریں کہ اگر کین انتظامیہ ایسے فیصلے تو نہیں کرتے جن کی موجودگی سے ضلع کے عوام اپنے بنیادی حقوق کو صحیح طور پر بروئے کار نہ لاسکتے ہوں۔ کمشنران کے لیے ان واقعات اور معاملات کا نوٹس لینا ضروری ہے جن سے عوام کو اپنی فریاد سرکام بالا تک پہنچانے سے روک دیا جاتا ہو، یا اپنے مقدمات کی وکالت کی اجازت نہ ہو، یا مکانات کی ناجائز تلاشی لی جاتی ہو، یا آزادی گفتار و کردار سے محروم

یا جاتا ہو۔ یا جائیداد نا جائزہ طریقے پر ضبط کی گئی ہو، یا غیر معقول وجوہ کی بنا پر گرفتاری عمل میں آئی ہو، یا جبر و تشدد کے ذریعہ سے اقبال جرم کرایا گیا ہو، یا رشوت بالجبر حاصل کی گئی ہو، یا کسی شخص سے بیگاری گئی ہو، یا کسی شخص کو اس کی خدمات کا معقول معاوضہ نہ دیا گیا ہو، یا رشوت لینے کی نیت سے کسی معاملہ کے فیصلہ میں غیر معمولی تاخیر کی جاتی ہو، یا کسی شخص کی عزت نفس کو بدکلامی سے مجروح کیا گیا ہو، یا کسی شخص کو اس کے استحقاق سے محروم کیا گیا ہو یا محروم کیا جاتا ہو، یا کسی درخواست گزار کو اہلکاران ہراساں و پریشاں کرتے ہوں، یا نجی دشمنی کی بنا پر کسی شخص کے خلاف انتقامی کارروائی کی گئی ہو، یا کسی شخص کو اس چیز کی قیمت ادا نہ کی جاتی ہو جو اس نے انتظامیہ کو فروخت کی ہو، یا کوئی ایسی کارروائی کی جاتی ہو جس سے شکایت کنندہ کے احساس خودی و خود اعتمادی کو شدید تکلیف پہنچتی ہو تو کمشنران برائے تحفظِ عزتِ نفس اس معاملے کی رپورٹ ممبران رارہ کین (مجلس شوریٰ کو کہیں گے تاکہ ایسے معاملات کا سدباب ہو سکے۔

حکومت وقت کو عوام کی شکایات کا ہر وقت ادراک ہو جس کے نتیجے میں حکومت وقت ہر دلعزیز بن جائے اور مضبوط سے مضبوط تر ہو۔

کمشنران برائے تحفظِ عزتِ نفس اسلامی سماج میں نظریہ عدل کو موثر بنانے میں نمایاں کردار ادا کر سکتے ہیں۔ البتہ طریق عدل کو زیادہ موثر بنانے کے لیے انتظامی ضابطوں کی تشکیل کی فوری ضرورت ہے۔ انتظامی ضابطوں کی تشکیل کے پس پشت یہ خیال کارفرما ہے کہ جن افراد کو انتظامی فیصلوں سے صدمہ پہنچا ہے وہ ان ضابطوں کی مدد سے ان افسران پر پابندیاں عائد کر دیں جو اپنے معقول حدود سے متجاوز ہو کر عوام کی ایذا رسانی کا سبب بن جاتے ہیں۔ ترقی یافتہ ممالک کی طرح ان ضابطوں کو قانونی شکل حاصل ہونی چاہیے۔ ان ضابطوں کا مقصد اولین یہ ہونا چاہیے کہ تمام سرکاری ملازمین کو اسلامی قوانین کا اس حد تک تابع بنا دیا جائے کہ وہ اپنے اختیارات تمیزی کا استعمال ان اختیارات و دفعات کے باہر نہ کر سکیں جو مرد و عورتوں نے فریق متعلقہ کی انجام دہی کے لیے انہیں تفویض کیے ہیں۔

ان ضابطوں کے تحت اہلکاران انتظامیہ کو اس بات کا عادی بنایا جاسکتا ہے کہ وہ مختتم نتائج پر پہنچنے سے قبل امور زیر غور سے متعلق تمام دستاویزات و ذبانی شہادت یکجا کر کے ان کی صحت کا اندازہ کر لیں۔ صحیح بات معلوم کرنے کے لیے اہلکاران کو اس بات کے لیے بھی آمادہ کیا جائے کہ وہ فریقین مقدمہ کی پیش کردہ شہادت کے علاوہ دوسرے ذرائع سے بھی ان واقعات

کی صحت کا اندازہ کر لیں جو معاملات زیر غور سے متعلق ہیں۔

ہر انتظامی فیصلہ کے خلاف کم از کم ایک اپیل کی اجازت ہر صورت میں ہونی چاہیے۔ انتظامی ضابطوں میں اس بات کی ضمانت ہونی چاہیے کہ اگر کین انتظامیہ ایسے فیصلے نہیں کریں گے جن سے قانون شکنی ہوتی ہو، مفاد عامہ کو صدمہ پہنچ سکتا ہو، یا کسی شہری کے آئینی حقوق تلف ہوتے ہوں۔ انتظامی ضابطوں کے یہ مقاصد بھی ہوتے ہیں کہ انتظامیہ کے طریق کار میں عوام کا اعتماد قائم رہے۔ تعلیم نہ ہونے کی بنا پر یا لاعلمی کی وجہ سے کسی شخص کو نقصان نہ پہنچے۔ ان ضابطوں سے تمام اہلکاران انتظامیہ کو پابند کیا جاسکتا ہے کہ وہ ہر اس فیصلے کا ہوازنہ، اسباب و علل بھی تحریر کریں جو انتظامی فیصلہ کے محرک بنتے ہیں۔ یہ انتظامی ضابطے اگر کین انتظامیہ کو ایسی خفیہ کارروائی سے باز رکھ سکتے ہیں جن کی خفیہ نوعیت سے مفاد عامہ کو صدمہ پہنچ سکتا ہے۔ یہ انتظامی ضابطے ان اہلکاران کو فیصلہ کرنے کی اجازت نہیں دیں گے جو متبادل خیالات کو صحیح طور پر وزن کر کے ان میں توازن نہ پیدا کر سکتے ہوں۔

ان انتظامی ضابطوں سے انتظامیہ کی سطح پر پیدا شدہ بددلتی، بغض و حسد اور تعصب کو سبھی ختم کیا جاسکتا ہے۔ غرضیکہ کمشنران برائے تحفظ عزت نفس کی تقرری اور انتظامی ضابطوں کی تشکیل سے اسلامی نظام مضبوط بنیادوں پر قائم ہو سکتا ہے۔ ایسی بنیادیں جن میں فلاحی مملکت کا راز مضمر ہے، جن سے حکومت وقت کی عزت، شہرت اور وقار میں غیر معمولی اضافہ ہو سکتا ہے، جن سے اخلاقیات نبوی کے اثرات تمام سوسائٹی کو محیط کر سکتے ہیں۔ جن سے عوام میں خود اعتمادی پیدا ہو سکتی ہے اور وہ اپنے خالق حقیقی کے ایمان کی تکمیل میں ہمہ تن مصروف ہو سکتے ہیں۔ اس طور پر اسلامی نظام کے خطوط واضح ہوں گے اور اس کے نقوش تمام عالم کو تابناک بنا دیں گے۔

تربیت فرد کا نبوی طریق

جناب محترم ڈاکٹر خالد علوی

آج کا انسان منظم معاشرتی زندگی بسر کر رہا ہے، اسے اس امر کا شاید احساس نہیں کہ اس تنظیم کے حصول تک اسے کن مراحل سے گزرنا پڑا ہے منظم معاشرتی زندگی نے انسان کو بے پناہ منفعتیں عطا کی ہیں۔

انسانی کاوشوں نے جو اجتماعی ادارے تخلیق کیے اور پروان چڑھائے ہیں وہ ان کی فکری وسعتوں اور علمی عظمتوں کا احساس دلاتے ہیں۔ اجتماعی شعور رکھنے والا جب گرد و پیش میں معاشرتی، معاشی، سیاسی، تعلیمی اور تفریحی ادارے (انسٹی ٹیوشنل) دیکھتا ہے تو اسے اطمینان ہوتا ہے۔ اسے اپنی ذات اور علاقہ کا ایک گونہ تحفظ حاصل ہوتا ہے۔ منظم معاشرے نے انسان کو تحفظ دیا ہے لیکن اس کی بعض انفرادی خوبیاں اور شخصی حسن کی رعنائیاں سلب کر لی ہیں۔ معاشرہ ایک غیر مری وجود ہے اور اس کے تمام اجتماعی مظاہر انفرادی کے ذریعہ سے انفرادی کے خلاف یا حق میں استعمال ہوتے ہیں۔ فرد اور اجتماع کی یکشمکش تخریب و تعمیر کا قابل توجہ منظر پیش کرتی ہے۔ شکست و ریخت اور بناؤ اور بگاڑ کی پوری انسانی تاریخ انسان کے عزم و ہمت کی داستان ہے۔ بظاہر تو فرد اجتماعی حالات اور معاشرتی ماحول میں جکڑا نظر آتا ہے لیکن کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ فرد کی باغیانہ حرکت، ٹپسلون سمندر میں طوفانی لہروں کی شکل اختیار کرتی ہے اور دیکھتے ہی دیکھتے پورا اجتماعی ڈھانچا ڈرتی کشتی کا نظارہ پیش کرنے لگتا ہے۔ نور دجی کی کرنوں سے محروم علمائے عمرانیات ابھی تک فرد اور اجتماع کے رشتے کو سنوارنے میں مصروف ہیں اور تا مہنوز آخری اور قطعی فیصلہ دینے کے قابل نہیں۔

غیر نمونہ طریقہ شک کے بجائے علم حقیقی کی صداقتوں کو بنیاد بنانے والوں کے ہاں فرد اور اجتماع کے مابین تعلق کا ایک حیرت انگیز توازن پایا جاتا ہے۔ اسلام انسان کے اجتماعی شعور کو ملحوظ رکھتا ہے اور باہمی میل جول سے پیدا ہونے والی اجتماعیت کو تسلیم کرتا ہے اور اس کے نشوونما میں معاونت کرتا ہے۔ وہ ایسے فطری اصول دیتا ہے جن سے اجتماعیت کو تقویت ملے۔ وہ اس کے لیے صالح بنیادیں فراہم کرتا ہے اور ایسے عوامل کا قلع قمع کرتا ہے جو اسے بگاڑیں۔ وہ مفید اور غیر

مفید جمیعتوں میں تمیز کا دستور دیتا ہے۔ اسی لیے آنحضرتؐ نے فرمایا:

الاکلکم راع وکلکم مسئول عن رعیتہ -

یعنی: سنو تم میں سے ہر ایک نگران اور ذمہ دار ہے اور ہر ایک سے ماتحت افراد کے بارے میں سوال کیا جائے گا۔

یہ امر محفوظ خاطر ہے کہ اسلام فرد کی انفرادیت کو بنیاد قرار دیتا ہے اور اجتماعیت کو بالکل فرد ہی کی اصلاح و صلاح کا وسیلہ قرار دیتا ہے بلکہ

تمام انبیاءؑ کے مشن میں بالعموم اور خاتم النبیینؐ کے پروگرام میں بالخصوص فرد کی اصلاح تربیت سنگ بنیاد کی حیثیت رکھتی ہے۔ مدینہ کی مثالی ریاست کی تنظیم اور آئیڈیل معاشرے کی تشکیل انہی تربیت یافتہ افراد کی بدولت ہو سکی۔ حضورؐ کی تعلیمات میں فرد کو اس امر کا احساس دیا گیا کہ وہ اپنے گناہوں کا تنہا ذمہ دار ہے۔ جو سزا اسے ملنی ہے اسے کوئی اور نہیں اٹھائے گا۔

معاشرتی جرائم کی ایک سزا تو اجتماعی ہے جسے معاشرہ ہی نازد کرتا ہے لیکن فرد کا انفرادی معاملہ اس کے رب کے ساتھ ہے جسے اس کو ہی بٹانا ہے، کوئی دوسرا اس میں شریک نہیں ہوگا۔ لہذا اسے

اپنی ذمہ داریوں کا احساس کرنا چاہیے اور اپنا فرض پورا کرنے میں دوسرے کا متحمل نہیں ٹکنا چاہیے اسے یہ نہیں دیکھنا چاہیے کہ فلاں شخص نیکی نہیں کر رہا تو میرے کیوں کروں؟ اسے صرف اپنا دامن گناہ

سے محفوظ رکھنا چاہیے۔ اس کا معاشرتی فائدہ یہ ہوتا ہے کہ ہر ایک شخص اپنا احتساب کرتا ہے، اصلاح کرتا ہے اور اپنی برائیوں کے لیے دوسرے کو نمونہ نہیں بناتا۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اگر اٹکاؤ کا کیس

کسی نازیبا حرکت کا ارتکاب ہوتا ہے تو ترکیب اپنے آپ کو اجنبی محسوس کرتا ہے، عریاں سمجھتا ہے اور اپنی اصلاح کی طرف مائل ہو جاتا ہے۔ قرآن نے اس اصولی قاعدے کو اس طرح بیان کیا

علیکم انفسکم لا یضوکم من ضل اذا اھتدیتم لیلہ

یعنی: اپنی فکر کر جب تم سیدھی راہ پر چل رہے ہو تو جو شخص گمراہ رہے اس سے تمھارا کوئی نقصان نہیں۔

فرد کی اس ذمہ دارانہ حیثیت کو مختلف پیڑیوں میں اس طرح بیان کیا:

ولا تکسب کل نفس الا علیھا ولا تزر وازرہ وزرا خیر لیلہ

یعنی: اور جو کوئی (بُرا) فعل کرتا ہے تو اس کا نقصان اسی کو ہوتا ہے اور کوئی

شخص کسی کے گناہ کا بوجھ نہیں اٹھائے گا۔

۱۔ اسلام کا معاشرتی نظام ۲۷
۲۔ القرآن، ۵: ۱۲
۳۔ القرآن، ۶: ۱۶۴

ان احسنتم احسنتم لانفسكم وان اساتم فاهما۔
 یعنی: اگر اچھے کام کرتے رہو گے تو اپنے ہی نفع کے لیے اچھے کام کرو گے اور اگر
 بُرے کام کرو گے تو (ان کا) وبال بھی تمہاری جان پر ہوگا۔

یہ ایک مسئلہ ہے کہ اسلامی نقطہ نظر سے فرد کی شخصیت کا ارتقاء اور اس کی ذات کی تکمیل
 بجائے خود مطلوب ہے۔ دین کا مخاطب فرد ہے، خدا کی عبادت اور اطاعت کی طرف فرد کو دعوت دی
 گئی ہے، حقوق و فرائض فرد پر عائد کیے گئے ہیں، امر و نہی کے احکام فرد کو دیے گئے ہیں، طاعت و
 جزا کی اُمید فرد کو دلائی گئی ہے۔ اس نظام نگر میں فرد ہی وہ اصل اکائی ہے جس کو ابتداء میں عامل
 کی حیثیت سے بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ اسی کی عقل اور جذبات سے اپیل کی گئی ہے۔ اسی کو اپنی ہدایت
 اور رہنمائی کا مخاطب بنایا گیا ہے۔ دین اسی کی فلاح کا طالب ہے اور اسی کو خسران سے بچانا چاہتا ہے۔
 اگر فرد اپنی جگہ ناقص رہ جائے اور اپنی شخصیت کو پستی میں گمراہی دے تو آخری فیصلے میں اس جماعت
 کی اجتماعی خوبی اس کے لئے کچھ نافع نہیں ہو سکتی جس کے ساتھ وہ دنیا میں اپنا تعلق رکھتا تھا۔

مقصد

فرد کی یہی اہمیت ہے جس کے پیش نظر اس کی تہذیب و تربیت اور تعلیم و تزکیہ کی طرف
 خصوصی توجہ دی گئی۔ آنحضرتؐ نے وحی ربانی کی روشنی میں تربیت کا ایک جامع پروگرام دیا جس میں فکر و
 عمل اور روح و جسد کے تمام پہلو آجاتے ہیں۔ غیر الہامی معاشروں نے اپنے افراد کی تربیت کا مقصد
 "اچھا شہری بنانا قرار دیا ہے لیکن اچھا شہری ایک ایسی اصطلاح ہے جسے ہر اجتماع اپنے معیار
 پر جانچے گا۔ اس کے لیے کوئی ہمہ گیر اصول یا ضابطہ نہیں بنایا جاسکتا۔ وطن پرستی، نسل پرستی، قوم
 پرستی، ترک دنیا اور قومی فساد کی خاطر دوسروں پر ظلم و تشدد تک سب کچھ اچھے شہری کے اوصاف
 میں آسکتا ہے۔ اس کے برعکس نبوی پروگرام کا مقصد فرد کو ایک اچھا انسان بنانا ہے۔ وہ اس
 کے جوہر انسانیت کے نشوونما ارتقا کا اہتمام کرتا ہے اور اسے رحمت کا پیغامبر بنا کر معاشرے میں
 بھیجتا ہے۔ اس نے اعلان کیا ہے:

وجعلناکم شعوباً و قبائل لتعارفوا ان اكرمکم عند اللہ اتقاکم

یعنی: تمہاری قومیں اور برادریاں بنا دیں تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچانو، درحقیقت اللہ کے نزدیک

تم میں سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو تمہارے اندر سب سے زیادہ پرہیزگار ہے۔

لہ۔ القرآن: ۱۳: ۷۷۔ اسلام کا نظام حیات، لکھ۔ القرآن: ۴۹: ۳۔

نبوی نقطہ نظر سے فرد کی تربیت کا مقصد اس کی شخصیت کی ایسی متوازن تعمیر ہے جس سے نہ صرف یہ کہ وہ صالح ہو بلکہ معاشرے میں صلاحیت کے نشرو نما کا باعث و داعی بنے۔ یہ صالح متقی انسان وہ ہے جو اللہ کی بندگی کرتا ہے اور زندگی کے ہر معاملے میں صرف اللہ ہی کی رہنمائی حاصل کرتا ہے اور اپنے آپ کو اس ارشاد خداوندی کا مصداق بناتا ہے۔

وما خلقت الجن والانس الا ليعبدون

یعنی: میں نے جنوں اور انسانوں کو اس کے سوا کسی کام کے لیے نہیں پیدا کیا کہ وہ میری بندگی کریں۔

اس تقویٰ شعار اور صالح انسان کی تیاری کے لئے رسول اللہ نے جو جامع پروگرام دیا ہے اس کے صرف دو بنیادی اصولوں کے تذکرے پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ ایک تعلق باللہ اور دوسرے خدمت خلق۔ فرد کی تربیت میں ان دو اصولوں کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔

تعلق باللہ

انسانی اعمال کا انضباط منحصر ہے فکری یکجہتی و پاکیزگی پر۔ رسول اللہ نے تربیت فرد کے لئے اللہ تعالیٰ کے ساتھ شعوری تعلق کو بنیاد بنایا ہے۔ قرآن و سنت کی نصوص سے واضح ہوتا ہے کہ توحید معبودیت اور توحید ربوبیت کے ساتھ معیت الہی مقصود قرار دیا گیا ہے۔ اس امر کا اہتمام کیا گیا کہ تعلق باللہ ذات کے شعور و لا شعور کا حصہ بن جائے۔ مسلمان معاشرے میں بچے کے کان میں اذان دینے کا عمل اس بات کی علامت ہے کہ توحید ربوبیت کا وہ احساس تازہ ہو جائے جو عہد الست میں پیدا ہوا تھا۔ تعلق باللہ ہی وہ واحد اساس ہے جو فرد کی حیات کا رخ صحیح رکھتی ہے اور یہی نبوی طریق تربیت کی بنیاد ہے۔ حضور ﷺ انسان کو ایسی تربیت ہتیا کرتے ہیں کہ ہر لمحہ و ہر لحظہ اس کا تعلق اپنے رب سے برقرار رہے، اس کا تعامل اللہ کے ساتھ ہو، اس میں خشیت الہی ہو، اس میں حب الہی کی لہریں اٹھتی رہیں اور رب تعالیٰ کے دیئے ہوئے منہاج زندگی کی جانب رجوع کا جذبہ موجود ہو۔ وہ اپنی خلوت میں مصروف ہو یا اپنے ہم جنس انسانوں کے ساتھ ہو، عبادت میں مشغول ہو یا عملی جدوجہد میں لگا ہوا ہو، صفت و تجارت میں منہمک ہو یا کاریگری میں مشغول ہو، صلح و آشتی کے لمحات میں ہو یا نزاع و جنگ کے اوقات میں، وہ اپنے رب

لئے۔ القرآن، ۵۱: ۵۶ لہ۔ القرآن، ۲: ۱۶۵

سے بے تعلق نہ ہو۔ اس تعلق کی معراج یہ ہے کہ اللہ کی محبت تمام محبتوں پر غالب آ جائے۔
 ارشاد خداوندی ہے :

وَمِنَ النَّاسِ مَن يَتَّخِذُ مِن دُونِ اللَّهِ إِندَادًا يُحِبُّوهُمْ كَحُبِّ اللَّهِ
 وَالَّذِينَ آمَنُوا أَشَدُّ حُبًّا لِلَّهِ

یعنی : اور لوگوں میں ایسے لوگ بھی ہیں جو خدا کے ہمسر ٹھہراتے ہیں جن سے وہ اس
 طرح محبت کرتے ہیں جس طرح خدا سے محبت کرنی چاہیے، لیکن جو خدا پر ایمان رکھتے
 ہیں وہ سب سے زیادہ اللہ سے محبت رکھنے والے ہیں۔

اس اجمال کی تفصیل اس آیت میں بیان فرمادی تاکہ کوئی ابہام باقی نہ رہے :
 قُلْ إِنْ كَانَ آبَاؤُكُمْ وَأَبْنَاؤُكُمْ وَإِخْوَانُكُمْ وَأَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيرَتُكُمْ
 وَأَمْوَالٌ مِّنْ أَمْوَالِهِمْ وَأَنْتُمْ مُؤْتَاهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا
 وَمَسَاكِينُ تَوْضَعُونَ فِيهَا أَحَبُّ إِلَيْكُمْ مِّنَ اللَّهِ وَرَسُولِهِ وَ
 جِهَادٍ فِي سَبِيلِهِ فَتَرَبَّصُوا حَتَّىٰ يَأْتِيَ اللَّهُ بِأَمْرٍ ۗ
 وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفَاسِقِينَ ٥

یعنی : اے رسول! مسلمانوں سے کہہ دیں اگر تمہیں اپنے باپ، دادا، بیٹے، بھائی،
 بیوی اور رشتہ دار اور وہ اموال جو تم نے (بڑی محنت سے) کمائے ہیں اور وہ
 تجارت جس کے مندا پڑ جانے سے تم بہت ڈرتے ہو اور وہ مکانات جنہیں تم بہت
 عزیز رکھتے ہو۔ اگر ان میں کوئی چیز بھی تمہیں اللہ سے اور اس کے رسول سے اور
 اس کی راہ میں جہاد کرنے سے زیادہ محبوب ہو تو پھر انتظار کرو یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ
 کا فیصلہ صادر ہو جائے۔ اور یاد رکھو اللہ تعالیٰ فاسقوں کو ہدایت نہیں دیا کرتا۔
 کتب حدیث میں "الحب فی اللہ" کے ابواب میں آنحضرتؐ کے مختلف ارشادات منقول
 ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ حب الہی کمال ایمان دین ہے اور فردوس من سے یہ مطلوب ہے
 کہ وہ جذبہ حب الہی سے مرشار ہو۔ مثلاً :

عَنْ النَّسِ عَنْ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ ثَلَاثٌ مِّنْ كُنْ فِيهِ
 وَجِدَ حَلَاوَةَ الْإِيمَانِ أَنْ يَكُونَ اللَّهُ وَرَسُولَهُ أَحِبَّ إِلَيْهِمَا سِوَا
 هُمَا وَأَنْ يَحِبَّ الْمَرْءُ لِحُبِّهِ إِلَّا لِلَّهِ تَعَالَىٰ وَأَنْ يَكُونَ أَنْ

طہ۔ القرآن، ۲ : ۱۶۵ طہ۔ القرآن، ۹ : ۲۴

لجیود فی الکفر کما یکره ان یقذف فی النار۔

یعنی: حضرت انسؓ رسول اللہؐ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہؐ نے فرمایا: تین صفات ایسی ہیں جس میں پائی گئیں وہ ایمان کی لذت پاگیا۔ یہ کہ اللہ اور اس کے رسولؐ ان کے علاوہ ہر چیز سے محبوب تر ہوں، یہ کہ انسان کسی سے صرف اللہ کے لئے پیار رکھتا ہو، اور یہ کہ کفر کی جانب لوٹنا اسے ایسا ہی مکروہ لگے جب اسے آگ میں ڈالا جانا ناپسند ہو۔ (مشکوٰۃ کتاب الادب باب الحب فی اللہ ص ۴۲۷)

اس محبت کے نتیجے میں انسان کو اللہ کی معیت و محبت حاصل ہوتی ہے جو بندے کے لئے بے مثال کیفیت ہوتی ہے۔ کسی عاشق نے کہا ہے:

نسیت کل طریق کنت اعرفہ الا طریقاً یؤدینى مرحبکم

اللہ تعالیٰ نے اپنی معیت اور بندے کی محبوبیت کا برملا ذکر کیا ہے۔ فرمایا: اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الَّذِیْنَ اتَّقَوْا وَّ الَّذِیْنَ هُمْ حُسْنُوْنَ ۝

یعنی: بے شک اللہ ان لوگوں کے ساتھ ہے جو متقی ہیں اور محسن بھی۔

حضرت موسیٰؑ نے اس معیت کا اظہار اس طرح فرمایا:

اِنَّ مَعِيَ رَبِّیْ سَيِّدِیْنَ ۝

یعنی: بلاشبہ میرے ساتھ میرا رب ہے یقیناً میری رہنمائی کرے گا۔ حضور اکرمؐ نے بھی ہجرت کے موقعہ پر اسی معیت کا ذکر کیا تھا:

لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا ۝

یعنی: تم غمگین نہ ہو اللہ ہمارے ساتھ ہے۔

آنحضورؐ نے حب الہی اور معیت رب کا جو احساس پیدا کیا اس کے حصول و استحکام کا ذریعہ بھی بتا دیا۔ بلاشبہ یہ نعمتیں توفیق الہی اور فیض ربوبیت ہی سے حاصل ہوتی ہیں لیکن انسان سطح پر جو کوشش ہو سکتی ہے اس کی جانب رہنمائی سے محروم نہیں رکھا گیا۔ باری تعالیٰ فرماتے ہیں:

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاَتَّبِعُوْنِیْ یُحِبِّکُمْ اللّٰهُ ۝

یعنی: آپ کہہ دیں اگر اللہ سے محبت کرتے ہو تو میری پیروی کرو اللہ تم سے محبت کرے گا۔

وَلَا تَهِنُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَأَنْتُمْ الْأَعْلَوْنَ إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ ۗ

یعنی: دل شکستہ نہ ہو، غم نہ کرو تم ہی غالب رہو گے اگر تم مومن ہو۔

عبادت کے ساتھ ذکر و فکر کا عمل اس استحکام میں مدد دیتا ہے۔ اللہ کی آیات میں غور و فکر اور اس کی یاد تربیت نفس کا موثر ذریعہ ہیں۔ ان کے باعث انسان اللہ تعالیٰ کے جلال کا شعوری احساس رکھتا ہے اور نفس کے فریب میں بہیں آتا۔ کبر و غرور اور ظلم و فرعونیت جیسے رذائل سے محفوظ رہتا ہے۔ قرآن پاک نے مومنین کی صفات کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا:

إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ وَالاخْتِلَافِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ لآيَاتٍ
لِّأُولِي الْأَلْبَابِ ۗ الَّذِينَ يَذْكُرُونَ اللَّهَ قِيَامًا وَقُعُودًا

وَعَلَىٰ جُنُوبِهِمْ وَيَتَفَكَّرُونَ فِي خَلْقِ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ
رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هَذَا بَاطِلًا سُبْحَانَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ۗ

یعنی: بے شک آسمان اور زمین کی پیدائش میں اور رات دن کے اختلاف میں نشانیاں ہیں عقل والوں کے لئے (یہ وہ ہیں) جو یاد کرتے ہیں اللہ کو کھڑے بیٹھے اور لیٹے اور ناکر کرتے ہیں آسمانوں اور زمین کی پیدائش میں اور غور و فکر کرنے کے بعد پکار اٹھتے ہیں) اے ہمارے رب تو نے یہ کائنات بے قاعدہ نہیں پیدا کی۔

حکم ہوتا ہے واذکروا اللہ کثیراً لعلکم تفلحون۔ یعنی: اور یاد کرو اللہ کو بہت تاکہ تم فلاح پاؤ۔

حضورؐ فرماتے ہیں:

أَلَا أَدُلُّكَ عَلَىٰ مَلَاكٍ هَٰذَا الْأَمْرَ الَّذِي تَصِيبُ بِهِ خَيْرَ الدُّنْيَا

الْآخِرَةِ عَلَيْكَ مَجَالِسُ أَهْلِ الذِّكْرِ وَإِذَا خَلُوتَ فَحَرِّكْ

لِسَانَكَ مَا اسْتَطَعْتَ بِذِكْرِ اللَّهِ وَاحِبٍ فِي اللَّهِ وَابْغِضْ فِي اللَّهِ ۗ

یعنی: کیا میں اس معاملہ کی بنیاد نہ بتاؤں جس کے ذریعے تم دنیا و آخرت کی بھلائی حاصل

کرو؟ اہل ذکر کی مجالس میں بیٹھو اور جب خلوت میں جاؤ تو اپنی زبان کو حسب استطاعت ذکر الہی

سے متحرک رکھو اور اللہ ہی کے لئے محبت کرو اور اللہ ہی کے لئے نفرت کرو۔

ذکر نہ صرف یہ کہ تعلق باللہ کو مستحکم کر لیا ہے بلکہ روح انسانی کو ایسا رنگ دیتا ہے کہ پھر کوئی

اور رنگ اس پر غالب نہیں آتا۔ ذکر کے بغیر تکمیل ذات ممکن نہیں۔ اقبال نے کہا:

۱۔ القرآن، ۳: ۱۳۹ ۲۔ القرآن، ۳: ۱۹۰-۱۹۱ ۳۔ مشکوٰۃ، کتاب الادب، باب حب فی اللہ (۲۷)

فقر قرآن اختلاط ذکر و فکر فکر را کامل نہ دیدم جز بہ ذکر

مصاحب

اچھے انسانوں کی مصاحبت انسان کے اندر تعلق باللہ کا احساس، عبودیت کا شعور اور حسن خلق کا انضباط پیدا کرتی ہے۔ قرآن پاک نے اپنے حکیمانہ انداز میں کفار کی حسرتوں کا ذکر کیا ہے:

يَا وَيْلَتَى لَيْتَنِي لَمْ أَتَّخِذْ فُلَانًا خَلِيلًا لَقَدْ أَضَلَّنِي عَنِ الذِّكْرِ ۗ

یعنی: ہلکے افسوس، کاش میں فلاں کو دوست نہ بنا تا اس نے مجھے ذکر سے منحرف کیا۔

قرآن کا حکم "کو فو امع الصادقین" کی تفسیر و توضیح میں رسول اکرمؐ اور صحابہ کرامؓ کے ارشادات سے معلوم ہوتا ہے کہ مصاحبت و معیت اتنی اہمیت رکھتی ہے۔ حضور فرماتے ہیں:

لا تصاحب الا مؤمنا ولا ياكُل طعامك الا تقى ۗ

یعنی: مومن کے سوا کسی سے مصاحبت اختیار نہ کر اور تیرا طعام صرف متقی ہی کھائے۔ مصاحبت، فکری تربیت اور عملی تنظیم پر گہرے اثرات ڈالتی ہے، اسی لیے رسول اللہؐ نے ملاقاتِ ذکر کی طرف توجہ دلائی۔ کتب حدیث کے ابواب الدعوات والذکر ارشادات نبوت سے بھرے پڑے ہیں۔

دُعا

تعلق باللہ کو پختہ کرنے اور رُوح کی صحیح تربیت میں دعا کو ایک خاص مقام حاصل ہے، دعا انسان کی عبودیت اور حاجتمندی کے اظہار کا ذریعہ اور اللہ کی قدرت کاملہ، حاکمیت علی الاطلاق و رحمت و غفران کا اقرار و اعتراف بھی ہے، نیز دعا تشکر و امتنان کا وسیلہ بھی اور عجز و نیاز کا اظہار بھی ہے۔ جس طرح ذکر رُوح کی بالیدگی کا باعث بنتا ہے، اسی طرح دعا بھی باطن کے گداز کا سبب بنتی ہے۔ دُعا کبر و غرور اور خود پسندی جیسے ہلک روحانی امراض کا علاج بھی ہے۔ دُعا کی وجہ سے جہاں انسان کو عزت نفس کے کھفظ کا احساس ہوتا ہے وہاں توجہ الہی کے باعث بے پناہ عقائد بھی حاصل ہوتے ہیں۔ اس کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ کی ربوبیت و رحمت کے ساتھ ایسا گہرا ربط پیدا ہوتا ہے کہ انسان منقطع کرنا بھی چاہے تو نہیں کر سکتا۔ دُعا کی لذت اور تباب پر اس کی تاثیر کے احوال صرف وہی جانتے ہیں جنہیں اپنے رب کے سامنے ہاتھ پھیلانے، سر جھکانے اور پرہیزگاروں کے ساتھ کچھ عرض کرنے کی سعادت نصیب ہوتی ہے۔ قرآن و سنت کی فصوص میں

۵۔ القرآن، ۸: ۲۵۔ ۲۶۔ مشکوٰۃ: کتاب الاداب، المحب فی اللہ، ۲۲۷۔

اس کی بے پایاں تاثیر کا ذکر موجود ہے۔

وَإِذَا سَأَلَكَ عِبَادِي عَنِّي فَإِنِّي قَرِيبٌ أُجِيبُ دَعْوَةَ
الدَّاعِ إِذَا دَعَانِ ۗ

یعنی: جب میرے بندے آپ سے میرے بارے میں سوال کریں تو (کہہ دیں)
کہ میں قریب ہوں، پکارنے والے کی پکار کا جواب دیتا ہوں۔

کتب حدیث میں دعا پر مفصل ابواب میں مرنیٰ اعظم نے دعا کا طریق، اس کے آداب
اور اس کی تاثیر کو بہ دلائل سمجھایا ہے۔ آنحضرتؐ سے جو دعائیں منقول ہیں ان کے الفاظ پر غور
کرنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ ایک مسلمان کو کیسا انسان بننے کی ترغیب و تعلیم دے رہے
تھے۔ دعا کے بارے میں فرمایا "الدعاء فح العبادة" پھر فرمایا "الدعاء هو العبادة"
حضرت سلمان فارسیؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہؐ نے فرمایا:

لا يرد القضاء الا الدعاء ولا يزيد في العمر الا السيرة

یعنی: قضا کو صرف دعا ہی ٹوٹا سکتی ہے اور احسان و بھلائی کے سوا کوئی چیز عمر
میں اضافے کا باعث نہیں بنتی۔

عبادت، ذکر الہی، مصاحبت اور دعا، تشکر کے ذریعہ سے مستحکم تعلق باللہ فرد کی تربیت
کا اولین ذریعہ ہے۔

خدمت خلق

نبوی طریق تربیت کا دوسرا بنیادی عنصر خدمت خلق ہے۔ فرد کی زندگی کے دو پہلو ہیں۔ ایک
محافظ سے وہ اپنے خالق سے جڑا ہوا ہے اور دوسرے کے اعتبار سے وہ مخلوق سے متعلق ہے۔
خالق کے حوالے سے وہ احساس عجز و نیاز اور عبودیت و بندگی کو پروان چڑھاتا ہے اور مخلوق
کی نسبت سے خدمت، نفع بخشی و فیض رسانی کو شعار بناتا ہے۔ خلق خدا اللہ تعالیٰ کا کنبہ ہے۔
اس کی خدمت اور اس سے حسن سلوک دنیا کی فلاح اور آخرت کی کامرانی کی ضامن ہے۔
نبی مکرمؐ کا ارشاد ہے:

عن عبد الله و ابی هريرة قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم
المخلوق عيال الله فاحب المخلوق الى الله من احسن الى عياله ۝

یعنی: عبد اللہ اور ابو ہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہؐ نے فرمایا، مخلوق اللہ کا کنبہ

ہے اور اللہ کے نزدیک محبوب ترین وہ ہے جو اس کے کہنے سے اچھا سلوک کرتا ہے۔
 خدمتِ خلق ایک وسیع اصطلاح ہے جس میں جسمانی خدمت، اخلاقی رویہ، مالی اعانت
 اور ممکنہ تحفظ شامل ہے۔ قرآن و سنت کی ہدایت سے پتہ چلتا ہے کہ حسنِ خلق دین کی روح ہے۔
 قرآن پاک نے نیکی کے تصور کو واضح کرتے ہوئے فرمایا:

لَيْسَ الْبِرَّ أَنْ تُولُوا وَجُوهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلَكِنَّ
 الْبِرَّ مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَآلِهِ وَسَلَّمَ
 الْمَالَ عَلَىٰ حُبِّهِ ذَوِي الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ
 وَالْمَسَاكِينَ وَابْنَ السَّبِيلِ وَالسَّائِلِينَ وَفِي الرِّقَابِ وَأَقَامَ
 الصَّلَاةَ وَآتَى الزَّكَاةَ وَالْمُؤْمِنِينَ بَعَثَهُمْ إِذَا عَاهَدُوا
 وَالصَّابِرِينَ فِي الْبَأْسَاءِ وَالضَّرَّاءِ وَحِينَ الْبَأْسِ أُولَئِكَ
 الَّذِينَ صَدَقُوا وَأُولَئِكَ هُمُ الْمُتَّقُونَ ٥

یعنی: نیکی یہی نہیں کہ تم نماز میں اپنا منہ پورب یا پچھم کی طرف کرو۔ بلکہ اصل نیکی
 اس کی ہے جو خدا پر، قیامت پر، فرشتوں پر، کتاب پر اور پیغمبروں پر ایمان لایا اور
 مال کی خواہش کے باوجود اپنا مال رشتہ داروں کو یتیموں کو، غریبوں کو، مسافر کو،
 مانگنے والوں کو اور غلاموں کے آزاد کرنے میں دیا۔ اور نماز ادا کرتا رہا اور زکوٰۃ
 دیتا رہا اور جو لوگ وعدہ کر کے اپنے وعدے کو پورا کرتے ہیں اور جو مصیبت،
 تکلیف اور بڑائی (میدان جنگ) میں ثابت قدم رہتے ہیں۔ یہی وہ ہیں جو راست باز
 ہیں اور یہی تقویٰ والے ہیں۔

کتب حدیث میں "الشفقة والرحمة علی الخلق" اور "حسن الخلق" کے ابواب
 بھی موجود ہیں جن سے عملی زندگی کی پوری تصویر بنتی ہے۔ آپ حسنِ خلق ہی کو لیں، بیسیوں احادیث
 اس کی اہمیت و فضیلت اور تفصیلی حکمتِ عملی پر مل جائیں گی۔ آپ کی دعاؤں میں منقول ہے
 "اللھما حسن خلقی فحسن خلقی" (یعنی: اے اللہ تو نے میرا سراپا اچھا بنا لیا ہے، میرے
 اخلاق کو بھی سنوار دے۔)

آپ نماز میں جو دعا مانگتے تھے اس کا ایک فقرہ یہ بھی ہوتا تھا:

وَإِهْدِنِي لِأَحْسَنِ الْأَخْلَاقِ لَا يَهْدِي لِأَحْسَنِ الْأَخْلَاقِ إِلَّا أَنْتَ وَاصْرِفْ

۱۷۷: ۲ - القرآن -

عَنْ سَيِّئًا لَا يَصِفُ عَنِّي سَيِّئًا إِلَّا أَنْتَ لِي

یعنی: اے اللہ مجھ کو بہتر سے بہتر اخلاق کی رہنمائی کر، تیرے سوا کوئی بہتر سے بہتر اخلاق کی راہ نہیں دکھا سکتا اور بُرے اخلاق کو مجھ سے پھیر دے اور ان کو نہیں پھیر سکتا مگر تو۔

پھر فرمایا: الْمَسَلُ الْمُؤْمِنِينَ إِيْمَانًا أَحْسَنَهُمْ خَلْقًا۔

یعنی: مسلمانوں میں کامل ایمان اس شخص کا ہے جس کا خلق سب سے اچھا ہے۔

مالی و جسمانی اعانت اجتماعی زندگی کی روح ہے اور فرد کے سکون کا ذریعہ جس معاشرے کے افراد ایک دوسرے کے مددگار ہوتے ہیں وہ مادی طور پر خوشحال اور روحانی اعتبار سے مطمئن ہوتا ہے۔ اگر معاشرت کی بجائے خود غرضی دستخصال کے اصول کار فرما ہوں تو وہ معاشرہ اسی دنیا میں جہنم بن جاتا ہے۔ میں یہاں حضور اکرم کی چند احادیث پیش کرنا چاہوں گا جن سے پتا چلے گا کہ آپ کس طرح کے افراد تیار کرنا چاہتے تھے۔ ان احادیث میں ترغیب و ترہیب کے شان دار نمونے ملیں گے۔

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الْمَسَاعِي عَلَى الْأَرْمَلَةِ وَالْمَسْكِينِ كَالسَّاعِي فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَاحْسِبْهُ كَالْقَائِمِ لَا يَفْتَرِدُ كَالصَّائِمِ لَا يَفْطُرُ (متفق عليه)

یعنی: ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ نے فرمایا کہ بیوہ اور مسکین کے لئے دوڑ دھوپ کرنے والا ایسا ہے جیسا خدا کی راہ میں سعی کرنے والا، راوی کہتا ہے کہ آپ نے یہ بھی فرمایا جیسا وہ نمازی ہے جو نماز سے نہیں تھکتا اور وہ روزہ دار ہے جو کبھی اپنا روزہ نہیں توڑتا۔

عَنْ النَّسِ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَالَّذِي لَفْسِي بِيَدِهِ لَا يُؤْمِنُ عَبْدٌ حَتَّى يَحِبَّ لِأَخِيهِ مَا يَحِبُّ لِنَفْسِهِ

یعنی: انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ نے فرمایا: قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے کوئی بندہ اس وقت کامل ایمان والا نہیں ہوتا جب تک اپنے بھائی کے لیے وہ بھلائی نہ چاہے جو اپنے لیے چاہتا ہے۔

قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَاللَّهِ فِي عَوْنِ الْعَبْدِ مَا كَانَ الْعَبْدُ فِي عَوْنِ أَخِيهِ

۱۔ مسلم، باب الدعاء في الصلوة۔ ۲۔ مشکوٰۃ، کتاب الادب، باب في الشفقة۔ ۳۔ ۲۲۲۔ ۴۔ ۵۔

یعنی : اللہ اپنے بندے کی مدد میں اس وقت تک رہتا ہے جب تک بندہ اپنے بھائی
کی مدد میں رہتا ہے ۔

پھر فرمایا :

عن عمران ان رسول الله صلى الله عليه وسلم قال المسلما نحو المسلم
لا يظلمه ولا يسلمه ومن كان في حاجة أخيه كان الله في حاجته و
من فرج عن مسلم كربة فرج الله عنه كربة من كربات يوم القيامة
ومن ستر مسلماً ستره الله يوم القيامة ۔

یعنی : حضرت عمرانؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا : مسلمان دوسرے مسلمان
کا بھائی ہے نہ تو خود اس پر زیادتی کرتا ہے نہ اسے کسی اور کے حوالے کر دیتا ہے اور جو شخص اپنے
بھائی کی حاجت روائی میں مصروف ہوگا اللہ اس کی حاجتیں پوری کرتا ہے ۔ جو شخص اپنے
بھائی کی کوئی تکلیف دور کرے گا ، اللہ اس پر سے قیامت کی تکلیفیں کم کر دے گا اور جو اپنے
مسلمان بھائی کی پرورہ پوشی کرے گا قیامت کے دن اللہ اس کے عیب لوگوں سے چھپا دے گا ۔

ارشاد خداوندی ہے کہ :

وَالَّذِينَ فِي آفْسَوْا لَهُمْ حَقُّ مَعْلُومٌ ۗ تِلْسَائِيلَ وَالْمُحْرُوفِ ۗ (القرآن، ۷۰، ۲۴-۲۵)

یعنی : جن کے مالوں میں مانگنے والوں اور محروم کے لیے حق ہے ۔

خدمت خلق تربیت فرد کا بڑا ذریعہ ہے کیوں کہ اس کے باعث انسان رذائل اخلاق
اور نفس کے قریب سے نجات حاصل کرتا ہے ۔ اس دنیا میں فساد کا بڑا سبب فرد کی ہوس ، اس
کی طبیعت کا بخل اور اس کا جبر و تشدد ہے ۔ یہ اس کی ہوس کی بڑی بڑی علامت ہے کہ معاشرہ استحصال
کا شکار مہرتا ہے ۔ یہ اس کے نفس کا غرور ہے جو جبر و تشدد اور ظلم و وحشت کو جنم دیتا ہے ۔
اور یہ اس کا بخل ہے جو معاشی زندگی کے نشوونما کو روک دیتا ہے ۔ بنی ۲ نے ان تمام اخلاقی
بیماریوں کا علاج خدمت خلق سے کیا ہے ۔ خدمت خلق کے لیے محبت و شفقت اور نرمی و
ہمدردی کے علاوہ ایشیا و قربانی کا جذبہ بھی ایک ناگزیر ضرورت ہے ۔ رسول اللہ کے تربیت یافتہ
انصاری کا عمل وحی ربانی کا حق بن گیا ۔ جب رب کائنات نے فیض نبوت سے تربیت یافتہ
انصاری کی تعریف کی ۔

وَيُؤْتِرُونَ عَلَىٰ أَنفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ ۗ

یعنی : یہ لوگ (مسلمان) ایسے ہیں کہ چاہے خود تکلیف میں ہوں مگر دوسروں

کے لیے ایشار کرتے ہیں۔

تعلق باللہ اور خدمت خلاق تربیت فرد کے وہ بنیادی اصول ہیں جن کے بغیر کسی انسان کی نہ اصلاح ہو سکتی ہے اور نہ تعمیر حضورؐ نے ان اصولوں کو شخصیت کا جز بنانے کے لیے وعظ و نصیحت، جزا و سزا کے احساس اور سب سے بڑھ کر شخصی عملی زندگی کا نمونہ پیش کیا۔

عہد نبوی کا نظام تعلیم و تربیت

جناب محترم ڈاکٹر محمد یوسف گورایہ

عہد نبوی کا نظام تعلیم و تربیت دنیا میں منفرد حیثیت کا حامل ہے۔ یہ انتہائی مبارک و مسعود ہے۔ اس کی ترتیب و تدوین اور تقنین و تخطیط ابوالانبیاء سیدنا ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام ہی نے فرمائی۔ اس سے ملت ابراہیمی اور امت محمدیہ کے درمیان دینی اور روحانی گہرے روابط استوار ہوئے۔

نظام تعلیم چار بنیادی عناصر پر مشتمل ہوتا ہے: (۱) مرکز تعلیم (۲) طلبہ (۳) معلم (۴) نظام تعلیم و تربیت۔ سیدنا ابراہیمؑ کی لازوال عظمت و بصیرت کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ آپ نے نظام تعلیم و تربیت کے ان چاروں بنیادی عناصر کا تصور فرمایا اور انہیں معرض وجود میں لانے کے لئے اللہ تعالیٰ سے قبولیت کی دعا فرمائی:

(۱) تعمیر بیت اللہ (۲) تخلیق امت مسلمہ (۳) بعثت محمدی۔ اور
(۴) نصاب تعلیم و تربیت۔

مرکز تعلیم و تربیت (بیت اللہ)

مرکز تعلیم و تربیت کی تاسیس و قیام کے لئے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بیت اللہ کی تعمیر فرمائی:

وَإِذْ يَرْفَعُ إِبْرَاهِيمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ وَإِسْمَاعِيلُ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا إِنَّكَ أَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ۔ (القرآن ۲: ۱۲۷)

ترجمہ: اور جب ابراہیمؑ اور اسماعیلؑ بیت اللہ کی بنیادیں اٹھا رہے تھے (تو دعا کیے جاتے تھے کہ) اے ہمارے پروردگار ہم سے یہ خدمت قبول فرما، بیشک تو سننے والا (اور) جاننے والا ہے۔

۲۔ اُمتِ مسلمہ (طلبہ)

درس گاہ بیت اللہ میں عبادت اور حصول تعلیم و تربیت کے لیے آپ نے اُمتِ مسلمہ کی تخلیق کے لئے دُعا فرمائی :

رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمِينَ لَكَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَا أُمَّةً مُسْلِمَةً لَكَ۔

(القرآن ۲ : ۱۲۸)

ترجمہ : اے ہمارے پروردگار ہم کو اپنا فرمانبردار بنائے رکھیے اور ہماری اولاد میں سے ایک اُمتِ مسلمہ پیدا فرمائیے۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیمؑ کی دعا کو شرف قبولیت بخشا اور اُمتِ مسلمہ پیدا فرمائی۔

وَكَذَلِكَ جَعَلْنَاكُمْ أُمَّةً وَسَطًا لِتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ

(القرآن ۲ : ۱۴۳)

ترجمہ : اور اسی طرح ہم نے تم کو اُمتِ معتدل بنایا تاکہ تم لوگوں پر گواہ بنو۔

۳۔ معلم (رسول)

درس گاہ بیت اللہ میں اُمتِ مسلمہ کی تعلیم و تربیت کے لیے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے معلم کے فرائض انجام دینے کے لیے ایک رسولؐ کی بعثت کے لیے دُعا فرمائی :

رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا مِنْهُمْ۔ (القرآن ۲ : ۱۲۹)

ترجمہ : اے ہمارے پروردگار اس اُمت میں انہیں میں سے ایک رسول مبعوث فرما۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی یہ دعا قبول فرمائی اور اُمتِ مسلمہ میں اپنے

فیض و کرم اور فضل و احسان سے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو رسول بنا کر بھیجا۔

لَقَدْ مَنَّ اللَّهُ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ إِذْ بَعَثَ فِيهِمْ رَسُولًا مِنْ أَنْفُسِهِمْ

(القرآن ۳ : ۱۶۴)

ترجمہ : خدا نے مومنوں پر بڑا احسان کیا کہ ان میں انہیں میں سے ایک رسول بھیجا۔

۴۔ نصابِ تعلیم و تربیت

اُمتِ مسلمہ کی تعلیم و تربیت کے لیے حضرت ابراہیمؑ نے ایک نصابِ تعلیم و تربیت تجویز

فرمایا اور بارگاہ رب العزت میں منظوری کے لیے پیش فرمایا :

يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيَاتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيهِمْ

(القرآن ۲: ۱۲۹)

ترجمہ: وہ ان پر تیری آیات کی تلاوت کرے اور کتاب اور حکمت کی تعلیم دے اور

ان کا تزکیہ کرے۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیمؑ کے مجوزہ نصاب تعلیم و تربیت کو شرف قبولیت بخشا اور اس

کے مطابق امت کی تعلیم و تربیت کا کام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سپرد فرمایا:

هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّينَ رَسُولًا مِنْهُمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ

وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ - (القرآن ۲: ۱۲۹)

ترجمہ: وہی تو ہے جس نے امیوں میں انہی میں سے رسول بھیجا جو ان پر اس کی آیتوں

کی تلاوت کرتا ہے، ان کا تزکیہ کرتا ہے اور کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔

ان مباحث سے معلوم ہوا کہ تعمیر بیت اللہ، تخلیق امت مسلمہ، بعثت محمدی اور تجویز

ترتیب نصاب تعلیم و تربیت ایک ہی مقدس و مندرجہ سلسلے کی مصنوع و مرصوص کرطیاں ہیں۔

اس کا آغاز سیدنا ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام ابوالانبیاء سے ہوا اور تکمیل سید المرسلین،

رحمۃ للعالمین اور ختم المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم پر ہوئی۔

عہد نبوی کا نظام تعلیم و تربیت انہیں عناصر اربعہ پر استوار تھا جن کی تجویز و ترتیب اور

تاسیس و تشکیل حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمائی تھی۔ اب ان چاروں عناصر کی مختصر طور پر

اہمیت بیان کی جاتی ہے۔

مرکز تعلیم

انسانیت کے لیے اولین مرکز تعلیم و تربیت اور اسلامی درس گاہ بیت اللہ کو دنیا کے

تمام مراکز اور تمام درس گاہوں پر جن خصوصیات کی بنا پر فوقیت حاصل ہے قرآن نے ان کا

ذکر اس طرح فرمایا ہے:

إِنَّ أَوَّلَ بَيْتٍ وُضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِي بِبَكَّةَ مُبَارَكًا وَهُدًى

لِلْعَالَمِينَ (القرآن ۲: ۱۲۵)

ترجمہ: پہلا گھر جو لوگوں کے لیے بنایا گیا وہی ہے جو مکے میں ہے مبارک اور دنیا

کے لیے موجب ہدایت۔

اس آیت میں بیت اللہ کی دو صفتیں بیان ہوئی ہیں (۱) مبارک (۲) ہدی للعالمین۔ ایک جگہ بیت اللہ کی صفت یہ بیان فرمائی گئی ہے کہ اس میں داخل ہونے والے کو امن و سکون نصیب ہوتا ہے۔

ومن دخله كان آمناً ط (القرآن ۳ : ۹۷)

ترجمہ : جو اس میں داخل ہوا اس نے امن پالیا۔

ایک جگہ بیت اللہ کو انسانیت کی اجتماع گاہ اور امن گاہ قرار دیا گیا ہے :

وَإِذْ بَعَلْنَا الْبَيْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ وَأَمْناً ط۔ (القرآن ۲ : ۱۲۵)

ترجمہ : اور جب ہم نے بیت اللہ کو لوگوں کے لئے جمع ہونے اور امن پانے جگہ مقرر کیا۔

قرآن و سنت اور سیرت و تاریخ میں بیت اللہ کی اور بھی کئی صفات بیان ہوئی ہیں۔ تذکرہ

آیات میں بیت اللہ کی صفات یہ ہیں : مبارک، ہدی للعالمین، اجتماع گاہ انسانیت اور

امن گاہ انسانیت۔ ہجرت کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ منورہ میں مسجد بنوی

تعمیر فرمائی۔ یہ مسلمانوں کا دوسرا بڑا تعلیمی و روحانی مرکز قائم ہوا اور یہ بھی انسانیت کے لیے

برکت، ہدایت، اجتماع اور امن کا موجب ثابت ہوا۔ اسی طرح جیسے جیسے خلقت دائرہ اسلام

میں داخل ہوتی چلی گئی اور اسلام آناً و اطراف عالم میں پھیلتا چلا گیا ویسے ہی ویسے

ان اولین اسلامی تعلیمی و روحانی مراکز کی طرز پر تعلیم و عبادت گاہیں قائم ہوتی چلی گئیں۔

مسلمانوں کی درس گاہیں بابرکت ہوتی تھیں کیوں کہ ان کے بانی سیدنا ابراہیم علیہ السلام اور

سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اتباع میں خلوص، نیک نیتی اور تقویٰ کی بنیاد پر ان

کی تعمیر کرتے تھے۔ ان میں رشد و ہدایت کی تعلیم دی جاتی تھی۔ ان میں برکت و ہدایت کی موجودگی

انسانیت کو اپنی طرف کھینچتی تھی اور متلاشیان حق اور تشنگان علم جوق در جوق ان اجتماع گاہوں

کی طرف کھنچے چلے آتے تھے۔ ان کا پر امن اور پرسکون ماحول علم و تحقیق کے لیے ہمیز اور

تعقل و تفکر کے لیے تحریک و تہییج کا باعث بنتا تھا۔

درحقیقت اسلامی درس گاہوں میں برکت اور ہدایت کا ماحول طلبہ کی خدا داد صلاحیتوں

کو ابھرنے پر آمادہ کرتا اور امن و اجتماع کی معتدل، خوشگوار اور سازگار فضا انھیں بڑھنے، پھلنے

پھولنے اور پروان چڑھنے کے وسیع و وافر مواقع فراہم کرتی تھی۔ اگر مسجد نبویؐ پر درس گاہ

کی حیثیت سے نگاہ دوڑائیے تو یہ نظم و نسق کے اعتبار سے مثالی، امن و سکون کے اعتبار سے

نمونہ، برکت و ہدایت کے اعتبار سے بے مثل نظر آئے گی۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم و فنون کی ہر نوع کا علم حاصل کرتے۔ مختلف مسائل حیات پر اجتہاد و تحقیق کی تربیت پاتے، تلاش و جستجو کی تڑپ کے تحت بہت سے علمی، فکری اور تحقیقی سوال کرتے تھے۔ اس آزادانہ علمی ماحول میں ان کی علمی و فکری تربیت ہوتی۔ درس گاہ میں نظم و ضبط کا سب سے بڑا اور اہم ترین قاعدہ اور قانون معلم اخلاق صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوہ حسنہ اور سیرت و کردار تھا۔ جبر و اکراہ اور حکم و تسلط کی جگہ معلم کی اخلاقی قوت اور اس کی ذات کی عظمت و رفعت تھی۔ یہ فضا صحابہ رضی اللہ عنہم کی صفات عالیہ کو پروان چڑھاتی اور شر و شرارت کو رذل اندازی کا موقع نہ دیتی۔

ان اسلامی درس گاہوں اور ان کے اوصاف و صفات کا موازنہ جب عہد حاضر کی درس گاہوں اور ان کی صفات سے کیا جاتا ہے تو ان کے مقصد و مدعا، ان کے ماحول اور ان کی فضا کا آپس میں کوئی ربط و تعلق نظر نہیں آتا۔ عہد نبوی کے تعلیمی و روحانی مراکز کی صفت قرآن نے یہ بیان کی ہے:

مَسْجِدٌ أُنِيسَ عَلَى التَّقْوَىٰ - ۱ القرآن ۹: ۱۰۸

ترجمہ: مسجد جس کی بنیاد تقویٰ پر رکھی گئی ہے۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا ہماری درس گاہوں کی بنیاد بھی تقویٰ ہی ہے؟ کیا ان کا مقصد و مدعا اور ان کا ماحول اور فضا وہی ہے جو عہد نبوی کی تعلیم گاہوں کی تھی؟

آج دو قسم کی درس گاہیں قائم ہیں۔ ایک جدید نظام تعلیم کی درس گاہیں اور دوسری قدیم نظام تعلیم کی درس گاہیں۔ جدید نظام تعلیم کی درس گاہوں کا اصل الاصول تو مغربی فکر و فلسفہ ہے اگرچہ فروعات میں "لازمی دینیات" کے نام سے بھی ایک مضمون مختلف تعلیمی سطحوں پر شامل نصاب ہوتا ہے۔ مغربی فکر و فلسفہ اپنی مبادیات اور قواعد و کلیات کے اعتبار سے اسلامی معاشرے و نفسیات، تہذیب و تمدن اور دین و عقیدہ سے پوری طرح ہم آہنگ نہیں۔ حال ہی میں اشتراکیت و اشتمالیت نے بھی ہماری درس گاہوں پر گہرے نقوش ثبت کیے ہیں۔ اس صورت حال سے یہ بات کھل کر سامنے آ جاتی ہے کہ ان درس گاہوں کے سامنے ملک و ملت کے حوالے سے کوئی بنیادی مقصد و مدعا موجود نہیں، اس نظام کے داعی اس کے حق میں اگر کوئی دلیل پیش کر سکتے ہیں تو فقط یہ کہ اس سے خواندگی کی شرح بڑھتی ہے اور نوکری مل جاتی ہے اور بس! اس سے بہ خوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ جب ہماری درس گاہوں کا مقصد و مدعا ہی متعین نہیں تو ان میں برکت و ہدایت اور اجتماع و امن کا ماحول کیسے پیدا ہو سکتا ہے۔ اور اگر ان میں انتشار و

افتراق، فساد و طغیان اور قتل و بگاوت ہے تو یہ اسی صورت حال کا منطقی نتیجہ ہے۔ اگر وہ مبارک کی جگہ نامبارک، ہدایت کی جگہ ضلالت، اجتماع کی جگہ انتشار اور امن کی جگہ فساد کا نقشہ پیش کرتی ہیں تو یہ نتیجہ ہے اس نفاق کا جو تقویٰ کی جگہ ان درس گاہوں کی بنیاد ہے۔ یہ بگاوت ہے جو ان نسل کی اس طبقہ کے خلاف جو اس نظام پر حاوی ہے جو یا تو نفاق کی وجہ سے مثبت تبدیلی کے حق میں نہیں یا نااہلیت کے سبب بہتر نظام کے قیام کے قابل نہیں۔

دوسری درس گاہیں قدیم نظام تعلیم کی درس گاہیں ہیں۔ ان میں غربی اور مذہبی نصاب تعلیم رائج ہے۔ ان میں خلوص و تقویٰ موجود ہے مگر بہ حیثیت مجموعی فرقہ واریت کا پہلو نمایاں نظر آتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اگرچہ مختلف فرقوں کی درس گاہوں کے احاطوں میں امن و سکون رہتا ہے۔ مگر ان کے بیشتر فارغ التحصیل جب مستند ہو کر باہر نکلتے ہیں تو ان میں کشیدگی پائی جاتی ہے جس کا اندازہ مساجد و محافل کے مختلف اجتماعات اور ایک دوسرے کی عبادت گاہوں پر قبضہ کرنے سے ہوتا ہے۔ ہماری جدید و قدیم درس گاہوں کو با مقصد اور تعمیری خطوط پر قائم کرنے کا ایک ہی طریقہ ہے اور وہ یہ ہے کہ ان کی بنیاد عہد نبوی کی تعلیمی و روحانی درس گاہوں کی طرح تقویٰ پر رکھی جائے۔ انہیں برکت و ہدایت کا سرچشمہ اور امن و اجتماع کا مرکز بنایا جائے۔

طلبہ

نظام تعلیم کا دوسرا عنصر طلبہ ہیں۔ عہد نبوی کے طلبہ کی صفات قرآن و حدیث اور سیرت تاریخ میں موجود ہیں جن کے سرسری مطالعے سے یہ بات بخوبی سامنے آتی ہے کہ ان کا سب سے بڑا مقصد اپنی سیرت کی تشکیل، کردار کی پختگی، دنیاوی امور میں مہارت اور اخروی مقاصد کا حصول تھا۔ خشیت الہی کے تحت حقوق و فرائض کی تعیین اور ادائیگی میں توازن اور رضائے الہی کے حصول کے لیے ایثار، قربانی، محبت، شفقت، ہمدردی، غمگساری، محنت، دیانت، قابلیت سے کام لینا تھا۔ مختلف علوم و فنون کی تحصیل کے لیے انتہا درجے کا شوق و ذوق، محنت و مشقت احقاقِ حق اور ابطالِ باطل کے لیے حق گوئی و بیباکی ان کے اوصاف تھے۔

قرآن حکیم نے عقل و فکر، تدبیر و تعقل پر بڑا زور دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عہد نبوی کی درس گاہوں میں اندھی تقلید اور جمود کی جگہ اجتہاد کا دور دورہ تھا۔ طلبہ اپنی ذہنی، فکری، قلبی اور روحانی صلاحیتوں کو پروان چڑھاتے تھے۔ ان میں افراط و تفریط کی جگہ اعتدال پایا جاتا تھا۔ وہ دینی اور دنیاوی امور میں توازن برقرار رکھتے تھے۔ علوم و فنون میں انہماک انہیں اپنے خانہ

و مالک کے حقوق کی ادائیگی سے غافل نہیں کرتا تھا نہ زہد و تقویٰ دنیاوی امور میں ہمارت کی راہ میں مانع ہوتا تھا۔ ان کے سامنے نظام تعلیم کا مقصد و مدعا واضح تھا، اس لیے وہ اس کے حصول کے لیے ہمہ تن مصروف و مشغول رہتے، اپنی تمام تر توانائیاں اس کو حاصل کرنے کے لیے وقف کر دیتے اور پورے امن و سکون کے ساتھ تحصیل علم میں لگے رہتے۔ پوری دلجمعی کے ساتھ اعلا مقاصد کا حاصل کرنا ان کا مطمح نظر ہوتا، بلند و بالا امور کی طلب و جستجو کی لگن، غیر ضروری، فضول اور بیکار کاموں کے لیے وقت ہی نہ چھوڑتی۔

یہی وہ صفات عالیہ تھیں اور اوصاف حمیدہ تھے کہ جن کی بدولت تلیل ترین مدت میں اس دور کے طلبہ نے وہ کارہائے نمایاں انجام دیے جن کی مثال نہیں ملتی۔ انھوں نے فقہ و قانون میں وہ اجتہادات کیے جن کی روشنی رہتی دنیا تک انسانیت کو آئین و قوانین کی ترتیب میں رہنمائی دیتی رہے گی۔ تعمیر و تشکیل شخصیت میں انھوں نے ایسی مثالیں قائم کیں جو قیامت تک انسانوں کے لیے رہبر و رہنما کی حیثیت سے موجود رہیں گی۔ علم و فضل اور عقل و تدبیر کے ایسے شاہکار سامنے لائے جو تاریکی و جہالت سے نکلنے والوں کے لیے مشعل کا کام دیتے رہیں گے۔

معلم

نظام تعلیم میں سب سے زیادہ اہمیت معلم کو حاصل ہوتی ہے۔ امت مسلمہ کے حقیقی معلم حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ آپ کا ارشاد ہے: **انہا بعثت معلما** (ترجمہ: مجھے معلم بنا کر بھیجا گیا ہے)۔ (منصب معلم پر فائز ہوتے ہی آپ نے سب سے پہلے اپنی قبل از نبوت سیرت و کردار کے بارے میں اپنے اہل شہر سے دریافت کیا اور پوچھا کہ میں چالیس برس تک آپ لوگوں میں زندگی بسر کر چکا ہوں آپ نے مجھے کیسا پایا؟ سب لوگوں نے شہادت دی کہ آپ سیرت و کردار کے بلند و بالا مقام پر فائز ہیں، آپ صادق و امین ہیں ہم نے آج تک آپ سے سوائے سچ کے کچھ نہیں سنا۔ اہل شہر کی اسی شہادت کو قرآن حکیم نے اس آیت کریمہ میں بیان کیا ہے:

فَقَدْ بَيَّنَّتْ فِيكُمْ عُمَرًا مِّنْ قَبْلِهِ ۗ أَفَلَا تَعْقِلُونَ ۝ (القرآن ۱۰: ۱۶)

ترجمہ: میں قبل (زیں) تم میں ایک عمر گزار چکا ہوں کیا تم سمجھتے نہیں!

آپ کے خلق عظیم کی شہادت سب سے آخری آسمانی وحی قرآن حکیم نے اس آیت میں

بیان فرمائی ہے :

وَإِنَّكَ لَعَلَىٰ خُلُقٍ عَظِيمٍ هـ (القرآن ۴: ۶۸)
آپ یقیناً خلقِ عظیم رکھتے ہیں۔

خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے منصبِ نبوت کے متعلق ارشاد فرمایا :
بُعِثْتُ لِأُتِمِّمَ حُسْنَ الْأَخْلَاقِ - (امام مالک الموطا باب حسن الخلق)
ترجمہ : میں حسن اخلاق کی تکمیل کے لیے مبعوث ہوا ہوں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے معلمی کے فرض کو جس حسن و خوبی سے انجام دیا وہ ایک
ابدی و سرمدی نمونہ عمل ہے۔ اس فریضے کی انجام دہی کے لیے آپ نے جس خلوص، جذبے، محنت،
محبت اور مدد روی کو اپنایا اللہ تعالیٰ نے اسے انتہائی بصیرت افروز انداز میں اس آیت میں
بیان فرمایا :

فَلَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَفْسِكَ عَلَىٰ آثَارِهِمْ إِنْ تَمَّ يُؤْمِنُوا بِهَذَا الْحَدِيثِ
أَسْفَاهُ (القرآن ۶: ۱۸)

ترجمہ : (اے پیغمبر) اگر یہ اس کلام پر ایمان نہ لائیں تو شاید آپ ان کے پیچھے
رج کر کے اپنے آپ کو ہلاک کر دیں۔

جب تک معلم کو اپنے مقصد و مشن کے ساتھ ایسی ہی وابستگی نہ ہو اس وقت تک وہ صحیح
معنوں میں تعلیم و تبلیغ کے منصب پر فائز ہونے کا حق نہیں رکھتا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے
اخلاق، اعمال، افعال اور سیرت و کردار کا جو نمونہ بحیثیت مجموعی ابھھر کر نمایاں طور پر سامنے آتا
ہے اسے قرآن حکیم نے تمام انسانیت کے لیے اسوہ حسنہ قرار دیا اور قیامت تک تعلیم و تبلیغ سے
والبنتہ انسانوں کو اسے اپنانے کا حکم دیا۔ چنانچہ قرآن حکیم کی تعلیم ہے :

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ - (القرآن ۲۱: ۳۳)

ترجمہ : تحقیق تمہارے لیے اللہ کے رسول میں بہترین نمونہ ہے۔

تاریخ عالم اس بات پر شاہد ہے کہ معلمین اسلام نے فرائضِ تعلیم سنبھالنے سے پہلے اپنی
سیرت و کردار کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوہ حسنہ کے مطابق ڈھالا۔ پورے جذبے، شوق
اور مشن کے ساتھ اپنے فرائض منصبی کی انجام دہی کی۔ کمالِ خلوص، محنت اور جانفشانی اپنے تلامذہ
میں علم و ہنر کی جستجو اور تحقیق و اجتہاد کی تڑپ پیدا کی۔

(عہد حاضر میں اخلاق و کردار کی پستی اور سیرت و اعمال کی گراؤٹ کا تجربہ یہ کیا جائے تو معلوم

رہا کہ بہ حیثیت مجموعی اس کی تہ میں معلمین کا کردار پوشیدہ ہے۔ ان کی مقصد و مدعا سے لا پرواہی، سنت و جانفشانی سے پہلو تھی، طلبہ سے بے رغبتی وہ عوامل ہیں جن کا پر تو ان کے زیر تعلیم طلبہ کی ذاتِ شخصیت پر پڑتا ہے۔ جب تک معلمین اپنی سیرت و کردار اور اعمال و افعال کو اسوہ حسنہ کے مطابق میں ڈھالنے اور اپنے اعلا اخلاق اور عمدہ کردار کو طلبہ کے لیے نمونے کے طور پر پیش نہیں کرتے اس وقت تک قومی و ملی اخلاقی گراؤٹ کا رخ تعمیر و ترقی کی طرف نہیں موڑا جاسکتا۔

عہد نبوی کا نصاب تعلیم و تربیت

قرآن حکیم کی سورہ بقرہ، سورہ آل عمران اور سورہ جمعہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس دنیا میں تشریف لانے کے مقاصد اور آپ کی نبوت و رسالت کے فرائض منصبی بیان ہوئے ہیں۔ ان ہی مقاصد نبوت کے مطابق آپ نے امت مسلمہ کی تعلیم و تربیت فرمائی اور یہی بنیادی تعلیمی اصول عہد نبوی کا نصاب تعلیم و تربیت تھے۔

یہ نصاب تعلیم چار بنیادی اصولوں پر مشتمل تھا: (۱) تلاوت آیات (یتلوا علیہم آیاتک) (۲) تعلیم کتاب (یعلّمہم الکتاب)، (۳) تعلیم حکمت (والحکمتہ)، (۴) تزکیہ نفوس (ویزکیہم)

تلاوت آیات

سب سے پہلے اصول تلاوت آیات کو لیجیے: امام راغب اصفہانی تلاوت کے معنی بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں: والتلاوة تخص با تباع کتب اللہ المنزلة (ترجمہ: تلاوت اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل کردہ کتب کی اتباع کے لیے مخصوص ہے) اس کے ساتھ ہی تلاوت کا یہ معنی بھی ہے: یقال فی القرآن فی شئ اذا قرأته و جب علیک اتباعہ: (ترجمہ: قرآن حکیم کے متعلق کہا جاتا ہے کہ جب تو نے اس میں سے کچھ پڑھا تو تیرے اوپر اس کی اتباع واجب ہوگئی)۔

تلاوت سے مراد قرآن حکیم کے اوامر و نواہی، احکام و تعلیمات کی تلاوت، ان پر عمل کے نقطہ نظر سے کرنا ہے۔ تلاوت کے دو مفہوم ہیں:

- ۱۔ قرآن کے الفاظ کی حفاظت اور ان کا تقدس
- ۲۔ قرآن احکام و قوانین اور اخلاقی و روحانی تعلیمات کا اتباع،

اس سے ظاہر ہے کہ "یتلوا علیہما یتلک" کا مفہوم یہ ہوا کہ قرآنی آیات کو عام کیا جائے، انہیں نہایت دل سوزی کے ساتھ تلاوت کر کے ذہن نشین کیا جائے اور قلب در ذہن پر ان آیات کو نقش کیا جائے۔ ملک و معاشرے میں موجود ہر فکر و فلسفہ پر ان آیات کا غلبہ ہو، شعر و ادب پر قرآنی آیات کی چھاپ ہو، معاشرے میں تمام افکار و خیالات ان کے تابع ہوں اور انفرادی و اجتماعی زندگی میں ان کا چرچا ہو۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بعثت سے وصال تک مسلسل تلاوت آیات کی۔ آپ نے قرآنی آیات کو اس طرح تلاوت فرمایا کہ وہ روزمرہ کا موضوع بن گئیں۔ موافق و مخالف سب ان ہی کے متعلق گفتگو کرتے۔ آپ نے تلاوت کے ذریعہ سے قرآن کو انعام کر دیا کہ قبل از اسلام کا شعر و ادب دب کے رہ گئے۔ ہر جگہ اور ہر مقام پر قرآنی آیات کے مختلف پہلوؤں پر مباحث و مذاکرات ہونے لگے، حتیٰ کہ قبل از اسلام عرب تہذیب و ثقافت کا سرمایہ "سبع معلقات" بھی اپنی اہمیت کھو بیٹھا اور ان کی جگہ قرآنی آیات نے لے لی۔

آج اگر عہد نبوی کے نصاب تعلیم کے پہلے جزو "تلاوت آیات" پر مبنی ملک کے نظام تعلیم کو ترتیب دیا جائے تو نہایت صدق اور اخلاص کے ساتھ سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع میں "تلاوت آیات" کو نصاب تعلیم میں پوری پوری اہمیت دینی ہوگی۔ ایک مقررہ مدت کے اندر اندر ملک کے ہر فرد میں تلاوت آیات کی استعداد پیدا کرنا ہوگی۔ اس کا عملی طریق کار یہ ہو سکتا ہے کہ ہمارے نظام تعلیم کے درجہ ابتدائیہ (پرائمری) میں پورے قرآن ناظرہ کی تعلیم کو لازمی قرار دیا جائے تاکہ ملک کا ہر پرائمری پاس بچہ پورے قرآن حکیم کو ناظرہ کے طور پر پڑھنے کی استعداد رکھتا ہو۔ دوسرا بڑا کام یہ کیا جائے کہ قرآن حکیم کی بنیادی تعلیمات کا خلاصہ مختلف موضوعات کے تحت آسان اور عام فہم اردو زبان میں طلبہ کو پڑھایا جائے۔

تعلیم کتاب

عہد نبوی کے نصاب تعلیم کا دوسرا بڑا اصول تعلیم کتاب ہے۔ کتاب سے مراد اللہ تعالیٰ کی سب سے آخری وحی، کتاب اللہ، قرآن حکیم ہے۔ اس کی تعلیم سے مراد اس کے احکام، تعلیمات، ارشادات، ہدایات، اولم و نواہی کی تعلیم ہے۔ پوری کتاب کو سمجھنا، اس کے معانی و مفہیم کو جاننا۔ اس میں دیے گئے احکام کا علم حاصل کرنا، اس کی تعلیمات، ارشادات اور ہدایات کا فہم و ادراک پیدا کرنا اس کے اولم اور نواہی کو سیکھنا۔ تعلیم کتاب ہے۔ قرآن حکیم، خالق کی طرف سے مخلوق کے لیے آخری، مکمل، تمام و کمال، غیر متغیر، غیر متبدل، ابدی، سرمدی ہدایت

ہے۔ ہر انسان پر فرض ہے کہ وہ اسے پڑھے، اسے سیکھے اور اس کی تعلیمات پر عمل کرے۔
 تعلیم کتاب میں فرد سے زیادہ معاشرے پر ذمے داری عائد ہوتی ہے کہ وہ اس کا اہتمام کرے۔
 عام حالات میں ہر فرد کو خود بخود تعلیم کتاب کی اہمیت کا احساس نہیں ہوتا، اس لیے یہ معاشرے کا
 فرض ہے کہ وہ ایسا نظام تعلیم معرض وجود میں لائے جس کی بنیاد "تعلیم کتاب" پر ہو۔ قرآنی آیات کو
 پڑھنا اور ان کی تلاوت کرنا، تلاوت آیات ہے تعلیم کتاب سے مراد ان آیات میں دی گئی تعلیمات کو
 سیکھنا، انھیں جانتا اور ان پر عمل کرنا ہے یہ سب اسی صورت میں ممکن ہے کہ تلاوت کے علاوہ قرآنی
 آیات کا معنی اور مفہوم بھی سمجھا جائے۔

اس سے صاف ظاہر ہے کہ ملک و ملت کے ہر فرد کو اس کا اہل بنانا کہ وہ قرآن حکیم کی جملہ
 تعلیمات کو سمجھ سکے اسلامی معاشرے کا سب سے بڑا فریضہ ہے۔ اسلامی معاشرہ اپنے اس فریضے
 کو اپنی حکومت کی وساطت سے انجام دیتا ہے۔ لہذا مسلمانوں کی حکومت پر اس فریضے کی اصل
 انجام دہی عائد ہوتی ہے۔ حکومت تمام مسلمانوں کو "تعلیم کتاب" کا اہتمام اپنے نظام تعلیم کے ذریعہ
 سے کر سکتی ہے۔ حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے مبارک و مسعود عہد میں جو نصاب تعلیم ترتیب
 دیا تھا اس میں تعلیم کتاب ہی کو بنیادی، محوری اور مرکزی حیثیت حاصل تھی۔ آپ کی حکومت کے
 جملہ ذرائع و وسائل تعلیم کتاب کے لیے وقف تھے۔ سربراہ حکومت اور تمام اعیان و اعوان
 مملکت، تعلیم کتاب میں مصروف تھے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے خصوصی تربیت گاہیں برائے
 اساتذہ قائم فرمائیں۔ تربیت یافتہ اساتذہ کو ملک کے طول و عرض میں تعلیم کتاب کے لیے
 مامور فرمایا۔ مسجد سب سے بڑی درس گاہ قرار پائی۔ ملک کی تمام مساجد تعلیم کتاب کے لیے
 وقف تھیں، اور تمام مسلمانوں پر فرض تھا کہ وہ مسجد میں حاضر ہوں اور کتاب کا علم حاصل کریں۔
 آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور خلافت راشدہ کا نظام تعلیم ایک مثالی نظام تھا۔ اس نظام
 کے ذریعے سے ہر مسلمان میں اتنی استعداد پیدا کر دی گئی تھی کہ وہ اللہ تعالیٰ کے احکام، اس کی کتاب
 قرآن حکیم، کو پڑھ کر خود سمجھ سکتا تھا۔ کتاب اللہ کی اس وسیع پیمانے پر تعلیم کا نتیجہ یہ ہوا کہ
 مسلمانوں کی حکومت کے تمام شعبے خود بخود اسلامی سانچے میں ڈھلتے چلے گئے۔ معیشت، معاشرت،
 سیاست، عدالت، حکومت، تہذیب، تمدن، ثقافت تمام شعبے نہایت آسانی، دلی رغبت
 اور سہولت کے ساتھ اسلامی رنگ اختیار کرتے چلے گئے۔ تعلیم کتاب مسلمانوں کے اخلاق و کردار
 پر اثر انداز ہوئی اور مسلمان کتاب اللہ کی تعلیمات کے زیر اثر انسانیت کے لیے نمونہ بن گئے۔ ان
 کے اعمال، افعال، سیرت، کردار، تہذیب اور اخلاق انسانیت کے لیے معیار قرار پائے۔ اللہ تعالیٰ

کی کتاب کو سیکھنے کا یہ اثر ہوا کہ نظام حکومت کو چلانے والے عمال اور حکام دیانت، امانت، محنت اور خدمت کا شاہکار بن کر سامنے آئے۔ عوام صدق، خلوص، ایثار، ہمدردی، اخوت، محبت، اتحاد و اتفاق کا مجسمہ بن کر ساری انسانیت کے سچے محسن و غمخوار ثابت ہوئے۔ شر، فحش و منکر مغلوب ہو گئے اور خیر، معروف، صلاح، فلاح غالب ہو گئے۔ بزودی، چوری، دہشت، فریب، مکاری، عیاری کی جگہ شجاعت، اولوالعزمی، بلند ہمتی، عزم صمیم، صدق اور خلوص ایسے صفات اسلامی معاشرت کا طرہ امتیاز قرار پائے۔ یہ وہ نتائج ہیں جو صرف ایک درست قدم سے برآمد ہوئے اور یہ درست قدم "تعلیم کتاب" کو نظام تعلیم کا مرکز قرار دینا تھا۔

"تعلیم کتاب" کو موجودہ نظام تعلیم میں رائج کرنے کی یہ صورت ہو سکتی ہے کہ درجہ ثانویہ (میٹرک) تک اسے لازمی قرار دیا جائے۔ ان پانچ سالوں میں "تعلیم کتاب" کو نصاب کا حصہ اس طرح بنایا جائے کہ میٹرک پاس کرنے تک ہر طالب علم لازمی طور پر پورے قرآن مجید کا ترجمہ سیکھ جائے اور قرآن کی بنیادی تعلیمات کو پوری طرح سمجھ جائے۔ جس طرح حصہ پرائمری میں پورا قرآن ناظرہ پڑھا دیا جائے۔ اسی طرح حصہ میٹرک میں پورے قرآن کا ترجمہ سکھا دیا جائے۔

تعلیم حکمت

قرآنی نصاب تعلیم و تربیت کا تیسرا بڑا اصول تعلیم حکمت (والحکمة) ہے۔ امام مالک نے فرمایا حکمت سے مراد دین کی معرفت، اس کی فقہ اور اس کی اتباع ہے۔ امام شافعی نے نزدیک حکمت سے مراد سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔ امام رازی نے فرمایا کہ کتاب سے مراد قرآنی احکام ہیں اور حکمت سے مراد ان احکام و شرائع کی حکمت اور ان میں انسانیت کے لیے مصالح و منافع کا بیان ہے۔ ان ائمہ مجتہدین و مفسرین کی آرا سے ظاہر ہوتا ہے کہ قرآنی نصاب تعلیم کا اصول — "والحکمة" — ایک نہایت جامع اصطلاح ہے جس میں وہ تمام علوم سمٹ آتے ہیں جن کا تعلق کتاب و سنت کی تعلیمات سے ہے۔ کتاب و سنت کی تعلیمات پر ایک سرسری نظر سے یہ بات واضح ہو جائے گی کہ دینی و دنیاوی امور پر مشتمل ہر وہ چیز جو دنیا و آخرت میں انسانیت کے لیے فائدہ مند اور نفع بخش ہے ان تعلیمات میں موجود ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ حکمت اسرارِ رموز دین الہی کی گرہ کشائی بھی ہے اور کتاب و سنت کی تعلیمات سے موافق اور ان کے مطابق تمام علوم و فنون بھی ہیں۔ یہ بات اور بھی زیادہ واضح ہو جاتی ہے جب سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا وقت نظر سے مطالعہ کیا جائے۔ آپ کے ارشادات، فرمودات، تقاریر، اقوال، افعال و اعمال

پر غور کیا جائے تو ظاہر ہوتا ہے کہ آپ نے "المدین یس" کی بڑی تلقین فرمائی۔ اور ساتھ ہی انسانیت کی فلاح و بہبود کا خیال فرمایا۔ حکومت، عدالت، قانون، تعلیم، معاشرت، معیشت، سیاست، تہذیب، تمدن، اخلاق، کردار، سیرت کی تشکیل و تعمیر میں آپ نے جو کچھ فرمایا اور جو کچھ کیا وہ حکمت کی عمدہ تفسیر ہے۔ "والحکمة" چونکہ نظام تعلیم کی بنیاد ہے اس لیے اسے نظام تعلیم میں اس طرح ترتیب دیا جائے کہ حکمت قرآن و سنت پوری طرح اجاگر ہو۔

"حکمت" قرآن حکیم کی بڑی جامع اصطلاح ہے جس سے بالعموم امرار و رموز شریعت مراد لیے جاتے ہیں۔ فقہ اسلامی میں "حکم" کی علت بیان کی جاتی ہے جو اس کی حکمت ہوتی ہے۔ حکمت روح دین و اسلام ہے اسے موجودہ نظام تعلیم میں بی۔ اے، بی۔ ایس۔ سی تک لازمی طور پر پڑھایا جائے۔ تاکہ ڈاکٹر انجینئر، ماہرین معاشیات، سیاسیات، معاشرت، عدالت اور تعلیم حکمت دین سے پوری طرح سرشار ہو کہ دنیا میں پھیل جائیں۔ قرآن کی تعلیمات کی غایت اور ان کی روح پر مبنی نصاب تیار کیا جائے جس میں اسلامی عقائد، عبادات اور معاملات کی حکمت اور ان کا فلسفہ بیان کیا جائے، تقابل ادیان، تقابل قوانین اور تقابل افکار و نظریات کی تعلیم کے ذریعہ سے اسلام کی حقانیت اور فوقیت ثابت کی جائے۔ مخالفین کے پیدا کردہ شکوک و شبہات کا ازالہ کیا جائے اور صدق و یقین کی دولت سے طلبہ کو مالا مال کیا جائے۔ اس سلسلے میں غزالی، ابن تیمیہ، شاہ ولی اللہ اور اقبال و دیگر مفکرین اسلام نے حکمت دین کے بیان میں جو خدمات انجام دی ہیں ان کی روشنی میں لاکھ عمل مرتب کیا جائے۔

تزکیہ نفس

اسلامی نظام تعلیم و تربیت کا جو تھا بنیادی اصول تزکیہ نفس ہے (وینز گیتھم)۔ تعمیر سیرت و کردار میں تزکیہ نفس کو محوری حیثیت حاصل ہے۔ اذہان و قلوب کی تمام اخلاقی بیماریوں نیتوں اور ارادوں کے تمام فسادات کا علاج تزکیہ نفس ہے۔ سرکاری، عدالتی، تعلیمی، سیاسی، معاشرتی، جملہ امراض اور ان کے انسداد و تدارک کا واحد حل تزکیہ نفس ہے۔ عہد رسالت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک انتہائی گمراہ، بد عنوان اور حیوانی صفات و اوصاف کی حامل قوم کو تزکیہ نفس کے ذریعہ سے دنیا کی سب سے بڑی با اخلاق، مہذب، متمدن اور صاحب سیرت و کردار قوم بنا دیا تھا۔ خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم نے اسلام کے نظام تعلیم اور اس کے بنیادی اصول، تزکیہ نفس کی بدولت ایران، عراق، شام، فلسطین، مصر، شمالی افریقہ کے انسانوں کو انسانیت سکھائی اور بعد کے ادوار میں یہ سلسلہ پوری دنیا میں پھیلتا چلا گیا۔

تزکیہ نفس کو نظام تعلیم کا حصہ کیسے بنایا جائے؟ یہ ایک اہم سوال ہے۔ تزکیہ نفس کا عمل نظام تعلیم کے تمام مدارج کا لازمی جز ہونا چاہیے۔ قرآن حکیم کا یہ اعجاز ہے کہ جو لوگ سمجھے بغیر بھی اس کی تلاوت کرتے ہیں وہ بھی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ اور جو لوگ قرآن مجید کو ترجمہ کی مدد سے پڑھتے ہیں وہ تو یقیناً اس کا واضح اثر قبول کرتے ہیں۔ مگر تزکیہ کا تعلق علم و تعلیم کے بجائے عمل سے زیادہ ہے۔ تلاوت اور تعلیم کتاب و حکمت کا تعلق تو زیادہ تر تدریس سے ہے مگر تزکیہ کا تعلق خالصتاً عمل سے ہے۔ تزکیہ نفس میں معام کی ذات، سیرت و کردار اور نمونہ عمل کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ استاد ایک طرف قرآنی تعلیمات کی تدریس کے فرائض انجام دے اور دوسری طرف ان تعلیمات کا عملی مجسمہ بن کر اپنی سیرت و کردار کے اعلا، عمدہ اور پاکیزہ نقوش طلبہ کے صاف اذہان و قلوب پر ثبت کرے۔ قرآن حکیم میں تطہر اور تزکیہ کی اصطلاحات ساتھ ساتھ بیان ہوئی ہیں تطہر کا مفہوم ہے رذائل سے پاک کرنا، اور تزکیہ کا مطلب یہ ہے کہ فضائل سے آراستہ کرنا۔ رذائل سے پاکیزگی اور فضائل سے آراستگی معلم کے فرائض منصبی کا لازمی جز ہے۔ تزکیہ نفس کا مطلب ترک دنیا ہرگز نہیں۔ تزکیہ نفس کی افضل و اکمل ترین مثال آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ جتنی بھر پور زندگی آنحضرتؐ نے گزاری اس کی مثال تلاش کرنا دشوار ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں کو حضورؐ کی زندگی ہی کو اسوہ حسنہ قرار دینے کا حکم دیا گیا ہے۔

تربیت گاہیں

عہد نبوی کے نظام تعلیم و تربیت کا جو اجمالی خاکہ پیش ہوا اور اس کی روشنی میں موجودہ نظام تعلیم کی ترتیب و تدوین نو کے لیے جو تجاویز پیش ہوئیں ان پر عمل کی صورت میں آئندہ نسل کے اخلاق و کردار کی اصلاح کی توقع کی جاسکتی ہے۔ مگر موجودہ نسل کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ دوسری اہم بات یہ ہے کہ اس طرز پر مدونہ و مرتبہ نظام تعلیم کے لیے اساتذہ کہاں سے میسر آئیں؟ انہی تقاضوں کے پیش نظر یہ تجویز ہے کہ اس نظام کا نقطہ آغاز تربیت گاہیں قرار دی جائیں۔ اس وقت ہر درجہ تعلیم میں تعیناتی سے قبل اساتذہ کو تربیت قبل از ملازمت دی جاتی ہے۔ اگر ان تربیت گاہوں کو فعال بنا کر ان کے نظام تعلیم و تربیت کو دینی و ملی تقاضوں سے ہم آہنگ کر دیا جائے تو ایک مختصر مدت میں مطلوبہ معیار و قابلیت کے اساتذہ ہر سطح تعلیم کے لیے میسر آ سکتے ہیں۔

اس مقصد کا حاصل کرنا تین اہم امور پر منحصر ہے: — اول تربیت گاہوں کو تعلیم گاہوں

پر ترجیح دی جائے۔ قابل ترین، دیانت دار، محنتی، جوش عمل اور عقیدہ سے سرشار اساتذہ
 کو تربیت گاہوں میں مقرر کیا جائے۔ اس صورت میں اگر ایسے اساتذہ کو زیادہ سے زیادہ
 مراعات بھی دینی پڑیں تو ان سے دریغ نہ کیا جائے تاکہ وہ پوری دلچسپی کے ساتھ مستقبل کے
 اساتذہ کی تربیت کے فرائض انجام دے سکیں۔ دوم: نصاب تعلیم و تربیت میں کتاب و
 سنت کی تعلیمات کو مرکزی و محوری حیثیت دی جائے۔ انھیں مغربی فکر و فلسفہ کی ذیل کی حیثیت
 حاصل نہ ہو۔ سوم: تربیت اساتذہ پر مامور معلمین کے انتخاب میں جہاں ان کی فنی مہارت، علمی
 قابلیت، محنت اور جانفشانی کا پورا پورا لحاظ رکھا جائے وہاں ان کے خود تزکیہ نفس پر عمل پیرا
 ہونے اور اسوہ حسنہ کو عملی طور پر اپنانے کو بھی لازمی شرط قرار دیا جائے۔

”اُسُوۃٌ رَّحِمَةٌ لِّلْعَالَمِیْنَ“ خَلْقٌ عَظِیْمٌ

جناب محترم ڈاکٹر نصیر احمد ناصر

آپ اہل علم و نظر اور نکتہ ور و نکتہ سنج ہیں۔ میرے مقالے کا عنوان سنتے ہی سمجھ گئے ہوں گے کہ میرا مافی الضمیر کیا ہے۔ اور میں کیا کہنا چاہتا ہوں! لیکن پھر بھی میں اپنے مقالے کے عنوان سے متعلق دو ایک تصریحات پیش کرنے کی اجازت چاہتا ہوں:

سب سے پہلے میں اس نکتے کی صراحت کر دینا چاہتا ہوں کہ میں نے ”اُسُوۃٌ رَّسُوْلٌ“ کے بجائے ”اُسُوۃٌ رَّحِمَةٌ لِّلْعَالَمِیْنَ“ کو کیوں ترجیح دی؟ اس کا مختصر اور سیدھا سادہ جواب یہ ہے کہ میں اس حقیقت پر زور دینا چاہتا ہوں کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بلاشبہ اللہ تعالیٰ کے نبی اور رسول ہیں۔ آپ بلاشبہ خاتم النبیین و سید المرسلین ہیں اور بلاشبہ آپ کی سیرت طیبہ ہی میں حسین کامیاب انفرادی و اجتماعی زندگی بسر کرنے کا حسین نمونہ ہے۔ جیسا کہ رب علیم و حکیم کا ارشاد ہے:

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ (القران ۲۱، ۲۳)

لیکن آپ بحیثیت رسول اللہ، رحمتہ للعالمین تھے اور ہیں، لہذا آپ کے اسوۃ حسنہ کی حقیقت رحمتہ للعالمین ہے، اور اس حقیقت و واقعیت کو خود اللہ جل شانہ نے انتہائی قطعیت اور معجز نما ایجاز بلاغت سے اس طرح بیان فرمایا ہے:

وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا رَحْمَةً لِّلْعَالَمِیْنَ (القران ۲۱: ۱۰۷)

لہذا جب میں اسوۃ رحمتہ للعالمین کہتا ہوں تو اس سے اس حقیقت کا اظہار و اعتراف مقصود ہوتا ہے کہ پیغمبر اعظم و آخر صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۃ حسنہ کو اگر ایک لفظ میں بیان کرنا ہو تو وہ ہے ”رحمتہ للعالمین“ نیز میں اس حقیقت پر بھی زور دینا چاہتا ہوں کہ لفظ ”رحمتہ للعالمین“ کی تنگنائے میں قرآن حکیم کے فلسفہ اخلاق کا دریائے ناپید کنارہ مضمحل ہے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ جس رب علیم و حکیم نے یہ فرمایا کہ آپ رحمتہ للعالمین ہیں، اسی کا ارشاد ہے کہ آپ صاحب خلق عظیم ہیں:

وَإِنَّكَ لَعَلَىٰ خُلُقٍ عَظِیْمٍ (القلم ۶۸: ۴۲)

اس سے ثابت ہوا کہ رحمتہ للعالمین اور خلق عظیم ایک ہی حقیقت کی دو تعبیریں ہیں اور دونوں

لازم و ملزوم ہیں، نیز آپ کا اسوۂ حسنہ رحمۃ للعالمین یا خلق عظیم ہے۔ اس تمہید سے اس امر کی بھی توضیح و توجیہ ہو جاتی ہے کہ میں نے کیوں اپنے مقالے کا عنوان: اسوۂ رحمۃ للعالمین ”خلق عظیم“ رکھا ہے۔ اب ہمیں یہ معلوم کرنا ہے کہ ”رحمت للعالمین“ کا معنی و مفہوم کیا ہے؟ یہ مصطلح قرآن حکیم کی ان مصطلحات میں سے ہے جنہیں ہم ان کی معجز نما معنویت و بلاغت کے باعث ”اعجازات قرآن“ سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ بہر حال ائمہ لغت اور مفسرین کے نزدیک ”رحمت“ ایسی رقت و سعادت اور عواطف شفقت و محبت سے عبارت ہے جن میں احسان بھی شامل ہو، اور احسان اسی حسنہ خیر اور حسن سلوک کو کہتے ہیں جس سے وہ شخص یا اشخاص خوش ہو جائیں جن سے احسان کیا جائے۔ رحمت کا مفہوم معلوم کرنے کے بعد اب ہم لفظ ”عالمین“ پر غور کرتے ہیں، جیسا کہ آپ جانتے ہیں، عالمین عالم کی جمع ہے، جس کا ترجمہ عموماً جہان کیا جاتا ہے۔ عالم بے شمار ہیں، جن میں سے چند ایک یہ ہیں: عالم انسانی، عالم حیوانی، عالم نباتاتی، عالم جماداتی، عالم بحری، عالم فضائی، عالم سمادی اور عالم زمانی وغیرہ۔ حیات و موت کے ان عوالم کے مدار ایک عالم بیکراں اور بھی ہے۔ جسے قرآن مجید نے دارالآخرت اور الجحیران کے ناموں سے موسوم کیا ہے۔ الجحیران جیسا کہ اس کے نام سے مترشح ہے ”حیات محض“ کا عالم ہے، یعنی اس میں زندگی تو ہوگی مگر موت نہ ہوگی۔ اس کے پھر دو عالم ہیں: جنت اور جہنم۔ اہل جنت لذت موت سے نا آشنا حیات محض کی لذت سے سرشار سدا عالم کیف دسور میں رہیں گے۔ برخلاف اس کے اہل جہنم لذت حیات و ممات سے نا آشنا، عالم سکرات میں رہیں گے۔ قرآن مجید کی زبان میں وَلَا یَمُوتُ بِہَا

دَلَا یَمُوتُ (۲۰: ۷۷، ۸۴: ۱۳)

جہاں تک خود فرد بشر کا تعلق ہے، اس کے دو عالم ہیں: ایک معرضی دوسرا موضوعی۔ معرضی عالم اس کا معاشرتی جہان ہے، جس میں وہ دوسرے لوگوں کے ساتھ زندگی بسر کرتا ہے۔ لیکن اس کا ایک اور جہان بھی ہے، جسے موضوعی یا داخلی عالم سے تعبیر کرتے ہیں، یہ اس کی اپنی دنیا ہوتی ہے، یہ اس اعتبار سے کہ وہ اس کی خود تعمیر و تشکیل کرتا ہے۔ اور اس میں اسی طرح رہنے اور زندگی بسر کرنے پر مجبور ہے۔ جس طرح معاشرتی دنیا میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ پیغمبر اعظم و آخر علیہ وآلہ وسلم ان تمام جہانوں کے لئے ”رحمت“ ہیں۔

یہاں اس لطیف نکتے کی طرف دناحتی اشارہ کر دیا جاتا ہے کہ رب رحمن و رحیم نے یہاں یہ مہین فرمایا کہ آپ رحیم ہیں بلکہ یہ فرمایا کہ آپ رحمت ہیں۔ سوال پیدا ہوا کیوں؟ اس کی علت غائی یہ ہے کہ رب جمیل و جلیل اس حقیقت پر زور دینا چاہتا ہے کہ آپ اس غایت درجہ رحیم ہیں کہ آپ کی ذات و خلق میں ”رحمت“ کے سوا کوئی ایسی بات ہے ہی نہیں جو رحمت کے منافی ہو یا اس زمرے میں نہ آتی ہو۔ یہ بات اہل علم و نظر سے پوشیدہ نہیں کہ قریب قریب ہر زبان کا یہ محاورہ ہے کہ کسی موصوف کی تعریف بدرجہ اتم بلکہ مبالغہ کی حد تک مقصود ہو، تو اسے اس کی صفت سے موصوف کرنے کے بجائے محض صفت سے تعبیر کرتے ہیں۔ مثلاً یہ کہنے کے بجائے کہ نلاں شخص

بے حد حسین ہے، یہ کہتے ہیں کہ ”وہ حسن“ ہے اس سے اس امر کی توجیہ و توضیح ہو جاتی ہے کہ کیوں رب رحمن و کریم نے آپ کو ”رحمت“ کہا۔ پھر یہ بھی نہیں فرمایا کہ آپ رحمت عالم ہیں، یعنی صرف عالم انسانی کے لئے رحمت ہیں، بلکہ یہ فرمایا کہ آپ جملہ مخلوقات اور جہانوں کے لئے رحمت ہیں، یعنی رحمۃ للعالمین ہیں۔ اس سے مقصود اس حقیقت پر زور دینا ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نہ صرف بنی نوع انسان، بری، بحری، فضائی جانوروں اور نباتاتی، جماداتی، سماوی عوالم بلکہ جملہ مخلوقات کائنات کے لئے رحمت ہیں۔ بالفاظ دیگر، اللہ تعالیٰ کی جملہ مخلوقات آپ کے عالمگیر و ہمہ گیر اخلاق حسنہ یا خلق عظیم سے مستفید و مستفیض ہو رہی ہے اور قیامت تک ہوتی رہے گی۔ اصل یہ ہے کہ رحمۃ للعالمین اس حقیقت کی آئینہ دار ہے کہ آپ ہر عالم اور اس کی مخلوقات کے لئے محبت ہی محبت، شفقت ہی شفقت اور احسان ہی احسان ہیں اور یہ بات آپ اہل علم و بصیرت جانتے ہیں کہ ”محبت“ کو خلوص و صدق اور قربانی و وفا، شفقت کو ہمدردی و غم گساری، حلم و بردباری اور عفو و درگزر اور ”احسان“ کو فلاح و بہبود، حسنہ و خیر، جو د و سخا اور حسن سلوک و ایثار مستلزم ہیں۔

نہ صرف تاریخ، کتب احادیث و سیر بلکہ خود کلام الہی آپ کی سیرت حسنہ کی اس ماہیہ الامتیاز خصوصیت کا شاہد ہے کہ آپ جس طرح رحمۃ للعالمین تھے اسی طرح صاحب خلق عظیم بھی تھے۔ آگے بڑھنے سے پہلے اس لطیف داہم نکتے کی صراحت کر دی جاتی ہے کہ خلق اس خیر حسنہ یا نیکی سے عبارت ہے، جو طبعی و اضطراری ہونے کے ساتھ ساتھ ارادی و اختیاری اور شعوری بھی ہو۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ حسن نیت و شعور کے بغیر نیکی حقیقت میں نیکی نہ ہوگی۔ علاوہ بریں خلق بھی رحمت کی طرح ایسا لفظ ہے جسے گنہگار معافی کہیں تو مبالغہ نہ ہوگا، اور اس میں خصلت و عادت، قول و فعل اور رویہ و کردار کا مفہوم پایا جاتا ہے۔ اس اعتبار سے اِنَّكَ لَعَلَىٰ خُلُقٍ عَظِيمٍ کا مطلب ہوگا کہ آپ کی خصلت و عادت، قول و فعل اور رویہ و کردار میں حسن بدرجہ اتم پایا جاتا ہے۔ چنانچہ حسن کے باعث ہی آپ کے محاسن یا مکارم اخلاق میں لا محدود عظمت و رفعت اور لامتناہی آفاقیت و ہمہ گیری پائی جاتی ہے بالفاظ دیگر، آپ کا حسن خلق آپ کی رحمت کی طرح کل عوالم کو محیط تھا۔

پیغمبر اعظم و آخر اور رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ کے ایک ایک گوشے کا مشاہدہ بالحق کیجئے، آپ لا محالہ اس نتیجے پر پہنچیں گے کہ حضور اکرم بلاشبہ حامل خلق عظیم اور رحمۃ للعالمین تھے اور اپنی تعلیمات، حکمت آموزی اخلاق آفرینی، سنت حسنہ اور تبریک رحمۃ للعالمین کے باعث آج بھی رحمۃ للعالمین ہیں اور اب لا باء تک رحمۃ للعالمین رہیں گے۔ وجہ یہ ہے کہ آپ کی زندگی میں سچ تھا، جھوٹ نہ تھا، حسن تھا، قبح نہ تھا، عدل تھا ظلم نہ تھا، صدق و اخلاص تھا، کذب و نفاق نہ تھا، شفقت و محبت تھی، حسد و عداوت نہ تھی، حلم و رحم تھا، غصہ و انتقام نہ تھا، ہمدردی و غم گساری تھی، تغافل و جفا کاری نہ تھی، انکساری و تواضع تھی، غرور و تکبر نہ تھا، سعادت و رفعت تھی، قسوت و شقاوت نہ تھی، احسان و ایثار تھا، حسد و بغل نہ تھا، شیریں کلامی تھی، تلخ کلامی نہ تھی، صبر و استقامت تھی، کم ہمتی و ناشکیبائی نہ تھی، بشاعت

تھی بزدلی نہ تھی، الغرض، آپ کی سیرت حسنہ جملہ محاسن و محارم اخلاق سے اس طرح مزین تھی کہ تاریخ کا فیصلہ یہ ہوا کہ آپ نہ صرف عالم انسانی بلکہ سب جہانوں کے لئے رحمت تھے، ہیں، اور ہمیشہ رحمت رہیں گے۔

تاریخ ہمیں بار بار اس حقیقت کی یاد دلاتی ہے کہ آپ اس قدر فیاض و سخی تھے، مخیر و محسن تھے کہ آپ کے پاس جو کچھ ہوتا اہل احتیاج میں تقسیم کر دیتے۔ چنانچہ آپ نے نہ صرف اپنی متاع بلکہ اپنی مالدار زوجہ مطہرہ، حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی دولت بھی پہلے رہا ہی کاموں اور پھر تحریک اسلام پر صرف کر دی۔ بعثت سے پہلے مکہ مکرمہ میں دو مرتبہ اتنا سخت قحط پڑا کہ بقول شیخ سعدی ”یاراں فراموش کر دند عشق“ آپ نے قحط زدہ لوگوں کی حالت زار دیکھی نہ جاتی تھی اور آپ نے دونوں مرتبہ ہزاروں درہم و دینار بلکہ جو کچھ آپ کے پاس تھا، ان میں تقسیم کر دیا، لیکن اس شعر بلکہ حقیقت کے مصداق کہ

جان دی، دی ہوئی اسی کی تھی

حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا،

آپ کا قلب سعید، جو معمورہ رحمت تھا، اپنی غایت درجہ جو د و سخا اور اثار و قربانی پر نہ مطمئن ہو سکتا تھا اور نہ ہوا کیونکہ اس کی حقیقی آرزو تو یہ تھی کہ نہ صرف عرب بلکہ کل دنیا میں نہ بھوک و پیاس رہے نہ فلاکت و احتیاج، کوئی بے گھر نہ رہے نہ بے کار، کوئی کسی کا محکوم و غلام نہ رہے اور نہ محتاج و دست نگر، نہ کوئی مظلوم و بے کس رہے نہ مقہور و مغضوب، ساری دنیا میں نہ ظلم و جہل رہے نہ شرک و بت پرستی۔ الغرض کسی انسانی معاشرہ میں نمود نہ رہے نہ آرزو، فرعون و ہامان رہیں نہ قارون و ابو جہل رہیں نہ ابو لہب۔

آپ مسلسل اس مسئلے پر تفکر بالحق کرتے رہے کبھی خانہ کعبہ میں تو کبھی خلوت کدہ خانہ میں اور آخر کار اس مسئلے کو حل کرنے کی طلب و جستجو آپ کو تنگنائے غار حرا میں لے گئی۔ آپ کی یہ طلب و جستجو دراصل صرف اہل عرب یا افراد نسل انسانی کے لئے نہیں بلکہ کل جہانوں کے لئے رحمت تمام بننے کی آرزو تھی۔ بالفاظ دیگر یہ ایک عالم گیر و ہمہ گیر اور حسین و منور انقلاب کی آرزو تھی، جو وہ اولاد آدم کے دلوں میں پیدا کرنا چاہتے تھے تاکہ وہ خود آگاہ و خدا آگاہ بن جائیں اور شرک و بت پرستی سے نکل کر توحید کی روشنی میں آجائیں اور اس طرح اپنے وقت کے نمودوں، آرزوں، فرعونوں، ہامانوں اور قارونوں کی غلامی و محکومی سے نکل کر مکرم و آزاد زندگی گزار سکیں۔ نیز نہ صرف اپنی ذات، اپنے اہل و عیال، اپنی قوم و ملت اور نوزاع انسانی کے لئے بلکہ جملہ مخلوقات کے لئے رحمت بن جائیں۔

آپ کی آرزو سچی تھی اور رب العالمین کی حسین مخلوقات کی دنیوی و اخروی زندگی کو حسین تر بنانے کی حسین آرزو تھی اور پھر جس رب حکیم و علیم نے آپ میں رحمتہ للعالمین بننے کی استعداد بھی بدرجہ اتم و دلالت کی تھی، اسی نے آپ کی آرزو پوری کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اور آپ کو نبوت و رسالت کے حسن المقام پر متمکن کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی آپ کو اس حقیقت نفس الامری سے آگاہ کر دیا کہ۔

وما ارسلنا الا رحمة للعالمين (۲۱: ۲۱۰) اور انک لعلی خلق عظیم (۴۸: ۱۳)

لہذا آپ کی سیرت حسین ترین نمونہ یا ماڈل ہے اور اب آپ کا فریضہ رسالت و نبوت اسلام کی تحریک رحمتہ للعالمین کو چلانا ہے کہ وہ قیامت تک چلتی رہے، اگرچہ اسلام کی روح توحید میں خود ایسی قوت جمال و جلال ہے جو اسے ابد تک محرک رکھنے کے لئے کافی ہے۔

ساتھ ہی ربّ علیم و حکیم نے رحمتہ للعالمین کی رہنمائی کے لئے قرآن مجید ایسی معجز نما زندہ جاوید کتاب کی منزل کا سلسلہ شروع کر دیا جو نور و ہدایت اور رشد و شفا ہے، نیز جو علم و حکمت اور عرفان و معرفت کا سرچشمہ ہے اور اس میں قلب انسانی کا تزکیہ و تصفیہ اور اس کی خداداد و معجز نما قوتوں کا نشو و ارتقا کرنے کی تاثیر حسن بھی ہے۔ بالفاظ دیگر، یہ آخری و محفوظ کلام الہی اپنے مخلص و متقی تلامذہ کے اخلاق کی تعمیر و تحسین اور تکمیل بھی کرتا ہے۔ یہاں اس از بس اہم نکتے کی صراحت کر دی جاتی ہے کہ اسلام محض ایک دستور حیات نہیں بلکہ تحریک بھی ہے اور اس کے باقی رحمتہ للعالمین کے حوالے سے تحریک رحمتہ للعالمینی ہے، جس سے کل عوالم کی مخلوقات نے ابد تک مستفید و مستفیض ہونا ہے۔

علاوہ ازیں، حامل خلق عظیم کی نسبت سے اگر اسلام کو تحریک اخلاق سے تعبیر کریں تو بے جا نہ ہوگا۔ اسلام میں حسن خلق کو غیر معمولی اہمیت حاصل ہے۔ جس کا اندازہ اس امر سے لگایا جاسکتا ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حسن خلق کو مومن کی بنیادی صفت قرار دیا ہے۔ لہذا رحمتہ للعالمین نے سب سے پہلے لوگوں کے اخلاق کی تعمیر و تزئین کرنے کی خاطر انہیں ایمان و توحید کی دعوت دی اور ان پر توحید کی حقیقت آشکارا کی تاکہ وہ خود آگاہ و خدا آگاہ بن جائیں، شرک و بت پرستی کی ناپکیوں سے نکل کر حسن و حق کی روشنی میں زندگی بسر کریں اور اپنے دشمن ازلی و پیدائشی، شیطان الرجیم کو پہچانیں اور اس کی محکومی و غلامی سے محفوظ رہ سکیں۔ صرف فرعون و ہامان، قارون و لولہب، نمرود و آزر اور عبداللہ بن ابی اور مسلمہ کذاب ہی تو شیطان کے بہکائے ہوئے نہیں بلکہ ہر زمان و مکان میں دینی و سیاسی احوال و ظروف کے مطابق اپنے آپ کو مختلف اسماء و القاب سے موسوم کر کے اور محافظ دین و ملک کا خرقہ سالوس پہن کر شیطان کے بہکائے ہوئے لوگ کارزار حیات میں نمودار ہوتے رہتے ہیں۔

اگر یہ کہا جائے کہ اسلام کی تحریک رحمتہ للعالمینی کا اصل الاصول توحید ہے تو یہ مبالغہ نہیں بلکہ حقیقت کا اظہار و اعتراف ہوگا جو قرآن و سنت سے ثابت ہے۔ توحید ہی اصل دین و ایمان ہے اور اس میں اپنی نوعیت کی ایسی قوت جلال و حق ہے، جس کی حریف کوئی باطل قوت نہیں ہو سکتی۔ علاوہ ازیں، اس میں دیگر تمام ادیان پر غالب آجانے اور اقوام عالم میں اتحاد و ایتلاف پیدا کرنے کی قوت حسن ہے۔ یہ عقیدہ توحید ہی تو ہے جس سے انسان میں حیرت انگیز فطری قوتوں کا شعور اپنی پوری شدت سے بیدار ہوتا ہے، ان قوتوں ہی کی بدولت وہ ایک طرف کائنات کی تسخیر کر سکتا ہے اور دوسری جانب اپنے نوردات اور مکارم اخلاق کی تکمیل کر کے احسان و رضوان کے حسن المقام پر متمکن ہو سکتا ہے جو کہ معراج انسانیت ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ عقیدہ توحید کو اپنی ذات میں جذب کر کے اس کے مطابق زندگی بسر کرنا ہی اصل دین ہے۔ یہی صبغۃ اللہ

یاد رنگ الہی ہے اور رنگ الہی میں اپنے آپ کو رنگ نگنے کا مطلب تخلق و اخلاق اللہ ہے۔ یعنی اپنے اندر صفات الہیہ پیدا کر دے، جنہیں محاسن و مکارم اخلاق سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ یہ نکتہ یاد رکھنے کے قابل ہے کہ شخصیت انسانی پر رنگ الہی جس قدر چڑھا ہوگا اسی قدر خلق انسانی میں وسعت و گہرائی اور رفعت و عظمت کی نمود ہوگی۔ اگر ہم یہ کہیں کہ پیغمبر اعظم و آخر صلی اللہ علیہ وسلم کی تحریک رحمتہ للعالمین کا مقصد افراد نسل انسانی کو رنگ الہی میں رنگنا یا بالفاظ دیگر خلق انسانی کی تعمیر و تحسین کر کے اسے عظیم بنانا ہے تو یہ بالغر نہیں، اظہار حقیقت ہوگا۔ چنانچہ جیسا کہ تاریخ بلکہ قرآن حکیم اور احادیث طیبہ سے ثابت ہے، آپ نے جب اسلام کی تحریک رحمتہ للعالمین کو انتہائی ناسازگار حالات میں انتہائی کامیابی کے ساتھ چلا کر اپنے رسالتی مشن کی تکمیل کر دی اور اپنی تحریک کے ہزاروں رفقاء کے ساتھ کار کو رنگ الہی میں رنگ دیا، بالفاظ دیگر ان کے مکارم اخلاق کی تکمیل کر دی اور انہیں اس قابل بنا دیا کہ وہ آپ کے مشن یا تحریک رحمتہ للعالمین کو کامیابی کے ساتھ جاری رکھ سکیں، تو آپ اپنے ان ہزاروں صحابہ کرامؓ کے ساتھ حجۃ الوداع کا فریضہ ادا کرنے میں ان عرفات میں اپنے اللہ جمیل و رب جلیل کے حضور حاضر ہوئے۔ اہل ہمدان کی لبیب اللہم لبیب کی ایمان افروز و روح پرور صدائوں سے فغا گونجنے لگی اور آسمان سے نور و رحمت کی بارش ہونے لگی تو آپ نے یہ ندائے فردوس گوش سنی:

اليوم اكملت لکم دینکم و اتممت علیکم نعمتی و رضیت لکم الاسلام دیناً (۲:۵)

ترجمہ: آج کے دن ہم نے تمہارے لیے دین کی تکمیل کر دی اور ہم نے تم پر اپنی نعمت پوری کر دی۔ یہ ندائے روح پرور آپ کے معبود و محبوب اور مطلوب و مقصود رب العالمین کی تھی اور اس میں یہ نوید جاں نزا مضمون تھی کہ مبارک ہو آپ نے اپنا رسالتی مشن پورا کر لیا ہے اور آپ نے مکارم اخلاق کی تکمیل کر دی ہے لہذا اب آپ کے بعد آپ کے صحابہ کرامؓ اور ان کے بعد فرزند ان توحید آپ کے مشن یعنی اسلام کی تحریک رحمتہ للعالمین کو جاری رکھیں گے اور یہ ہمیشہ قیامت تک چلتی رہے گی۔

ان مباحث کی روشنی میں ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ اپنے اخلاق کی تعمیر و تکمیل اور تطہیر و تحسین کرنا اور آپ کی تحریک رحمتہ للعالمین کو چلانا ہی مقصود قرآن و سنت ہے، نیز جس طرح آپ نے اپنے رسالتی مشن کی تکمیل کی اور اپنی یعنی اسلام کی تحریک رحمتہ للعالمین کو چلایا اور اس راہ میں جس طرح صبر و استقلال سے مصائب و شداید برداشت کیے اور جس جرأت و پامردی سے اس وقت کے فرعونوں، ہامانوں، قارونوں، نمرودوں اور آزرودوں کا مقابلہ کیا، اس میں حسین و کامل بندگی کرنے کا حسین نمونہ ہے اور یہی مفہوم ہے:

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ (۲۱:۳۳) کا۔

چنانچہ جو شخص مؤمن بن کر رحمتہ للعالمین کے اسوۂ حسنہ کے مطابق اسلام کی تحریک رحمتہ للعالمین میں برضا و رغبت شامل ہو جاتا ہے اور بھرپور حصہ لینے لگتا ہے، وہ بشمول نوع انسانی کے کل مخلوقات کے لیے رحمت بن جاتا ہے۔ پھر وہ نہ تو مشرک و بت پرست ہو سکتا ہے اور نہ ظالم و جابر۔ وہ نہ منافق و متکبر ہو سکتا ہے اور نہ ریاکار و سرکش۔ وہ نہ

مصرف و تجیل ہو سکتا ہے اور نہ سود خوار و سرمایہ پرست۔ نہ تو عیار و کاذب نہ مفسد و مفتن۔ وہ نہ کسی کے سامنے ہاتھ پھیلا سکتا ہے نہ سر ہی جھکا سکتا ہے۔ وہ جلب منفعت کی خاطر نہ تو لوگوں کا استحصال کرتا ہے نہ حرام و ناجائز طریقوں سے دولت حاصل کرتا ہے۔ وہ نہ تو ضمیر فروش و جسم فروش ہوتا ہے اور نہ لطف فروش و قلم فروش۔ وہ اکتنا زو احمکار کرتا ہے نہ چور بازاری و جعل سازی۔ اس کے ہاتھ، زبان اور قلم سے نہ تو کسی کو گزند پہنچتا ہے اور نہ کسی کی عزت نفس مجروح ہوتی ہے۔ وہ نہ قوت و اقتدار کے نشے میں لوگوں کی آزادی، تقریر و تحریر سلب کر سکتا ہے نہ ان پر اپنا حکم ہی چلا سکتا ہے، کیونکہ وہ اس حقیقت پر ایمان رکھتا ہے کہ **إِنَّ الْحُكْمَ إِلَّا لِلَّهِ** (یوسف ۴۰: ۱۲)۔

یہی نہیں، تحریکِ رحمۃ للعالمین کا رضا کار، انسان تو انسان کسی حیوان کو بھی بلا وجہ ایذا نہیں پہنچاتا بلکہ ان کی پرورش و نگہداشت کرتا ہے۔ وہ پالتو جانوروں کی طرح جنگلی، صحرائی، کوہستانی، فضائی اور آبی جانوروں کو بھی اپنے ربِّ رحیم و جمیل کی مخلوقات سمجھ کر ان کی پرورش کا اہتمام کرتا ہے۔ عالم انسانی کی طرح وہ عالم نباتاتی و جماداتی کے لیے بھی رحمت ہوتا ہے۔ وہ شجر کاری تو کرتا ہے، مگر شجر براندازی نہیں کرتا۔ وہ درختوں، پودوں اور فصلوں کی نشوونما کے لیے ان کا تزکیہ تو کرتا ہے لیکن انہیں نقصان نہیں پہنچاتا۔ اسی طرح وہ جنگلات کی حفاظت کرتا ہے۔ اور انہیں نہ تو برباد کرتا ہے نہ برباد ہونے دیتا ہے۔ وہ زمین سے پانی نکالتا اور اس سے مستفید تو ہوتا ہے مگر اسے ضائع نہیں کرتا۔ چشموں، نہروں، کار یزوں، ندی نالوں، دریاؤں اور جھیلوں کی حفاظت کرتا اور ان سے آب و توانائی حاصل کرتا ہے اور انہیں ضائع نہیں ہونے دیتا۔ وہ ماحول کو صاف ستھرا اور حسین بنانے کی کوشش کرتا ہے، اسے گندہ دیکھنا پسند نہیں کرتا۔ وہ زمین سے تیل، گیس اور طرح طرح کی معدنیات نکالتا اور ان سے مستفید ہوتا ہے، غافل اور بے ہنر رہ کر کفرانِ نعمت نہیں کرتا۔ وہ تو زمین کے ذروں کا جگر چیر کر ان سے جوہری توانائی حاصل کرتا ہے۔ وہ پانی سے بجلی پیدا کر لیتا ہے۔ وہ فضاؤں کو مسخر کر کے زمان و مکان کے فاصلوں کو کم کرتا اور انسانیت کے لیے رحمت بنتا ہے۔

الغرض رحمۃ للعالمین اور حاملِ خلقِ عظیم صلی اللہ علیہ وسلم کا سچا پیروکار مخلوقات کے لیے رحمت بننے کی خاطر علم کی قوت یا اصطلاح قرآنی میں "سلطان" کے ذریعے سے کائنات کی نعمتوں سے تمتع و استفادہ کرنے میں کوشاں رہتا ہے۔ اصل میں مفہوم ہے یہی رحمۃ للعالمین، خلقِ عظیم اور اسوۂ حسنہ کا، اور یہی مقصود ہے اسلام کی تحریک کا اور یہی مشیت ہے ربِّ ذوالجلال والاکرام کی۔

اسلامی نظامِ عدل کا نفاذ

مشکلات اور ان کا حل

جناب محترم مولانا سید محمد متین ناشی

الحمد لِلّٰہِ وَکَفٰی وَسَلَامٌ عَلٰی عِبَادَةِ الذِّیْنِ اصْطَفٰی۔ اہلِ اعد

مغرب کا نظامِ عدل کوئی سو ڈیڑھ سو برس سے ہمارے ماں نافذ ہے اور اس سے مانوسیت اتنی بڑھ چکی ہے کہ اسلامی نظامِ عدل کا ذکر آتے ہی یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ آخر اس تبدیلی کی ضرورت کیا ہے؟ مغرب کے نظامِ عدل میں جو خرابیاں دکھائی دے رہی ہیں کیوں نہ بعض عملی اقدامات کے ذریعہ انہیں دور کر دیا جائے؟ لوگ یہ بات واضح طور پر کہیں یا نہ کہیں لیکن اسلامی نظامِ عدل کا معاملہ عام طور پر کسی سنجیدہ اور دور رس اقدام کے بجائے ایک جذباتی خواہش بن چکا ہے۔ اس صورتِ حال کے پیچھے ایک پیچیدہ نفسیات کار فرما ہے اور اسے سمجھنے بغیر مسئلے کے حل کی طرف کوئی قدم اٹھانا تو درکنار ہم اس مسئلے کی نوعیت تک کو نہیں سمجھ سکتے۔

دنیا بھر میں انقلاب اور تبدیلی کا ایک بنیادی اصول یہ ہے کہ لوگ کسی تبدیلی کی ضرورت محسوس کریں اور ظاہر ہے کہ تبدیلی کی ضرورت اس وقت محسوس ہوتی ہے جب موجودہ صورتِ حال میں کسی کمی یا کسی بنیادی خامی کا احساس ہو۔ مغرب کے نظام میں ہمیں سب سے پہلے موجود صورتِ حال سے مطمئن رہنا سکھایا ہے۔ انسانی نفسیات میں ”قدرِ اعلیٰ“ کی طرف جو فطری میلان ہوتا ہے یہ نظام اسے تدریجاً اور منظم طور پر مٹاتا ہے اور اس کی سمت کو بدل کر اسے معاشی مابقت کا رنگ دیتا ہے۔ چنانچہ اگر ہم میں سے کچھ لوگ اس کا احساس بھی رکھتے ہوں کہ اسلام کا نظامِ عدل ایک بہتر اور ارفع نظام ہے جب بھی یہ خیال ان کے کسی عملی اقدام کی بنیاد نہیں بن سکتا اس لیے کہ عام طور پر ان کا یہ خیال ہے کہ موجودہ نظامِ اول تو اسلام کے نظامِ عدل سے متصادم نہیں ہے، اگر کہیں جزوی طور پر تضاد موجود بھی ہے تو اسے ترمیم کے ذریعہ سے دور کیا جاسکتا ہے۔ اس فکر کے پیچھے دو مغالطے کام کر رہے ہیں جن میں سے ایک منطقی اور دوسرا علمی ہے۔

منطقی مغالطہ یہ ہے کہ اگر کوئی شے کسی دوسری شے سے متصادم نہیں ہے تو وہ اس شے

کا بدل بن سکتی ہے۔ حالانکہ کسی شے کا کسی دوسری شے سے متصادم نہ ہونا یہ ثابت نہیں کرتا کہ شے ثانی شے اول کا بدل بھی بن سکتی ہے۔ کیونکہ ایک شے متصادم نہ ہونے کے باوصف ناکافی ہو سکتی ہے۔ اس کے بعض پہلوؤں پر غیر ضروری زور ہو سکتا ہے۔ اہم پہلو نظر انداز ہو سکتے ہیں۔ چنانچہ مغرب کا نظام عدل ان معنوں میں اسلام کے نظام عدل کا بدل نہیں بن سکتا۔

لیکن ہم اس امر کو اس کے پورے سیاق و سباق میں اس وقت تک نہیں سمجھ سکتے ہیں جب تک ہم اس علمی مغالطے کو نہ سمجھ لیں جو درحقیقت اس پورے فساد کی جڑ ہے۔

مغرب اور اسلام کے نظام عدل میں فرق بنیادی اور ثانوی حیثیت کا نہیں ہے، یہ فرق حتمی، اساسی اور فیصلہ کن ہے۔ وہ اس طرح کہ دنیا کے ہر نظام اور ادارے کی بنیاد اس چیز پر ہوتی ہے کہ کسی خاص نظام کے پیچھے کونسا تصور انسان کا رہا ہے۔ اسلام کا تصور انسان تو واضح ہے کہ انسان خلیفۃ اللہ فی الارض ہے، چنانچہ جو چیز بھی انسان میں خلافت الہیہ کے عنصر کو ملتی ہے وہ اسے انسان کی تعریف سے بھی خارج کر دیتی ہے، چاہے اس کی شکل و صورت اور ماحول پاؤں وہی رہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام کے نظام عدل میں شہادت کے سلسلے میں خصوصاً بعض ایسی بنیادی شرائط رکھی گئی ہیں جن کے بغیر انسانی حیثیت قائم ہی نہیں ہوتی۔ اس کے برعکس مغرب کے پورے نظام کے پیچھے جو تصور انسان کام کر رہا ہے وہ یونان سے آیا ہے اور جسے ارسطو نے سماجی حیوان (SOCIAL ANIMAL) کہہ کر بیان کیا ہے۔ اب ظاہر ہے کہ جو نظام سماجی حیوان اور اس کی ضرورتوں کے مطابق وضع کیا گیا ہے وہ اپنے اس دائرہ کار میں تو شاید کسی حد تک کفایت کرے جو اس تصور سے مطابقت رکھتا ہے لیکن ایک ایسے معاشرے میں جہاں انسان کا بنیادی تصور ہی خلیفۃ اللہ فی الارض ہے یہ تصور اور کچھ نہ سہی تو ناکافی ضرور ہے۔

مغرب میں نظام عدل کے پیچھے انسان کی بنیادی تعریف حیاتیاتی ہے یعنی جس مخلوق کو سائنسی زبان میں انسان قرار دیا جاسکے وہ قانون کے لیے کافی ہے۔ اس کے برعکس اسلام کا تصور انسان قدری ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر اس میں انسانیت کا قدری پہلو پایا جاتا ہے تو پھر اسے انسان گنا جائے گا ورنہ قرآن کی اصطلاح میں اذ لک کا لانا عام بل حماصل کا مصداق ہے۔ یہ ہے وہ بنیادی فرق جو اس سارے مسئلے کی جڑ ہے۔

سب ایک اور بات ایسی ہے جس پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔ وہ یہ کہ مسلم معاشرے میں جب تک اسلامی قوانین نافذ رہے قانون کی خلاف ورزی کم سے کم ہوتی تھی اور جوب

اسی معاشرے میں مغربی قوانین نافذ کئے گئے تو قانون کی خلاف ورزی بہت بڑھ گئی۔ اس کا اندازہ چودہ سو برس کی شرح جرائم اور ڈیڑھ سو برس کی شرح جرائم سے بہ آسانی لگایا جاسکتا ہے۔ میرے خیال میں اس کی وجہ یہ ہے کہ ہر قانون کے پس پردہ تصور انسانی کے علاوہ اس قانون کے تحت زندگی گزارنے والوں کا مذہبی شعور کارفرما ہوتا ہے، کیونکہ ملک کی سب سے بڑی عدالت کے فیصلے کی بابت اگر کسی کم سے کم درجے کا تصور عصمت اور تصور طہارت نہ ہو تو قانون موثر ثابت نہیں ہو سکتا اور ظاہر ہے کہ یہ تصور عصمت و طہارت مذہب ہی سے میسر آسکتا ہے۔ لہذا جب مغربی نظام عدل مسلم معاشرے میں نافذ ہوا تو چونکہ وہ نظام معاشرے کے مذہبی شعور اور مذہبی رجحانات سے مطابقت نہیں رکھتا تھا اس لیے معاشرے کے باطن نے اسے قبول کرنے سے اجابہ کیا، جس کے نتیجے میں ذہنی بغاوت پیدا ہوئی اور جرائم کا ارتکاب بڑھ گیا۔

مغربی اور اسلامی نظام عدل کے بارے میں گفتگو کرتے وقت یہ امر بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا کہ عدلیہ ہی اصل میں وہ چیز ہے جو معاشرے کے اعمال و افعال کو مخصوص خطوط پر استوار کرتی ہے۔ اسی لیے ہر ملک کا نظام عدل اس ملک کے اساسی نظریات و معتقدات کا عکاس ہوتا ہے اور اس حوالے سے صرف اسی ملک کے ساتھ مخصوص ہوتا ہے۔ اگر اس اصول کو مد نظر رکھا جائے تو ملک کے باشندے اس نظام عدل سے نہ صرف یہ کہ ناواقف رہتے ہیں بلکہ بعض اوقات ان کی زندگی اس نظام عدل سے متصادم ہو جاتی ہے۔ ہمارا حال یہ ہے کہ ہمارے ملک کی بنیاد اسلام ہے اور ملک میں کم و بیش برطانوی قوانین نافذ ہیں۔ ظاہر ہے کہ برطانوی نظام حیات کی اساس دوسری ہے اور اسلامی نظام حیات کی دوسری، جس کا ثبوت یہ ہے کہ بہت سے جرائم ہیں جو برطانوی قانون کی رو سے جرم ہی نہیں شمار کیے جاتے بلکہ بعض اوقات انہیں قانونی تحفظ بھی حاصل ہوتا ہے۔ مثلاً عمل ہم جنسی، یا کلب میں جوا کھیلنا، یا شراب نوشی، یا زنا بالرضا جبکہ اسلامی نظام عدل میں ان میں سے بعض جرائم کی سزا موت اور بعض کی کوڑے ہیں۔

مغربی اور اسلامی نظام عدل پر غور کرتے وقت یہ بات بھی پیش نظر رکھنی چاہیے کہ مغربی قانون کا ارتقاء استقرانی منطق پر ہوتا ہے جسے اگر شمار یاتی کہہ دیا جائے تو غلط نہ ہوگا، یعنی وہاں قوانین ہزار ہزار دو ہزار، لاکھ دو لاکھ انسانوں کے طرز عمل BEHAVIOUR کو دیکھ کر وضع کر دیے جاتے ہیں لیکن استقرای یا شماریات میں غلطی کا امکان ہے۔ جب کہ اسلامی نظام عدل کی اساس انسانی فطرت پر ہے۔ اسی وجہ سے مغربی قوانین میں تبدیلی ہوتی رہتی ہے کیونکہ انسانی طرز عمل متبدل و متغیر ہے جب کہ اسلامی نظام عدل میں تبدیلی نہیں ہوتی اس لیے کہ

انسانی فطرت میں تبدیلی ممکن نہیں۔

دوسری بات یہ کہ وہ نظام عدل جو کسی خاص طرز عمل (BEHAVIOUR) کے انسانوں کے لیے وضع کیا گیا ہو عالمگیر نہیں ہو سکتا جب کہ وہ نظام عدل جو فطرتِ انسانی پر مبنی ہو عالمگیر ہوتا ہے۔ لہذا اسلامی نظام عدل کو اگر مغرب میں نافذ کیا جائے تو وہاں یہ کامیاب ہو سکتا ہے کیونکہ بہر حال وہاں انسان ہی جیسے ہیں لیکن مغرب کا نظام عدل پاکستان میں کامیاب نہیں ہو سکتا اس لیے کہ مغربی باشندوں کے طرز عمل اور پاکستانیوں کے طرز عمل میں اختلاف ہے۔ مختصر یہ کہ ہمیں آخر کار پاکستان میں مکمل اسلامی نظام عدل نافذ کرنا ہو گا ورنہ ہمارا معاشرتی ارتقاء ہرگز اسلامی نہ ہو گا۔

اسلامی نظام عدل کی چند امتیازی خصوصیات

اسلامی نظام عدل کو جو چیز دیگر نظام عدل سے ممتاز کرنے والی ہے یہ ہے کہ:

- ۱۔ دیگر نظام عدل (وضعی قوانین) کو سوسائٹی کے افراد اپنے اسوا و ظروف اور اپنی ضروریات کو پیش نظر رکھ کر تیار کرتے ہیں جبکہ اسلام کا نظام عدل خود معاشرے کو اپنے خطوط اور اپنی اساس کے مطابق ڈھالتا ہے۔ بصورتِ اول سوسائٹی آگے آگے ہوتی ہے اور قانون اس کے پیچھے جب کہ اسلامی نظام عدل آگے ہوتا ہے اور معاشرے کو اس کے پیچھے چلنا پڑتا ہے۔
- ۲۔ صفت دوام۔ دوسری بات یہ ہے کہ اسلامی نظام عدل وحی الہی پر مبنی ہوتا ہے، یعنی اس کا صانع اور منزل اللہ تبارک و تعالیٰ ہے جب کہ وضعی قوانین انسانی ذہن کے نائیدہ ہیں اور چونکہ "الانسان معکب من المخطاء والنسیات" اس لیے انسان کے وضع کردہ قوانین میں فطری طور پر وہ ضعف، عجز، کم ہمتی، نتائج سے عدم واقفیت، مستقبل سے بے خبری پائی جاتی ہے جو اس کی سرشت میں داخل ہے یہی وجہ ہے کہ قانون بنتے ہی اس میں ترامیم شروع ہو جاتی ہیں۔ اگر اس اعتبار سے دیکھیں تو وضعی قوانین ہمیشہ ناقص اور ناقابل اصلاح رہتے ہیں۔ اس کے برخلاف اسلامی قوانین چونکہ اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ ہیں، ایک ایسے رب کے جو علیم وخبیر ہے، جس کے سامنے ازل اور ابد سب کھلے ہوئے، جو مستقبل کے تمام انقلابات سے آگاہ ہے اور جس کا علم ہر شے کو محیط ہے، اس لیے اس میں نقص کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا اور وہ اساسی طور پر ہر تغیر اور تبدیلی سے بے نیاز ہے۔ لہذا یہ ماننا پڑے گا کہ اسلامی نظام عدل اپنے اندر صفت دوام رکھتا ہے۔

مثال کے طور پر ملاحظہ فرمائیں :

(الف) قرآن کریم میں ارشاد ہے :

لَا تَسْرِدْ رُوَاذِرًا وَّ زُرًّا تُخْرَى (فاطر ۱۸)

ترجمہ : کوئی بوجھ اٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا۔

یعنی جو شخص کسی جرم کا ارتکاب کرے سزا اسی کو ملے گی یہ نہیں ہو سکتا کہ کرے کوئی اور بھرے کوئی۔

(ب) یا ارشاد باری ہے :

لَا يَكْلِفُ اللَّهُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا (البقرہ ۲۸۶)

ترجمہ : اللہ تعالیٰ کسی بھی نفس پر اتنی ہی کلفت ڈالتا ہے جتنی کہ وہ برداشت کر سکے۔

اس آیت سے یہ اصول متفرع ہوا کہ شرعی احکام میں تکلیف مالا یطاق کی گنجائش نہیں۔

(ج) یا ارشاد ہوا :

إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْإِحْسَانِ وَإِيتَاءِ ذِي الْقُرْبَىٰ وَ

يَنْهَىٰ عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْكَرِ وَالْبَغْيِ (النحل ۹)

ترجمہ : اللہ تعالیٰ تمہیں انصاف اور احسان اور رشتہ داروں کی مدد کرنے کا حکم دیتا ہے اور فحش باتوں، ناجائز کاموں اور سرکشی اختیار کرنے سے منع کرتا ہے۔

(د) یا فرمایا :

إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُكُمْ أَنْ تَوَدُّوا الْأَمَانَاتِ إِلَىٰ أَهْلِهَا وَإِذَا حَكَمْتُمْ

بَيْنَ النَّاسِ أَنْ تَحْكُمُوا بِالْعَدْلِ (النساء ۵۸)

ترجمہ : اے مسلمانو! اللہ تعالیٰ تمہیں حکم دیتا ہے کہ امانتیں اہل امانت کے سپرد کرنا اور جب تمہیں لوگوں کے معاملات کا فیصلہ کرنا پڑے تو انصاف سے فیصلہ کرنا۔

(۵) ایک مقام پر حکم فرمایا :

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا قَوَّامِينَ بِالْقِسْطِ شُهَدَاءَ

لِلَّهِ وَلِوَالِدَيْكُمْ وَأُولَىٰ الدِّينِ وَالْأَقْرَبِينَ (النساء ۱۳۵)

ترجمہ : اے ایماندار بندو! انصاف پر قائم رہو اور اللہ سے ڈرتے ہوئے گواہی دو

اگر وہ گواہی خود تمہارے خلاف ہی کیوں نہ ہو یا تمہارے والدین یا عزیز واقارب

کے خلاف ہو۔

(و) سورہ مائدہ میں ارشاد ہوا :

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا قَوَّامِينَ لِلَّهِ شُهَدَاءَ بِالْقِسْطِ
وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاكُتُومِ عَلَىٰ أَنْ لَا تَعْدِلُوا ۖ أَعْدِلُوا هُوَ
أَقْرَبُ لِلتَّقْوَىٰ وَاتَّقُوا اللَّهَ ۚ إِنَّ اللَّهَ خَبِيرٌ بِمَا تَعْمَلُونَ
(المائدہ ۸)

ترجمہ: اے ایمان والو! اللہ کے واسطے انصاف کے ساتھ گواہی دینے میں مستعد رہو اور
ایسا نہ ہو کہ لوگوں کی عداوت تم سے گواہی دینے میں بے انصافی کرے۔ انصاف
کرو کہ انصاف ہی پر ہیزگاری تک پہنچنے کا قریب ترین راستہ ہے اور اللہ سے ڈرو
کیونکہ وہ تمہارے اعمال کی خبر رکھتا ہے۔

ان آیات کو نازل ہوئے آج پودہ سو سال سے زائد کا عرصہ گزر چکا۔ مسلمان تو مسلمان غیر مسلم
مفکرین و مقننین کو دعوت دی جاتی ہے کہ وہ ثابت کر دیں کہ اتنا طویل عرصہ گزر جانے کے باوجود قانون
سازی کی ان اساسیات میں معمولی سا نقص، معمولی سی کسنگی اور خفیف سی کمی پیدا ہوئی ہے؟ ہرگز
نہیں۔ قانون سازی کی یہ بنیادیں انقلاب دہر و ایام سے قطعاً بے نیاز ہیں۔

مساوات

اسلامی نظام عدل کی اہم ترین امتیازی خصوصیت اس کا عطا کردہ تصور مساوات ہے۔ یعنی
قانون اسلامی کے آگے امیر، غریب، بادشاہ، فقیر، محکوم، حکمران برابر ہیں حتیٰ کہ نبی اکرم نے اپنے
یا اپنے اہل خاندان کے لیے بھی کسی قسم کا استثناء گوارا نہ فرمایا اور غزوہ بدر میں جب آپ کی چھڑی حضرت
سواد کے پیٹ میں لگ گئی اور انھوں نے قصاص کا مطالبہ کیا تو سید الکونین امام المرسلین بدر کے
سپہ سالار صلی اللہ علیہ وسلم اپنے بطن مبارک سے کپڑا ہٹا کر کھڑے ہو گئے۔ چھڑی سواد کے ہاتھ میں
محمادی اور انھیں بطیب خاطر اجازت دی کہ وہ بدلہ لے لیں۔ اسلام کے نظام عدل میں جب
شارع اسلام اپنی ذات گرامی کو انتقام کے لیے پیش کر سکتے ہیں تو پھر کون ایسا ہے جو خود کو قانون سے
بالا تہہ سمجھے۔

آج تو دنیا بہت ترقی کر چکی ہے، قانون و شروح قانون کی لاکھوں کروڑوں کتابیں تیار
ہو چکی ہیں لیکن مغربی نظام عدل کی رو سے ایک عام شہری بادشاہ کو عدالت میں طلب نہیں کر سکتا
اور عام عدالتیں وزیراعظم پر مقدمہ نہیں چلا سکتیں، اس لیے کہ بادشاہ سے تو غلطی کا صدور ہی
ممکن نہیں۔ مگر قرآن کریم پودہ سو برس سے اعلان کر رہا ہے:

بِأَيْهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاكُمْ مِنْ ذَكَرٍ وَأُنْثَىٰ وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوبًا
 وَقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوا ۗ إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ (الحجرات ۱۳)
 ترجمہ: اے انسانو! ہم نے تمہیں ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور تمہارے درمیان
 شاخیں اور قبیلے بنائے تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچان سکو۔ بیشک اللہ کے نزدیک
 تو وہی عزت والا ہے جو اللہ سے زیادہ ڈرنے والا ہے۔

صحیح بخاری شریف میں ہے کہ جب مخزومیہ عورت نے چوری کی اور قریش نے محسوس
 لیا کہ اگر اس کا ہاتھ چوری کے مقدمے میں کاٹ دیا جائے گا تو قبیلے قریش کی بے عزتی ہوگی اور
 انھوں نے حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں سفارش کرنے
 کے لیے بھیجا تو جواب ملا:

التشفع في حد من حد الله ثم قال يا ايها
 الناس انما ضل من قبلكم انهم كانوا اذا سرق الشرف تركوا
 واذا سرق الضعيف فيهم اقاموا عليهم الحد ودانيم
 الله لو ان فاطمة بنت محمد سرقت لقطع محمد يدها
 ترجمہ کیا تم اللہ کی حدود کے بارے میں مجھ سے سفارش کر رہے ہو پھر آپ کھڑے ہوئے
 اور خطبہ دیتے ہوئے ارشاد فرمایا: ”لوگو! تم سے پہلے کئی قومیں اسی لیے گمراہ
 ہو گئیں کہ ان کا کوئی معزز آدمی چوری کرتا تو اسے چھوڑ دیتے اور جب کوئی کمزور
 شخص اس جرم کا ارتکاب کرتا تو اس پر حدیں جاری کرتے۔ اور خدا کی قسم اگر محمد کی
 بیٹی چوری کرتی تو محمد ضرور بالضرور اس کا ہاتھ کاٹ دیتے۔“

کیا اس مساوات کی نظیر تاریخ عالم میں مل سکتی ہے؟

خوفِ خدا اور تصورِ آخرت

اسلامی نظامِ عدل کی ایک اہم ترین خصوصیت یہ ہے کہ وہ معاشرے کی تربیتِ خوفِ خدا اور
 تصورِ آخرت کی بنیاد پر کرتا ہے۔ کیونکہ اگر انسان پر بظاہر بہت سی پابندیاں عاید کر دی جائیں
 اور اس کے باطن کو نہ بدلا جائے تو عقلی حیدر ساز بے شمار راستے نکال لیتی ہے۔ اسلام درحقیقت

اپنے معاشرے کو اندر سے بدلتا ہے تاکہ قانون شکنی اور سرکشی کا موقع ہی نہ آئے۔ اس اندرونی تبدیلی کے لیے اسلام سب سے زیادہ خوفِ خدا اور تصورِ آخرت پر زور دیتا ہے۔ اسی لیے قرآن کریم کی ابتدا کرتے ہی اللہ تعالیٰ نے اعلان فرمایا:

ذٰلِكَ الْمَكْتَبُ لِمَنْ فِيهِ حُدًى لِّلْمُتَّقِينَ

اس کتاب میں کسی کو شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہے۔ یہ کتاب ہدایت ان لوگوں کے لیے ہے جو اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والے ہیں۔

پھر کیا گیا:

فَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَرَهُ ۗ وَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَرَهُ

کہ جس نے بھی ایک ذرے برابر نیکی کی ہوگی وہ اس کے ثمراتِ قیامت کے دن دیکھ لے گا اور جس نے بھی ایک ذرے برابر برائی کی ہوگی وہ اس کے نتائجِ قیامت کے دن بھگت لے گا۔

قیامت کا دن کیا ہوگا کہ:

يَوْمَ يَفِرُ الْمَرْءُ مِنْ أَخِيهِ وَأُمِّهِ وَأَبِيهِ وَصَاحِبَتِهِ وَبَنِيهِ لِكُلِّ امْرَأٍ مِنْهُمْ يَوْمَئِذٍ شَانٌ يُغْنِيهِ (عبس ۳۷)

جس روز انسان بھاگنے لگیں گے اپنے بھائی سے اور اپنے ماں باپ، بیوی اور بیٹے سے اس وقت ان میں سے ہر شخص کو اپنی ہی پٹی لڑھے گی اور وہ دوسرے سے بے توجہ ہوں گے۔

پھر ارشاد ہوا:

يَوْمَ تَسبَى السَّلْوَ فَمَا لَهُ مِنْ قُوَّةٍ وَلَا نَاصِرٍ (الطارق ۹)

جس روز سب راز فاش ہو جائیں گے تو اس وقت انسان کو نہ خود قوت ہوگی نہ اس کا کوئی مددگار ہوگا۔

قرآن کریم میں یہ اور اس طرح کی سینکڑوں آیات اور ان کے علاوہ احادیثِ انسان کے باطن کو بدلنے والی اور اسے خوفِ خدا اور تصورِ آخرت سے وابستہ رکھنے والی ہیں۔ اسی تربیت اور تعلیم کا نتیجہ تھا کہ جب ایک ماں اپنی بچی سے دودھ میں پانی ملانے کو کہہ رہی تھی تو بچی نے جواب دیا کہ حضرت عمرؓ نے منع فرمایا ہے اور جب ماں نے یہ کہا کہ کیا عمرؓ دودھ میں پانی ملاتے ہوئے دیکھ رہے ہیں؟

تو جھٹ بچی بولی اٹھی! اماں! عمر تو نہیں لیکن عمر کا خدا دیکھ رہا ہے۔“ اسی طرح کے واقعات حضرت ماعزؓ اسلمی اور غامدیہ کے ہیں۔ اگر ماعزؓ اسلمی اور غامدیہ دربار نبوت میں حاضر ہو کر بار بار اعترافِ زنا نہ کرتے تو کون انہیں سزا دیتا۔ واقعاتِ زنا کا کوئی گواہ بھی نہیں تھا۔ مگر چونکہ باطن بدل چکا تھا اور ان حضرات نے یہ محسوس کیا کہ ہم سے گناہ سرزد ہو گیا ہے جسے اگرچہ ہم نخلق کی نگاہوں سے چھپا سکتے ہیں تاہم خالق کی نگاہوں سے نہیں چھپا سکتے اس لیے دربار رسالت میں حاضر ہو کر پکار اٹھے ”ٹھہرنی یاد رسول اللہ“ اے خدا کے رسول! ہمیں پاک کر دیجئے۔ ماعزؓ اور غامدیہ یہ جانتے تھے کہ ہمیں سنگسار کر کے ہلاک کر دیا جائے گا۔ جان کس کو پیاری نہیں ہوتی لیکن آخرت کا تصور اور رب کا خوف تھا جو کشاں کشاں انہیں مقتل میں لے آیا۔

یہی ہے وہ بنیاد جس پر اسلام کا نظام عدل معاشرے کی تنظیم کرتا ہے۔ کیا دنیا کا ترقی یافتہ سے ترقی یافتہ نظام عدل اس طرح کی ایک مثال بھی پیش کر سکتا ہے؟ اس مقام پر اگر آپ مجھے طبی اصطلاح استعمال کرنے کی اجازت دیں تو میں عرض کروں گا کہ اسلامی نظام عدل کی دیگر بنیادوں میں سے ایک بنیاد PREVENTION IS BETTER THAN CURE ہے۔ کہ ماحول ایسا بنا دیا جائے، اس حال اس طرح تبدیل کر دیے جائیں، طبائع میں اس نوع کا انقلاب برپا کر دیا جائے کہ انسان خود بخود جرائم کے ارتکاب سے محترز رہے۔

سخت ترین عقوبات

اسلامی نظام عدل کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ جرائم ثابت ہونے پر وہ مجرم کے ساتھ کسی رورعایت کی گنجائش نہیں چھوڑتا کیونکہ موجودہ دور کی طرح اگر مجرم کے ساتھ رورعایت کی جائے تو نظام تمدن میں خلل پڑے گا اور کسی شریف آدمی کی جان و مال اور عزت و آبرو محفوظ نہیں رہے گی۔ لہذا اسلام کے نظام عقوبات میں سزائیں عبرتناک رکھی گئی ہیں۔ نظام عقوبات کے فلسفے پر بحث کرتے ہوئے حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ اپنی مشہور عالم تصنیف حجتہ اللہ بلاغہ میں لکھتے ہیں،

بعض معاصی کے ارتکاب پر شریعت نے حد مقرر کی ہے۔ یہ وہی معاصی ہیں جن کے ارتکاب سے زمین پر فساد پھیلتا، نظام تمدن میں خلل پیدا ہوتا اور مسلمان معاشرے کی طہانیت و سکون قلب رخصت ہو جاتا ہے۔ دوسری بات یہ کہ وہ معاصی کچھ اس قسم کے ہوتے ہیں کہ دوچار بار ان کا ارتکاب کرنے سے ان کی لت پڑ جاتی ہے اور

اس سے سمجھا چھڑانا مشکل ہو جاتا ہے۔ اس طرح کے معاصی میں محض آخرت کا خوف دلانا اور نصیحت کرنا کافی نہیں ہوتا بلکہ ضروری ہے کہ ایسی عبرت ناک سزا مقرر کی جائے کہ اس کا مرتکب معاشرے میں نفرت کی نگاہ سے دیکھا جائے اور ساری زندگی سوسائٹی کے دیگر افراد کے لیے سامانِ عبرت بنا رہے اور اس کے انجام کو دیکھ کر بہت کم لوگ اس قسم کے جرائم کے ارتکاب کی جرأت کریں۔

اصل میں اسلام نے جو نظام اصلاح قائم کیا ہے اس کی ابتدا ہی فرد کی اصلاح سے ہوتی ہے۔ کیونکہ جب تک کسی معاشرے کے افراد صالح نہ ہوں ان کا مجموعہ یعنی معاشرہ صالح نہیں ہو سکتا۔ لہذا اگر وہ اسلام جو فرد اس قدر قاسد ہو چکا ہے کہ آذانہ اللہ تعالیٰ کی مقرر کردہ حدود کو توڑتا ہے وہ ایک فرد سارے معاشرے کو تباہ کر سکتا ہے۔ اور اس کی مثال اس دانت کی سی ہے جس میں پائوریہ یا کے جراثیم داخل ہو چکے ہیں۔ لہذا جو شخص بھی دانتوں کے امراض کا ماہر ہو گا وہ فوراً اس جراثیم زدہ دانت کو دانتوں کے اجتماع سے الگ کر دینے کا حکم دے گا۔

حدود کے نفاذ میں شریعت نے جو دوسری مصلحت مد نظر رکھی ہے وہ ہے اس کا عبرت ناک ہونا۔ اسی لیے قرآن کریم میں جس مقام پر حد زنا کا ذکر ہے وہاں یہ بھی حکم ہے کہ :

وَلْيُشْمَذَ عَنِ الْبُهَاتِ طَائِفَةٌ مِّنَ الْمُؤْمِنِينَ (النور ۲)

ترجمہ : اور چاہیے کہ ان کی سزا کا مسلمانوں کی جماعت مشاہدہ بھی کرے۔ یہی مصلحت، معلوم ہوتا ہے سرقہ کی حد میں قطعید کی بھی ہے۔ کیونکہ ایک دست بیدہ شخص جب ہر وقت مسلم معاشرے میں پھرتا ہے تو اس کے حشر کو دیکھ کر لاکھوں انسان ارتکاب سرقہ کے خیال سے باز رہیں گے۔

اسلام میں قضا کا تصور

دیگر نظام نائے عدل کی طرح اسلامی نظام عدل میں عمدہ قضا، پھولوں کا مار نہیں بلکہ کانٹوں کا ایسا تاج ہے جسے طلب کرنا بھی جائز نہیں۔

صحیح بخاری شریف میں ہے: حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:
 لَا تَوَلَّىٰ هَذَا مِنْ سَأَلَهُ وَلَا مِنْ حَرَصَ عَلَيْهِ لَه
 ہم اس شخص کو حاکم نہیں بناتے جو اس عہدے کو طلب کرے یا اس کا لالچ کرے۔
 اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

مَنْ دَلِيَ الْقَضَاءَ أَوْ جُعِلَ قَاضِيًا بَيْنَ النَّاسِ فَقَدْ ذُبِحَ
 بَغْيًا وَسَكِينًا - ۱۰

جو قاضی بنایا گیا یا لوگوں کے درمیان فیصلہ کرے وہ بغیر چھری کے ذبح
 کر دیا گیا۔

اسی لیے اسلامی نظام عدل میں ہر کس و ناکس کو قاضی نہیں بنایا جاسکتا کہ وہ کوئی
 امتحان پاس کرے اور اس کا فقرر عمل میں آجائے، بلکہ ضروری ہے کہ جسے عہدہ قضا سپرد کیا
 جائے وہ متقی اور بے نفس ہو، اسے ہر قسم کے خارجی اثرات سے بے پرواہ ہو کہ صحیح فیصلے پر
 پہنچنے کی خواہش ہو۔ ایسے قاضی کے بارے میں صحیحین میں حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ
 سے روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

إِذَا حَكَمَ الْحَاكِمُ فَاجْتَهَدَ قَاصِبًا فَلَهُ أَجْرَانِ وَإِذَا حَكَمَ
 فَاجْتَهَدَ فَاخْطَا فَلَهُ أَجْرٌ وَاحِدٌ ۱۱

ترجمہ: حاکم جب فیصلہ کرتے وقت اجتہاد کرے اور اپنے اجتہاد میں صحیح ہو تو اس
 کے لیے دو اجر ہیں اور اگر اس نے اجتہاد کیا اور اس سے خطا ہو گئی جب بھی
 ایک اجر ملے گا۔

ان احادیث سے معلوم ہوا کہ اسلامی نظام عدل میں قضا ایک عبادت ہے بشرطیکہ تمام
 مقدمات کا فیصلہ کرتے وقت قاضی کی نیت درست ہو اور وہ حق و انصاف کا دامن اپنے ماتھے سے
 نہ چھوڑے۔

شہادت کا معیار

دیگر نظام ملے عدل میں ہر اللو پینجو شہادت دینے کا مجاز ہے خواہ اس کا ذاتی کردار کتنا ہی

گھنا و نا کیوں نہ ہو۔ صرف ضروری یہ ہے کہ وہ اپنے ہوش و حواس میں ہو اور خود اپنی بات کو جو وہ ادائے شہادت کے وقت منہ سے نکال رہا ہے سمجھتا ہو۔ لیکن اسلامی نظام عدل میں شہادت کا کڑا معیار مقرر کیا گیا ہے۔ اور اولین شرط یہ ہے کہ:

وَأَشْهَدُ وَأُذَوِّعُ عَدْلِي مَعَكُمْ وَأَقِيمُوا الشَّهَادَةَ لِلَّهِ

(الطلاق : ۲)

ترجمہ: اور اپنے میں سے دو عادل اشخاص کو گواہ ٹھہرا لو اور گواہی ٹھیک ٹھیک اللہ کے واسطے دو۔

قرآن کریم کا یہ جملہ اس بات کی طرف اشارہ کر رہا ہے کہ اسلامی نظام عدل میں ادائے شہادت درحقیقت ادائے امانت ہے، اسی لیے عادل کی شرط عائد کی گئی ہے جس کی فقہائے اسلام نے یہ تعریف کی ہے کہ:

”وہ کبائر سے مجتنب ہو، صغائر پر اصرار نہ کرے اور اس کی نیکیاں اس کی برائیوں پر غالب ہوں۔“

اس کے علاوہ اسلامی نظام عدل میں ”تزکیۃ الشہود“ کا نظام رکھا گیا ہے جو شاید دنیا کے کسی نظام میں نہیں ہے، اور ان سب پر مستزاد یہ کہ شریعت میں جھوٹی شہادت پر سخت سزائیں مقرر کی گئی ہیں اس لیے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے اکبر الکبائر کہا ہے۔ صحیح مسلم شریف میں ہے:

أَلَا أَنْبَأُكُمْ يَا كَبِيرَ الْكِبَائِرِ قَالَ قَوْلُ الزُّورِ وَقَالَ شَهَادَةُ الزُّورِ

ترجمہ: آپ نے فرمایا کہ کیا میں تمہیں سب سے بڑے کبیرہ گناہ کے بارے میں بتاؤں؟ وہ ہے جھوٹ بولنا یا جھوٹی شہادت دینا۔

مفت اور فوری حصولِ انصاف

ایک اسلامی حکومت کی دیگر ذمے داریوں کے ساتھ ساتھ یہ بھی ذمے داری ہے کہ رعایا کو مفت اور فوراً انصاف مہیا کیا جائے تاکہ غریب سے غریب آدمی اپنا حق وصول کر سکے اور کسی شخص کی غربت حصولِ انصاف میں مزاحم نہ ہو، اور چونکہ اسلامی نظام عدل سیدھا

سادہ ہے اس لیے مقدمات کے فیصلے بھی جلد از جلد ہو جاتے ہیں اور اس بات کا اہتمام کیا جاتا ہے کہ مغربی نظام عدلی کی طرح انصاف میں اتنی تاخیر نہ ہو جائے کہ ظلم بن جائے۔ آج ہمارے ملک میں جو نظام عدلی رائج ہے اس نے ہمارے غریب عوام کو عین مشکلات سے دوچار کر رکھا ہے وہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں۔ وکلاء کی مہاری فیسیں، اسٹامپ کے اخراجات، ایک معمولی سے مقدمے میں بے ضرورت پچاس تا ستر سو روپے، آمدورفت کے اخراجات، عدالتوں کے لالچیں چکر۔ ان چیزوں کی وجہ سے اس وقت غریبوں کو انصاف میسر آنا اگر محال نہیں تو دشوار تر ضرور ہے۔

مذکورہ بالا خصوصیات کے باعث اگر یہ کہا جائے تو بیجا نہ ہو گا کہ اسلام کا عطا کردہ نظام عدلی اس وقت بھی دنیا کے تمام نظام عدلی سے نائق، آسان تر، مہذب، حیات اجتماعی کے لیے النفع اور قابل عمل ہے۔ ضرورت اللہ پر بھروسہ کرنے کے قدم بڑھانے کی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس راہ میں مشکلات بھی ہیں اور موانع بھی۔ سو سالہ دورِ غلامی نے ہم سے احساس زیاں تک چھین لیا ہے۔ ہم اپنے گریبانوں میں چھپے ہوئے آفتاب کو چھپوڑ کر دوسروں کے چراغوں کی طرف دوڑنے میں مصروف ہیں، اور اگر یہ کہا جائے تو بیجا نہ ہو گا کہ کسمحلت تک ہم احساس کمتری کے شکار ہیں۔ یہ سب کچھ تسلیم۔ لیکن اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے :

وَالَّذِينَ جَاءَهُدُ وَاٰفِيْنَا كُنْهَدِ يَشْهَرُ سُبْلَنَا

جو لوگ ہمارے راستے میں کوشش کریں گے ہم ضرور بالضرور انھیں اپنی راہیں دکھلا دیں گے۔ مگر اس کے لیے شرط یہی ہے کہ

در رہ منزل لیلی کہ خطر با ست بجاں

شرط اول قدم آنت کہ مجنوں باشی

ہمیں اللہ کے وعدے پر بھروسہ کرنے کے اسلام کو من کل الوجوہ اس ملک میں نافذ کر دینا چاہیے جب ریلوے کا محکمہ ہم سے ٹکٹ دیتے وقت عملاً یہ وعدہ کرتا ہے کہ ہم تمہیں کراچی بذریعہ ریل پہنچا دیں گے تو ہم اس کے وعدے پر اعتماد کر کے اسے ٹکٹ کی قیمت بھی ادا کر دیتے ہیں اور اس کی تیار کی ہوئی ٹرین میں بیٹھ بھی جاتے ہیں اور ہمیں ایک لمحے کے لیے بھی یہ شبہ نہیں ہوتا کہ پتہ نہیں یہ ٹرین ہمیں کراچی پہنچائے گی کہ نہیں؟ تو کیا اللہ کا وعدہ (العہاد باللہ) پاکستان کے محکمہ ریلوے کے وعدے سے بھی زیادہ مشتبہ ہے کہ ہم جیہیں جیہیں میں پڑے ہوئے ہیں اور تذبذب کے شکار ہیں اور کبھی کہنے لگتے ہیں کہ اسلام کا نظام عدلی فرسودہ ہے، آج کے ماڈرن دور میں نہیں چل سکتا۔ کبھی

مغربی نظام عدل میں ان پہلوؤں کو تلاش کرنے لگتے ہیں جو اسلام سے متصادم نہیں تاکہ جیسے بھی ہو انگریزوں کے ہمارے ملک کے عزیز عوام پر مسلط رہ کر ان کا خون چوستا رہے۔ ان کے اسلاف کی بخشش ہوئی اقدار حیات کو مسخ کرتا رہے اور ان سے کوٹھو کے بیل کی طرح عدالتوں کے چکر پر چکر لگواتا رہے۔ ہماری مثال اس بندر یا کی سی ہے جس کا بچہ چونتیس سال ہوئے مر چکا ہے لیکن وہ اس کے سڑے ہوئے ڈھلے کو سینے سے لگا کر پھرتی رہتا چاہتی ہے۔

اللہ کے فضل و کرم سے ہم ۳ سال کے بعد اب ملک میں اسلام کا بول بالا ہو رہا ہے۔ میں یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ پاکستانی عوام کو منزل مل گئی لیکن اتنا ضرور عرض کروں گا کہ ملت پاکستانیہ جو طویل اور صبر آئے ماہ ۳ سالوں سے بھنگ رہی تھی اور اس کے سفر کی سمت متعین نہ تھی اب اس کی سمت سفر متعین ہو چکی ہے۔ وفاقی شرعی عدالت کا قیام، نظام زکوٰۃ کا نفاذ، بلا سود بنک کا آغاز، قومی زبان پر زور، نظریہ پاکستان کی ترویج و اشاعت، حدود اسلامی کا نفاذ، یہ چیزیں ایک صبح نو کی خبر دیتی ہیں۔ لیکن کسی ملک میں کسی نظام کا نفاذ محض کسی حکومت کی ذمہ داری نہیں ہوتی۔ یہ کام ہم سب کو مل کر کرنا ہے۔ علما، وکلاء، جج حضرات، طلباء، اساتذہ، تاجر، صنعت کار، سرمایہ دار، مزدور، زمیندار، اطباء، پولیس، فوج، عمال حکومت اور ملک کے سارے عوام کا یہ فرض ہے کہ اس ملک میں جسے اسلام کے نام پر حاصل کیا گیا تھا اسلام کا نظام اپنی پوری جامعیت و مانعیت کے ساتھ نافذ کریں۔ جب تک سارے عوام کا تعاون نہ ہو یہ مرحلہ سر نہ ہوگا۔

مشکلات اور ان کا حل

جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے اسلامی نظام عدل کے نفاذ میں سب سے بڑی دشواری یقین کی کمی اور احساس کمتری ہے، اور یہ کوئی انہونی بات نہیں ہے۔ جو قوم ڈیڑھ سو برس تک انگریزوں کی غلام رہ چکی ہو اس کی طبیعت میں اس قسم کے عناصر کا پیدا ہونا فطری ہے اور یہ اسی کا اثر ہے کہ ہم مغربی نظام عدل کو ملک میں باقی رکھنا چاہتے ہیں اور ہماری تمام تر کوششیں اس کے لیے کی جا رہی ہیں کہ رائج الوقت مغربی نظام عدل سے ان شقوں کو خارج کر دیا جائے جو شریعت سے متصادم ہیں یہ نظریہ سرے سے غلط ہے، کیونکہ اس سے تو یہ اندازہ ہوتا ہے کہ بہر صورت و بہر حال ہم مغربی نظام عدل کو باقی رکھنا چاہتے ہیں حالانکہ چاہیے تو یہ تھا کہ ہم اسلامی نظام عدل کو ملک میں یکسر نافذ کرنے کے لیے اقدامات تجویز

کرتے اور اس کے ساتھ ساتھ مغربی نظام عدل کی جو اچھی اور مفید چیزیں ہیں اور اپنی
 شہاد میں اسلامی شریعت سے متصادم نہیں ہیں انہیں داخل کر لیتے۔ اس کی ہزاروں مثالیں
 اسلامی تاریخ میں موجود ہیں۔ مثلاً خندق کھود کر دشمن سے مقابلہ کرنا، مجوسیوں کے طرز
 حساب کو اپنانا، فلسفہ یونان کو اسلامی عقائد کے اثبات کے لیے استعمال کرنا وغیرہ وغیرہ
 لہذا اولین ضرورت یہ ہے کہ ہم اپنے مقصد کی حقانیت پر پختہ یقین قائم کریں اور

پھر: اذا عزمنا فتوکل علی اللہ کا طرز عمل اختیار کریں کیونکہ

گماں آباد ہستی میں یقین مردِ مسلمان کا

بیاباں کی شبِ تاریک میں قندیلِ رہبانی

معاشرے کو تیار کرنا

کہا جاتا ہے اور یہ حقیقت ہے کہ ہمارا موجودہ معاشرہ اسلامی نظام عدل کو کما حقہ
 قبول کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا، کیونکہ ایک اسلامی معاشرے کے لیے تقویٰ کا جو معیار
 ہونا چاہیے وہ ہمارے معاشرے میں موجود نہیں۔

تبلیغ

ہمیں اس سوال پر دواولوں سے غور کرنے کی ضرورت ہے :
 (الف) ایک تو یہ کہ کیا نفاذ شریعت کو اس وقت تک معرض التواء میں رکھا جائے جب
 تک کہ معاشرہ اس کے لیے تیار نہ ہو جائے ؟ یہ طرز فکر غلط اور منہاج نبوت کے خلاف ہے
 اس لیے کہ اصلاح معاشرہ کے دیگر عوامل کے علاوہ قوی ترین عامل خود نفاذ شریعت ہے۔
 آپ روشنی لائیے ظلمت خود بخود دور ہو جائے گی۔ شریعت نور ہے اور معاشرے کے مفاصل ظلمت۔
 نور کے آجانے کے بعد انشاء اللہ العزیز ظلمت خود بخود کا فور ہو جائے گی۔ دوسری بات یہ کہ یہ کتنا کہ
 پہلے معاشرہ صحت مند ہو جائے تب شریعت نافذ کی جائے گی بالکل ایسا ہی ہے جیسے کسی مریض کو
 کسی طبیب کے پاس لے جایا جائے اور طبیب کہے کہ اس وقت یہ بیمار ہے جب صحت مند ہو جائے
 تب میرے پاس لے کر آنا حالانکہ شریعت ایک بیمار معاشرے کی خود طبیب ہے۔ اسے اپنی تمام تر
 برکات کے ساتھ آنے دیکھے وہ خود اس معاشرے کو صحت بخش دے گی۔ اللہ کے فضل و کرم سے
 ہمارے پاس تو ہر مرض کے لیے سامانِ شفا بغیر کسی تحریف و تبدل کے موجود ہے جو انسان کے ظاہری

و باطنی تمام امراض کے لیے داروئے شفا ہے۔ ارشاد باری ہے :

قُلْ هُوَ لِلَّذِينَ آمَنُوا هُدًى وَ شِفَاءً (السجده ۴۴)

ترجمہ: آپ اے میرے نبی کہہ دیجیے کہ یہ قرآن ایمان والوں کے لیے ہدایت اور شفا ہے۔

ایک مقام پر ارشاد ہوا :

وَقُلْ جَاءَ الْحَقُّ وَ نَزَّهَتْ الْبَاطِلُ إِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوقًا
وَ نُنزِّلُ مِنَ الْقُرْآنِ مَا هُوَ شِفَاءٌ وَ مَرَحْمَةٌ لِلْمُؤْمِنِينَ وَ
لَا يَزِيدُ الظَّالِمِينَ إِلَّا خَسَارًا ۝ (بنی اسرائیل ۸۱)

ترجمہ: آپ کہہ دیجیے کہ حق آگیا اور باطل مٹ گیا بیشک باطل تو مٹنے والا تھا۔ اور ہم قرآن میں ایسی چیزیں نازل کرتے ہیں جو ایمان والوں کے حق میں شفا اور رحمت ہیں۔ مگر ظالموں کے لیے خسارے کے سوا اور کسی چیز میں اضافہ نہیں کرتے۔

(ب) دوسری بات یہ کہ اگر اسلامی نظام عدل کو نافذ کرنا ہو تو اس کی شکل کیا ہوگی؟ اور معاشرے کو کس طرح تیار کیا جائے گا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اسلامی نظام عدل کو نافذ کر دیا جائے اور اس کے ساتھ ساتھ معاشرے کو اسلامی نظام عدل کو قبول کرنے کے لیے تیار کیا جائے۔ اس کے طریق پر بحث کرنے سے پہلے ضروری ہے کہ ہم اپنے حالات کا بالاختصار جائزہ

لیں۔ چند سال پہلے ہمارے معاشرے کی حالت بالکل سعدی کی اس حکایت کی طرح تھی جس میں سعدی نے اس شاعر کا واقعہ بیان کیا ہے جو ایک سردرات میں پوستین پہن کر ڈاکوؤں کے ایک قلعہ میں گیا تھا۔ اس نے حسب عادت ڈاکوؤں کے سردار کی شان میں قصیدہ مدحیہ پڑھا اور سردار نے انعام دینے کے بجائے شاعر کے کپڑے اتر کر ننگ دھڑنگ قلعے سے باہر نکلوا دیا۔ رات کا وقت تھا۔ کتوں نے جب شاعر بے چارے کو اس حال میں دیکھا تو بھونکنے لگے اور کاٹنے دوڑے۔ شاعر جھکا کہ پتھر اٹھا کر کتوں کو مارے تو پتھر برف کے ساکھڑے ہوئے تھے اس وقت شاعر نے کہا :

”اے چہ کہ سنگ را بستہ و سگ را کشادہ“

کہ یہ کیا کہینہ ہے کہ پتھر تو باندھ دیے ہیں اور کتوں کو کھلا چھوڑ دیا ہے۔

اب سے چند سال پہلے ہمارے معاشرے کا یہی حال تھا کہ اکابر اعازا اور اعازا اکابر بن گئے تھے۔ لاکھوں کے مجمع میں فخریہ اپنی شراب نوشی کا تذکرہ ہوتا تھا اور مجمع اس پہ تالیوں کے ذریعہ داد دیتا۔ بالکل وہی صورت تھی جسے بلقیس کی زبانی قرآن نے نقل کیا ہے کہ :

إِنَّ الْمُلُوكَ إِذْ دَخَلُوا قَرْيَةً أَفْسَدُوهَا وَجَعَلُوا أَعْرَافَهُمْ أَهْلِيهَا
 آذِلَّةً ر (النمل ۳۳)

ترجمہ: مطلق العنان — بادشاہ جب کسی بستی میں داخل ہوتے ہیں تو اس میں
 فساد پھیلاتے ہیں اور اس بستی کے شرفا کو ذلیل بنا دیتے ہیں۔

بحمد اللہ موجودہ حکومت جب سے آئی ہے وہ صورت حال نہیں ہے، بااں ہمہ اگر یہ
 کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ سنگ رالبتہ و سنگ راکشادہ والی شکل ضرور ہے یعنی بیک وقت
 ملک میں نیکی اور بدی کی قوتیں سرگرم عمل ہیں۔ ایں ہم فہمیت است۔ مگر فی الحال ہمارا مثال
 اس شخص کی ہے جو اپنے سامنے ایک ایسی بالٹی دھرے بیٹھا ہے جس میں پانچ سو چھید ہیں۔ اس
 بالٹی میں وہ شخص آبِ خیر مسلسل ڈالے جا رہا ہے لیکن ان چھیدوں کی وجہ سے پانی بالٹی
 میں ٹھہرتا نہیں۔ لہذا اگر ہم چاہتے ہیں کہ خیر کا پانی معاشرے کی بالٹی میں ٹھہرے تو ہمیں
 سب سے پہلے ان سوراخوں کو بند کرنا ہوگا جن کے راستے تمام اچھی تعلیمات باہر نکل جاتی
 ہیں۔ قرآن کریم نے اس کے لیے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا نسخہ تجویز کیا ہے۔

ارشاد ہے:

وَأْمُرْ بِالْمَعْرُوفِ وَانْهَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَأَصْبِرْ عَلَىٰ مَا أَصَابَكَ
 إِنَّ ذَٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْأُمُورِ ر (لقمان ۱۷)

ترجمہ: نیکی کا حکم دوہرائی سے روکو اور اس راستے میں جو مصائب آئیں انہیں صبر
 سے برداشت کرو کیونکہ یہ بڑی باتوں میں سے ہے۔

ایک مقام پر ارشاد ہے:

الَّذِينَ إِذَا مَكَتَاهُمْ فِي الْأَرْضِ أَخَامُوا الصَّلَاةَ وَالزَّكَاةَ
 وَأَمْرٌ ذَا بِالْمَعْرُوفِ وَنَهْوٌ عَنِ الْمُنْكَرِ وَ لِلَّهِ عَاقِبَةُ الْأُمُورِ ر

ر (الحج ۴۱)

ترجمہ: یہ وہ لوگ ہیں کہ اگر ہم ان کو ملک میں بااختیار کر دیں تو یہ لوگ نماز قائم
 کریں زکوٰۃ ادا کریں نیکی کاموں کا حکم کریں برے کاموں سے روکیں اور سب
 کاموں کا انجام خدا ہی کے اختیار میں ہے۔

صحیح مسلم شریف میں حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے حضور نے

ارشاد فرمایا:

رَأَى لِقَاءَهُمْ فِي حُلِيِّهِمْ وَرَأَى فِيهِمْ كَيْدًا وَنَجْوَى
 مِنْ نَرَايَ مِنْكُمْ مِنْكُمْ أَفَلَيْعَبُونَ بِسَيْدِهِ فَإِنْ كَانُوا
 لَيْسَتْ طَعْفُ فَيْلَسَا نَهْ فَإِنْ لَمْ يَسْتَطِيعْ فَيَقْلِبْهُ وَذَلِكَ
 أَوْضَعُ الْإِيْبَانِ

ترجمہ: تم میں سے جو شخص نبرائی کو دیکھے اسے چاہیے کہ اپنی قوتِ باہرہ سے اپنے رول کو
 لیکن اگر اسے اس بات کی طاقت نہ ہو تو وہاں سے اسے روکنے اور اگر اس کی بھی
 طاقت نہ ہو تو اسے دل سے اس برائی کو ہٹانے کی کوشش کرنی چاہئے۔ لیکن یہ ایمان کا کمزور ترین
 حالت ہے۔

ان آیات و حدیث کی روشنی میں ضروری ہے کہ نفاذِ عدلِ اسلامی کے ساتھ ساتھ
 یا کسی وقت و کسی جگہ یا کسی صورت سے کہ ایک طرف سے خیر کا علم ہو رہا ہے لیکن تعینِ اسی وقت
 کی تبلیغ کر رہی ہیں۔ یہی قرآن کے ذریعہ سے لوگوں کو مارد و ہمارے کی تربیت دینی جاری ہے
 دینی سنی آراء کے ذریعہ سے بے ہودہ اور گندی فلمیں دکھا کر عوام کا مذاق بگاڑنا یا بے

ان خیالات اور مسائل میں شہوت انگیز تصویریں شائع ہو رہی ہیں، جنسی ناول، جاہلوں
 ناول، بے ہودہ قسم کے ڈائجسٹ اور طرح طرح کے ناپاک رسالوں کی تبلیغ ہو رہی ہے۔ یہ
 صورتیں خیر کی آواز
 نقارہ نکلنے میں طوطی کی آواز میں سخاوت ہے۔

لہذا حکومت، دانشور طبقہ، ادباء، شعرا، صحافی، اساتذہ، علماء اور عوام
 مل کر معروف کی تبلیغ کریں اور منکرات کو اپنی استطاعت کے بموجب روکنے کی کوشش کریں۔
 کہ معاشرہ اصلاح پذیر نہ ہو جائے۔ اسلام میں اس طریق کو طریقِ تبلیغ کہتے ہیں۔

ترغیب

تبلیغ کے بعد جو چیز معاشرے کو بدلنے میں مدد و معاون ثابت ہوتی ہے وہ ترغیب
 ہے۔ اسی بنا پر ابتدائے اسلام میں مستحقین کو زکوٰۃ کی سہولت میں موقوفہ القلوب کو رکھا
 تھا تاکہ کفار اسلام قبول کرنے کے مادی فوائد دیکھیں اور محسوس کریں۔ لہذا اگر کسی

تفتیش

ہمارے ملک کے محکمہ پولیس کا جو حال ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں، عاقلانہ اشارہ کافی است۔ اب صورت حال یہ ہے کہ حدود کے مقدمات تفتیش کے ابتدائی مراحل ہی میں اس قدر خراب کر دیئے جاتے ہیں کہ حاکم اپنے اس یقین کے باوجود کہ مجرم نے جرم کا ارتکاب کیا ہے اس پر حد نافذ نہیں کر سکتا۔ اس لئے ضروری ہے کہ مقدمات کی تفتیش ربا لخصوص حدود قصاص کے مقدمات کی (کسی دوسرے ادارے کے سپرد کر دی جائے۔ اس کے لیے بہت سے اقدامات کیے جاسکتے ہیں۔ چند ایک کا ذکر کیا جا رہا ہے۔

(الف) سارے ملک میں اسلام کا حقیقی نظام احتساب قائم کر دیا جائے اور حدود قصاص کے مقدمات کی تفتیش محکمہ احتساب کے سپرد کر دی جائے۔

(ب) اگر بالفرض پہلی صورت دشوار ہو تو تفتیش کی ساری ذمہ داری سی۔ آئی۔ اے۔ پر ڈالی جائے۔

(ج) النسب یہ ہے کہ گورنر نہ انسپکشن ٹیم یا ماہی کورٹ انسپکشن ٹیم کی طرف سے ملک کے تمام افسروں میں سے بہترین افسروں کو چن کر تفتیشی افسر بنا دیا جائے اور انہیں تنخواہوں کا ایسا سکیل دیا جائے کہ رشوت ستانی کا امکان نہ رہے۔ اور اگر کسی محتسب یا تفتیشی افسر پر رشوت ستانی کا جرم ثابت ہو جائے تو اسے سزائے موت مع ضبطی املاک دی جائے۔

تدریب

اسلامی حدود قصاص کے مقدمات کا فیصلہ کرنے کے لیے جلد از جلد قاضیوں کی سرکاری سطح پر تربیت کا انصرام کیا جائے۔ اور ضروری قرار دیا جائے کہ قضاة جدید قوانین کی ضروری واقفیت کے ساتھ شرعی قوانین کے ماہر ہوں۔ قاضیوں کی تربیت کے لیے ہر صوبے میں ایک ادارہ وفاق کے ماتحت قائم کیا جائے۔ تمام اداروں کا نصاب ایک ہو اور سب کا امتحان وفاق ادارہ اپنے اہتمام میں لے۔ قاضیوں کے تقرر کے وقت صرف تعلیمی صلاحیت نہ دیکھی جائے بلکہ تقویٰ کا اعلا معیار بھی مد نظر رکھا جائے۔

تدوین فقہ

قرنِ اولیٰ میں جب کہ اسلام زیادہ تر عرب کے علاقے تک محدود تھا باضابطہ فقہ کی تدوین کی ضرورت پیش نہیں آئی کیونکہ اسلامی نظام نہایت سیدھا سادہ تھا اور عرب کا ماحول بھی سیدھا سادہ۔ لیکن جب فتوحات کی کثرت ہوئی اور مصری، ایرانی، کلدانی، ترک، رومی اور جنوبی ایشیا کی اقوام دائرہ اسلام میں داخل ہو گئیں تو معاشرہ پہلے کی طرح سیدھا سادہ نہ رہ گیا بلکہ اب نئے نئے مسائل نے سراٹھایا، عقلی موٹوگافیاں شروع ہوئیں اور اسلام کا نظام عدل ایرانی اور رومی نظام عدل کے بالمقابل آگیا تو ضرورت پیش آئی کہ اس عہد کے پیچیدہ معاشرے کی ضروریات کو پیش نظر رکھ کر باضابطہ طور پر فقہ کی تدوین کی جائے۔ اللہ تعالیٰ ہمارے فقہائے کرام کی قبور کو انوارِ برکات سے بھر دے کہ انھوں نے نہ تو ہمت ناری اور نہ لکیر کے فقیر بنے رہے بلکہ انہوں نے قرآن و سنت پر غور و فکر کر کے ان سے اصولوں کا استخراج کیا اور ان کی بنیاد پر فقہ کا ایک عظیم الشان سرمایہ جمع کر دیا، ایسا سرمایہ کہ جس کی بنیاد پر بنوعباسیہ کی جیسی عظیم الشان سلطنتوں کا نظام چلتا تھا۔ اور کبھی فقہ اسلامی کے بارے میں تنگی داماں کی شکایت نہیں کی گئی۔

الحمد للہ کہ آج وہ سارا علمی اور تحقیقی سرمایہ اپنی تمام تر جامعیت کے ساتھ محفوظ ہے۔ البتہ اگر یہ کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا کہ چونکہ چھٹی ساتویں صدی ہجری کے بعد اجتہاد کا سلسلہ رک گیا اس لئے ہماری فقہ میں جمود آگیا۔ زمانہ تو تہ تی کرتا رہا لیکن فقہ اپنی جگہ پر کھڑی رہ گئی لہذا ہماری فقہ کا بالخصوص وہ حصہ جو معاملات اور قضا و احکام سے متعلق ہے کسی قدر پیچھے رہ گیا ہے۔ اگرچہ فتاویٰ عالمگیری اور مجلۃ الاحکام الحدیثیہ جیسے کام ماضی میں ہوئے ہیں تاہم زمانہ جس تیزی سے پیچیدہ ہوتا جا رہا ہے یہ کام بھی مکنتی نہیں کہے جاسکتے لہذا ضروری ہے کہ ہم اپنی فقہ کے محولہ بالا حصے کا دوبارہ جائزہ لیں اور حالات حاضرہ کی روشنی میں اس کی تدوین جدید کریں۔ فقہ کی تدوین جدید کے وقت اگر مندرجہ ذیل امور کو مد نظر رکھا جائے تو کم سے کم غلطی کا امکان ہے:

(الف) اللہ تبارک تعالیٰ نے قرآن کریم میں فرمایا ہے:

يُرِيدُ اللَّهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيدُ بِكُمُ الْعُسْرَ (البقرہ ۱۸۵)

ترجمہ: اللہ تمہارے لیے آسانی چاہتا ہے وہ دشواری نہیں چاہتا۔

دیکھ رہی ہے۔ ستاروں کی گزر گاہوں کے ڈھونڈھنے والوں کی شبِ تاریک، تاریک سے تاریک
 تہ ہوتی جا رہی ہے۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کافۃ للناس بشیراً و نذیراً
 تھے، ان کے اسوۂ حسنہ کے ہم امین ہیں۔ ہمیں اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں خیر امتہ کے لقب
 سے نوازا ہے، ہم پر صرف اپنی ہی اصلاح کی ذمہ داری نہیں ہے بلکہ ہمارے لیے آخر جنت
 للناس کی بھی تصریح ہے، اس لیے انسانی زندگی کے ہر شعبے میں سیادت و قیادت کا فرض
 اسی امت کو ادا کرنا ہے۔ چودھویں صدی کے اختتام اور پندرھویں صدی کے آغاز میں اسلام
 کی نشاۃ ثانیہ کے بغیر آئندہ قطر آرزو ہے ہیں ان کے پیچھے غالباً تیز البرید کا رفرما ہے۔ اب اس امت
 کو اگلے بڑھ کر اسلام کو ایک فعال، متحرک اور انقلابی نظامِ حیات کی طرح پیش کرنا ہے۔ آج ہی
 کے دن صبح صادق کے وقت ندرت کا آفتاب وادی بطحا سے طلوع ہوا تھا، الحمد للہ کہ ہم آج
 پاکستان کے اس عظیم شہر سے آوازہ اخلاق بنوی بلند کر رہے ہیں۔ خدا کرے ہمارا یہ آوازہ عمر
 رواں کے لیے حیات نو کا پیغام اور ہماری یہ صدا کا روانِ ملت اسلامیہ کے لیے صلۃ الرحیل
 ثابت ہو۔ آمین

اندکے پیش نو گفتم نعم و ن ہر سعیدم
 کہ تو از وہ شوی، ورنہ سخن بسیار است

۱۹۵۶ء لکھنؤ میں لکھی گئی۔ اس وقت میں لکھنؤ میں تھا۔
 لکھنؤ میں لکھی گئی۔ اس وقت میں لکھنؤ میں تھا۔
 لکھنؤ میں لکھی گئی۔ اس وقت میں لکھنؤ میں تھا۔
 لکھنؤ میں لکھی گئی۔ اس وقت میں لکھنؤ میں تھا۔

لکھنؤ میں لکھی گئی۔ اس وقت میں لکھنؤ میں تھا۔
 لکھنؤ میں لکھی گئی۔ اس وقت میں لکھنؤ میں تھا۔
 لکھنؤ میں لکھی گئی۔ اس وقت میں لکھنؤ میں تھا۔

محنت کا ضابطہ اخلاق

(سیرۃ نبوی کی روشنی میں)

جناب محترم مولانا عبدالقدوس تاسمی

الحمد لله رب العالمين والصلوة على رسوله الذي كافت للناس وخاتم النبيين:
 فخر من سلين خاتم النبيين حضرت محمد مصطفيٰ احمد مجتبيٰ صلي الله عليه وسلم کی سیرت طیبہ
 اور خلق عظیم کا مستند ترین مرجع وہ ہے جو قرآن کریم کے حوالے سے تیار ہو جائے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ
 عنہا فرماتی ہیں ”کان نحلقة القرآن“ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت قرآن کریم تھی، یعنی حضور
 صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوۂ حسنہ قرآن کریم کی تعلیمات پر منطبق تھا۔
 قرآن کریم بتاتا ہے کہ محنت اور جہد و جہد انسان کی فطرت ہے۔ ارشاد باری ہے: ”لَقَدْ خَلَقْنَا
 الْإِنْسَانَ فِي كَبَدٍ“ (انسان کو ہم نے سخت مشقت کے لیے پیدا کیا ہے) اس آیت کا مفہوم یہی ہے کہ
 محنت اور کام انسان کی زندگی کا لازمہ ہے۔ جب تک وہ زندہ رہے گا کسی نہ کسی جسمانی یا دماغی عمل میں
 مصروف ہی رہے گا۔

عمل اور کام کا ذکر قرآن کریم میں بڑی کثرت سے آیا ہے یعنی لفظ عمل اور اُس کے مشتقات ۳۵۹
 مرتبہ اور فعل اور اُس کے مشتقات ۱۰۹ مرتبہ ذکر ہوئے ہیں۔ کسب، ابتغاء وغیرہ کئی اور ہم معنی الفاظ کا
 استعمال ان کے علاوہ ہے۔ ان آیات کا مرکزی نقطہ یہی ہے کہ انسان کوئی نہ کوئی عمل تو لازماً کرتا ہے جس کا
 نتیجہ اُس کے سامنے آکر رہے گا۔ اب یہ اُس کے انتخاب پر موقوف ہے۔ اگر اس کا عمل اچھا ہو تو نتیجہ
 اچھا رہے گا اور اگر عمل بُرا ہو تو نتیجہ بھی بُرا رہے گا۔ (فمن يعمل مثقال ذرة خیرا يبہ ومن يعمل
 مثقال ذرة شرا يبہ) (۲)

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ میں عمل سے متعلق تین امور نمایاں ہیں: اولاً یہ کہ
 حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری زندگی سراسر جہد و جہد اور سعی و عمل کا نمونہ تھی حضور کے شب و روز کا
 ایک لمحہ بھی فراغت یا غفلت سے نہیں گزرا۔ ثانیاً یہ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اعمال حسن انتخاب کا
 مثالی نمونہ تھے، جن میں سعادتِ اُخروی کا پہلو غالب تھا۔ ثالثاً یہ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اعمال میں
 دنیوی زندگی سے متعلق اعمال کا پہلو بھی کسی حد تک شامل تھا۔ حضور کی زندگی رہبانیت کی زندگی نہ تھی۔

عمل اور محنت کے بارے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات اور اُسوۂ حسنہ کا بنیادی نقطہ یہ ہے کہ محنت اور کام ایک قابلِ عزت عمل ہے جسے انبیاءؑ سرانجام دیتے رہے ہیں۔ کھیتی باڑی، شجر کاری، خیاطی، تجارتی، آہن گری وغیرہ متعدد پیشوں کی صنعت گری انبیاء کرامؑ ہی کی طرف منسوب ہے اور حضرت نوح علیہ السلام کی کشتی سازی اور حضرت داؤد علیہ السلام کی زرہ سازی کا تذکرہ قرآن کریم نے بھی فرمایا ہے۔

خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی قبل از نبوت کی زندگی میں دو ایسے مواقع کا تذکرہ آتا ہے جہاں آپ نے اُجرت پر کام کیا۔ ایک وہ موقع جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ والوں کی بکریاں چرائی تھیں۔ سنن نسائی میں حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ ایک دفعہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو بھی نبی گزرا ہے اُس نے شبانی کا عمل انجام دیا ہے۔ صحابہؓ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہؐ کیا آپ نے بھی ایسا کام انجام دیا ہے؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "وانا کنت اربعا مالا لاهل مکة بالقراریط" "میں بھی مکہ والوں کی بکریاں قراریط پر چرایا کرتا تھا" حدیث کے ایک راوی نے قراریط کی تشریح یہ کی ہے کہ ایک بکری کی چرائی کی اُجرت ایک قیراط تھی۔ بعض اور اصحاب کے خیال میں قراریط کسی چراگاہ کا نام ہے۔ دوسرا موقع وہ تھا جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت خدیجہ کا مال لے کر شام کا سفر اختیار کیا جس کی صورت یہ ہوئی کہ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے آپ کو بلا کر عرض کی (اور یہ اُس وقت کا واقعہ ہے جب ابھی آپ کا نکاح حضرت خدیجہؓ سے نہیں ہوا تھا) کہ مجھے آپ کے بارے میں معلوم ہوا ہے کہ آپ قول کے سچے، امانت دار اور بااخلاق ہیں۔ اگر آپ میرا مال تجارت کے لیے لے جانا قبول فرمائیں تو جو حق الخدمت میں دوسرے قریشیوں کو دیتی ہوں آپ کو اُس سے دو گنا دوں گی چنانچہ دو اونٹنیاں اُجرت ٹھہری۔ اور جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم حضرت خدیجہ کا مال لے جا کر بیچ آئے اور نفع دوسروں کی بہ نسبت دو گنا ہوا تو حضرت خدیجہؓ نے دو اونٹنیوں کے بجائے چار اونٹنیاں خدمت میں پیش کیں۔ اس واقعہ سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اُجرت پر کام کرنے والے کے جوہر یہ ہیں کہ سچا اور دیانت دار ہو اور کام کی صلاحیت اس میں موجود ہو اور کام کرنے والے کا یہ فرض ہے کہ عمل کے اختتام پر حق الخدمت پورا پیش کرے۔ اگر فریقین میں سے کوئی ایک یا دونوں مقررہ شرائط سے زائد کارکردگی دکھائیں تو یہ اُس کا احسان اور تبرع ہوگا۔ فریقِ ثانی اُس کے معاوضے کا ذمہ دار نہ ہوگا۔ اس مثال سے یہ واضح ہوتا ہے کہ مزدور اچھا کام کرے تو کام لینے والے کو بھی چاہیے کہ زیادہ اُجرت دے کر اُس کی حوصلہ افزائی فرمائے۔

عہد نبوت میں آپ کی توہمات تمام تر دعوتِ اسلام کی طرف مبذول رہیں۔ معاشی ضرورتوں کا

۶۰۔ اے انسانانہ ہر ایک سے تم کو جو تمہارے پاس ہے اسے اب بھٹکھینا
کسبِ معاش کی فضیلت
 تمہارے اہلکار

قرآن کریم کی مندرجہ ذیل آیات میں کسبِ معاش کی ترغیب دی گئی ہے اور وہ خلیعِ معاش کو

اللہ تعالیٰ کا فضل قرار دیا گیا ہے، (حجرات ۱۰) **وَجَبَلْنَا لَهُ رُحْمًا ذَاتًا**

۱۔ **وَمِنْ آيَاتِهِ مَا نَزَّلْنَا بِاللَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَابْتِغَاءَ كَفْمٍ مِنْ قَضِيهِ** (۱۹)

اور اس کی نشانیوں میں سے تمہارا سونا ہے رات اور دن میں اور اس میں ان کے امانت

اس کی دی ہوئی روزی کا تلاش کرنا ہے۔ (مذکورہ آیت سے منسوب)

۲۔ **وَمِنْ آيَاتِهِ جَعَلَ لَكُمْ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ لِتَسْكُنُوا فِيهِ وَلِتَبْتَغُوا مِنْ قَضِيهِ** (۲۰)

اور اور قیامت میں اس کی رخصت ہی تو ہے کہ اس کے تمہارے لیے رات اور دن بنا دے کہ تم اس میں آرام

رہیں آرام بھی لیں اور اس کی روزی بھی تلاش کرتے رہو تاکہ تم اس میں سے تمہاری حاجت لے سکو

۳۔ **وَمِنْ آيَاتِهِ جَعَلَ لَكُمْ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ لِتَسْكُنُوا فِيهِ وَلِتَبْتَغُوا مِنْ قَضِيهِ** (۲۱)

اور اور تمہارا پروردگار ہی تو ہے جو تمہارا رات دن بنا دے تاکہ تم اس میں سے تمہاری حاجت لے سکو

۴۔ **وَمِنْ آيَاتِهِ جَعَلَ لَكُمْ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ لِتَسْكُنُوا فِيهِ وَلِتَبْتَغُوا مِنْ قَضِيهِ** (۲۲)

اور اور تمہارا پروردگار ہی تو ہے جو تمہارا رات دن بنا دے تاکہ تم اس میں سے تمہاری حاجت لے سکو

۵۔ **وَمِنْ آيَاتِهِ جَعَلَ لَكُمْ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ لِتَسْكُنُوا فِيهِ وَلِتَبْتَغُوا مِنْ قَضِيهِ** (۲۳)

اور اور تمہارا پروردگار ہی تو ہے جو تمہارا رات دن بنا دے تاکہ تم اس میں سے تمہاری حاجت لے سکو

۶۔ **وَمِنْ آيَاتِهِ جَعَلَ لَكُمْ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ لِتَسْكُنُوا فِيهِ وَلِتَبْتَغُوا مِنْ قَضِيهِ** (۲۴)

اور اور تمہارا پروردگار ہی تو ہے جو تمہارا رات دن بنا دے تاکہ تم اس میں سے تمہاری حاجت لے سکو

۷۔ **وَمِنْ آيَاتِهِ جَعَلَ لَكُمْ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ لِتَسْكُنُوا فِيهِ وَلِتَبْتَغُوا مِنْ قَضِيهِ** (۲۵)

اور اور تمہارا پروردگار ہی تو ہے جو تمہارا رات دن بنا دے تاکہ تم اس میں سے تمہاری حاجت لے سکو

۸۔ **وَمِنْ آيَاتِهِ جَعَلَ لَكُمْ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ لِتَسْكُنُوا فِيهِ وَلِتَبْتَغُوا مِنْ قَضِيهِ** (۲۶)

اور اور تمہارا پروردگار ہی تو ہے جو تمہارا رات دن بنا دے تاکہ تم اس میں سے تمہاری حاجت لے سکو

۹۔ **وَمِنْ آيَاتِهِ جَعَلَ لَكُمْ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ لِتَسْكُنُوا فِيهِ وَلِتَبْتَغُوا مِنْ قَضِيهِ** (۲۷)

اور اور تمہارا پروردگار ہی تو ہے جو تمہارا رات دن بنا دے تاکہ تم اس میں سے تمہاری حاجت لے سکو

۱۰۔ **وَمِنْ آيَاتِهِ جَعَلَ لَكُمْ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ لِتَسْكُنُوا فِيهِ وَلِتَبْتَغُوا مِنْ قَضِيهِ** (۲۸)

اور اور تمہارا پروردگار ہی تو ہے جو تمہارا رات دن بنا دے تاکہ تم اس میں سے تمہاری حاجت لے سکو

۴- لان یحتطب احدکم حزمة علی ظہریٰ بخیر لہ من ان یسأل احدا
فیعطیہ او یمنعہ (۱۷)

دیہ کہ تم ایندھن کا گٹھا اپنی پیٹھ پر اٹھا لو۔ اور اسے بیچ کر گزارہ چلاؤ۔ اس سے بہتر
ہے کہ کسی سے مانگو چلے ہے وہ تمہیں کچھ دے یا نہ دے

۵- ان اللہ یحب العبد المؤمن المحترف (۱۸)

(اللہ تعالیٰ اُس مومن بندے کو پسند کرتا ہے

جو کسی حرفت میں لگا ہو)

۶- حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک انصاری حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوا اور کچھ

مانگنے لگا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا کہ کیا تمہارے گھر میں کچھ ہے؟ اُس نے عرض کی، جی ہاں ایک

ٹاٹ ہے جس کا کچھ حصہ میں بچھاتا اور کچھ حصہ اوڑھتا ہوں۔ اس کے علاوہ ایک لکڑی کا پیالہ ہے جس میں

میں پانی پیتا ہوں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمانے پر وہ دونوں چیزیں گھر سے لے آیا اور حضورؐ نے

انہیں نیلام کر کے دو درہم میں بیچا اور وہ درہم اُسے دے کر فرمایا کہ ایک درہم کاغذ خرید کر گھر میں ڈال

دو اور ایک درہم سے کلہاڑی کا پھل خرید کر میرے پاس لاؤ۔ اس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے

دست مبارک سے دستہ ڈال دیا اور فرمایا کہ جاؤ ایندھن بیچنے کی مزدوری کیا کرو اور پندرہ دن کے بعد

مجھے اطلاع دو۔ وہ پندرہ دن کے بعد آیا تو دس درہم کما چکا تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ

تمہارے لیے یہ محنت اس سے بہتر ہے کہ قیامت کے دن تمہارا سوال تمہارے چہرے پر داغ ہو۔ سوال

صرف تین اشخاص کے لیے جائز ہے: وہ فقیر جو اٹھنے کے قابل بالکل نہ ہو یا ایسا شخص جس پر تادان کا

زبردست بوجھ آپڑا ہو۔ یا وہ جس نے دیت کا بوجھ اٹھایا ہو اور وہ اسے تکلیف دے رہا ہو (۱۹)

۷- ایک دفعہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت میں چند صحابہ تشریف فرما تھے کہ سامنے سے ایک

پھرتیلا شخص گزارا۔ صحابہ فرماتے لگے کہ کیا اچھا ہوتا کہ اس شخص کی قوتیں جہاد کی راہ میں صرف ہوتیں۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر وہ اپنے چھوٹے عیال کے نفقہ کے لیے محنت کرنے جا رہا ہو تو

بھی اللہ کی راہ میں ہے اور اگر بوڑھے ماں باپ کے لیے محنت کا ارادہ ہو تب بھی اللہ کی راہ میں ہے۔

اور اگر سوال کی ذلت سے بچنے کے لیے نکلا ہو تب بھی فی سبیل اللہ ہے۔ ہاں اگر اس کی پھرتی فخر اور

دکھا دے کی ہو تو پھر شیطان کی راہ میں ہے (۲۰)

حکومت کے کسی منصب یا ملازمت میں مشغول رہنا بھی ایک عمل ہے جو محنت کے دائرے میں

آتا ہے۔ چنانچہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ خلیفہ ہوتے تو فرمایا، میری قوم کو یہ معلوم ہے کہ میرا پیشہ (تجارت)

میرے گھردالوں کے خرچے کے لیے کافی تھا۔ اب میں مسلمانوں کے کام میں مشغول ہو گیا ہوں، اس لیے ابوبکر کے گھردالے مسلمانوں کے بیت المال سے کھائیں گے اور ابوبکر اس میں مسلمانوں کے لیے محنت اور حرقت میں مشغول رہے گا۔^(۲۰)

خادموں کے ساتھ سلوک

- ۱۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ وسلم کے خادم تھے۔ فرماتے ہیں کہ میں نے دس سال حضورؐ کی خدمت کی۔ کبھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے اُف نہ کہا۔ اگر میں نے کبھی کوئی چیز تیار کی یا کوئی کام کیا تو یہ نہ فرمایا کہ ایسا کیوں کیا اور اگر کبھی کوئی کام چھوڑ دیا تو یہ نہ فرمایا کہ کیوں چھوڑا ہے۔^(۲۱)
- ۲۔ ارشاد فرمایا کہ اگر کسی کا خادم کھانا پکا کر اُس کے پاس لائے تو اُسے اپنے ساتھ کھانے کے لیے بٹھائے اور اگر نہ بٹھائے تو کھانے میں سے اُسے بھی کچھ کھلا دے، کیوں کہ خادم نے اس میں محنت کی ہے۔^(۲۲)
- ۳۔ حضرت ابو مسعود بدریؓ فرماتے ہیں کہ ایک دفعہ میں اپنے غلام کو مار رہا تھا۔ پیچھے سے آواز آئی کہ: ”ابو مسعود! جتنی دسترس تم کو اس غلام پر حاصل ہے اُس سے زیادہ دسترس اللہ تعالیٰ تم پر رکھتا ہے۔“ مڑ کر دیکھا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم تھے۔ میں نے فوراً کہا کہ: ”اب یہ اللہ تعالیٰ کے نام پر آزاد ہے۔“ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”اگر تم ایسا نہ کرتے تو دوزخ کی لپٹ تم تک پہنچ جاتی۔“^(۲۳)
- ۴۔ ایک صاحب فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت ابوذر غفاریؓ کو دیکھا کہ ایک غلام اُن کے ساتھ ہے اور دونوں یکساں جوڑے پہنے ہوئے ہیں۔ حضرت ابوذرؓ نے اس کی وجہ یوں بتائی کہ انھوں نے ایک دفعہ ایک بھائی یعنی غلام کو ناشائستہ بات کہی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم میں جاہلیت کا اثر باقی ہے۔ اور فرمایا:

ان انھوا نکم نحو نکم بمعلم اللہ تحت ایدیکم فمن کان انھوہ تحت یدہ
فلیطعہ مما یا کل ویلبسہ مما یلبس ولا تکلفوہم ما یغلبہم فان
کلفتموہم ما یغلبہم فاعینوہم

دیہ تمہارے بھائی، تمہارے خدام اللہ تعالیٰ نے تمہارے اختیار میں دیے ہیں۔
تو جب کسی کا بھائی اُس کے اختیار یعنی ماتحتی میں آئے تو جو خود کھائے اُس میں
سے اُسے بھی کھلائے اور جو خود پہنے اُس میں سے اُسے بھی پہنائے۔ ان پر ایسا
بوجھ نہ ڈالو جو اُن کے بس کا نہ ہو، اور اگر کوئی کام اُن کی طاقت سے زیادہ اُن کے
ذمے لگا دیا تو پھر اُن کی مدد کیا کرو۔^(۲۴)

لیکن (یہ شکاف) زندہ لوگوں کی نظروں کو برا لگتا ہے۔
حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں یہ بھی فرمایا کہ:

مَنْ مَاتَ عَدُوًّا لِقَوْمٍ فَهُوَ فِي مَمَاتِهِمْ وَهُوَ فِي مَمَاتِهِمْ وَهُوَ فِي مَمَاتِهِمْ
سب سے پہلے اور قرآن میں اپنے قاتل کے مال کا نیک بیان ہے اور اس سے اس شخص کے بارے میں یہ بات پتہ چلتی ہے کہ
بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ
خلف لاء جاتے ہیں اور یہی ہے اللہ کی نعمت ہے کہ اس نے اپنے بندوں کو اس قدر سمجھا دیا ہے کہ
کام کر کے والوں کے حقوق
میں ان کے حقوق کا اہتمام ہو اور ان کے حقوق کا اہتمام ہو اور ان کے حقوق کا اہتمام ہو
کیا چاہئے یہ معاملے کے ایک فرق کے طور پر وہ اس امر کا مجاز نہیں کہ کام کی تکمیل یا وقت پوری کرنے سے پہلے
حق الخدمت کا مطالبہ کرنے یا غیرتہ معاملہ صوبے سے زیادہ کا مطالبہ کرنے سے پہلے۔
اس بارے میں ہر عامل اور مزدور کا معاملہ اپنے معاہدے کے لحاظ سے طے ہوگا کہ کسی کو دوسرے
کا معاہدہ اس پر اثر انداز نہ ہوگا چنانچہ حضرت خذرجی نے جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو تجارت کے لیے
مال حوالے کیا تھا تو آپ کے ساتھ جو شرط معاہدہ طے ہوئی تھی وہ دوسروں سے جدا اور ممتاز تھی۔
اجرت کا معاہدہ طے کرنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ مزدور کو کام سے پہلے اجرت کی مقدار بتادی
جائے تاکہ بعد میں نزاع پیدا نہ ہو بلکہ اگر احتمال باقی رہے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:
جَلَسْتُ مِنْ رَجُلٍ اسْتَأْجَرَ جِيرًا فليُعَالَاهُ حُرًّا كَمَا كَانَ يَوْمَ تَوَدَّ أَنْ يَبْرَأَ مِنْهُ لِيُجِيرَ لِي
بِأَشْيِءِ كَرِيْمِي كَوْكَبِي مَزْدُورٌ كَوَكَبِي مَزْدُورٌ كَوَكَبِي مَزْدُورٌ كَوَكَبِي مَزْدُورٌ
تنبہ: کسی مزدور کی پہلے سے بتادئے (معاہدے) کے بعد اگر وہ کسی اور سے معاہدہ کرے تو پہلے سے بتادئے
بناوے اور جب کام کرنے والا کام کو مکمل کرے تو پھر اس کے حق الخدمت میں کمی نہ کرنا چاہئے نہیں۔
حضور کا ارشاد ہے:

اعطوا الاجير اجرة قبل ان يجف ريشه (۳۳)

بالتالي مع اشتراط ان يكون من المزدورين انهم من المزدورين انهم من المزدورين انهم من المزدورين
اس سے پہلے ہی پھلے اور شروع ان کے لئے (۳۴)۔ اور یہی ہے اللہ کی نعمت ہے کہ اس نے اپنے بندوں کو اس قدر سمجھا دیا ہے کہ
بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ
یہ بات ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ تم میں اشخاص کے خلاف میں خود مندعی
ہوں گا: ان میں سے ایک ذیہ شخصیت ہے جو کسی مزدور کو کام پر لگا کر اس سے کام پورا کرنے اور مزدور کا
حق پورا نہ دینے سے پہلے (۳۵)۔ اور یہی ہے اللہ کی نعمت ہے کہ اس نے اپنے بندوں کو اس قدر سمجھا دیا ہے کہ

عامل اور مزدور کے ساتھ احسان

شرائط معاہدہ سے زیادہ حسن سلوک تبرع اور احسان ہوگا۔ اس کی ایک مثال حدیث میں اس طرح آئی ہے کہ پچھنے لوگوں میں ایک شخص ایسا بھی تھا کہ اُس نے ایک مزدور سے مزدوری طے کی تھی اور جب مزدور کام کر چکا تو اُس نے واجب مزدوری اُس کو پیش کی مگر مزدور اس پر راضی نہ تھا بلکہ اور زائد کا مطالبہ کرنے لگا جس سے مالک نے انکار کیا۔ اور مزدور حق الخدمت چھوڑ کر چلا گیا۔ اس حق الخدمت کو مالک نے اُس مزدور کی طرف سے بکری پالنے میں لگایا۔ چند سالوں میں اس سے بڑا ریوڑ بنا۔ اتفاقاً وہ مزدور دوبارہ آیا اور اپنے حق کا مطالبہ کرنے لگا۔ مالک نے پورا ریوڑ اُس کے حوالے کیا، جس کو دیکھ کر مزدور بہت حیران رہ گیا۔ اُس کی اس نیکی کا صلہ اُسے دنیا میں یہ ملا کہ ایک دفعہ دو دوستوں کے ساتھ غار میں گھر گیا تھا۔ ہر ایک نے اپنی اپنی نیکی کے طفیل دعا مانگی۔ اُس نے بھی اپنی اس نیکی کے صلے خلاصی کی دعا مانگی۔ اور اُس کی دعا قبول ہو گئی۔ (۳)

اس مثال سے یہ سبق ملتا ہے کہ مزدور کو نفع بخش کاموں میں شریک کرنا چاہیے۔

محنت اور کسب کے جائز ذرائع

دلیل معاش کی تلاش انسان کے ذمے فرض ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت نے اس بارے میں کچھ پابندیاں بھی لگائی ہیں اور جن مکاسب سے معاشرے کو انفرادی یا اجتماعی نقصان پہنچتا ہے وہ ناجائز ٹھہراتے گئے ہیں۔ مثلاً حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تصویر سازی اور گلے بجانے کے پیشے کو ناجائز قرار دیا ہے۔ بچوں سے مزدوری کا کام لینا اور ہنرمند عورتوں کے سوا دوسری عورتوں سے محنت مزدوری کا کام لینا بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کے حوالے سے ناپسندیدہ بتایا گیا ہے۔

حوالے

- (۱) سورة البلد آیت ۴۔ (۲) سورة الزلزال آیات ۷، ۸۔ (۳) البخاری: الجامع الصحیح، کتاب الاجارات ۱: ۱۰۳۔ (۴) اسیرۃ الحلیبہ ۱: ۱۳۵۔ (۵) البنہانی وسائل الوصول الی شمائل الرسول ص ۱۳۱ انوری ذمہایۃ الارب ۱۸: ۲۶۳۔ (۶) زرقانی شرح مواہب ۴: ۲۶۵، شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا خصال نبوی ص ۲۸۔ (۷) برائے قمرست خدام رجوع کیجیے نہایت الارب ۱۸: ۲۲۹۔ ۲۳۷ و زاد المعاد ۱: ۱۹۔ (۸) البخاری الجامع الصحیح کتاب الاجارات ۱: ۳، ۴، زاد المعاد ۳: ۸۰۔

(٩) سورة الروم آية ٢٣ - (١٠) سورة القصص آية ٤٣ - (١١) سورة الاسراء آية ٤٤ - (١٢) سورة البقرة آية ١٩٨ - (١٣) ابن ماجه كتاب التجارات، والنسائي، السنن - كتاب البيوع ٢: ٢١٠ - (١٤) ابن ماجه عن مقدم بن معدكرب به حواله كنز العمال ٢: ٢٠٤ - (١٥) البخاري: الجامع، كتاب البيوع ١: ٢٤٨ - (١٦) البخاري الجامع: كتاب البيوع، حواله كزشته وكتاب المساقاة ١: ٣١٩ - (١٧) طبراني عن ابن عمر به حواله كز العمال ٢: ١ (١٨) سنن ابن داود به شرح بزل المجهود ٣: ٢٢ - (١٩) طبراني به حواله اشترأ كية الاسلام مصطفى السباعي وكنز العمال ٢: ٢٠٤ - (٢٠) البخاري: الجامع، كتاب البيوع ١: ٢٤٨ - (٢١) البخاري: الجامع، كتاب الادب ٢: ٨٩٢ (٢٢) ايضا كتاب العتق ١: ٣٢٤ - (٢٣) مسلم: الصحيح ٢: ٥١ - (٢٤) البخاري: الجامع ١: ٢٣٤ و مسلم الصحيح ٢: ٥٢ - (٢٥) البخاري: الجامع، كتاب الاجارات ١: ٣٠١ - (٢٦) سورة يوسف آية ٥٥ - (٢٧) سورة القصص آية ٢٤ - (٢٨) مجمع الزوائد ٤: ٩٨ - (٢٩) حواله كزشته - (٣٠) طبقات ابن سعد جزء ١ ص ٩٢ - (٣١) الجامع الصحيح كتاب العتق ١: ٣٢٤ - (٣٢) النسائي: سنن ٢: ١٥٠ و محمد بن الحسن في كتاب الآثار عن ابي سعيد الخدري مرفوعاً - (٣٣) مجمع الزوائد ٤: ٩٤ - (٣٤) البيهقي، السنن ٤: ١٢١ (٣٥) الجامع الصحيح، كتاب الاجارات ١: ٣٠٢، ٣٠٣ - (٣٦) محمد مبارك: نظام الاسلام، الاقتصاد ص ٤

اسلامی تعلیمات اور تربیتِ اساتذہ

جناب محترم پروفیسر اسماعیل سیٹھی

پیشتر اس کے کہ اسلامی تعلیمات کی روشنی میں اساتذہ کی تربیت و تعلیم کے مقاصد پر گفتگو کی جائے یہ طے کرنا ہوگا کہ اندر سے اسلام انسان کی تخلیق کی غرض و غایت کیا ہے؟ کائنات ہستی میں اس کا مقام کیا ہے؟ اس کے فرائض اور ذمے داریاں کیا ہیں؟ قرآن حمید کس قسم کے انسان تیار کرنا چاہتا ہے اور ان کے لیے کس نوع کی تعلیم تجویز کرتا ہے؟

بدیہی اور بہت واضح بات ہے کہ اسلامی تعلیمات کی رو سے پورے کرہٴ خاکی اور اس میں پھیلی ہوئی وسیع و عریض کائنات پر انسان کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ وہ ایک ایسا محور ہے جس کے گرد پورا عالم آب و گل گھوم رہا ہے۔ کتاب اللہ الحمید نے تو لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ فِي أَحْسَنِ تَقْوِيمٍ کہہ کر انسان کو بے حد و حساب اور بے نہایت شرف و مجد کا سزاوار ٹھہرا دیا ہے۔ اسلامی تعلیمات کی رو سے انسان ناطق ہستی ہے۔ اقبال نے کہا تھا کہ:

ناطق ہستی در جہاں بودن خوش است

حضرت مر علی شاہ کا ارشاد ہے:

حمد اسماء را تو بہ ات آمدی

علم الاسماء طرائز جہاں تست

نداں خلیفہ و منظر ذات آمدی

اسجد و الادم ہم اندر شان تست

حضرت مولانا روم بھی فرما رہے ہیں کہ انسان عالم ہست و بود کا مرکز ہے، وہ مسجود ملائک ہے اور اس دنیا کی ہر چیز اس کی اطاعت و متابعت کے لیے ہے۔

قرآن عظیم کی تعریحات کے مطابق خدا تعالیٰ ایک قائم بالذات، ایک ذی حیات ابدی

اور مطلقاً آزاد تخلیقی فعلیت ہے جو واحد، قادر مطلق، حسن مکمل، مہربان کامل، عادل اور

خیر تمام ہے۔ مذہبی نقطہ نظر سے انسان میں اللہ تعالیٰ نے اپنی روح پھونکی ہے۔ اس لیے

خدا کی صفات اس کے لیے ایک نصب العین کی حیثیت رکھتی ہیں۔ لہذا وحدت، ابدیت،

صداقت، حسن، خیر، محبت، عدل، قوت اور آزادی انسان کے لیے بنیادی اقدار ہیں۔

ن کے زیادہ سے زیادہ حصول کے لیے سعی کرنا اس کی اپنی ذات اور اس کے ماحول کے دوسرے
 فرد کے لیے انتہائی ضروری ہے۔

ان توضیحات کے پیش نظر اسلام وہ انسان پیدا کرنا چاہتا ہے جو علم حاصل کر کے متعلق
 شیا سے واقف ہو۔ اور وہ انسان جو بہتر مقاصد کے لئے زندہ رہے۔ اور چند روزہ دنیا میں
 اس کی زندگی کا مقصد صرف رب العزت کی خوشنودی کا حصول اور اس کی رضا طلبی ہو، جو خواہشات
 نفسانی پر قابو رکھے، محبوب خداوندی اور یاد الہی میں سرشار رہے، احکام خداوندی کی پابندی
 میں جسم و جان کی ساری قوتیں صرف کر دے۔ بنی نوع انسان کی خدمت اور تکمیل آدمیت اس کا شعار
 ہو۔ فطرت کی قوتوں کا مسخر کرنے والا ہو کہ ان سے انسانیت کی فوز و فلاح کا کام لیا جاسکے۔ ایک
 ایسا انسان جس کے بارے میں اقبال نے فرمایا کہ:

ما تھ ہے اللہ کا بندہ مومن کا نا تھ

غالب و کارہ آفرین کار کشا کارہ سازہ

خاکی و نوری بہاد بندہ مولا صفات

ہر دو جہان سے غنی اس کا دل بے نیازہ

مقصد گفتگو یہ ہے کہ اسلام انسان سے صداقت، حسن، خیر یا با الفاظ دیگر تخلقوا
 بِاخْلَاقِ اللّٰهِ کا طلب گزار ہے۔ اسلام اسے دوسری دنیا کے لئے تیار کرنا چاہتا ہے اور
 ساتھ ہی یہ بھی چاہتا ہے کہ اُس کی یہ دنیا بھی سنوری رہے۔ گویا اسلام ایسے انسان چاہتا ہے
 جو عبودیت اور کاملیت کے جیتے جاگتے نمونے ہوں۔

اسلام نے اپنے انسانِ مطلوب کے لئے تعلیم کا جو ڈھانچہ تیار کیا ہے اُس کا بنیادی
 نکتہ یہ ہے کہ وہ ایک خاص مزاج اور ایک خاص سیرت و کردار کے انسان تیار کرنا چاہتا ہے۔
 اس کے نزدیک مساجد و مکاتب سیرت سازی کی فیکٹریاں ہیں جہاں سے خاص قسم کے انسان
 ڈھل کے نکلتے ہیں۔ اسلام کا نظامِ تعلیم اسی ایک نکتہ پر استوار ہے۔ اسلام جس قسم کا معاشرہ
 اور جس قسم کے انسان تیار کرنا چاہتا ہے ان کی تعلیم کے مقاصد کا تعین بھی اُس نے خود ہی کر دیا
 ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ تعلیم اسلام کے نزدیک بنیادی اہمیت کی چیز ہے۔ یہ تو انسان کو ظلمت سے
 نور کی طرف لے جانے والا عمل ہے۔ یُنْخِرُ جُھُمًا مِنَ الظُّلُمَاتِ اِلَى النُّورِ ۝ کا مفہوم یہی
 ہے۔

استاد کا مقام

اسلام کے تعلیمی نظریات میں استاد کو اولین حیثیت دی گئی ہے۔ خدائے رب العزت نے اپنے آپ کو بھی معلم کہہ کے پکارا ہے کہ: "خدا نے انسان کو وہ کچھ سکھایا جو وہ نہیں جانتا تھا۔ عَلَّمَ آدَمَ الْأَسْمَاءَ كُلَّهَا" آیہ کریمہ خدا کی اس صفت کی علامت ہے۔ دوسری جگہ ارشاد ہوا۔ "وَإِنَّكَ لَتَلْقَى الْقُرْآنَ مِنْ لَدُنْ حَكِيمٍ عَلِيمٍ" اے محمد یقیناً تم یہ قرآن ایک حکیم و عظیم ہستی کی طرف سے پارہ ہے ہو۔"

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ معلم کامل تھے خود کو بہ حیثیت معلم بھی پیش کیا ہے
إِنَّمَا بُعِثْتُ مُعَلِّمًا ۝ اور پھر فرمایا فَتَجَلَّىٰ لِی كُلُّ شَيْءٍ فَعَرَفْتُهُ۔

اسے بھی حضور کا معلمانہ معجزہ جانئے کہ ان کے زیر تربیت صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی صورت میں ایک ایسی جماعت تیار ہو کر نکلی کہ بلا شائبہ ریب چشم ملک نے انسانوں کا ایک ایسا پاک نفس اور قدسی صفات گروہ آج تک نہیں دیکھا۔ حضور کے فیضانِ سرمدی نے جو شاگرد تیار کئے اس کے ثمرات زندگی کے ہر میدان میں آج بھی دیکھے جاسکتے ہیں۔
شہلی نے اسی لئے کہا تھا:

اُس کی برکت تھی کہ صحرائے حجازی کی سموم بن گئی دہر میں جا کر جن آرائے بہار
یہ اسی کا تھا کہ شہمہ کہ عرب کے بچے کھینے جاتے تھے ایوان کہ کسریٰ میں شکار
یہ اسی کا تھا نتیجہ کہ عرب کے رہزن فاش کرنے لگے جبریل امین کے اسرار

استاد کا مقام صرف علم کی ترسیل نہیں بلکہ قرآن مجید نے یُذَكِّرُهُمْ وَيَعَلِّمُهُمُ
الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ کہہ کے اس کے مقدس ترین اور اہم ترین فریضے کی نشان دہی بھی کر دی
ہے کہ استاد کا کام تربیت و تادیب بھی ہے جس کے بغیر تعلیم ایک میکانکی عمل رہ جاتا ہے۔ حضور
کے اسوہ حسنہ میں تعلیم و تدریس پر بہت زور ملتا ہے۔ ایک حدیث کی رو سے، ایک ایسا عالم
جو اپنے علم پر عمل کرتا ہے اور یہ علم دوسروں تک پہنچاتا ہے قابل رشک مقام رکھتا ہے۔ اس معیار
میں حضور کی حکمت بالغہ کی معراج دیکھو کہ آپ نے بعض قیدیوں کے لئے ذرہ ذرہ کے طور
پر ٹھہرا دیا کہ وہ ناخواندہ لوگوں کو پڑھنا سکھائیں۔ حضور نے دعوتِ حق کا کام بے غرض
ہو کر انجام دیا۔ کوئی ذاتی ملاوٹ والہ نہ تھا۔ صرف خدا کی مخلوق کی بہبود و پیش نظر تھی۔ قرآن کریم
میں یوں ذکر ہوا۔ لَنْ لَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ أَجْرًا إِنْ هُوَ إِلَّا ذِكْرٌ لِّبِلَدٍ لِّئَلَّيْنِ ۝

اسے نبی کہہ دو کہ میں اس تبلیغ اور ہدایت کے کام پر تم سے کسی اجر کا طالب نہیں ہوں یہ تو ایک عام نعمت ہے تمام دنیا والوں کے لیے۔

نصاب

تعلیمی فلسفے میں سب سے بڑا سوال یہ ہوتا ہے کہ مجوزہ نظام سے کس قسم کا ذہن پیدا کرنا مقصود ہوتا ہے۔ چنانچہ ہر ملک و قوم کے حکماء نے اپنے عقاید اور اسواں کو سامنے رکھ کر تعلیمی نصاب مدون کیے۔ اسلام میں چونکہ دین و دنیا کی تفریق نہیں اہل ایمان کی دعا ہے جو ارشادِ الہی سے ثابت ہے رَبَّنَا آتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَفِي الْآخِرَةِ حَسَنَةً، لہذا مفکرین اسلام نے ایک ایسا نصاب مرتب کرنے کی کوشش کی جس کی تحصیل کے بعد انسان دین و دنیا دونوں کی نعمتوں سے متمتع ہو سکے۔ اس کی یہ دنیا بھی سنورے اور عاقبت بھی۔ اپنے اپنے طور پر مختلف ممالک میں مفکرین امت نے قرآن و سنت کی روشنی میں تعلیم کا مقصد و مہیا ج طے کر کے تدوین کی کوشش کی۔ یہ پہلو مسلمانوں کی تعلیمی تاریخ کا ایک روشن باب ہے۔ مسلم ماہرین میں غزالی نے وجدان اور تعقل دونوں کو علم کا موضوع یا ذریعہ قرار دیا اور یہ کہا کہ علم کی غایت علم اعلیٰ یا وجدانی علم کا حصول ہے۔ ان کے نزدیک رضائے الہی علم کا سب سے بڑا ثمر ہے۔ باقی علوم ان کے نزدیک کسب و کتاب ہیں۔ برصغیر ہندوستان میں شاہ ولی اللہ دہلوی کا اہم کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے دین و دنیا دونوں کو زندگی کی کلیت کے لئے لازمی قرار دیا۔ بغداد میں مسلمانوں کی تعلیم کا جو سب سے بڑا دستاں قائم ہوا اس کی خصوصیت وہی زندگی کی ہمہ گیری دین و دنیا کی وحدت اور مادہ اور روح کا اشتراک تھی۔

افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ شاہ ولی اللہ اور حضرت امام غزالی کی تلقینات سے ہم کوئی فائدہ نہ اٹھا سکے۔ آج ہمارا نظام تعلیم جس ابتری، پریشانی، شکوک و شبہات کا شکار ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارا نصاب مادہ و روح کے اشتراک اور دین و دنیا کی وحدت سے محروم ہے۔ امام غزالی نے علم کی دو قسمیں بیان کی ہیں۔ محمودہ اور مذمومہ۔ دوسری قسم کا علم عقاید میں اشتباہ پیدا کرتا ہے اور انسان سے عقیدے کی قوت اور زندگی کی حرارت پھین لیتا ہے۔ لیکن ایسا تو نہیں کہ ہمارا علم محمودہ کی بجائے مذمومہ کے حصار میں ہے۔ اس غلط فہمی کا ازالہ ضروری ہے کہ تعلیم جو بھی ہو مفید ہے۔ اسلام نے اسے غلط قرار دیا ہے۔ چنانچہ جناب رسالت مآب کا ارشاد ہے کہ اللَّهُمَّ إِنِّي أَعُوذُ بِكَ مِنْ عِلْمٍ لَا يَنْفَعُ۔ اے خدا مجھے بے نفع علم سے بچانا۔ گویا صحیح علم وہ ہے جو علم نافع ہو۔ ہمارے آج کے حالات کا تقاضا ہے کہ ہم اپنے نصابات کو بے بہتتی

اور غیر نافعیت سے بچائیں۔

قرآن نے سنرئہم آیاتنا فی الآفاقِ وَفِی الْفُصُحِمْ فرما کر مطالعہ فطرت پر بڑا زور دیا۔ ہمارے نصابِ تعلیم میں یہ مطالعہ انسانی زندگی میں خرید کر کے لئے استعمال ہونا چاہیے۔ نصاب میں پند و موعظت کے ساتھ ساتھ انکار اور بد عملی کے نتائج بھی واضح کئے جائیں۔ جیسے کہ قرآن پاک میں ہے۔ **آلَھُمْ سَہْ کِتَابٌ اُنزِلَ اِلَیْکَ فَلَا یَکُنْ فِی صَدْرِکَ حَرَجٌ مِّنْهُ لِتُنذِرَ بِهِ وَذِکْرٰی لِلْمُؤْمِنِیْنَ۔**

طریق تدریس

آج کے غلط تعلیمی نظریات نے استاد کو معلم کے مقام سے گر کر اُسے ایک اہل کارہ کی حیثیت دے دی ہے۔ وہ آج ایک ادارہ، ایک انجمن، ایک ستارہ نور نہیں محکمہ تعلیم کا ایک تنخواہ دار ملازم ہے جو باقی ملازمین سرکار کی نسبت کسی فوقیت کا حامل نہیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ استاد کا طرز تدریس ایک مشینو عمل ہو کر رہ گیا ہے۔ جس کے نتائج سے قوم اچھی طرح آگاہ ہے۔ نہ اُسے اپنے مشن سے محبت ہے اور نہ ان مقاصد سے لگاؤ جن کے پیش نظر یہ فریضہ اُس کے سپرد کیا گیا ہے۔

اساتذہ کے لئے مسجد نبوی کے معلمِ کامل کی حیاتِ مقدسہ میں بصیرت کے بے شمار پہلو ہیں جن کو سامنے رکھ کر استاد کی تربیت کی جاسکتی ہے اور جن پہلوؤں کو اپنا کر وہ اپنے مشن کی تکمیل کرسکتا ہے۔

شفقت رحیم حضور کے طرزِ تعلیم میں نمایاں ترین عنصر شفقت و محبت کا ہے۔ حضور سراپا رحمت عالم تھے۔ ان کی محبت و رافت نے عرب کے گنوار اور ضعیف بدوؤں کی دنیا بدل کے رکھ دی۔ آپ کی تعلیم کی اثر انگیزی میں نمایاں پہلو آپ کی شفقت کا ہے۔ ام مہاجر نے حضور کا حلیہ مبارک یوں بیان کیا۔ **بُولُتَا تُو مَعْلُومٌ ہُو تَا کہ اُس کی آواز گہ دو پیش پہ چھا گئی ہے، گفتگو ایسی تھی جیسے زبان سے موتیوں کی لڑی سلسلہ دار نکلتی چلی آرہی ہو۔** کلام شیریں اور واضح تھا۔ نہ کم گو تھا نہ زیادہ باتیں کرنے والے دور سے سنو تو اس کی آواز سب سے زیادہ بلند مگر خوش آہنگ محسوس ہوتی اور قریب سے سنو تو بہت شیریں اور لطیف معلوم ہوتی۔ ارشاد باری تھا: **وَلَا تَجْهَرْ بِصَلَاتِکَ وَلَا تَخَافُتْ بِہَا وَابْتَغِ بَیْنَ ذَلِکَ سَبِیْلًا** اور اپنی نماز نہ بہت بلند آواز سے پڑھو اور نہ پست آواز سے پڑھو۔

یاد رہے کہ حضور کا طریقہ تعلیم یہ تھا کہ ہر ہدایت کو تین بار دہراتے تھے۔ تاکہ ذہن نشین ہو جائے۔

گفتگو نہایت شیریں اور دل آویز ہوتی تھی۔ باتیں آہستہ اور سادہ الفاظ میں فرماتے تھے جس سے مخاطب کا الشراح صدر ہو جاتا تھا۔ قرآن پاک میں یوں ذکر ہوا:

فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللَّهِ لِنْتَ لَهُمْ وَلَوْ كُنْتَ فَظًا غَلِيظَ الْقَلْبِ لَانفَضُّوا
مِن مَّحْوِكَ (آل عمران)

یعنی یہ اللہ کی رحمت ہے کہ تم ان لوگوں کے لئے نرم ہو۔ ورنہ اگر تم درشت شو اور سنگدل ہوتے تو یہ سب لوگ تمہارے گرد و پیش سے چھٹ جاتے۔

یہی سلیح اپنے مخاطبین کی ذہنی سطح اور تفہیم مطالب کا اتنا خیال رکھتے تھے کہ بیک وقت قرآن پاک کی دس آیتوں سے زیادہ نہیں بیان کیں۔ قرآن حمید نے جو مختلف مقامات پر بعض واقعات کو مختلف پیرایوں اور اسالیب میں دہرایا ہے اس سے بھی مراد یہ ہے کہ بات دلوں میں جاگزیں ہو جائے۔ قرآن کی حکایات و تماشیل بھی اس باب میں رہنمائی کرتی ہیں۔ کہ بات کو دل و دماغ میں کیسے بٹھایا جائے۔

لَقَدْ كَانَ فِي قَصصِهِمْ عِبْرَةٌ لِّأُولِي الْأَلْبَابِ ہ مولانا روم نے کیسے دلکش الفاظ میں قرآن پاک کی تلاوت کے فوائد بیان کیے ہیں :

پوں تو در قرآن حق بگرہ سختی	باروان انبیاء آمینختی
ہست قرآن حالکے انبیاء	ما بیان بحر پاک کبریا
ور بخوانی و نہ قرآن پذیر	انبیاء و اولیا را دیدہ گیر
ور پذیرائی چو بر خوانی قصص	مرغ جانت تنگ آید در قصص

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ تدریس، تدریج اور عمل کا تھا۔ چنانچہ جب حضور نے معاذ کو یمن کی طرف روانہ کیا تو آپ نے فرمایا:

تم اس قوم کے پاس جاتے ہو جو اہل کتاب ہیں اس لیے سب سے پہلی چیز جس کی طرف تم بلاؤ وہ یہ ہے کہ وہ لوگ خدا کو ایک سمجھیں۔ جب وہ لوگ اس کو مان لیں تو ان کو بتلاؤ کہ اللہ نے ان پر دن رات میں پانچ وقت کی نمازیں فرض کی ہیں۔ جب وہ لوگ نماز پڑھنے لگیں تو اسٹھیں بتلاؤ کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے مالوں میں نہ کوآۃ فرض کی ہے۔ جو ان کے مالداروں سے لی جائے گی اور ان کے فقراء کو دی جائے گی۔ جب وہ لوگ اس کا اقرار کریں تو ان سے نہ کوآۃ لے لو اور لوگوں کے عمدہ مالوں سے پہرہ بیز کرو۔

طریق تدریس

سرحدیہ عالم حضور کے طریق تدریس میں سوال و جواب کا طریقہ بھی شامل تھا۔ ایک دفعہ حضور نے صحابہ سے پوچھا۔ یہ کون سا دن ہے؟ پھر آپ نے فرمایا کیا یہ قربانی کا دن نہیں ہے؟ صحابہ نے جواباً عرض کیا کہ آج قربانی کا دن ہے۔

حضور نے پھر دریافت فرمایا کہ یہ کونسا مہینہ ہے؟ کیا یہ ذوالحجہ نہیں ہے؟ صحابہ نے عرض کیا یہ مہینہ ذوالحجہ کا ہے۔ اس کے بعد حضور نے فرمایا کہ تمہارے خون اور تمہارے مال آپس میں تمہارے لیے ایسے ہی حرام ہیں جیسے اس دن میں، تمہارے اس مہینے میں، تمہارے اس شہر میں حرام ہیں۔

اور تعلیم کو عوام تک پہنچانے کے لیے حضور نے ارشاد فرمایا:

لِيُبَيِّغَ الشَّاهِدُ الْغَائِبَ

علم حاصل کرنے کے لیے قرآن کریم نے مشاہدہ، غور و فکر، عقل، تجربہ، ایمان، کشف والہام روایئے صادقہ اور یقین کے ذرائع بیان فرمائے ہیں۔

مشاہدہ کائنات اور تحقیق و جستجو کے لیے بہت سے مقامات پر ترغیب دی گئی ہے۔ ایک مقام پر سوال اٹھا کر کہا جاتا ہے۔ کیا پرندوں کی طرف نہیں دیکھتے کہ پہ پھیلے اڑتے پھرتے ہیں۔

أَوَلَمْ يَرَوْا إِلَى الطَّيْرِ فَوْقَهُمْ

کسی جگہ پھلوں کو دیکھنے کی طرف اشارہ ہوتا ہے:

أَنْظُرُوا إِلَى ثَمَرِهِ إِذَا أَثْمَرَ

پھر ارشاد ہوا۔ قُلِ الْظُّرُومُ وَمَا ذَا فِي السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ. آپ کہہ دیجیے کہ تم غور کرو اور دیکھو۔ کہ کیا کیا چیزیں ہیں آسمانوں میں اور زمین میں۔ کہیں آغازِ تخلیق کے متعلق سوال کیا گیا۔ اَوَلَمْ يَرَوْا كَيْفَ يُبْدِئُ اللَّهُ الْخَلْقَ. کہیں تدریجی عملِ تخلیق کا ذکر ہوتا ہے۔

إِنَّا كُلَّ شَيْءٍ خَلَقْنَاهُ بِقَدَرٍ

حضور نے بھی اسلام کی دعوت دیتے وقت اسی تدریج کے قانون کو پیش نظر رکھا۔ نبوت کے پہلے تین سال تک خفیہ طریقے سے اسلام کی تعلیمات افراد کو پہنچاتے رہے۔ اٹھائی سال کے بعد حضور نے دارالرقم میں مرکز قائم فرمایا۔ اس کے بعد حسب ارشاد باری: وَأَنْزَلْنَا عَشِيرَتَكَ الْأَقْرَبِينَ هَٰذَا حَضْرًا لِنُفِخِ فِي الصُّورِ لِقَوْمٍ يَعْلَمُونَ۔ اس موقع پر حضور نے ایک ایک کو اس کے نام سے

مخاطب فرمایا: "یا بنی عبدالمطلب، یا عباس، یا صفیہ"

اس کے بعد حضور نے ایک دن صبح سویرے پہاڑی پر چڑھ کر یا صبا جاہ کہہ کر ایک خانہ دان والوں کو پکارا۔ حضور کا خطبہ بہت جامع اور مختصر ہوتا تھا۔ جو کہ کے مقام پر آپ نے یوں ارشاد فرمایا:

فَإِنَّ أَصْدَقَ الْحَدِيثِ كِتَابُ اللَّهِ - صدق و راستی میں سب سے بڑھا ہوا مجموعہ کلام اللہ کی کتاب ہے۔

وَأَحْسَنَ الْقَصَصِ بِمَا أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ هَذَا الْقُرْآنَ -

تمام بیانات سے پاکیزہ ترین اور خوب ترین بیان قرآن مجید ہے۔

وَأَخْيَرُ الْأَعْمَالِ مَا نَفَع - بہترین اعمال وہ ہیں جن سے انسان کو دینی، اخلاقی اور روحانی

فائدہ ملے۔

جامع المسائل آنحضرتؐ نے ہر نقل قیصر روم کے نام جو دعوت نامہ بھیجا اس کے الفاظ بھی سادہ، جامع اور مختصر ہیں:

إِنِّي أَدْعُوكَ بِدَعَايَةِ الْإِسْلَامِ أَسْلِمَ تَسْلَمَ -

حضرات! آخر میں اتنا عرض کر دوں کہ ہمارے جملہ مسائل اور مشکلات کا حل صرف اور صرف عشق رسولؐ میں مضمر ہے۔ ہزاروں تعلیمی پالیسیاں بنائیے۔ اگر ان میں عشق رسولؐ کی جھلک نہیں تو یقیناً نیچے

قطعاً بے مصرف و بے فائدہ ہیں۔ جب تک ہمارا نظام تعلیم حب رسولؐ کے گرد نہیں گھومے گا وہ نتائج ہرگز ہرگز برآمد نہیں ہوں گے جن کے لئے قوم چشم براہ ہے۔

پندارہ سعدی کہ راہ صفا تو ان رفت جز در پے مصطفیٰ!

نظامِ تعلیم و تربیت - اخلاقِ نبوی کی روشنی میں

جناب محترم ڈاکٹر معصوم علی ترمذی

سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی سرچشمہٴ رشد و ہدایت ہے۔ اس ذاتِ گرامی سے نور کی وہ کرنیں پھوٹی ہیں جن کی چمک دمک سے ساری دنیا میں اجالا ہو گیا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سرتاپا رحمت بھی تھے اور ہدایت بھی۔ تعلیم و تعلم، صلاح و فلاح، ہدایت و استقامت کے جو دل نشیں اندازہ آپ کی ذاتِ والا صفات سے بروئے کار آئے انھوں نے عرب کے بادیہ نشینوں کو مملکتوں کا سلطان بنا دیا۔ آج یہ میرا خوشگوار فرض ہے کہ اخلاقِ نبوی کی روشنی میں نظامِ تعلیم و تربیت کا جائزہ لوں۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ کہاں اخلاقِ نبوی کا بحرِ بیکراں اور کہاں میری ناچیز فہم و دانش۔ بہر حال کوشش کر سکتا ہوں اور وہ بھی صرف اس لیے کہ ناچیز ہونے کے باوجود نسبتِ اسی ذاتِ گرامی صلی اللہ علیہ وسلم سے حاصل ہے۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ابتدا میں چند ضروری نکتوں کی وضاحت کر دی جائے۔

کسی فرد یا جماعت کی فوز و فلاح کا انحصار اس کے حسنِ عمل اور خوبی کردار پر ہے، اور حسنِ عمل یا خوبی کردار موقوف ہے صحیح اور صالح تعلیم و تربیت پر۔ تعلیم و تربیت اگر صحیح ہے تو ایسی نسل پروران چمٹھے گی جس کے کردار کی استقامت سے ٹکرانے والی ہر باطل قوت پاش پاش ہو کر رہ جائے گی۔ کیونکہ بقول شاعر:

دل بدل جاتے ہیں تعلیم بدل جانے سے

اور جب دل کی دنیا بدل جائے تو پھر خارجی دنیا بدلتے دیر نہیں لگتی۔ گویا قوموں کی حیات اور ان کی ساری صلاح و فلاح کا مدار صحیح تعلیم و تربیت پر ہے۔

تعلیم و تربیت کی اسی اہمیت کے پیش نظر خالقِ کائنات نے تعلیم و تربیت کو رسول اللہ کا بنیادی فریضہٴ نبوت قرار دیا۔ چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

”اللہ تعالیٰ نے ایمان والوں پر احسان کیا جو ان میں رسول بھیجا انہی میں کا ان پر اس کی آیتیں پڑھتا ہے اور ان کو پاک کرتا ہے۔ اور ان کو سکھاتا ہے کتاب اور

کام کی باتیں اور وہ تو پہلے سے صریح گمراہی میں تھے۔ (آل عمران)

اس آیت کریمہ میں بیان کردہ چاروں باتوں (تلاوت آیات، تزکیہ نفس، احکام کتاب اور تعلیم حکمت) کا تعلق تعلیم و تربیت ہی کے اساسی پہلوؤں سے ہے، بلکہ یہ کہنا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہی وہ عناصرِ راجعہ ہیں جن سے اسلامی نظامِ تعلیم یا نئی گمراہی کا اختیار کردہ نظامِ تعلیم و تربیت تشکیل پاتا ہے۔ گویا اسلامی نظامِ تعلیم کے بنیادی مقاصد یہ ہیں۔

۱۔ نئی نسل کو ان کے خالق و مالک کے احکامات بعینہ ان الفاظ میں پہنچائے جائیں جن میں وہ نازل ہوئے ہیں۔

۲۔ قرآن پاک کا وہ مفہوم و مطلب جو اللہ کے رسولؐ نے وحی الہی کے تحت بتایا اسے ذہن نشین کر لیا جائے۔

۳۔ نئی پود کو حکمت و سنت یعنی زندگی گزارنے کے نبوی اسلوب سے آگاہ کیا جائے جو زندگی کے چھوٹے بڑے تمام شعبوں پر حاوی ہو۔

۴۔ قرآن و سنت کی تعلیم کے ساتھ ساتھ نئی نسل کی اخلاقی اصلاح، اس کی زندگی کو اسلامی سانچے میں ڈھانسنے اور افکار و خیالات کو پاکیزہ بنانے کے لیے علمی اور روحانی تربیت سبھی کی جائے، نیز جو کچھ بھی وہ سیکھیں تربیت یافتہ افراد کی نگرانی میں اس پر عمل بھی کریں، تاکہ ان کی تعلیم صرف اعتقاد و نظریات تک ہی محدود نہ رہے بلکہ عملی صورت اختیار کر کے ان کی زندگی میں مثبت اور مفید تبدیلیاں پیدا کریں۔

ان مقاصد کے حصول کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہایت مدبرانہ، حکیمانہ، مریبانہ اور مشفقانہ اسلوب اختیار فرمایا، جو بلاشبہ معلمین کے لئے بہترین نمونہ ہے۔ معلم اعظم ہونے کی حیثیت سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے علم کی قدر و قیمت بیان فرمائی تاکہ لوگوں میں تحصیل علم کی لگن پیدا ہو۔ پانچہ ایک حدیث میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

”اللہ تعالیٰ جس کی بھلائی کا ارادہ فرماتے ہیں اسے دینی بصیرت عطا فرماتے ہیں۔“

اسی طرح ایک حدیث میں ہے کہ:

”جو شخص علم حاصل کرنے کے لیے گھر سے نکلے وہ اپنے گھر واپس لے کر آئے گا اللہ کی راہ میں رہتا ہے۔“

اصحاب علم کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے حضورؐ کی زبان مبارک سے کہلوا یا کہ:

”علم والے اور جاہل آپس میں کیسے برابر ہو سکتے ہیں؟“

چنانچہ حدیث میں علما کو انبیا کا وارث قرار دیا گیا ہے۔ اور طالبین علم کے بارے میں فرمایا کہ اگر انھیں تحصیل علم میں موت آجائے تو وہ شہادت کا مرتبہ پائیں گے۔

تسلیم و تعلیم کے ساتھ اصلاح معاشرہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بنیادی فرائض میں شامل تھا۔ چنانچہ آپ قرآنی تعلیمات کو خصوصی انداز میں بیان فرماتے۔

اس سلسلے میں حضور اجتماعات سے بھی خطاب فرماتے اور انفرادی طور پر بھی دعوت دیتے تھے۔ بعض اوقات منتخب افراد کو جمع کر کے ان کی تعلیم و تربیت کا انتظام بھی فرماتے۔ قرآن کریم کی عبارت پڑھتے پھر اس کی تشریح و توضیح فرماتے، صحابہ کرام اکٹھے ہوتے اور مختلف امور پر بحث و تمحیص کرتے اور اپنے پیغمبر سے رہنمائی حاصل کرتے۔ درس و تدریس کا سلسلہ ایک زمانے تک دارالارقم میں جاری رہا۔

پھر قریش مکہ نے جب آپ کو آپ کے رفقاء کے ساتھ شعب ابی طالب میں محصور کر دیا تو وہیں پر یہ مجالس قائم ہونے لگیں۔ پھر ہجرت کے بعد حضرت ابوالیوب الفزاری کے مکان پر اور پھر مسجد نبویؐ میں درس و تدریس ہونے لگی۔ بعد ازاں آپ نے ایک باضابطہ درس گاہ کی بنیاد ڈالی، اور خود معلم اول کی حیثیت سے وہاں تعلیم و تربیت فرمانے لگے۔ یہ درس گاہ ”صفہ“ کے نام سے مشہور ہے۔ صفہ عربی میں سائبان کو کہتے ہیں۔ یہ مسجد نبویؐ کے شمالی جانب ایک چبوترہ تھا جہاں وہ صحابہ قیام پذیر تھے جو علم دین سیکھنے کی غرض سے مختلف علاقوں سے آتے تھے۔ ان کی مجموعی تعداد تقریباً چار سو تک تھی، گویا وقتاً فوقتاً ان میں کمی بیشی ہوتی رہتی تھی۔ حضرت بلال، حضرت صہیب رومی، حضرت عمار بن یاسر، حضرت سلمان فارسی اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہما صفہ کی اسی مشہور درس گاہ سے تعلق رکھتے تھے۔ ان میں جو قرآن کی تعلیم زبانی حاصل کر لیتے وہ ”قرا“ کہلاتے تھے۔ اسلام کی دعوت عام کرنے کی غرض سے یہی لوگ بھیجے جاتے تھے۔ غزوہ احد کے بعد ۴ھ میں بڑے معونہ میں دعوت اسلام کی غرض سے بھیجے جانے والے بن ستر (۷۰) قرا کو شہید کر دیا گیا تھا وہ انہی میں سے تھے۔

تعلیم و تربیت کا ایک عام اور واضح اصول یہ ہے کہ حسب موقع نرمی اور سختی دونوں سے کام لیا جائے۔ نرمی کے موقع پر نرمی اور سختی کے موقع پر سختی۔ معلم و مربی کامل ہونے کی حیثیت سے نبی کریمؐ نے سختی اور نرمی دونوں سے کام لیا۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ حضورؐ نے اپنی ذات کے لیے کسی سے بدلہ نہیں لیا مگر شریعت کی حد توڑنے پر سزا دینا ضروری سمجھا۔ آپ حدود اللہ کے سلسلے میں کسی مصلحت کے روادار نہ تھے، البتہ عام معاملات میں نہایت نرمی، تحمل اور بڑوباری

سے کام لیتے تھے۔

حضور اکرم کے طریقہ تعلیم میں ایک اہم بات یہ تھی کہ موقع و محل کے مطابق نصیحت فرماتے اور مخاطب کے فہم و ادراک اور اس کی استعداد کو پیش نظر رکھ کر بات کرتے تھے۔ آپ نے فرمایا کہ لوگوں سے ان کی سمجھ بوجھ کے مطابق بات کرو۔ چنانچہ حضور اکرم ایک بدو اور ایک شہری یا سمجھ دار یا کم فہم سے گفتگو کرتے وقت مختلف انداز اختیار فرماتے تھے۔ نیز ہر شخص کے حالات کے مطابق اسے نصیحت فرماتے۔ چنانچہ ایک صحابی، حضرت جابر کو پہلے نصیحت فرمائی کہ غور نہ کرو اور اپنے آپ کو بڑا نہ سمجھو اور پھر اس پر عمل کی تدابیر بتائیں۔ لیکن جب ایک اور شخص نے عرض کیا کہ مجھے نصیحت فرمائیے تو صرف اتنا ارشاد ہوا کہ ”غصہ نہ کر“ اس نے کئی دفعہ اپنا سوال دہرایا مگر ہر دفعہ آپ نے یہی جواب دیا کہ ”غصہ نہ کر“

معلم اعظم اول حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم انسانی نفسیات اور اس کی محدود صلاحیتوں سے بخوبی واقف تھے۔ چنانچہ تعلیم و تربیت کے لیے ایسا طریقہ استعمال فرماتے جو گراں نہ گزرتا۔ بعض باتیں مثالوں اور تشبیہات سے سمجھاتے، کبھی توجہ اور مہمک پیدا کرنے کی غرض سے صحابہ کرام سے سوال کرتے اور پھر صحابہ کا اضطراب دیکھ کر خود ہی جواب دیتے، کبھی ان کے جواب میں ترمیم فرمادیتے۔ مثلاً ایک بار دریافت فرمایا کہ تم پہلوان کسے کہتے ہو؟ صحابہ نے عرض کیا جسے کشتی میں کوئی پھپھار نہ سکے۔ آپ نے فرمایا نہیں بلکہ پہلوان وہ ہے جو غصہ میں اپنے نفس پر قابو رکھے۔

حضور اکرم کے طریقہ تعلیم کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ آپ تعلیم و تعلم کو اس انداز سے جاری رکھتے کہ متعلمین ذرہ برابر کتابت محسوس نہ کرنے پائیں اور تدریس ان کے لیے فرحت و انبساط کا باعث بنے۔ اس لیے کہ جبر و اکراہ سے مفید نتائج ممکن نہیں۔ چنانچہ حضرت ابن مسعود فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمیں تعلیم دینے میں دنوں کا وقفہ دیتے تاکہ ہم اکتانہ سبائیں۔ جہاں آپ تعلیم و تعلم کے دوران اصول تدریج کو پیش نظر رکھتے وہاں گفتگو میں عجلت سے کام نہ لیتے، آہستہ آہستہ اور مٹھ مٹھ کر بات کرتے اور اصول اعادہ کے تحت دو دو تین تین بار دہراتے تاکہ متعلم کے ذہن نشین ہو جائے۔ حضرت عروہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ جب گفتگو فرماتے تھے تو درمیان میں وقفہ کرتے اور بات کو کھول کر بیان کرتے تاکہ سننے والا اسے اپنے ذہن میں محفوظ رکھ سکے۔ آپ مشکل الفاظ استعمال کرنے سے گریز فرماتے تھے بلکہ آپ کا انداز اتنا ہی سادہ اور دلنشین ہوتا تھا جتنا حضرت ابن عباس رسول اللہ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا:

سکھاؤ، آسانی پیدا کرو، مشکل نہیں، اور جیب کوئی مفصّے میں ہو تو اسے خاموش
ہو جانا چاہیے۔

آپ میں ایک بڑی خصوصیت تواضع اور انکساری تھی۔ آپ بڑے حلیم الطبع اور بردبار تھے۔
بعض دیہاتی تو بڑے اکھڑ پن سے پیش آتے اور درشتگی کا مظاہرہ کرتے۔ لیکن آپ نہایت تحمل سے
انہیں مطمئن فرماتے۔ آپ کی حیثیت ایک متواضع برادر اور ایک رحیم و شفیق باپ کی تھی۔ آپ نے
فرمایا میں تمہارے لیے تمہارے باپ کی مانند ہوں۔ گویا آپ بڑے خوشگوار ماحول اور نہایت
دلنشین انداز سے تعلیم دیتے تھے۔

ایک اور چیز جو آپ کے طریقہ تعلیم میں ملتی ہے وہ یہ ہے کہ فضائل کو عمدہ تشبیہوں
کے ساتھ اور رذائل کو قبیح مناظر اور قابل نفرت صورتوں میں اس طرح پیش کیا جائے کہ سننے
والا بالطبع فضائل کی طرف مائل اور رذائل سے متنفر ہو جائے۔ خدا کی راہ میں خرچ کرنا ایک
اخلاقی فضیلت ہے جس کی مثال یوں بیان فرمائی:

”یہ نیکی ایک دانہ ہے جو زمین سے سات بالیں بن کر اگتا ہے اور ہر بانی میں سینکڑوں دانے
پھلتے ہیں۔ اس طرح نیکی کا یہ ایک دانہ سینکڑوں ربانی انعامات کا باعث ہوتا ہے۔“
اس کے مقابلے میں نمائش کی نیکی کو بے نتیجہ قرار دیا گیا۔ کہا گیا، اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی
کسان اپنا بیج چٹان پر پھینک دے جس پر ذرا سی مٹی ہو، ذرا سی بارش ہوئی تو بیج اور مٹی سب بہ گئی۔
اس بیج سے ایک دانہ بھی پیدا نہ ہوگا۔ اسی طرح یتیم کما مال کھانے والے کے بارے میں فرمایا کہ وہ اپنے
مردہ بھائی کا گوشت نوچ نوچ کر کھاتا ہے۔

اس کے ساتھ ساتھ آپ کی سیرت اور عملی اسوہ میں ایسا زبردست اثر تھا جس نے بہت قلیل عمر
میں ایک درمادہ قوم کو دنیا کا مادی اور رہنما بنا دیا۔ آپ کے اخلاق اور کردار ہی کے فیضان سے
تقریباً سو لاکھ صحابہ کرام کو وہ عظمت عطا ہوئی کہ دنیا کا بڑے سے بڑا آدمی ان کی خاک پا کے برابر بھی
نہیں ہو سکتا۔

اسلامی نظام تعلیم کے بنیادی خدو خال اور رسول اللہ کے طریق تربیت پر غور کرنے سے یہ
بات نمایاں ہو کر سامنے آتی ہے کہ یہ سارا نظام اس نصب العین اور نظریہ حیات کے گرد گھومتا ہے جسے سلام
کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔

در اصل نظریہ تعلیم نظریہ حیات ہی کا عکس ہوا کرتا ہے۔ تعلیم کا مقصد تعمیر سیرت و کردار ہے
یا دوسرے لفظوں میں ایک انسان کو اس قابل بنانا ہے کہ اس کا اپنے نظریہ حیات یا اس نصب العین

پر جسے اس نے قبول کیا ہے غیر متزلزل یقین و ایمان پیدا ہو۔

بعض ماہرین تعلیم مغرب کی تقلید میں بدقسمتی سے ہم جس کے عادی ہو چکے ہیں، فرماتے ہیں کہ مذہب سے تعلیم کو الگ رکھنا چاہیے۔ تعلیم کا مقصد حصول علم ہے، اسے بالکل غیر جانبدار ہونا چاہیے تاکہ ایک شخص اس علم کی روشنی میں آزادانہ طور پر مسائل و معاملات زندگی کو پرکھے اور نتائج اخذ کرے۔ لیکن اگر ٹھنڈے دل سے غور کیا جائے تو اہل مغرب کی اس کاروائی کی وجہ ہماری سمجھ میں آسکتی ہے۔ اہل مغرب نے اگر تعلیم کو مذہب سے الگ کر دیا ہے تو ان کے لیے یہ ضروری تھا۔ اس لیے کہ جب مذہب ان کے تصور حیات سے کوئی تعلق نہیں رکھتا تو کس طرح ممکن ہے کہ وہ ان کے نظام تعلیم کا جزو قرار پائے۔ مذہب کو سیاست سے الگ کرنے کے بعد مغربی اقوام کے لیے یہ ممکن ہی نہیں کہ وہ اسے تعلیم یا کسی اور شعبہ حیات میں ساتھ رکھتے۔

مذہب اور تعلیم کا افتراق، مذہب اور سیاست کے افتراق کا لازمی نتیجہ ہے اور مذہب کو سیاست سے الگ کرنے پر وہ اس لیے مجبور ہوئے کہ ان کا مذہب ان منظم جماعتوں کی ضروریات کو پورا کرنے سے قاصر تھا جنہیں ریاستیں کما جاتا ہے۔ انھوں نے مذہب کو سیاست سے مجبوراً اس وقت الگ کیا کہ جب کلیسا اور ریاست کے طویل جھگڑوں نے یہ بات پوری طرح ثابت کر دی کہ دونوں کا یکجا رکھنا بے سود بلکہ ناممکن ہے۔

بعض اوقات یورپ میں کلیسا اور ریاست کی جہانی گومیکا و فی فلسفہ کی طرف منسوب کیا جاتا ہے جس نے حکمرانوں کو یہ اختیار دے دیا تھا کہ اگر ریاست کے اندرونی اور بیرونی انتظام کے لیے ضروری ہو تو وہ ہر قسم کی مذہبی اور اخلاقی قیود کو توڑ کر جو چاہیں کر سکتے ہیں۔ لیکن فی الحقیقت یورپ میں میکا و فی فلسفہ کا ظہور ہی اس وقت ہوا کہ جب یورپ کی اقوام اسے قبول کرنے کے لیے پہلے ہی پوری طرح سے آمادہ ہو چکی تھیں۔

اس کے برعکس زندگی کا وہ تصور جو ہمیں اسلام نے دیا ہے عیسائیت کے تصور سے یکسر مختلف ہے۔ اسلام زندگی کے تمام شعبوں پر عادی ہے۔ سیاست اس سے نہ صرف مطابقت رکھتی ہے بلکہ وہ اس سے الگ نہیں ہو سکتی بقول اقبال:

جہاں ہوں سیاست سے تو رہ جاتی ہے پنگیزی

پھر ہمیں کیا ضرورت ہے کہ ہم تعلیم کے بارے میں وہی نقطہ نظر اختیار کریں جو یورپی اقوام کو عیسائیت کے نقائص کی بنا پر اختیار کرنا پڑا۔ مغرب کے ماہرین تعلیم کے لئے مذہب اور تعلیم کو باہم رکھنا ایسا ہی مضحکہ خیز ہے جیسا کہ ہمارے لئے مذہب اور تعلیم کو جدا رکھنا۔

اگر ہم رائج الوقت دیگر نظریات حیات مثلاً اشتراکیت، جمہوریت، قومیت وغیرہ کا مطالعہ کریں تو یہ حقیقت آشکارا ہو جاتی ہے کہ ایک قوم کا نصب العین اور تصور حیات اس کی زندگی کے تمام

شعبوں پر حکومت کرتا ہے۔ اس کا نظام قانون، نظام سیاست، نظام تعلیم، نظام معاشیات، غرض کہ اس کی زندگی کے تمام اعمال اس کے ماتحت تشکیل پاتے ہیں اور وہ ان کی خدمت کے لیے وجود میں آئے ہیں اور ہر آن اس کی خدمت کے لیے وقف رہتے ہیں۔

ہمیں اگر بحیثیت مسلمان جینا ہے تو ہمارے لیے اس کے سوا کوئی راہ مستقیم نہیں کہ ہم اس نظام تعلیم و تربیت کو اپنائیں جو ہمارے نصب العین کا محافظ ہو، کیونکہ دنیا میں کوئی قوم ایسی نہیں جس کا نظام تعلیم اس کے نصب العین سے ہم آہنگ نہ ہو۔

ہماری زندگی کے مختلف شعبوں میں جو انحطاط کا عمل جاری ہے وہ غلط تربیت کی بنا پر اپنے نصب العین سے دوری کے باعث ہے۔ نصب العین سے دوری تعلیم و تربیت میں کاروباری ذہنیت پیدا کرتی ہے، اور جب کوئی چیز کاروباری سطح پر آجائے تو اس میں کسی بلند مقصد کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ایک کاروباری آدمی کے سامنے صرف اپنا مفاد ہوتا ہے اور کوئی دوسرا مقصد نہیں ہوتا۔ وہ وہی مال منڈی میں لائے گا جس کے زیادہ خریدار ہوں۔ شکایت کی جاتی ہے کہ نئی نسل بے راہروی کا شکار ہے، اس میں احترام و تعظیم کے جذبات مفقود ہیں۔ سوال یہ ہے کہ انھوں نے یہ سیکھا ہی کب ہے۔ کیا نئی نسل کی تربیت ان خطوط پر ہو رہی ہے جس کے نتیجے میں یہ عنصر پیدا ہو؟ احترام کا موجب وہ تعلیم بنتی ہے جو ذہنوں میں جلا تلو ب میں پاکیزگی، فکر میں بلندی، معاشرے میں ہمدردی، انفرادی اور اجتماعی زندگی میں حسن توازن اور انسانیت میں ارتقا اور نصب العین سے قربت پیدا کرے۔ احترام و تعظیم پیدا ہوتے ہیں عظمت کے احساس سے۔ آپ ان کی تربیت انی خطوط پر کیجئے جس سے وہ اپنے نصب العین کے سچے عاشق بن جائیں۔ جب اپنے نصب العین کی عظمت ان کے سامنے بے نقاب ہوگی تو ان کی نگہ عقیدت خود بخود اس کی بارگاہ میں سبک جائے گی۔ احترام نام ہے اعترافِ عظمت کا۔ عظمت ہوگی تو احترام خود بخود پیدا ہوگا۔ حقیقت خود کو منواتی ہے منوائی نہیں جاتی۔ ان کے سامنے ایسے افراد پیش کیجئے جو اسلامی سیرت کے پیکر ہوں اور جن کی زندگیوں ان کے اپنے نصب العین کی عملی تصویریں ہوں تو پھر دیکھئے یہی نوجوان مجسم تنظیم بنتے ہیں یا نہیں اور اس سلسلے میں کامل ترین اور روشن ترین مثال یعنی نبی کریم کا اسوۂ حسنہ ہمارے سامنے ہے دعویٰ نبوت کے بعد قریش نے کیا کچھ نہیں کہا مگر کسی نے یہ جرات نہیں کی کہ آپ کے اخلاق و اعمال کے خلاف ایک حرف بھی نہ بان سے نکال سکے۔ جہاں دوستوں کی نگاہوں کے سہارے آپ کے لیے وقف تھے وہاں آپ کے کٹر مخالفین کے پر غرور سر بھی آپ کی بلند کرداری کے سامنے خم تھے۔

آج بھی ہو جو براہیم کا ایماں پیدا
آگ کر سکتی ہے اندازہ گلستاں پیدا

عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ بچے کی تعلیم اس وقت شروع ہوتی ہے کہ جب وہ مکتب یا اسکول جاتا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ جب بچہ اسکول جانے کے قابل ہوتا ہے اس وقت تک وہ بہت کچھ سیکھ چکا ہوتا ہے۔ ماہرین نفسیات کے مطابق تین چار سال کی عمر میں بچہ جو کچھ سیکھتا ہے اس کا اثر تمام زندگی رہتا ہے۔ ظاہر ہے اس عمر میں بچہ گھری میں رہتا ہے، بلکہ زیادہ تر ماں کی گود میں۔ گویا تربیت کی ابتدا ماں کی گود سے ہوتی ہے۔ اسی بنا پر کہا جاتا ہے کہ اولین مکتب ماں کی گود ہے۔ لہذا ماں کی یہ بہت بڑی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنی ساری توجہ بچوں کی صحیح تربیت پر مرکوز رکھے۔ تاکہ اس کی جملہ صلاحیتوں میں نکھار پیدا ہو۔

اولاد کی پرورش اور اس کی تربیت کا ماں کے ساتھ ساتھ باپ بھی پوری طرح ذمہ دار ہے۔ اسلام مرد و عورت دونوں کو اولاد کی تعلیم و تربیت کا ذمہ دار ٹھہراتا ہے۔ لیکن اگر ہم اپنے گرد و پیش پر نظر ڈالیں تو ہم دیکھیں گے کہ آج کے والدین اپنی معاشی و دیگر مصروفیات کی بنا پر اپنے بچوں کی تربیت پر برائے نام ہی وقت دے پاتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان کے پہلے معلم یا مربی بچائے ان کے والدین کے ٹی۔ وی، ریڈیو، گھر کے ملازم یا پھر ان کے پڑوسی اور ان کے ارد گرد پھیلا ہوا غیر اسلامی معاشرہ ٹھرتے ہیں۔ اس طرح کی تربیت پائے ہوئے بچے بڑے ہو کر پہلے اپنے لیے اور پھر پورے معاشرے کے لیے مہیت بن جاتے ہیں۔

توقع کی جاتی ہے کہ اسکول، کالج یا یونیورسٹی ان بچوں کو صحیح تعلیم و تربیت دے سکیں گے لیکن یہ امید ایک امید موموم ہی رہ جاتی ہے، کیونکہ اسکول اور کالج کا مقصد تو یہ ہے کہ یہاں اس تعلیم و تربیت کا نشوونما کیا جائے جو بچہ ابتداءً اپنے گھر سے لے کر آیا ہے یا پھر اس کی تربیت میں جو کمی رہ گئی ہے اسے پورا کر کے اس کی سیرت سازی کی جائے۔ لیکن جب بچہ سرے سے ہی اس صحیح تعلیم و تربیت سے محروم رکھا گیا ہو اسے اپنے والدین سے ملنی چاہیے تھی تو پھر دوسروں سے اس کی اصلاح کی توقع رکھنا بے سود ہے۔

بچہ تو دراصل ایک سیدھی اور نرم و نازک شاخ کی مانند ہوتا ہے۔ یہ اس کے والدین یا اس کے سرپرست ہوتے ہیں جو اپنی صحیح یا غلط تربیت سے اسے جدر چلاتے ہیں موڑ لیتے ہیں۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد کہ :

”ہر بچہ اسلامی فطرت پہ پیدا ہوتا ہے۔ پھر اس کے والدین اس کو یہودی، نصرانی یا

مجوسی بنالیتے ہیں۔ اس حقیقت کو آشکارا کرتا ہے۔

لہذا ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم سب پہلے تعلیم و تربیت کے سلسلے میں حضور اکرم ص کا اسوہ معلوم کریں اور پھر ان کے بنائے ہوئے اصولوں کی روشنی میں اپنے بچوں کی تربیت کریں جس کی ابتدا والدین دسرپرست اپنے گھر سے کریں اور پھر مکتب و مدرسہ کے مدرسین اور اسکول و کالج اور یونیورسٹی کے اساتذہ انہیں اسلامی اقدار سے روشناس کرتے ہوئے اچھا شہری بنانے میں اپنے اپنے فرائض پوزے کریں۔ اگر ہم نے ایسا کر لیا تو ہم ایک ایسی نسل تیار کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے جو اسوہ رسول پر عمل پیرا اور اخلاق نبوی کو اپنانے والی ہو۔

یہ ہماری خوش قسمتی ہے اور ہمیں اس سلسلے میں دنیا کی دوسری تمام اقوام سے امتیاز حاصل ہے کہ ہمارے پاس تعلیم و تربیت، اخلاقیات، نصب العین کی بلندی اور پاکیزگی کا موثر ترین نمونہ موجود ہے۔ جس سے ہم زندگی کے ہر شعبے میں مہر پورا استفادہ کر سکتے ہیں۔ دراصل ہماری ساری محرومی کا سبب یہ کوتاہی اور فردگزاشت ہے کہ ہم نے تعلیمات نبوی سے پورا پورا فائدہ نہیں اٹھایا اور مغرب کی پرہیزگار حکمت عملی اور لادینی نظام تعلیم کا شکار ہو گئے۔ ہر کارہ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے اصولوں کو جس لمحہ نیک نیتی سے اختیار کر لیا گیا اور اس نظام تعلیم پر عمل شروع ہو گیا تو پھر کوئی مسئلہ منہیں رہے گا۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم نیک نیتی اور غلوں کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات پر عمل پیرا ہو جائیں۔

سیرتِ محمدیہ کا معاشی پہلو

جناب محترم مولانا محمد طاہر

میں نے مقالے کا موضوع ہے: سیرتِ محمدیہ کا معاشی پہلو، اور مجھے اس مقالے میں موضوع کے نظری اور عملی دونوں رُخوں پر کچھ روشنی ڈالنا ہے، یعنی یہ بھی واضح کرنے کی کوشش کرنا ہے کہ سید الانبیا حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے علمی و نظری طور پر جو معاشی تعلیمات و ہدایات فرماتیں وہ کیا ہیں؟ اور ان پر عمل کرنے اور ان کی تطبیق سے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ نبیہ میں جو معاشی مظاہر جلوہ گر اور جو عملی اوضاع و اطوار ظہور پذیر ہوئے وہ کیا ہیں؟ اور ظاہر ہے اس مختصر مقالے میں ان کو پوری تفصیل کے ساتھ نہیں بلکہ اجمال و اختصار کے ساتھ ہی پیش کیا جا سکتا ہے، اور پھر چوں کہ سیرتِ محمدیہ کے اصل ماخذ قرآن و حدیث ہیں لہذا میں کوشش کروں گا کہ جو کچھ بھی عرض کروں قرآن و حدیث سے ہو۔

(۱) اور چوں کہ معاشیات کا تعلق رزق و مال سے ہے، لہذا سب سے پہلے میں اُس رویتے اور طرزِ فکر کے متعلق کچھ عرض کروں گا جو رزق و مال کے بارے میں قرآن و حدیث سے سمجھ میں آتا ہے، الفاظِ دیگر اُس حیثیت و پوزیشن کو واضح کروں گا جو رزق و مال کی اسلام اور پیغمبر اسلام کی نظر میں ہے لیوں کہ اسے سمجھ لینے کے بعد اسلام کی معاشی تعلیمات کا سمجھنا بھی آسان ہو جائے اور ان پر عمل کرنا بھی آسان، اس لحاظ سے مال کے بارے میں اسلام کے رویتے کے تعین کا مسئلہ ایک بڑا اہم اور ضروری مسئلہ ہے۔

اس مسئلے کے بارے میں قرآنِ حکیم اور احادیثِ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مطالعے سے جو میں سمجھ سکا ہوں وہ یہ ہے کہ مال کے متعلق جو اسلام کا رویتے ہے وہ نہ محض محبت کا رویتے ہے اور نہ محض نفرت کا رویتے بلکہ ان دونوں کے بین بین الیسار رویتے ہے جسے محبت آمیز نفرت یا نفرت آمیز محبت کا رویتے کہہ سکتے ہیں، اس کی تفصیل آگے آئے گی۔

محض محبت کا رویتے اس لیے نہیں کہ اس سے انسان کے اندر مال کی لے پناہ حرص پیدا ہوتی اور وہ حلال و حرام کی تمیز کیے بغیر اندھا دھند اُس کے حصول کے پیچھے پڑ جاتا اور اُسے سمیٹ سمیٹ کر جمع

رکھتا ہے، ضروری مصارف میں خرچ کرنے سے گریز کرتا اور حق تلفیوں کا مرتکب بنتا اور آخرت سے غافل
 اور بے پروا ہو جاتا ہے۔ لہذا قرآن و حدیث کی رو سے محض محبت کا رویہ غلط و باطل اور منشاء اسلام
 کے خلاف ہے۔ اور محض نفرت کا رویہ اس لیے نہیں کہ یہ انسان کو ترک دنیا اور رہبانیت و جوگیت
 کی طرف لے جاتا اور بعض ضروری فرائض و واجبات سے لائق و بے پروا بنا دیتا ہے جو مختلف حیثیتوں
 سے اُس کے ذمے عائد ہوتے اور جن کی ادائیگی پر معاشرے کے قیام و بقا اور اجتماعی امن و اطمینان
 کا دار و مدار ہوتا ہے اور یہ چیزیں چوں کہ اسلام کے منشاء کے خلاف ہیں لہذا نفرت کا رویہ بھی اسلام
 کے نزدیک باطل اور مردود رویہ ہے، بالفاظ دیگر مال کے متعلق محبت کا رویہ چوں کہ افراط پر اور
 نفرت کا رویہ تفریط پر مبنی ہے اور اسلام چوں کہ توسط و اعتدال کا دین ہے لہذا اس کے نزدیک
 افراط و تفریط پر مبنی محبت اور نفرت کے دونوں رویے غلط ہیں اور صحیح رویہ صرف وہ ہے جو ان
 دونوں کے درمیان اور وسط میں ہے اور وہ یہ کہ مال فی نفسہ نہ محبت کے قابل ہے اور نہ نفرت کے
 قابل بلکہ وہ ایک ایسی چیز ہے جس میں ذریعہ خیر بننے کی بھی صلاحیت ہے اور ذریعہ شر بننے کی بھی صلاحیت
 اس سے انسان کو نفع بھی پہنچ سکتا ہے اور ضرر بھی پہنچ سکتا ہے لہذا ذریعہ خیر بن سکنے کی وجہ سے
 محبت کے قابل اور ذریعہ شر بن سکنے کی وجہ سے نفرت کے قابل ہے اور چوں کہ یہ دونوں صلاحیتیں
 اُس کے اندر ہر وقت موجود رہتی ہیں لہذا وہ بیک وقت محبت اور نفرت دونوں کے قابل ہوتا ہے
 بنا بریں اس کے متعلق اسلام کا رویہ محبت کے ساتھ نفرت اور نفرت کے ساتھ محبت کا رویہ ہے۔
 اس کا ثبوت یہ کہ قرآن و حدیث میں ایک طرف وہ نصوص ہیں جن میں مال کو خیر، نفع
 اور قیاماً مال لیتنا سے تعبیر فرمایا گیا ہے، کیوں کہ اس کے ذریعہ سے انسان کے بہت سے طبعی
 معاشرتی، تمدنی اور اخلاقی تقاضے پورے ہوتے اور بہت سے دینی مقاصد بہ روتے کار آتے ہیں اور
 انسان کو سکون و اطمینان ملتا ہے۔ نیز وہ نصوص ہیں جن میں جائز طریقوں سے مال حاصل کرنے
 کی ترغیب اور اُس کے لیے صحیح نیت سے جدوجہد کو جہاد فی سبیل اللہ جیسا نیک عمل اور ذریعہ مغفرت
 اور رضائے الہی بتلایا گیا ہے، ظاہر ہے کہ اس قسم کی نصوص سے مال کے متعلق محض نفرت کے رویہ
 کی نفی ہوتی ہے۔ اور دوسری طرف وہ نصوص بھی ہیں جن میں ایسے حرام مال کی مذمت اور بُرائی
 بے جو باطل و ناجائز طریقوں جیسے رِبو، میسر و قمار، رشوت، چوری، خیانت اور دھوکہ دہی وغیرہ سے
 حاصل کیا گیا ہو یا تکاثر و تفاخر کی نیت سے کمایا گیا ہو یا بُخل کی وجہ سے ذخیرہ دخرانہ بنا کر رکھا گیا
 ہو، اور ایسے مال کو اللہ کی ناراضی اور دنیا و آخرت کی بربادی کا ذریعہ بتلایا گیا ہے، سو ظاہر ہے کہ
 نصوص سے مال کی محبت کے رویے کی صاف نفی ہوتی ہے۔

مال کے بارے میں اسلام کا جو رویہ اور عندیہ ہے اُس پر کچھ روشنی قرآن مجید کی اُن آیات سے بھی پڑتی ہے جن میں مال کو انسان کے لیے فتنہ بتلایا گیا ہے، مثلاً سورۃ الانفال کی یہ آیت:

وَأَعْلَمُوا أَنَّمَا آمَاكُمُ وَأَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ ۝

”اور خوب جان لو کہ تمہارے اموال اور تمہاری اولاد

فتنہ ہیں یعنی سخت آزمائش وابتلا“

امام راغب نے المفردات میں لکھا ہے کہ فتن کے اصل معنی ہیں کھراکھوٹا معلوم کرنے کے لیے سونے وغیرہ کو آگ کی بھٹی میں ڈالنا، اسی لحاظ سے فتنہ کے معنی آزمائش و امتحان کے لیے گئے ہیں، یوں کہ اس میں بھی انسان کی کامیابی و ناکامی کا اظہار ہوتا ہے، لہذا مال کو فتنہ، آزمائش اور امتحان یعنی کامطلب یہ ہوا کہ مال انسان کے لیے بہ منزلہ آگ کی بھٹی اور امتحان کے پرچے ہے جس سے انسان کا کھراکھوٹا اور کامیاب و ناکام ہونا ظاہر ہوتا ہے، چنانچہ جو شخص مال کو جائز و حلال طریقوں سے کماتا اور جائز طور پر صحیح مصارف میں خرچ کرتا ہے وہ فائز و کامیاب ہوتا ہے، اور جو مال کو ناجائز و حرام ذرائع سے حاصل کرتا اور مصارف خیر میں خرچ کرنے کے یہ جاتے اُسے جمع رکھتا یا غلط و ناجائز مصارف میں خرچ کرتا ہے وہ عند اللہ ناکام و نامراد رہتا ہے۔

اور ظاہر ہے کہ کسی چیز کو برکھنے کا معیار اور امتحان کا پرچہ بہ جانتے خود نہ کوئی اچھی اور قابل رغبت چیز ہے اور نہ بُری اور قابل نفرت چیز بلکہ اس لحاظ سے اچھی چیز ہے کہ اس سے کھرے اور کامیاب ہونے کا اظہار ہوتا ہے۔ اور اس وجہ سے بُری چیز ہے کہ اس کے ذریعے سے کھوٹے اور فیصل و ناکام ہونے کا انکشاف ہوتا ہے۔ ٹھیک یہی حال مال کا بھی ہے، انسان کی کامیابی کا ذریعہ بننے کی وجہ سے اچھا اور ناکامی و نامرادی کا ذریعہ بننے کی وجہ سے بُرا ہے۔

مال کی اسلام کی نظر میں جو حیثیت ہے اُس پر کچھ اُن آیات و احادیث سے بھی روشنی پڑتی ہے جن میں یہ بتایا گیا ہے کہ مال کی اللہ کے ہاں کوئی قدر و منزلت نہیں، اگر ہوتی تو اللہ کافروں کو ہرگز نہ دیتا اور ہرنی و ولی اور نیک بندہ مال دار ہوتا، اور یہ کہ مال کا ہونا انسان کے لیے وجہ شرافت و فضیلت ہے اور نہ نہ ہونا انسان کے لیے سبب رزالت و حقارت ہے بلکہ شرف و فضیلت کا واحد سبب تقویٰ اور صرف تقویٰ ہے اور رزالت و حقارت کا واحد سبب کفر و شرک اور فسق و فجور ہے، چنانچہ اگر دو مسلمان ایمان و تقویٰ میں برابر ہیں تو اللہ کے ہاں اُن کا درجہ برابر ہے اُن میں سے ایک کا غنی و مال دار اور دوسرے کا مسکین و نادار ہونا اُن کے درجے میں کمی بیشی کا باعث نہیں بن سکتا، قرآن مجید میں سورۃ السبا کی آیت ہے:

وَمَا أَمْوَالُكُمْ وَلَا أَوْلَادُكُمْ بِالَّتِي تُقَرَّبُ بِكُمْ عِنْدَنَا نُفَىٰ إِلَّا
مَنْ آمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا

”اور نہ تمہارے اموال اور نہ تمہاری اولاد وہ چیز ہے جو تمہیں ہمارے قریب کرنے اور تمہارے لیے تقرب الہی کا ذریعہ بنے، مگر وہ جو ایمان اور عمل صالح کیے“

جامع ترمذی اور سنن ابن ماجہ میں حضرت سہل بن سعد رضی اللہ عنہ سے مروی ایک حدیث

نبویؐ کا ترجمہ یہ ہے: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر اللہ کے نزدیک دنیا کی قدر چھتر کے برابر کے برابر بھی ہوتی تو وہ کافروں کو اُس میں سے ایک گھونٹ بھی نہ پلاتا۔

مسند احمد وغیرہ میں حضرت عبد اللہ بن عباسؓ سے مروی ایک اور حدیث نبویؐ کا ترجمہ اس

طرح ہے: نبی صلی اللہ علیہ وسلم ایک مُردار بکری کے پاس سے گزرے جسے اُس کے مالکوں نے باہر پھینک

دیا تھا تو آپؐ نے ساتھیوں سے مخاطب ہو کر فرمایا: قسم ہے اُس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان

ہے کہ دنیا کا مال اللہ کے نزدیک اس سے بھی زیادہ گھٹیا اور بے وقعت چیز ہے جتنی یہ مُردار بکری اپنے

مالکوں کی نظر میں ہے۔ ان احادیث سے صاف واضح ہوتا ہے کہ اللہ کے ہاں دنیوی مال و دولت کی

کوئی قدر و منزلت نہیں۔ لہذا اس کی بنا پر ایک انسان کو دوسرے سے بہتر اور افضل سمجھنا غلطی اور

گمراہی ہے جس سے مسلمان کو بچنا چاہیے، حال آنکہ عام طور پر مسلمان اس میں مبتلا ہیں۔

اسلام کی نظر میں دنیوی مال و دولت کی جو حیثیت ہے اس پر میں نے سب سے پہلے اور قدر

تفصیل کے ساتھ گفتگو اس لیے کی ہے کہ میں سمجھتا ہوں کہ آج عام طور پر ہم مسلمانوں کی یہ جو

حالت ہے کہ حلال و حرام اور جائز و ناجائز کی تمیز کیے بغیر کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ مال و

دولت سمیٹنے اور مال داری میں ایک دوسرے سے بڑھ جانے کی حرص میں مدہوش ہیں، دیکھا جا

تا اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ ہم نے مال و دولت کو اصل مقصود بالذات اور ذریعہ شرف و عظمت سمجھ

رکھا ہے اور اُس کے متعلق رویت اور طرز فکر قطعی محبت کارویت اور طرز فکر ہے جو اسلام اور منشائے

خدا و رسولؐ کے خلاف ہے، لہذا ضروری ہے کہ مسلمان کو یہ بتایا جائے کہ یہ حیثیت ایک مسلمان کے

مال و دولت کے بارے میں اس کارویت اور طرز فکر کیا ہونا چاہیے اور کیا نہ ہونا چاہیے۔

سیرتِ محمدیہؐ کے معاشی پہلو کی وضاحت میں ایک بات جو آغاز میں عرض کر دینا ضروری

ہے وہ یہ کہ قرآن و حدیث میں معاشی زندگی سے متعلق جو تعلیمات ہیں وہ دو قسم کی ہیں: ایک وہ

جن کی بنیاد عدل اور دوسری وہ جن کی بنیاد احسان ہے۔ جو عدل پر مبنی ہیں اُن کے اندر اس چ

کو ملحوظ رکھا گیا ہے کہ ہر فرد اور ہر فریق معاملہ کو اُس کا واجب حق پورا پورا اور ٹھیک ٹھیک

اور کسی کی کچھ بھی حق تلفی نہ ہو۔ لہذا ان تعلیمات کی حیثیت حقیقی اور مستقل قوانین کی ہے جن پر عمل کرنا ضروری اور جن کے نفاذ اور تحفظ کی ذمہ داری حکومت پر عائد ہوتی ہے۔ اور جو تعلیمات احسان پر مبنی ہیں ان کے اندر اس کا لحاظ رکھا گیا ہے کہ افراد رضا کارانہ طور پر اپنے حقوق کا ایک دوسرے کے لیے ایثار کریں۔ لہذا یہ تعلیمات اخلاقی نوعیت کی ہیں جن پر عمل کرنا واجب نہیں بلکہ مستحب ہے۔ البتہ ان پر عمل کرنے کا عند اللہ جو درجہ اور جو اجر و ثواب ہے وہ اُس درجے اور اجر و ثواب سے کہیں اونچا اور زیادہ ہے جو عدل والی قانونی تعلیمات پر عمل کرنے کا ہے۔ مصلح اعظم، ہادی برحق حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے امت کو اختیار دیا کہ وہ ان دو قسم کی تعلیمات میں سے جن پر چاہیں عمل کریں، لیکن اپنے عمل کے لیے آپ نے صرف احسان والی اخلاقی معاشی تعلیمات اختیار فرمائیں اور ہمیشہ ان پر قائم اور عمل پیرا رہے یعنی ہمیشہ اپنے حق کا دوسرے کے لیے ایثار فرمایا، کیوں کہ آیت قرآنی ”إِنَّكَ لَعَلَىٰ خُلُقِي عَظِيمٌ“ کے مطابق آپ اخلاقی عظمت کے بلند ترین درجے پر فائز تھے۔ لہذا یہ سمجھنا درست نہیں کہ اسلام کی معاشی تعلیمات صرف وہ ہیں جو محمد رسول اللہ صلی علیہ وسلم کی معاشی زندگی میں عملی طور پر جلوہ گر ہوئیں اور صحابہ کرام کی آنکھوں نے ان کا مشاہدہ کیا، کیوں کہ ان کے علاوہ وہ بھی اسلام کی معاشی تعلیمات ہیں جو عدل پر مبنی اور آپ کے اقوال و ارشادات سے سامنے آئیں اور صحابہ کرام نے انہوں سے سُنیں اور جو آج قرآن و حدیث میں موجود ہیں اور عام انسانوں کے لیے وہی قابل عمل بھی ہیں، کیوں کہ اخلاقی تعلیمات پر عمل کرنا ہر شخص کے بس میں نہیں، بتائیے دنیا میں کتنے لوگ ایسے ہیں جو خود بٹھو کے رہ کر دوسروں کو کھلا سکتے ہوں؟

(۲) اب میں اسلام کی کچھ وہ معاشی تعلیمات پیش کرنا چاہتا ہوں جن کا قرآن و حدیث میں اجمال و تفصیل کے ساتھ ذکر ہے اور جن سے سیرت مقدسہ کے معاشی پہلو کے کچھ خدوخال نمایاں اور اجاگر ہوتے ہیں۔

قرآن و حدیث کی معاشی تعلیمات میں سے ایک اہم اور بنیادی تعلیم یہ ہے: ہر مسلمان پر جو معاش کے سلسلے میں کوئی مفید کام کر سکتا ہو، لازم ہے کہ ضرور کام کرے۔ الایہ کہ کوئی عذر مالمع ہو۔ ضرور کا لفظ میں نے اس لیے استعمال کیا ہے کہ قرآن و حدیث میں یہ تعلیم جس اسلوب سے ہے وہ نڈب پر نہیں و جو ب پر دلالت کرتا ہے۔ اس کے لیے قرآن مجید میں جو امر کے صیغے استعمال ہوئے ہیں ان کا و جو ب کے لیے متعین ہونا احادیث نے ثابت کر دیا ہے۔ ایک حدیث نبویؐ جس کے راوی حضرت عبداللہ بن مسعود ہیں کے الفاظ ہیں: ”قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم طلب الحلال فریضة بعد الفریضة“ دوسری حدیث جو حضرت انسؓ سے مروی ہے اس طرح ہے:

” قال رسول الله صلى الله عليه وسلم طلب الحلال واجب على كل مسلم“ ان احاديث میں قریضہ اور واجب کے الفاظ صاف بتا رہے ہیں کہ حلال رزق و مال کے لیے جدوجہد اور سعی و کوشش کرنا مسلمان کا دینی قریضہ اور ایک واجب و ضروری عمل ہے۔ اور یہ اس وجہ سے بھی کہ رزق و مال پر فرد اور معاشرے دونوں کی حیات و بقا اور قیام و بہبود تیز بہت سے دینی اور معاشرتی فرائض و واجبات کی ادائیگی کا دار و مدار ہے۔ گویا نقلی اور عقلی کئی ایسے دلائل ہیں جن سے معاشی جدوجہد کا واجب اور ضروری ہونا ثابت ہوتا ہے، بعض احادیث میں اس کو جہاد جیسا تیک عمل فرمایا گیا ہے جس پر عظیم اجر و ثواب کا وعدہ ہے۔ بعض احادیث میں یہ فرما کر اس کی طرف رغبت دلائی گئی ہے کہ یہ اللہ کی محبت اور مغفرت کا ذریعہ اور وسیلہ ہے۔

معاشی جدوجہد سے متعلق اسلام کی یہ جو تعلیم ہے اس کی ضرورت، اہمیت اور افادیت سے کسی ہوش مند کو انکار نہیں ہو سکتا۔ یہ الگ بات ہے کہ کوئی اس پر عمل کرے یا نہ کرے اور اس سے فائدہ اٹھائے یا نہ اٹھائے، افسوس کہ آج مسلمان معاشرے اس پر عمل کرنے کے معاملے میں سب سے پیچھے ہیں۔ نتیجہ یہ کہ اپنی بنیادی ضروریات تک میں خود کفیل نہیں اور دوسروں کے دست نگر ہیں۔

یہ بہر حال جہاں تک سید الانبیاء حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ کرام کا تعلق ہے وہ اس تعلیم پر پوری طرح عمل پیرا رہے۔ حدیث و سیرت کی کتابوں سے صاف واضح ہوتا ہے کہ رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم معاش کے سلسلے میں بہ نفس نفیس تجارت بھی کرتے رہے جو قریش مکہ کا خاص پیشہ اور مشغلہ تھا اور بعض دفعہ اجرت پر بکریاں بھی چراتیں، اسی طرح گھریلو معاشیات میں بھی آپ برابر روزمرہ کے معاشی کاموں میں حصہ لیتے رہے اور یہ سلسلہ پوری زندگی میں جاری اور قائم رہا۔ فرائض نبوت کی ادائیگی کے ساتھ آپ کو جب بھی موقع ملا کسب معاش کے لیے آپ نے ضرور کوئی کام کیا۔ پھر یہی حال صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا تھا۔ اپنی معاش کا بوجھ خود اٹھانے کے لیے ہر صحابی کوئی نہ کوئی کام کرتا تھا۔ کوئی تجارت، کوئی زراعت، کوئی صنعت و حرفت اور کوئی محنت و مزدوری کا کام انجام دیتا تھا۔

قرآن و حدیث میں دوسری معاشی تعلیم اجرت پر کام کرنے کے راتے سے متعلق ہے۔ اجرت پر کام کرنے کے راتے کو اصولی طور پر درست و جائز قرار دیا گیا ہے۔ قرآن مجید کی متعدد آیات سے اس کا جواز ثابت ہوتا ہے۔ پھر اس بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جو احادیث مبارکہ ہیں ان کے اندر مستاجر اور اجیر کے لیے واضح ہدایات بھی ہیں جن کا خلاصہ یہ ہے کہ مستاجر پر لازم ہے کہ (۱) وہ اجیر سے اتنا ہی کام لے جتنا وہ آسانی کے ساتھ کر سکتا ہو۔ (۲) اور یہ کہ کام پر لگانے سے پہلے

واضح طور پر اجیر کو بتادے کہ اُس کی اُجرت کتنی ہوگی۔ (۳) اور یہ کہ کام ختم ہونے پر فوراً اجیر کو اس کی اُجرت ادا کر دے۔ (۴) اور یہ کہ اُجرت مقرر کرنے میں اس بات کا پورا لحاظ رکھا جائے کہ اُس سے اجیر کی بنیادی معاشی ضروریات کسی نہ کسی طور پوری ہو سکتی ہوں۔ (۵) اور یہ کہ اُجرت کے تعین میں کام کی نوعیت اور مقدار کا لحاظ رکھا جائے، جو کام نوعیت کے لحاظ سے ادنیٰ و معمولی درجے کا ہو اُس کی اُجرت کم، جو متوسط درجے کا ہو اُس کی اُجرت زیادہ اور جو اعلا درجے کا ہو اُس کی اُجرت اس سے بھی زیادہ لگائی جائے۔ مطلب یہ کہ اسلام اس کو اصولی طور پر تسلیم کرتا ہے کہ افادیت کے لحاظ سے اور اُس فنی مہارت کے لحاظ سے جو کام کرنے والے نے حاصل کی نیز اُس انرجی و توانائی کے لحاظ سے جو کام میں کام کرنے والے کی خرچ ہوئی، کاموں کے مختلف درجے ہیں لہذا ان کے مطابق ان کی اجرتیں مختلف و متفاوت ہونی چاہئیں۔ اسی طرح کام کی مقدار کے لحاظ سے بھی اُجرت میں کمی بیشی کا فرق ہونا چاہیے۔ مثلاً ایک ہی نوعیت کا کام جب چار گھنٹے ہو تو اُس کی جتنی اُجرت ہو آٹھ گھنٹے کے کام کی اُس سے دوگنی ہونی چاہیے۔ قرآن حکیم میں ہے: "يَكُلُّ دَرَجَاتٌ مِّمَّا عَمِلُوا" سب کے لیے مختلف درجے ہیں اُن کے عمل کے اعتبار سے۔ دراصل یہ ایسا اصول ہے جو انسانوں کو بہتر سے بہتر اور زیادہ سے زیادہ کام یا محنت کرنے پر ابھارتا ہے اور اس سے ملکی پیداوار میں روز افزوں اضافہ ہوتا اور معاشی خوش حالی بڑھتی ہے۔ (۶) مستاجر پر یہ بھی لازم ہے کہ وہ اجیر کو کام کے اوقات میں دینی فرائض کی ادائیگی مثلاً نماز، روزے سے نہ روکے، اسی طرح کھانے پینے کے اوقات میں کھانے پینے اور شدید تکان کی صورت میں قدرے آرام کا موقع دے۔ (۷) اسی طرح اجیر پر لازم ہے کہ وہ معاہدے کے مطابق کام اچھے سے اچھا اور بہتر سے بہتر کرے، کام میں چوری اور سُستی و کوتاہی سے بچے۔ (۸) اور پھر اجیر اور مستاجر میں سے کوئی بھی دوسرے کی مجبوری سے ناجائز فائدہ نہ اٹھائے اور ہر ایک دوسرے کا بھلا چاہے اور احترام کرے۔

سیرت اور حدیث کی کتابوں سے معلوم ہوتا ہے کہ معلمِ کامل، ہادیِ برحق حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود بھی بہ نفسِ نفیس اُجرت پر دوسروں کا کام کیا اور بعض دفعہ دوسروں سے بھی اُجرت پر کام کرایا۔ جب خود کام کیا تو بہتر سے بہتر اور معاہدے سے زیادہ کیا۔ اور دوسروں سے کام کرایا تو ان کو مقررہ اُجرت سے زیادہ عطا فرمائی اور کبھی کسی کو آپ سے شکایت نہ ہوئی۔

سنن الکبریٰ بیہقی میں حضرت جابر رضی عنہ سے مروی ایک حدیث اس طرح ہے: قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آجرت نفسی من ہجرتین بقلوص۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میں نے اُجرت پر ہجرت سے دو تجارتی سفروں کا معاملہ کیا، ہر سفر ایک جوان

اونٹ کے عوض۔ صحیح البخاری میں حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ایک حدیث یہ اس طور ہے: ”قال سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول ما بعث الله نبيًا إلا راعى غنم، قالوا ولا انت يا رسول الله قال وانا كنت اراها لاهل مكة بالقراريط“

ترجمہ: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ فرماتے سنا کہ اللہ نے جس نبی کو بھی مبعوث فرمایا اُس نے بکریاں چرائیں۔ صحابہ کرامؓ نے عرض کیا کہ کیا آپ نے بھی؟ تو فرمایا ہاں میں بھی مکے والوں کی بکریاں چند قیراط کے عوض چراتا رہا۔ ایک روایت میں یہ بھی ہے کہ حُسن کارکردگی کی بنا پر حضرت خدیجہؓ نے آپ کو مقرزہ اجرت سے زیادہ پیش فرمائی۔ ایک حدیث میں ہے کہ آپ نے حجام سے پھنیاں لگوائیں اور اُس کو اجرت دی۔ جب مکے سے مدینے کی طرف ہجرت فرمائی تو اجرت پر ایک شخص کو لیا جو راستہ دکھانے پر مامور ہوا۔ اسی طرح کئی روایات ہیں جن میں صحابہؓ کے اجرت پر کام کرنے کرانے کا ذکر ہے۔

(۳) قرآن و حدیث کی معاشی تعلیمات میں سے ایک بڑی اہم تعلیم وہ ہے جو شخصی ملکیت

سے تعلق رکھتی ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ قدرتی اشیاء میں سے جو شے اپنی قدرتی حالت و شکل پر قائم اور برقرار ہو اُس کا کوئی شخص مالک نہیں کہلا سکتا، کیوں کہ قرآن مجید کی متعدد آیات کے مطابق ایسی ہر شے سب کے استفادہ کے لیے مباح عام کی حیثیت رکھتی ہے۔ لہذا کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ اُس شے سے فائدہ اٹھانے کا صرف اُسی کو حق ہے دوسرے کو نہیں، البتہ جب کوئی شخص دوسروں سے پہلے و سبقتاً کے کسی قدرتی شے میں اپنی سعی و محنت سے ایسا رد و بدل کر دے جس سے اُس شے میں ایک نئی افادیت پیدا ہو جائے تو اُس شخص کو اپنی سعی و محنت کے اثرات کی وجہ سے جو اُس شے کے ساتھ قائم ہوئے اُس شے سے استفادے کے حق میں دوسروں پر ترجیح و تخصیص حاصل ہو جاتی ہے جس کا نام حق ملکیت ہے۔ اب دوسرا کوئی اس کی رضامندانہ اجازت کے بغیر اس شے سے استفادہ نہیں کر سکتا۔ قدرتی اشیاء کی ابتدائی ملکیت کا یہ تصور قرآن مجید کی بعض آیات سے بھی مستنبط ہوتا ہے اور احادیث میں اس کا واضح ذکر ہے مثلاً ”مَنْ أَحْيَا رِضَامِيَّةً فَهِيَ لَهُ“ گویا کسی قدرتی شے کی ابتدائی ملکیت کا اصل سبب انسان کی مفید محنت ہے محض قبضہ نہیں پھر جب پہلا مالک اپنی چیز کسی دوسرے کو ایسے طریقے سے دے دیتا ہے جس میں اُس کی رضامندی موجود ہوتی ہے تو وہ چیز دوسرے کی ملکیت میں منتقل ہو جاتی ہے اور وہ اُس کا مالک بن جاتا ہے۔ رضامندی کے موجود ہونے نہ ہونے کا خارجی معیار یہ ہے کہ جس طریقے میں پہلے مالک کے لیے کسی نہ کسی شکل میں مادی یا روحانی معاوضہ موجود ہو وہ طریقہ رضامندی کا طریقہ ہوتا ہے، اور جس میں

معاوضہ موجود نہیں ہوتا وہ عدم رضامندی کا طریقہ ہوتا ہے۔ رضامندی کے عام طور پر پانچ طریقے ہیں: (۱) تجارتی خرید و فروخت کا طریقہ، جس میں ظاہر ہے کہ ایک فریق کے لیے نقد وغیرہ کی شکل میں اور دوسرے کے لیے جنس کی شکل میں معاوضہ موجود ہوتا ہے۔ (۲) دوسرا طریقہ صدقے و ہبہ کا طریقہ ہے جس میں دینے والے کے لیے روحانی و اخروی اجر و ثواب کی شکل میں معاوضہ موجود ہوتا ہے لہذا وہ اپنی مرضی اور خوشی سے دوسرے کو دیتا ہے۔ (۳) تیسرا طریقہ نوکری و ملازمت کا طریقہ ہے۔ اس میں ایک شخص دوسرے کو اجرت و تنخواہ کے طور پر جو دیتا ہے اُس کے عوض اُس کو خدمت اور منفعت ملتی ہے۔ (۴) چوتھا طریقہ قرض و ادھار کا طریقہ ہے جس میں دینے والے کو اطمینان ہوتا ہے کہ مقررہ میعاد کے بعد اُس کو اپنی مقرضہ چیز جیسی چیز بھی ملے گی اور وہ اجر و ثواب کا بھی مستحق بنے گا۔ اور (۵) پانچواں طریقہ وراثت کا طریقہ ہے جس میں صلہ رحمی کی وجہ سے مورث کے لیے اجر و ثواب موجود ہوتا ہے۔ گویا وہ نسب و قرابت کی بنا پر یہ چاہتا تھا کہ اُس کے مرنے کے بعد اُس کا مترکہ مال اُس کے قریبی رشتے داروں کو ملے لہذا وہ اس کی بنا پر اخروی اجر و ثواب کا مستحق قرار پاتا ہے، ان مذکورہ پانچ طریقوں سے ایک کی ملکیت کا دوسرے کی طرف منتقل ہو جانا ان آیات و احادیث سے ثابت ہوتا ہے جن میں ان طریقوں کا ذکر ہے۔

اور پھر شخصی ملکیت کے متعلق اسلام کا یہ جو اصولی تصور ہے اس کی رُو سے جس طرح کوئی شخص اشیائے صرف میں سے کسی شے کا مالک قرار پاتا ہے اسی طرح ہر اُس شے کا بھی مالک قرار پاتا ہے جو ذرائع پیداوار کی تعریف میں آتی ہے۔ مثلاً زرعی زمین اور کارخانہ وغیرہ، دونوں کی ملکیت میں کچھ فرق ہے تو صرف یہ کہ اسلام اشیائے صرف کے مالک کو ہر اُس تصرف کا اختیار دیتا ہے جو اُس کے لیے مفید ہو، جب کہ ذرائع پیداوار کے مالک کو کسی ایسے تصرف کا اختیار نہیں دیتا جو اُس کے لیے تو مفید ہو، لیکن مفاد عام کے لیے مضر و نقصان دہ ہو، کیوں کہ ایسی اشیاء اپنی وضع و ساخت کے لحاظ سے مفاد عام کے لیے ہوتی ہیں۔ لہذا شخصی ملکیت کے باوجود اُن کی یہ حیثیت قائم رہتی ہے اور مالک پابند ہوتا ہے کہ اُن میں کوئی ایسا تصرف نہ کرے جو اُس کے لیے تو مفید ہو، لیکن مفاد عام کے لیے مضر ہو۔ اس سے اُن مفاسد کا دروازہ بند ہو جاتا ہے جو ذرائع پیداوار کے مالک کو ہر قسم کے تصرف کا اختیار ہونے کی صورت میں ضرور پیدا ہوتے اور بدامنی و بے چینی کا باعث بنتے ہیں۔

احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ عہدِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں شخصی و انفرادی ملکیتوں کا جو نظام قائم ہوا وہ اسی تصورِ ملکیت کے مطابق تھا۔ قدرتی اشیاء کی ملکیت کی بنیاد انسانی محنت تھی اور

انتقالِ ملکیت کی بنیاد پہلے مالک کی حقیقی رضامندی یا وہ طریقے تھے جن میں حقیقی رضامندی پائی جایا کرتی ہے۔

(۴) اسلام کی معاشی تعلیمات میں سے ایک اہم تعلیم وہ ہے جس کا تعلق معاشی معاملات کے جواز و عدم جواز سے ہے اور جس کے ساتھ معاشرے کے معاشی اعتدال و توازن کا گہرا رشتہ ہے، اور وہ یہ کہ جو معاشی معاملات بنیادی طور پر ایسے ہیں کہ ان کے اندر ہر فریق کو اُس کا حق ضرور ملتا اور اُس کی رضامندی کا سامان ہوتا ہے وہ عدل کے مطابق ہونے کی وجہ سے صحیح اور جائز ہیں۔ اور جن میں ایک فریق کی ضرور حق تلفی ہوتی یا حق تلفی کا ظن و احتمال ہوتا ہے وہ موجود یا محتمل ظلم کی وجہ سے باطل اور فاسد ہیں۔ صحیح اور جائز معاشی معاملات کی مثال بیع و تجارت، اجارہ، نوکری و مزدوری ہیں جب کہ ان میں کوئی دھوکہ فریب اور مجبوری موجود نہ ہو۔ بیع و تجارت میں ظاہر ہے کہ ہر فریق کو اُس کا حق کسی جنس یا نقدی کی شکل میں ضرور ملتا ہے، یہ الگ بات ہے کہ دھوکے فریب اور مجبوری کی شکل میں ایک فریق کے حق میں کچھ کمی واقع ہو جاتی ہے۔ اجارے کے معاملے میں بھی ظاہر ہے کہ ایک فریق کو اُس کا حق نقدی وغیرہ کی شکل میں اور دوسرے کو منفعت کی شکل میں ضرور ملتا ہے، یہ دوسری بات ہے کہ جمالت اور مجبوری کی وجہ سے بعض دفعہ ایک فریق کی کچھ حق تلفی ہو جاتی ہے۔ اور نوکری و مزدوری کے معاملے میں بھی ظاہر ہے کہ ایک فریق کو اُس کا حق نقدی وغیرہ کی شکل میں اور دوسرے کو منفعت اور خدمت کی شکل میں ضرور ملتا ہے، یہ الگ بات ہے کہ بعض دفعہ ایک فریق اپنی مجبوری کی وجہ سے استحصال کا شکار ہو جاتا ہے اور اُس کو اُس کا پورا حق نہیں ملتا۔ بہر حال اصولی اور بنیادی طور پر یہ مذکورہ معاملات ایسے ہیں کہ ان میں ہر فریق کو اُس کا حق کسی نہ کسی شکل میں ضرور ملتا ہے۔ لہذا یہ عدل کے مطابق ہیں اور اسلام کے نزدیک جائز و درست۔

باطل و ناجائز معاملات کی مثال ربا، قمار، رشوت اور مخابہ کے معاملات ہیں، کیوں کہ ان میں ایک فریق کی ضرور حق تلفی واقع ہوتی ہے اور اُس کا مال دوسرا ناحق طور پر ضرور لیتا ہے۔ ربا میں قرض دینے والا فریق، مقرض فریق سے اپنے اصل مال پر جو زائد لیتا ہے اُس کا اس کی طرف سے مقرض کے لیے کوئی حقیقی عوض موجود نہیں ہوتا۔ لہذا وہ بلا عوض اور ناحق دوسرے کا مال لیتا ہے۔ گویا ایک فریق کی حق تلفی اس معاملے کی ماہیت اور بنیادی ساخت میں موجود اور اس کی حقیقت کا جزو و لاینفک ہے۔ میسر و قمار کے معاملے میں بھی جیتنے والا فریق ہارنے والے فریق سے جو مال لیتا ہے اس کا کوئی مفید عوض ہارنے والے کے لیے موجود نہیں ہوتا جو جیتنے والے کو اُس کا حق دار بنانا

ہو۔ لہذا وہ دوسرے کا مال ناحق طور پر لیتا ہے اور یہ چیز اس معاملے کی ماہیت میں داخل ہے۔ رشوت کے معاملے میں بھی ایک فریق کی ضرورت تعلق واقع ہوتی ہے، کیوں کہ اس میں حاکم بہ طور رشوت جو مال لیتا ہے اُس کا اُس کی ذات کی طرف سے کوئی عوض موجود نہیں ہوتا۔ اسی طرح حاکم رشوت کی وجہ سے جس حق دار کا حق دوسرے کو دلو اتا ہے دوسرے کی طرف سے اُس کا عوض موجود نہیں ہوتا لہذا اس معاملے کی ماہیت میں ایک فریق بلکہ دو فریق کی حق تعلق بہ طور جز کے شامل ہے۔ غور سے دیکھا جائے تو مخا برہ و مزارعہ کا معاملہ بھی ایسا ہی نظر آتا ہے۔ اس میں بھی مالک زمین کاشت کار سے جو لیتا ہے اُس کا مالک زمین کی طرف سے کاشت کار کے لیے کوئی ایسا عوض موجود نہیں ہوتا جو اُسے اس کا حق دار ٹھہراتا ہو، کیوں کہ زمین استعمال ہونے سے نہ صرف یہ کہ مالیت میں کم نہیں ہوتی بلکہ بعض دفعہ مالیت میں کچھ بڑھ جاتی ہے۔ جب کاشت کار بنجر زمین کو آباد کرتا اور اُسے خوب کھاد وغیرہ دیتا ہے۔ لہذا زمین جب مالک کی طرف لوٹتی ہے تو اُس کی حیثیت ویسی ہی ہوتی ہے جو سود خور کی طرف لوٹنے والی اصل رقم کی ہوتی ہے۔ اُس کی حیثیت کرایے و اجارے پر دی ہوئی ایسی چیز کی نہیں ہوتی جو استعمال ہونے سے گھستی اور پرانی ہوتی اور اس کی مالیت اور قیمت ضرور گھٹتی ہے، اور چوں کہ یہ معاملہ اپنی ماہیت و حقیقت کے لحاظ سے ربو کی طرح ہے لہذا بعض احادیث نبویہ میں اس کو صریح طور پر ”ربو“ کہا گیا اور اُس کو نہ چھوڑنے والوں کے لیے بعینہ وہی دھمکی ہے جو ربو کو نہ چھوڑنے والوں کے لیے قرآن مجید میں ہے یعنی اللہ و رسول کی طرف سے اعلان جنگ۔ مستدرک حاکم میں حضرت جابرؓ کی ایک حدیث ہے جس کا ترجمہ یوں ہے۔ جب سورۃ بقرہ والی تحریم ربو کی آیات نازل ہوئیں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو مخا برہ کو نہ چھوڑے اُسے معلوم ہونا چاہیے کہ وہ اللہ اور اُس کے رسول سے جنگ کر رہا ہے۔

اسی طرح مختلف احادیث نبویہ میں بیع کی جن قسموں اور شکلوں سے منع فرمایا گیا ہے جیسے بیع محافلہ، بیع مزابنہ، بیع منابذہ، بیع طامسہ، بیع مخا برہ، بیع المجازنہ، بیع المحصاة، بیع عُربان، بیع عینہ، بیع الغمر، بیع المضامین و الملائق، بیع جبل الحبلہ، بیع السنین، بیع الکالی بالکالی، بیع الحيوان باللحم، بیع الثمار قبل ان يبدؤ صلاحها، بیع و سلف اور بیعتین فی بیعتہ وغیرہ۔ ان بیوع کی حقیقت کا تجزیہ کر کے دیکھا جائے تو ان کے اندر ربو یا میسر و قمار کا کچھ رنگ نظر آتا اور ایک فریق کی حق تعلق کا اگر یقین نہیں ہوتا تو غالب ظن اور قوی احتمال ضرور ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے یہ عموماً باہمی نزاع اور جھگڑے کا باعث بنتے اور بد امنی دے چینی پیدا کرتے ہیں لہذا اسلام نے ان کو ممنوع و ناجائز ٹھہرایا ہے۔

(۵) معاشی معاملات کے جواز و عدم جواز کے متعلق اسلام کی یہ جو تعلیم ہے اس پر عمل کا

کامل ترین اور روشن ترین نمونہ دیکھنا ہو تو وہ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ میں

دیکھا جاسکتا ہے۔ احادیث بتاتی ہیں کہ اعلان نبوت کے بعد آپ نے معاش کے سلسلے میں ہمیشہ

تجارت یعنی بیع و شراہ کا مشغلہ اختیار فرمایا جس میں انتہائی درجے کی دیانت و امانت بھی تھی اور

سماحت و خوش معاملگی بھی، اور یہ وہ معاملہ ہے جس کے حلال و حرام اور مستحسن و مستحب ہونے

کی قرآن مجید میں صراحت ہے۔ اسی طرح آپ نبوت سے پہلے اور نبوت کے بعد ہمیشہ ربوا اور میسر

سے دُور رہے بلکہ جس معاملے میں ربوا اور قمار کا شبہ اور شائبہ بھی تھا اُس کو بھی کبھی قریب نہ آنے

دیا، آپ نے کبھی اپنی ذات کے لیے کسی کو زمین مخابرہ و مزارعہ پر دی اور نہ کبھی کسی سے لی یہود و خیر

کے ساتھ جو معاہدہ ہوا تھا وہ بہ قول امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے مزارعت کا معاملہ نہ تھا بلکہ

غیر مسلم ذمیوں کے ساتھ بیت المال کے لیے خراجِ مقاسمت کا معاملہ تھا جو معاشی ہونے کے ساتھ

ایک طرح کا سیاسی معاملہ تھا نیز آپ نے کبھی کسی ضرورت مند کو اپنی کوئی چیز کرایے و اجارے پر نہ

دی بلکہ صدقہ اور ہبہ کے طور پر بلا معاوضہ دی۔ اسی طرح آپ نے کبھی کسی کو مالِ مشاربت پر نہ دیا بلکہ

ضرورت مند کو صدقہ اور قرضِ حسنہ کے طور پر دیا جو احسان پر مبنی اور مستحب تھا۔ یہاں یہ واضح کر

دینا بھی ضروری ہے کہ اُن حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نبوت سے پہلے جب آپ کی عمر مبارک تقریباً

پچیس برس تھی حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ جو تجارتی کام کیا وہ مضاربت پر نہ تھا بلکہ

متعین اجرت پر تھا۔ طبقات ابن سعد میں ہے کہ اُن حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت خدیجہ

رضی اللہ عنہا کے تجارتی مال اور اُن کے غلام میسرہ کے ساتھ جو شام کا تجارتی سفر فرمایا اُس کی

اجرت چار جوان اونٹ مقرر ہوئی تھی جو دوسرے لوگوں کے مقابلے میں دو گنی تھی۔ اس روایت

کا ترجمہ یہ ہے کہ حضرت ابوطالب نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا: بھتیجے مجھے معلوم ہوا ہے کہ

خدیجہ نے سفر شام کے لیے فلاں شخص کی اجرت دو جوان اونٹ مقرر کی ہے، میں نہیں چاہتا کہ

وہ آپ کو بھی اتنی ہی اجرت دے جتنی وہ اُس شخص کو دے گی۔ کیا آپ اُن سے اس بارے میں

بات کرنا پسند کریں گے؟ تو آپ نے فرمایا میں پسند نہیں کرتا۔ تو پھر حضرت ابوطالب خود حضرت خدیجہ

کے پاس گئے اور اُن سے کہا کہ مجھے پتہ چلا ہے کہ آپ نے اپنے تجارتی کاروان کے ساتھ بھیجنے کے لیے

فلاں شخص کی اجرت دو جوان اونٹ مقرر کی ہے، محمد کے لیے میں چار سے کم اونٹوں پر راضی نہیں

ہو سکتا تو حضرت خدیجہ نے کہا منظور ہے اگر آپ کسی دُور کے اور دشمن کے لیے کہتے ہیں ہم اب

لیتے اور ایسے شخص کے لیے کیسے نہیں کریں گے جو آپ کا محبوب اور قریبی ہے۔

طبقات ابن سعد میں اسی سفرِ شام سے متعلق دو روایتیں اور بھی ہیں۔ ان میں بھی کوئی ایک لفظ بھی ایسا نہیں جس سے ظاہر ہوتا ہو کہ یہ معاملہ اجرت کے بجائے مضاربت یعنی نفع کے ایک حصے پر طے ہوا تھا۔ اسی طرح سیرت ابن ہشام میں ابن اسحاق کی سفرِ شام سے متعلق جو روایت ہے جسے طبری وغیرہ سب نے نقل کیا ہے اس میں بھی کوئی ایسی صراحت نہیں کہ یہ تجارتی سفر متعین اجرت پر نہیں مضاربت پر ہوا تھا بلکہ اس روایت میں متعدد ایسی چیزیں ہیں جو اس معاملے کے مضاربت ہونے کی نفی کرتی ہیں۔ اس معاملے کے متعلق مضاربت کا خیال دراصل ابن اسحاق کی روایت کے بعض الفاظ سے پیدا ہوا جو اس طرح ہیں: قال ابن اسحاق: وكانت خديجة بن خويلد امرأة تاجرة ذات شرف و مال تستأجر الرجال في مالها و تضار بهم اياه بشئ تجعله لهم - خدیجہ بن خویلد تجارت پیشہ خاتون تھیں اور شریف و مال دار۔ وہ واقف کار اشخاص سے اپنے مال میں اجرت پر بھی کام کراتی تھیں اور ان کو مقررہ حصے کے عوض مال مضاربت پر بھی دیتی تھیں۔ اس عبارت کا صاف مطلب یہ ہے کہ حضرت خدیجہؓ اپنی تجارت میں دو طریقوں سے کام لیتی تھیں: ایک متعین اجرت پر اور دوسرا مضاربت سے نفع کے ایک حصے پر، لیکن کسی نے یہ سمجھ کر کہ دوسرا جملہ پہلے جملے کی تفسیر ہے یہ مطلب نکالا کہ حضرت خدیجہؓ ہر ایک سے صرف مضاربت پر کام کراتی تھیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے جو کام کرایا وہ بھی مضاربت پر تھا، حال ان کہ نہ دوسرے جملے کو پہلے جملے کی تفسیر سمجھنا درست اور نہ اس سے یہ مطلب لینا درست کہ حضرت خدیجہؓ صرف مضاربت پر کام کراتی تھیں، کیوں کہ دوسری روایات اور احادیث میں اس کی تصریح ہے کہ وہ متعین اجرت پر بھی کام کراتی تھیں اور ان حضرت سے جو کام لیا وہ متعین اجرت پر تھا، سفرِ شام کے متعلق تو ابن سعد کی روایت صاف بتا رہی ہے کہ وہ معاملہ چار اونٹوں کے عوض رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ہوا جب کہ دوسرے شخص سے دو اونٹوں کے عوض ہوا تھا۔ اس کے علاوہ المستدرک للحاکم اور سنن الکبریٰ للبیہقی میں حضرت جابرؓ سے مروی ایک حدیث کے الفاظ یہ ہیں: استأجرت خديجة رضي الله عنها رسول الله صلى الله عليه وسلم سفرتين الى جرش، كل سفرة بقلوص، حضرت خدیجہؓ نے اجرت پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دو مرتبہ مقام جرش کی طرف سفر تجارت کا معاملہ کیا، ہر سفر ایک جوان اونٹنی کے بدلے۔ امام حاکم نے اس حدیث کو صحیح الاسناد بتایا ہے، جرش یمن میں کسی جگہ کا نام ہے جہاں بازار لگتا تھا۔ اس روایت سے معلوم ہوا کہ حضور نبی اکرمؐ نے حضرت خدیجہؓ کے لیے یمن کی طرف بھی تجارتی سفر فرمائے جو ہو سکتا ہے کہ شام کے سفر سے پہلے کے ہوں۔

بیہقی میں حضرت جابرؓ سے مروی ایک مرفوع حدیث بھی ہے جس کے الفاظ یہ ہیں:
 قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آجرت نفسي من خديجة سفرتين
 بقلوص۔ حضور نبی اکرمؐ نے فرمایا! میں نے خدیجہؓ سے دو مرتبہ متعین اجرت پر تجارتی سفر کا
 معاملہ کیا۔ ہر سفر ایک جوان اونٹنی کے عوض۔

ان روایات سے اُس مطلب کی صاف تغلیط و تردید ہوتی ہے جو ابن ہشام کی روایت کے
 بعض الفاظ سے لیا گیا اور بعد والوں نے بے سوچے سمجھے لکھنا شروع کر دیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ
 وسلم نے حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ جو تجارتی کام کیا وہ مضاربت کے طور پر تھا۔ اگر ان حضرات
 کے سامنے اس سلسلے کی تمام روایات ہوتیں تو وہ کبھی ایسا نہ لکھتے۔

(۶) اس بحث کے تعلق سے یہاں یہ عرض کر دینا ضروری ہے کہ آن حضرت صلی اللہ علیہ وسلم
 نے مضاربت کا معاملہ کبھی بھی اس لیے اختیار نہیں فرمایا کہ یہ معاملہ احسان کے درجے کا نہیں تھا۔
 اور جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا کہ آن حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ دستور تھا کہ آپ ہمیشہ عدل
 کے مقابلے میں احسان کو اختیار فرماتے، لہذا آپ کسی کاروباری ضرورت مند کو مال نفع کے ایک حصے
 پر دینے کے بہ جاتے اس کو افضل اور بہتر سمجھتے تھے کہ اس کو مال یوں ہی یا قرضِ حسنہ کے
 طور پر دیا جائے۔ اسلام کے بعض دوسرے اصولوں کی رو سے جو عدل سے تعلق رکھتے ہیں
 مضاربت کا معاملہ جائز ہے، لیکن یہ جواز استحباب کے ساتھ نہیں بلکہ کراہیت کے ساتھ ہے۔
 گویا اس کے جائز ہونے کا مطلب ہے حرام نہیں، جیسے طلاق جائز تو ہے، لیکن کراہیت کے ساتھ
 ، کیوں کہ اس کو اَبْغَضُ الْمَبَاهَاتِ فرمایا گیا ہے۔

(۷) قرآن وحدیث کی معاشی تعلیمات میں ایک تعلیم وہ ہے جو ضرورت سے زائد اور
 فاضل مال سے تعلق رکھتی ہے اور وہ یہ کہ زائد از ضرورت اور فاضل مال کو جمع رکھنے کے بہ جاتے
 راہِ خدا اور مصارفِ خیر میں خرچ کر دیا جائے، سورۃ بقرہ کی آیت ہے:

يَسْأَلُونَكَ مَاذَا يُنْفِقُونَ ۗ قُلِ انْفِقُوا

”آپ سے پوچھتے ہیں کہ کیا خرچ کریں فرمادیجیے

جو ضرورت سے زائد ہو“

سورۃ التوبہ کی آیات کا ترجمہ ہے: جو لوگ سونے چاندی کو خزانہ بنا کر رکھتے اور راہِ خدا
 میں خرچ نہیں کرتے انہیں دردناک عذاب کی خبر سنادیجیے جس دن اُس کو جہنم کی
 آگ میں تپایا جائے گا پھر اُس سے اُن کی پیشانیوں، اُن کے پہلوؤں اور اُن کی پیٹھوں کو داغا

جائے گا یہ کہتے ہوئے کہ یہ وہ ہے جو تم نے اپنے لیے خزانہ بنایا پس چکھو مزہ اُس کا جو تم جمع کرتے اور خزانہ بناتے رہے تھے۔

سورۃ الہمزہ میں ہے: ویل وخرابی ہے ہر اُس کے لیے جو سامنے منہ پر دوسرے کو طعنہ دینے والا اور پیٹھ پیچھے عیب جوئی کرتے والا ہے، جس نے مال جمع کیا اور گن گن کر رکھتا رہا اور یہ گمان کرتا رہا کہ اُس کا مال اُس کے لیے ہمیشہ رہے گا۔ ہرگز نہیں وہ چکنا چور کر دینے والی آگ میں پھینک دیا جائے گا۔

صحیح المسلم کی ایک حدیث کا ترجمہ ہے: حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہ نے روایت کرتے ہوئے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اے آدم کے بیٹے یاد رکھ کہ تیرا اپنے فاضل مال کو خرچ کر دینا تیرے لیے بہتر اور اُسے روک رکھنا تیرے لیے بُرا و مفر ہے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ایک حدیث کا ترجمہ ہے: نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے خطبے میں فرمایا خوش بختی ہے اس کے لیے جس نے اپنا فاضل مال خرچ کیا اور فضول باتوں سے خود کو روکا۔

حضرت قتادہ کی روایت کردہ ایک حدیث نبوی کا ترجمہ ہے: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میری طرف چند کلمات وحی کیے گئے جو میرے کان میں داخل ہو کر دل میں ٹھہر گئے: ایک یہ کہ میں اُس کے لیے دُعائے مغفرت نہ کروں جو مشرک مرا ہو، اور دوم یہ کہ جس نے اپنا فاضل مال صحیح مصارف میں خرچ کر دیا وہ اُس کے لیے موجب خیر ہے اور جس نے روک رکھا وہ اس کے لیے موجب شر اور بُرا ہے اور یہ کہ بہ قدر کفاف رکھنے پر اللہ ملامت نہیں کرتا اور ناراض نہیں ہوتا۔

صحیح المسلم میں حضرت ابوسعید الخدری سے مروی ایک حدیث کا ترجمہ یہ ہے: کہا کہ اس دوران کہ ہم ایک سفر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے کہ اچانک اونٹنی پر سوار ایک شخص آیا اور اپنی نہایت لانگ اونٹنی کو دائیں بائیں گھمانے لگا جو چل نہیں سکتی تھی، اُس کی اس قابلِ رحم حالت کو دیکھ کر حضور نے فرمایا: جس کے پاس فاضل سواری ہو وہ اُس پر لوٹا دے جس کے پاس کوئی سواری نہیں، جس کے پاس فاضل خوراک ہو اُس کو دے دے جس کے پاس خوراک نہیں، یہاں تک کہ ہم یہ سمجھے کہ جس کے پاس جو بھی فاضل مال ہے وہ اُس کا حق نہیں بلکہ اُس کا حق ہے جو اُس کا ضرورت مند ہے۔

اب آئیے یہ دیکھیں کہ اس تعلیم کو پیش فرمانے والے کا خود اپنا اس پر کیا عمل تھا، اور صحابہ

کرام کی جو عینی شہادتیں اس بارے میں حدیث کی کتابوں میں محفوظ ہیں ان سے کیا حقیقت سامنے آتی ہے؟

حضرت انس رضی اللہ عنہ جنہیں کئی سال تک خادم خاص کی حیثیت سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت کا شرف نصیب ہوا فرماتے ہیں: کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لآیتہ فیر شیئاً الغدیہ۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے کوئی چیز ذخیرہ نہ کر رکھتے تھے، یہ حدیث جامع ترمذی اور بیہقی وغیرہ میں ہے، حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ایک لمبی حدیث کے آخری الفاظ یہ ہیں: أَلَا دَرَانِي لَأَا كُنْزٍ دِينَارٍ وَلَا دَرَاهِمًا وَلَا آخْبَارٌ زَقَالِغِيَّةٍ، آگاہ رہو کہ میں نہ دینار جمع کرتا ہوں اور نہ درہم اور نہ کھانے کی کوئی چیز گل کے لیے ذخیرہ کر رکھتا ہوں۔ یہ حدیث الترغیب و الترہیب میں ہے۔ حضرت ابوسعد خدری اور حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہما سے مروی ایک حدیث نبوی کا مضمون ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، اگر میرے پاس اُحد پہاڑ کے برابر سونا ہو تو میں اُسے راہِ خدا میں خرچ کر ڈالوں گا اور یہ نہیں چاہوں گا کہ تیسرے دن میرے پاس اس میں سے کچھ بھی باقی رہے سوائے اس کے جو مجھے کسی کا قرض ادا کرنا ہو۔

بخاری اور مسلم میں ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی ایک حدیث کا ترجمہ ہے: کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوئی تو میرے پاس گھر میں کوئی سامانِ خوراک نہ تھا سوائے جو کچھ مقدار کے جو ایک چمڑے کے ظرف میں پڑے تھے۔

صحیح البخاری ہی میں حضرت عمرو بن حارث رضی اللہ عنہ کی ایک روایت کے الفاظ یہ ہیں: ما ترک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عند موتہ درہما ولا دینارا، ولا عبداً، ولا امة ولا شیئاً الا بغلته البیضاء التي کان یرکبھا و سلامہ وارضاً جعلھا لابن السبیل صدقة۔ ترجمہ ہے: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وفات کے وقت نہ درہم چھوڑے نہ دینار، نہ غلام چھوڑا اور نہ کنیز، اور نہ ہی کوئی دوسری شے چھوڑی سوائے سفید فخر کے جس پر آپ سواری فرماتے تھے اور ایک ہتھیار کے اور ایک زمین کے جو مسافر مہمانوں کے لیے بہ طور صدقہ تھی۔

صحیحین میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی ایک حدیث کے الفاظ اس طرح ہیں: توفی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ودرعہ مرہونۃ عند یہودی فی ثلاثین صاعاً من شعیر، حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوئی تو اُس وقت آپ کی زرہ ایک یہودی کے پاس تیس صاع جو کے عوض گروی تھی، غور فرمائیے یہ اُس وقت کی بات ہے جب مالِ غنیمت بڑی مقدار میں آ رہا

تھا اور آپ اپنے ہاتھ سے مسلمانوں میں تقسیم فرما رہے تھے، اصل بات یہ تھی کہ آپ کو جو حصہ ملتا اُسے جمع رکھنے کے بجائے آپ اُسے تقسیم فرمادیتے تھے، اپنی ذات کے لیے کبھی فکرِ فردانہ فرمائی اور اللہ پر انتہائی توکل کا ثبوت پیش فرمایا۔

(۸) اسلام کی معاشی تعلیمات میں سے ایک تعلیم یہ بھی ہے کہ مسلمان کا معیارِ زندگی سادہ ہونا چاہیے یعنی خوراک، پوشاک، گھر اور گھر کیوسامان وغیرہ میں مترقانہ تعیش و تکلف اور امیرانہ ٹھاٹھ باٹھ کے بجائے نمایاں سادگی ہونی چاہیے تاکہ اُس کا مال اس مد پر کم سے کم اور اجتماعی فلاح و بہبود کے مصارف میں زیادہ سے زیادہ خرچ ہو اور اُن برائیوں سے بھی بچ جائے جو مترقانہ زندگی سے ضرور پیدا ہوتی ہیں اور معاشرے کو بُری طرح بگاڑ کر رکھ دیتی ہیں، غور سے دیکھا جائے تو سادہ معیارِ زندگی کے متعلق اسلام کی یہ جو تعلیم ہے فرد اور معاشرے دونوں کے لیے اپنے اندر بے شمار مصالح اور فوائد رکھتی ہے جو روحانی و اخلاقی بھی ہیں اور تمدنی و سماجی بھی، بہر حال یہ واقعہ ہے کہ جو معاشرہ سادگی کی زندگی اختیار کرتا ہے، توازن کے ساتھ ضرورت ترقی کرتا اور زندگی کے ہر میدان میں برابر آگے بڑھتا ہے۔ سادگی کی اس تعلیم پر بھی عمل کا مثالی نمونہ دیکھنا ہو تو وہ بھی سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ میں نمایاں صورت میں دیکھا جاسکتا ہے۔ خوراک کا یہ عالم تھا کہ یہ قول حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا مدینے کی زندگی میں کبھی دو روز مسلسل آپ نے جو کی روٹی بھی پیٹ بھر کر اور سیر ہو کر نہ کھائی، آپ کے دسترخوان پر کبھی ایک سے زیادہ کھانا نہ دیکھا گیا، بعض دفعہ دو دو ماہ گزر جاتے اور گھر میں چولہا نہ جلتا اس لیے کہ پکانے کے لیے کچھ موجود نہ ہوتا اور صرف کھجور اور پانی پر گزارہ ہوتا، کبھی کبھی پڑوسی بکری کا دودھ بھیج دیتے تو پی لیا جاتا، شام کے وقت عموماً فاقہ رہتا اور گھر کے سب لوگ بھوکے پیٹ سوتے۔ سنن ابن ماجہ میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ایک روایت کا ترجمہ یہ ہے: ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں کسی نے گرم کھانا پیش کیا تو آپ نے تناول فرمانے کے بعد الحمد للہ فرمایا اور ارشاد ہوا کہ کئی روز سے گرم کھانا حلق سے نہیں اُترا اور پیٹ میں نہیں پہنچا تھا۔ غذا کی سادگی اور کمی کے بارے میں ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی ایک حدیث خاص طور پر قابل ذکر اور لائق توجہ ہے جس کے الفاظ یہ ہیں: وَكَوْنُ شُئْنَا شَبَعْنَا وَلَكِنَّهٗ كَانَ يُؤْتِرُ عَلٰی نَفْسِهٖ۔ اور اگر ہم چاہتے تو ہمیشہ خوب سیر ہو کر کھا سکتے تھے، لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خود پر دوسروں کو ترجیح دیتے تھے یعنی اپنا سامان خور و نوش بہ طور ایثار و ہمدردی دوسرے مسکین و فقرا کو عطا فرمادیتے تھے گویا یہ حالت اضطراری نہ تھی اختیاری تھی۔ اس کا اظہار اُس مرفوع حدیث سے بھی ہوتا ہے جس کے راوی حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہ ہیں اور جس کا ترجمہ یہ ہے: نبی صلی اللہ

علیہ وسلم نے فرمایا: میرے رب نے مجھ پر یہ چیز پیش فرمائی کہ اگر تم چاہو تو بطحا کو آپ کے لیے سونا بنا دیا جاتے، میں نے عرض کیا کہ میرے رب مجھے نہیں چاہیے بلکہ میری خواہش و تمنا تو یہ ہے کہ ایک دن کھاؤں اور دوسرے دن بھوکا رہوں۔ جب بھوکا رہوں تو عاجزی و زاری کے ساتھ تیرے یاد کروں اور جب کھاؤں تو تیرا شکر یہ ادا کروں اور تیری حمد بجالاؤں، سر دارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم خود بھوکے رہ کر دوسروں کو جو کھلاتے تھے تو آپ دراصل قرآن مجید کی اس آیت پر عمل فرماتے تھے:

وَلْيُؤْتِرُوا عَلٰی اَنْفُسِهِمْ وَ لَوْ كَانَتْ بِهٖمْ فِصَالَةٌ ۝

”اور وہ اپنی ذات پر دوسروں کو ترجیح دیتے ہیں خواہ وہ خود

اس کے ضرورت مند ہوں“

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لباس اور کپڑوں کے بارے میں صحابہ کرام کی جو روایات ہیں ان کا خلاصہ یہ ہے کہ عموماً آپ کا لباس نہایت سادہ اور معمولی رہتا جیسا کہ دوسرے مساکین مسلمانوں کا، آپ نے ہمیشہ قیمتی اور ریشمی لباس سے اجتناب فرمایا۔ بعض دفعہ آپ کی خدمت میں قیمتی لباس پیش کیا گیا تو آپ نے دوسروں کو عنایت فرمادیا، آپ موٹے اور کھردرے لباس کو اپنے لیے پسند فرماتے اور پہنتے، پھر کبھی ایک جوڑے سے زائد نہ تھا اور وہ بھی عموماً پیوند لگا ہوا، حضرت عائشہ صدیقہ فرماتی ہیں وَلَا يُطْوِي لَهَا ثَوْبًا۔ اور کبھی آپ کا کوئی کپڑا تہہ کر کے نہیں رکھا گیا یعنی صرف ایک جوڑا ہوتا تھا دوسرا ہوتا ہی نہیں تھا کہ تہہ کر کے رکھا جاتا۔ بعض روایات میں ہے کہ جن کپڑوں میں حضور کی وفات ہوئی ان میں اوپر تلے کئی پیوند لگے ہوئے تھے اور پھر لباس میں یہ سادگی مجبوری کی بنا پر نہ تھی بلکہ اپنی مرضی اور اختیار سے تھی۔ آپ کے پاس جو اچھا اور زائد کپڑا آتا دوسرے مساکین ضرورت مندوں کو عنایت فرمادیتے۔ حضرت حسن رضی اللہ عنہ سے مروی ایک حدیث کا ترجمہ یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی ذاتی ضرورت کی چیزوں سے لوگوں کی ہمدردی و امداد فرماتے، حتیٰ کہ آپ نے اپنے پھٹے تہ بند پر کپڑے کے بہ جاتے چمڑے کا پیوند لگایا۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو سادگی اور مسکینی کی زندگی اتنی پسند تھی کہ آپ اللہ سے یہ دعا فرمایا کرتے تھے:

اللّٰهُمَّ اٰخِيْنِيْ مُسْكِيْنًا وَّ اَمِيْنِيْ مُسْكِيْنًا وَّ اَحْسَرْنِيْ فِيْ زَمْرَةِ الْمَسْكِيْنِيْنَ

”اے اللہ مجھے زندہ بھی مسکینی میں رکھ اور موت بھی مسکینی میں دے اور میرا حشر بھی مسکینوں میں کرنا۔“

خوراک اور لباس کی سادگی کی طرح تاجدارِ مدینہ صلی اللہ علیہ وسلم کا رہائشی گھر بھی نہایت سادہ، معمولی اور چھوٹا سا تھا، آپ نے مسجد نبوی کے متصل ازواجِ مطہرات کے لیے چھوٹے چھوٹے جو

جُجرے بتوائے، نہ اُن کے صحن تھے نہ دالان۔ اور کسی حجرہ یا کمرہ کی وسعت چھ سات ہاتھ سے زیادہ نہ تھی، دیواریں مٹی کی تھیں اور اتنی کم زور کہ ان میں شگاف پڑے ہوتے تھے جن سے دھوپ اندر آتی تھی۔ چھت چھپر کی طرح کھجور کی شاخوں پتیوں سے بنی تھی، بارش سے بچنے کے لیے بالوں کے کھبل لپیٹ دیے جاتے تھے اور اونچائی اتنی تھی کہ آدمی کھڑا ہو کر چھت کو ہاتھ سے چھوس سکتا تھا، گھر کے دروازوں پر معمولی پردہ یا ایک پٹ کا کواڑ ہوتا تھا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم باری باری ایک ایک شب ایک ایک جُجرے میں گزارتے تھے اور دن میں لوگوں کے لیے نشست ساتھ ہی مسجد میں ہوتی تھی۔ ان جُجروں کے علاوہ اوپر ایک چھوٹا سا بالاخانہ بھی تھا جس کو احادیث میں مشربہ کہا گیا ہے، لکھا ہے کہ آپ نے جب ایلاہ کیا نیز گھوڑے پر سے گر کے جب چوٹ آئی تھی تو ایک مہینہ اسی مشربہ میں اقامت فرماتی تھی، اس کمرے میں جو فرنیچر اور گھر پلو سامان تھا وہ ہر ف یہ کہ ایک چٹائی یا بان کی چار پائی جس پر لیٹنے سے جسم پر نشان پڑ جاتے تھے، چمڑے کا ایک تکیہ جس میں کھجور کی چھال بھری ہوئی تھی اور ادھر ادھر چند کھالیں لٹکی ہوئی تھیں اور بس، روشنی کے لیے چراغ تک موجود نہ تھا، ایک حدیث میں ہے کہ ایک مرتبہ ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے دیوار پر دھاری دار رنگین پردہ لٹکا دیا تو حضور ﷺ دیکھ کر ناراض ہوئے اور فرمایا کہ ہمیں اینٹ پتھر کو لباس پہنانے کے لیے مال نہیں دیا گیا ہے اور اُسے اُتر دیا۔

(۹) قرآن و حدیث کی معاشی تعلیمات میں سے ایک تعلیم یہ بھی ہے کہ افراد معاشرہ کے درمیان

معیار معیشت اور منظر معیشت میں زیادہ سے زیادہ مساوات و یکسانی ہونی چاہیے۔ اس کی کچھ وضاحت یہ کہ قرآن و حدیث کی رو سے یہ تو جانتے ہیں کہ معاشرے کے بعض افراد کے پاس مال زیادہ اور بعض کے پاس کم ہو، کیوں کہ مال کمانے کی دماغی جسمانی صلاحیتیں اور قوتیں سب انسانوں کے اندر برابر و یکساں نہیں بلکہ ان میں نمایاں فرق و اختلاف اور کھلی تفاوت ہے لہذا اس کے نتیجے میں بعض انسانوں کے پاس رزق و مال کم اور بعض کے پاس زیادہ ہونا قدرتی امر ہے۔ اور چوں کہ رزق و مال کے اس فرق و تفاوت کے ساتھ انسانوں کی انفرادی و اجتماعی گونا گوں مصلحتیں وابستہ ہیں لہذا اللہ تعالیٰ نے اس کی

نسبت اپنی طرف فرمائی ہے، سورۃ النحل میں ارشادِ رب العزت ہے:

وَاللّٰهُ فَضَّلَ بَعْضُكُمْ عَلَىٰ بَعْضٍ فِي الرِّزْقِ ۝

”اور اللہ نے تمہارے بعض کو بعض پر رزق میں

فضیلت دہر تری دی ہے“

اور سورۃ الرعد میں فرمایا:

اللّٰهُ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَن يَّشَاءُ وَيَقْدِرُ ۝

اللہ کھلا کرتا ہے رزق جس کے لیے چاہتا ہے اور تنگ کرتا ہے۔“

یہ اور اس مضمون کی متعدد قرآنی آیات میں اللہ تعالیٰ نے بندوں کے درمیان رزق و مال کی کمی بیشی کو اپنی طرف منسوب فرمایا ہے جس کا ایک مطلب یہ ہے کہ اس کو کوئی ختم نہیں کر سکتا اور اس کا موجود رہنا انسانیت کے لیے مفید اور ضروری ہے، غرض یہ کہ اسلام یہ نہیں چاہتا کہ معاشرے کے سب افراد کے پاس رزق و مال برابر و مساوی ہو، لیکن یہ ضرور چاہتا ہے کہ معیار زندگی اور ظواہر معیشت میں زیادہ سے زیادہ برابری و یکسانی ہو یعنی ایک تو یہ کہ معاشرے کا کوئی فرد بنیادی معاشی ضروریات سے محروم نہ ہو جن کے بغیر عام طور پر ایک انسان نہ اطمینان کے ساتھ زندہ رہ سکتا اور نہ اپنے متعلقہ فرائض ٹھیک طور پر ادا کر سکتا ہے جو مختلف حیثیات سے اُس کے ذمے عائد ہوتے ہیں۔ مطلب یہ کہ ہر فرد کو کسی نہ کسی شکل میں اور کسی نہ کسی معیار پر ہمیشہ غذا، لباس اور مکان ضرور میسر ہو، اور دوم یہ کہ ان ظاہری چیزوں میں جہاں تک ممکن ہو سکے مساوات و برابری ہو، اور اسلام یہ اس لیے چاہتا ہے کہ جس معاشرے کے بعض افراد بنیادی معاشی ضروریات ہی سے محروم ہوں اُس میں دیر سویر ایسے حالات ضرور رونما ہو کر رہتے ہیں جن سے پورا معاشرہ بد امنی و بے چینی میں مبتلا ہو جاتا ہے اور کسی کو پائیدار امن و اطمینان نصیب نہیں ہوتا، اسی طرح جس معاشرے کے بعض افراد کا معیار زندگی بہت اونچا اور بعض کا بہت پست ہو، بعض کے دسترخوان پر قسم قسم کے نفیس کھانے اور بعض کے دسترخوان پر رُو دکھی سُو دکھی روٹی ہو، بعض کے پاس مختلف قسم کے قیمتی و فاخرانہ لباس و کپڑے کثیر تعداد میں ہوں اور بعض کے پاس برائے نام سادہ قسم کے ایک دو جوڑے ہوں، اسی طرح بعض کے پاس قیمتی فرنیچر سے مرصع شان دار بنگلے اور کوٹھیاں ہوں اور بعض کے پاس ضروری سامان کے بغیر کچھ مکان و جھونپڑے ہوں ایسے معاشرے میں طرح طرح کے اخلاقی، معاشرتی، معاشی اور سیاسی مفاسد جنم لیتے اور اس کو کھوکھلا دلو دانا کر تباہی و بربادی سے ہمکنار کر دیتے ہیں مثلاً پلس ماندہ افراد میں سے جن کی تعداد بہت زیادہ ہوتی ہے، بعض حسد و بغض میں مبتلا ہو کر جلتے رہتے اور اوپر والوں کو نقصان پہنچانے کی کوشش کرتے ہیں اور بعض رشک میں مبتلا ہو کر اپنے پست معیار زندگی کو بلند کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جب جائز طریقوں سے اس میں کامیاب نہیں ہوتے تو حرام و ناجائز طریقے اختیار کرتے ہیں جن سے دوسروں کی حق تلفی ہوتی اور بے چینی پھیلتی ہے۔ اسی طرح اونچا معیار زندگی رکھنے والوں کے اندر فخر و غرور پیدا ہوتا ہے اور وہ نچلے معیار زندگی والوں کو حقارت سے دیکھتے اور اُن کے ساتھ ناروا سلوک کرتے ہیں، نیز اُن کے اندر وہ بُرائیاں جنم لیتی ہیں جو اُنچے معیار زندگی کا خاصہ ہیں، اور چوں کہ یہ تمام خرابیاں اور بُرائیاں افراد معاشرہ کے اندر اس صورت میں پیدا نہیں ہوتیں جب اُن کے درمیان مظاہر معیشت اور معیار زندگی میں فطری مساوات ہو لہذا

اسلام یہ چاہتا ہے کہ مقدار مال کی کمی بیشی کے باوجود افراد کے معیار زندگی میں مساوات دیکھ سانی ہونی چاہیے۔

قرآن مجید کی جن آیات میں یہ بیان ہے کہ اللہ تعالیٰ سب جان داروں اور سب انسانوں کا رب اور رزاق ہے اور وہ یہ چاہتا ہے کہ ہر جان دار اور ہر انسان کو رزق اور سامان پرورش ملے، نیز جن آیات میں یہ بیان ہے کہ اللہ تعالیٰ نے زمین کی تمام اشیاء یعنی نوع انسان اور سب انسانوں کے انتفاع و استفادہ کے لیے پیدا فرمائی ہیں اور سب کو اُن سے فائدہ اٹھانے کا مساوی حق ہے، اور پھر وہ آیات جن میں طعام، لباس اور مسکن کا سب انسانوں کے لیے یہ طور ایک نعمت خداوندی کے ذکر ہے، اس پر دلالت کرتی ہیں کہ نوع انسان کے ہر فرد کو رزق اور سامان معیشت بہ صورت غذا، لباس اور گھر ضرور ملنا چاہیے اور کوئی اس سے محروم نہ رہے۔

اسی طرح قرآن حکیم کی جن آیات میں مال دار ہونے پر اترانے اور فخر کرنے، اپنی تو نگری کا دوسروں پر رعب جمانے اور ظواہر معیشت کے ذریعہ سے اپنی دولت و ثروت کا مظاہرہ کرنے کی مذمت اور جماعت ہے، جیسے وہ آیات جن میں قارون، اس کی نمائش مال و دولت اور پھر اُس کے انجام بد کا تذکرہ ذقنہ ہے، اس کا تقاضا کرتی ہیں کہ جن کے پاس زیادہ مال و دولت ہو وہ معیار معیشت کے ذریعہ سے اس کا اظہار نہ کریں اور خوراک، پوشاک اور رہائش وغیرہ میں ایسے معیار زندگی سے بچیں جسے معاشرے کی عظیم اکثریت آسانی کے ساتھ نہ اپنا سکتی ہو۔

سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی جن احادیث میں یہ تعلیم ہے کہ افراد معاشرہ کے درمیان معیار زندگی میں مساوات ہونی چاہیے اُن میں سے ایک نہایت واضح حدیث وہ ہے جس میں آپؐ نے غلاموں کے آقاؤں کو یہ ہدایت فرمائی ہے کہ جو خود کھاتے ہو وہی اُن کو بھی کھلاؤ، جو خود پہنتے ہو وہ اُن کو بھی پہناؤ اور معیشت کی ظاہری چیزوں میں اُن سے کوئی امتیاز نہ برتو، چنانچہ اس مبارک ہدایت پر عمل ہوا اور نتیجہ یہ نکلا کہ حضرت عثمان غنی اور حضرت عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہما جیسے غنی و متمول صحابہ کرامؓ جب اپنے غلاموں کے ساتھ بیٹھے ہوتے تو اجنبی پہچان نہ سکتا کہ ان میں آقا کون ہے اور غلام کون، کیوں کہ معیار معیشت میں ان کے درمیان کوئی فرق نہ نظر آتا تھا۔ لکھا ہے کہ مدینہ منورہ میں سب مسلمانوں کے مکان تقریباً ایک ہی جیسے مٹی پتھر سے بنے ہوئے کچے مکان تھے، بعض دفعہ کسی نے اپنے مکان میں امتیازی شان پیدا کرنے کی کوشش کی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ناراضگی کو دیکھ کر اس امتیازی شان کو ختم کر دینا پڑا۔ معجم طبرانی کی ایک حدیث کے الفاظ اس طرح ہیں: عن ابی العالیة ان العباس بن عبد المطلب رضی اللہ عنہ بنی غرقة فقال النبی صلی اللہ علیہ وسلم

أَهْدِيْهَا، فَقَالَ أَهْدِيْ مَهَا وَالصَّدَقِ بِشَمْنِهَا؛ فَقَالَ أَهْدِيْ مَهَا. حضرت ابو العالیہ کی روایت ہے کہ حضرت عباسؓ نے اپنے مکان پر خوب صورت بالاخانہ بنایا جو امتیازی شان کا حامل تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن سے فرمایا اسے گرا کر منہدم کر دو، انہوں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہؐ کیا دوں یا اس کی قیمت صدقہ کر دوں تو آپؐ نے فرمایا گرا دو۔

سنن ابی داؤد اور سنن ابن ماجہ وغیرہ میں ایک اور حدیث ہے جس کا مضمون اس طرح ہے: انصارِ مدینہ میں سے ایک نے اپنے گھر کے دروازے پر اونچا سا قبة بنوایا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا وہاں سے گزر ہوا تو دیکھ کر پوچھا یہ کس کا مکان ہے بتلایا گیا کہ فلاں کا، آپؐ سن کر خاموش ہو گئے، لیکن دل سے ناراض ہوئے، پھر جب حسبِ معمول وہ صحابیؓ مجلسِ مبارک میں حاضر ہوئے اور سلام عرض کیا تو حضورؐ نے اُن سے منہ موڑ لیا اور جواب نہ دیا لہذا انہیں محسوس ہوا کہ حضور کسی وجہ سے ناراض ہیں، پوچھنے پر بعض صحابہؓ نے اُن کو بتایا کہ اس ناراضی کی وجہ وہ قبة ہے جو آپؐ نے بنایا ہے۔ وہ یہ سن کر گھر گئے اور اس قبة کو فوراً مسمار کر دیا، پھر ایک موقع پر جب حضورؐ کا وہاں سے گزر ہوا تو قبة نہ دیکھ کر پوچھا تو بتایا گیا کہ اس کے مالک کو جب آپؐ کی ناراضی کا علم ہوا تو اُس نے فوراً اُس کو گرا دیا۔ اس پر حضورؐ خوش ہوئے اور اس صحابیؓ کے حق میں دعا فرمائی، ایک روایت میں یہ بھی ہے کہ اُس قبة کو دیکھ کر آپؐ نے فرمایا: اس قسم کی عمارت اُس کے مالک کے لیے قیامت کے دن وبال بنے گی۔ یہ بہر حال اس قسم کی احادیث کا ایک مطلب یہ بھی نکلتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم یہ چاہتے تھے کہ مسلمانوں کے درمیان رہائشی مکانات میں بھی یکسانی دہرا برزی ہونی چاہیے تاکہ مکانات کے ذریعہ سے وہ ایک دوسرے پر فخر و مباہات کا اظہار نہ کر سکیں۔ ان بارے میں کاتب کے پاس سامانِ معیشت ہو اور یکسانی کے ساتھ ہو اُس حدیثِ نبویؐ کا ذکر بھی ضروری ہے جو امام بخاریؒ نے کتاب الشریکۃ میں نقل فرمائی ہے اور جو اس طرح ہے: عن ابی موسیٰ قال قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم ان الاشعرئیین اذا ارسلوا فی الغزو، او قل طعام عیالہم بالمدينة جمعوا ما عندہم فی ثوب واحد ثم اقتسموہ بینہم فی انا واحد بالسویۃ، فہم متی وانا منہم۔ حضرت ابو موسیٰؓ سے مروی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: قبیلہ اشعر کے لوگوں کا یہ طریقہ اور طرزِ عمل تھا کہ جب جنگ کے موقع پر خوراک کی کمی محسوس کرتے، یا مدینہ میں بہر حال امن و تحفظ وغیرہ کی وجہ سے اُن کے سامنے کمی خوراک کا مسئلہ کمڑا ہوتا تو وہ اپنا سب بچا کھچا سامانِ خوراک ایک جگہ ایک کپڑے پر جمع کرتے اور پھر اس کو ایک پیمانے سے اپنے درمیان برابر برابر تقسیم کر لیتے، اور فرمایا وہ مجھ سے ہیں اور میں اُن سے ہوں۔

اس حدیثِ مبارک کے آخری الفاظ خاص طور پر قابلِ توجہ اور لائقِ اعتنا ہیں۔ ان کا تعلق

اشعریوں کے جس طرزِ عمل سے ہے وہ اُن کے اندر قبل از اسلام چلا آ رہا تھا، اس طرزِ عمل کی وجہ سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا اُن کے متعلق یہ فرمانا "فَمَنْ مِمَّنِي وَآنَا مِنْكُمْ" اس پر دلالت کرتا ہے کہ یہ طرزِ عمل آپ کے نزدیک صحیح اسلامی طرزِ عمل اور بے حد محبوب تھا اور اس فرمانے سے مقصد یہ تھا کہ مسلمان بھی اپنی زندگی میں یہی طرزِ عمل اختیار کریں۔

پھر امام بخاری نے اسی کتاب الشریکۃ میں ایک فعلی حدیث بھی بیان فرمائی ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ایک غزوے میں حضور نبی اکرم نے بھی یہی طرزِ عمل اختیار فرمایا۔ جب صحابہ کرام نے قلتِ خوراک کی شکایت پیش کی، آپ نے منادی کرائی کہ جو جس کے پاس سامانِ خوراک رہ گیا ہے ایک جگہ جمع کر دیا جائے۔ جب جمع ہو گیا تو آپ نے برکت کی دُعا کے بعد فرمایا کہ سب اس میں سے اپنی ضرورت کے مطابق لے لیں، چنانچہ سب نے اپنے اپنے برتن و توشہ دان بھر لیے اور اُس کے بعد بھی کچھ بچ گیا، پھر امام بخاری نے اسی باب میں حضرت ابو عبیدہ بن الجراحؓ کے متعلق بھی ایک اثر بیان فرمایا کہ اُن کو بھی جب ایک غزوے میں ایسی ہی صورتِ حال پیش آئی تو بہ حیثیت سردارِ لشکر اور سپہ سالار کے آپ نے لشکریوں کو حکم دیا کہ جس کے پاس جو بھی سامانِ خوراک ہے ایک جگہ جمع کر دیا جائے، چنانچہ جمع ہونے کے بعد آپ نے سب کے مابین برابر برابر تقسیم فرمایا، اس روایت کو بیان کرنے سے امام بخاری کا مقصد یہ بتانا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک غزوے میں جو طرزِ عمل اختیار فرمایا وہ آپ کی ذات سے مخصوص و مختص نہ تھا۔ درنہ حضرت ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ اس کو اختیار نہ فرماتے، اور یہ کہ اس طرزِ عمل کا جن خاص حالات سے تعلق ہے وہ جب اور جہاں بھی پائے جائیں مسلمانوں کے سردار و سربراہ پر لازم ہوگا کہ وہ اس سُنّتِ رسول پر عمل کرتے ہوئے مذکورہ طرزِ عمل اختیار کرے۔

(۱۰) قرآن و حدیث کی معاشی تعلیمات میں سے ایک بڑی اہم تعلیم یہ بھی ہے کہ مسلمان اپنے ذاتی اخراجات میں اسراف و تبذیر سے بچے یعنی نہ اپنے مال کو غلط اور بے جا مصارف میں خرچ کرے اور نہ جائز و صحیح مصارف میں خرچ کرتے وقت حدِ اعتدال سے آگے بڑھے، کچھ واضح الفاظ میں مطلب یہ ہے کہ اسلام نے مسلمانوں کو جس اسراف سے روکا اور جس کے مرتکب کو مجرم و گنہگار ٹھہرایا ہے کیف و کم کے لحاظ سے اُس کی دو قسمیں ہیں: کسی حرام چیز اور ناجائز کام میں مال خرچ کرنا خواہ کتنا ہی کم اور تھوڑا کیوں نہ ہو باعتبار کیف کے اسراف ہے، اور کسی صحیح اور مشروع مصرف میں حدِ اعتدال اور قدرِ ضرورت سے زیادہ خرچ کرنا، باعتبار کم کے اسراف ہے اور دونوں حرام و ناجائز ہیں، مثلاً شراب و دیگر نشہ آور اشیا، مُردار، لُحْمِ خنزیر، مَحْسَمے و مورتیاں، مُردوں کے لیے ریشمی لباس اور سونے کی انگوٹھی وغیرہ، لہو و لعب اور موسیقی کے آلات، نیز جوئے لاٹری، کسی کا حق مارنے کے لیے حکام کو رشوت وغیرہ، حرام و ممنوع چیزوں اور

کاموں میں مال خرچ کرنا خواہ کتنا ہی تھوڑا ہو اسراف کی تعریف میں آتا ہے، اسی طرح طعام و خوراک لباس و پوشاک اور مکان و فرنیچر، ضروری سواری پر حد سے زیادہ خرچ کرنا بھی اسراف کے تحت آتا ہے۔ اور پھر یہ دوسرا اسراف تفاخر کے جذبے اور اپنی شان دولت مندی کے اظہار کی غرض سے ہو تو وہ دگنا جرم بن جاتا ہے۔ فقہانے لکھا ہے کہ بغیر کسی دینی مصلحت اور مہمان کی ضیافت کے ایک سے زیادہ کھانے پکانا، نیز ضرورت دور وٹیوں کی ہو اور تین پکوانا یا خریدنا، اسراف ہے، ضرورت و حاجت سے زیادہ کپڑے و لباس بنوانا جو بکسوں اور الماریوں میں پڑے پڑے ضائع دیے کار ہو جائیں اور کبھی ان کے استعمال کی نوبت ہی نہ آئے، اسراف ہے، ایک سادہ مکان، لیکن جو ضرورت سے زائد ہو یعنی ضرورت دو کمروں کی تھی اور تین بنوائے یا ضرورت چار کمروں کی تھی اور پانچ بنوائے یا خرید لیے تو یہ بھی اسراف ہے۔

مقام افسوس ہے کہ مسلمان اسراف کے معاملے خصوصاً مکانوں کے اسراف کے معاملے میں اتنے زیادہ آگے نکل چکے ہیں کہ اب ان کو اعتدال پر لانا بہت مشکل بلکہ ناممکن و محال ہو کر رہ گیا ہے۔ بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ غنی و مال دار مسلمان اسلام کی اس تعلیم کو تقریباً بھول چکے ہیں جو اسراف و تبذیر سے متعلق اور اسلامی معاشیات میں بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ آج اچھے خاصے مسلمان جو نماز روزے، زکوٰۃ کے پابند محو پرچ اور ٹرے کرتے چلے جا رہے ہیں، تکاثر و تفاخر کے جنون میں مبتلا اور معیار زندگی کو بلند سے بلند تر کرنے اور ایک دوسرے سے آگے بڑھ جانے کی فکر و کوشش میں منہمک و مستغرق ہیں اس کا نتیجہ وہ بدترین صورت حال ہے جس سے آج ہر جگہ مسلمان معاشرے اور نام نہاد اسلامی ممالک دوچار ہیں۔ اور زعماد مصلحین حضرات کی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا کہ اس صورت حال کی اصلاح ہو تو کیسے ہو، کیوں کہ بعض حضرات اس کے لیے جو کوششیں فرما رہے ہیں ان سے نہ صرف یہ کہ مطلوبہ نتائج برآمد نہیں ہو رہے بلکہ صورت حال مزید بگڑتی چلی جا رہی ہے، ضرورت ہے کہ مرض کے اصل اسباب کو پوری طرح سمجھ کر ایسا علاج تجویز کیا جائے جس کا فائدہ عارضی نہ ہو بلکہ مستقل و پائیدار ہو۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی معاشی اصلاحات

جناب محترم مولانا عبدالقدوس ہاشمی

الحمد لله وحده والصلاة والسلام على النبي الذي لا نبي بعده

دنیا میں ایسی تحریکیں بہت ہی کم پیدا ہوتی ہیں جنہوں نے انسانی زندگی کے ہر پہلو کو متاثر کیا ہو۔ کوئی تحریک صرف ایک پہلو کو متاثر کرتی نظر آتی ہے اور کوئی تحریک دو پہلوؤں پر اثر انداز ہوتی ہے۔ اور بعض تحریکوں کا تو مقصد ہی یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایک پہلو کی اصلاح ہو جائے۔ کوئی محض ایک پہلو مثلاً سیاسی صورت حال کی اصلاح چاہتی ہے اور کوئی بڑھتی ہوئی مادی وابستگی اور عیش کوشی سے لوگوں کو دور رکھنے کی ہدایات پر اپنا سارا زور صرف کر دینا پسند کرتی ہے۔ ایسی ہی ایک رُخی اصلاحی تحریکوں میں سے چین کے بوڑھے فلسفی لاؤ زے کی تحریک تاؤ مت، ایران کے عظیم المرتبت فلسفی زردشت اعظم کی تحریک، شری درہمان مہا سیرجی کی تحریک جین مت اور گھور تپتیا اور مہا تپتیا کی تحریک بدھ مت وغیرہ ہیں۔

اسلام ایسی کوئی یک رُخی تحریک نہیں ہے بلکہ ایک ہمہ گیر نظام زندگی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو دنیا میں جس طرح زندگی بسر کرنے کی ہدایات دی تھیں اُن ہی کا نام اسلام ہے۔ قرآن مجید میں تو بار بار یاد دلایا گیا ہے کہ دین ہمیشہ سے اسلام ہی رہا ہے۔ سورۃ الشوریٰ کی تیرھویں آیت میں وضاحت کے ساتھ اطلاع دی گئی ہے کہ جو شریعت تم کو دی جا رہی ہے اور جو دین تمہیں دیا گیا ہے یہ وہی ہے جو حضرت نوح علیہ السلام کو اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کو دیا گیا تھا۔ حتیٰ کہ لفظ مسلمین کے ساتھ سورۃ الحج کی آیت نمبر ۷۸ میں بتایا گیا ہے کہ یہ تمہارے باپ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ملت ہے۔ اُن ہی نے تمہارا نام مسلمین رکھا ہے۔

ہمیں مذہبی افسانوں اور آثارِ قدیمہ کے ذریعے سے جو تاریخی معلومات حاصل ہو سکی ہیں وہ بھی یہی بتاتی ہیں کہ بنی نوع انسانی کا اولین مذہب توحید تھا۔ یعنی مونو تھزم ہی انسان کا اولین مذہب ہے اور اسی عقیدے کے ماتحت انسانوں کے اعمال و حرکات میں تنظیم پیدا ہوتی ہے۔ اقوامِ قدیمہ کے افسانوں میں اسمائے معرّفہ بدلے ہوئے تو ملتے ہیں، لیکن عقیدۂ توحید کامل یا ناقص صورت میں ہر قوم میں موجود ہے۔

اس کے بعد قوموں نے صفاتِ الہی کی تجسیم کی یا مخلوقات میں صفاتِ الہی کو مرکوز کیا، اس طرح عقائد و افکار میں خرابیاں پیدا کیں اور ان افکار کے زیر اثر اعمال و حرکات وجود میں آئے۔ ہر قوم میں ہادی درہ نما آئے اور انہوں نے اول عقائد کی اور پھر اعمال کی اصلاح کی۔

چوں کہ انسانی اعمال کا ایک بڑا بلکہ بہت بڑا حصہ انسان کی معاشی جدوجہد ہوتا ہے، اس لیے لازمی طور پر خرابیاں سب سے زیادہ اُس کے معاشی اعمال میں نمایاں ہوئیں۔ عقائد کی خرابی کا اثر انسان کی اُن حرکات پر پڑا جو ایک آدمی اپنی اور اپنے بال بچوں کی ضروریاتِ زندگی مہیا کرنے کے لیے کرتا ہے، معاملات میں دھوکا، فریب، لوٹ کھسوٹ، چور بازاری، ذخیرہ اندوزی، چوری اور حیب تراشی وغیرہ، یہ سب انسان کے عقائد کی کم زوری اور خالق کائنات پر کامل اعتماد کے فقدان کا لازمی نتیجہ ہے۔ اگر کوئی شخص اللہ تعالیٰ پر پورا بھروسہ رکھتا ہے کہ وہ محنت کرنے والے کو اس کا صلہ ضرور دے گا۔ اور اگر اس کا یہ بھی یقین ہے کہ اس کو اپنی اعمال کے لیے ایک دانا و پینا اللہ جل جلالہ کے سامنے جواب دہ ہوتا ہے تو اس کی معاشی جدوجہد اس قسم کے اعمال کی صورت اختیار نہیں کر سکتی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تاریخ کے جس دور میں پیدا ہوئے وہ اجتماعِ نوعِ انسانی کے پھیلاؤ کا وسیع ترین دور تھا۔ مشرق و مغرب میں تجارتی تعلقات پوری طرح قائم ہو چکے تھے۔ ساری دنیا کے لوگوں میں مقامی اور بین الاقوامی لین دین ہونے لگے تھے۔ دنیا میں بڑی بڑی حکومتیں اور بادشاہیاں پیدا ہو چکی تھیں۔ شان و شکوہ اور اسراف و تبذیر کی بدترین صورتیں موجود تھیں۔ اس لیے یہ ضروری تھا کہ حضرت آدم علیہ السلام کا دینِ اسلام اور حضرت نوح علیہ السلام کی شریعت پھر سے اور مکمل صورت میں قائم کی جائے تو عقائد و عبادات کے ساتھ ساتھ معاشی جدوجہد اور معاملات کی بھی اصلاح کی جائے۔ اگر اس کی طرف پوری توجہ نہ دی جاتی تو انسانیت کا بڑا نقصان ہوتا اور دینی نظام ناقص کا ناقص رہ جاتا، اس لیے آخری پیغمبر اسلام نے عقائد و عبادات کے بعد سب سے زیادہ توجہ معاشی اصلاحات کی طرف مبذول فرمائی

معاشیات کی اہمیت

معاشی اصلاحات پر گفت گو کرتے ہوئے سب سے پہلا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ انسانی اعمال میں معاشی جدوجہد کو کیا مرتبہ دیا جائے؟ کیا تقربِ الہی حاصل کرنے کے لیے معاشی جدوجہد سے کنارہ کش ہو کر مٹھوں، دیباڑوں اور خالقاہوں میں بیٹھ رہنا ضروری ہے، یا تعذیبِ نفس کرنا، ترکِ دنیا کر کے جنگلوں اور پہاڑوں میں بسیرا کرنا مفید ہے؟ انسان نے یہ صورتیں پیدا کر رکھی تھیں، حال آں کہ اسے خبر تھی کہ یہ ساری صورتیں فطرت کے خلاف جنگ کی ہیں۔ سارے انسان تو کیا ایک فرد واحد بھی پوری طرح ترکِ دنیا

ہیں کر سکتا، وہ اگر صحت نشین ہو جائے گا پھر بھی اس کے گرد پیش دنیا ہی ہوگی، وہ معاش کے معروف طریقوں کو چھوڑ بھی دے گا تو بارش، دھوپ اور سردی سے بچنے کے لیے کسی کھوہ اور غار کی ضرورت باقی ہی رہے گی۔ وہ پیاس بجھانے کے لیے چشمہ آب تک ضرور جائے گا اور بھوک میں جنگلی پھل ضرور بٹورے گا۔ وہ دہارا میں رہ کر بھیک پر گزارا تو کرے گا، لیکن بھیک دینے والوں کو بھیک دینے کے لیے معاشی جدوجہد کرنی ہی پڑے گی۔ ایک بزرگ کسی خانقاہ میں چلے و مراقبہ تو کریں گے، لیکن ان کے لیے ضروریات زندگی بہت سے مریدوں کی معاشی جدوجہد ہی سے مہیا ہو سکیں گی۔

انسان نے اپنی نادانی سے جو یہ تصور قائم کر رکھا تھا کہ معاشی جدوجہد تقرب الہی کے راستے میں حائل ہے، حضور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی اصلاح کی، اور بار بار یہ وضاحت فرمائی کہ معاشی جدوجہد کا مرتبہ عبادت الہی کے برابر ہے، بلکہ کسبِ حلال خود اپنی جگہ پر ایک عبادت ہے۔ بندۂ مومن کو روزی کمانے کا دنیوی فائدہ ہی نہیں بلکہ اخروی ثواب بھی ملے گا۔ کسبِ حلال اللہ تعالیٰ کا حکم ہے۔ اس کی خلاف ورزی معصیت اور گناہ ہے۔ معاشی جدوجہد تقرب الہی کی راہ میں حائل نہیں بلکہ تقرب الہی کا ذریعہ ہے۔ ایک بندۂ مومن حلال مال کے لیے جو محنت کرتا ہے، اس کی وجہ سے وہ اللہ کا پیارا اور حبیب ہو جاتا ہے۔ ارشاد فرمایا کہ:

(۱) جو ایک پودا بھی زمین پر لگاتا ہے وہ نیک عمل کرتا ہے جس کے صلے میں وہ جنت کے باغوں کا مستحق قرار پاتا ہے۔ (زراعت)

(۲) ایمان دار تاجر قیامت کے دن عرشِ اعظم کے سائے میں جگہ پائے گا۔ (تجارت)

(۳) محنت اور مزدوری کر کے حلال روزی کمانے والا اللہ تعالیٰ کا حبیب دوست ہوتا ہے (محنت) اسی طرح رزق حاصل کرنے کے جتنے ذرائع جاتز ہیں، ان سب کی تعریف فرمائی۔ لوگوں کو ترغیب دی کہ وہ ان ذرائع کو اختیار کریں اور رزقِ حلال حاصل کریں۔ یہی خالق کائنات کا حکم ہے اور انھیں صرف دنیا ہی میں نہیں بلکہ آخرت میں بڑا صلہ ملے گا۔

صرف دولت

دوسرا اہم سوال جو کچھ ہم کمائیں اُس کے صرف کرنے کا ہے۔ انسان کی ضروریات اور ان کی تکمیل کے لیے دولت کی پیدائش، یہ ایک اہم سوال ہے۔ انسان نے اس میں بڑی بڑی خرابیاں پیدا کر رکھی ہیں، اور ان کی وجہ سے معاشرۂ انسانی میں بے پناہ خرابیاں پیدا ہو گئی ہیں۔ ضروریاتِ انسانی کی اگر صحیح تقسیم و تقسیم کی جائے تو حسبِ ذیل قسمیں ہوتی ہیں۔

(۱) ضروریاتِ زندگی :- یعنی ایک انسان کو اپنی اور اپنے اہل و عیال کی زندگی کے لیے جن چیزوں

کی ضرورت ہوتی ہے۔ مثلاً غذا، پانی، مکان، لباس، دوا وغیرہ وغیرہ۔

(۲) ضروریاتِ کارکنہ کی: یعنی ایک آدمی کو اپنا کام جاری رکھنے کے لیے جن چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ مثلاً کسان کے لیے ہل، بیل، ٹریکٹر وغیرہ، صنعت کار کے لیے اوزار، آلات وغیرہ، تاجر کے لیے گودام اور ساتبان وغیرہ۔

(۳) ضروریاتِ توانائی یا ارجاعِ توانائی: یعنی آدمی اپنی حرکات میں اور جدوجہد میں اپنی توانائی کا جو حصہ صرف کرتا ہے، اس کے پھر سے واپس لانے کی تدابیر کے سلسلے میں جو ضروریات لاحق ہوتی ہیں مثلاً سیر، تفریح، ورزش وغیرہ۔

ان تینوں اقسامِ ضرورت کو شریعتِ اسلامی نے قبول کیا ہے۔ اور ان کی تکمیل کے لیے جدوجہد کو محمود اور قابلِ تعریف قرار دیا ہے۔ البتہ ان کی تکمیل کے سلسلے میں اعتدال سے باہر قدم رکھنے کی ممانعت کر دی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اعتدال کی راہِ مستقیمہ پر رہنے کے سلسلے میں بہت سی ہدایات دیں۔ مثلاً کھانے پینے میں حرام و حلال کی پابندی قائم رکھو۔ ایسا مکان نہ تعمیر کرو جو ضرورت سے زائد ہو اور جس میں سکونت مقصود ہی نہ ہو۔ جب خود کھاؤ پیو تو یہ یاد رکھنا کہ ہمسایہ بھوکا تو نہیں ہے۔ سائل اور محروم کے حق سے غافل نہ ہو جاؤ۔ قربت داروں کے حقوق و ضروریات یاد رکھو اور ان کے ساتھ صلہ رحمی کا سلوک کرتے رہو۔ وغیرہ وغیرہ۔

ان تینوں مباح ضروریاتِ زندگی کی تکمیل کے سلسلے میں اعتدال کا دامن چھوٹنے کے بعد کیا کیا خرابیاں پیدا ہوتی ہیں، ان کے معلوم کرنے کے لیے کسی کو عظیم مفکر یا فلسفی ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ ایک ذی ہوش اپنے گرد و پیش نظر ڈال کر بہ آسانی معلوم کر سکتا ہے کہ بے اعتدالی کی وجہ سے کس قدر رشک و حسد، مخالفت اور دشمنی اور سب سے زیادہ معاشی ناہمواری پیدا ہوتی ہے۔ شداد کی طرح لوگ جنتِ ارضی تعمیر کرنے اور مہاراجہ در بھنگہ کی طرح سو رگ بھون بنانے کے سلسلے میں کیا کچھ نہیں کر گزرتے۔ رنگ محل کی تعمیر اور پانی محل بنوانے میں کتنے مزدوروں سے بغیر ادائے اجرت بیگار لی گئی۔ شہزادی کلپوٹرا، روم کی ملکہ اور خود مسلمان شہزادی شجرۃ الدر کے ملبوسات کی تیاری میں کاریگروں پر کیا گزری۔

ان تینوں ضروریات کے علاوہ آدمی دو اور قسموں کے ماتحت اپنی دولت کو صرف کرتا ہے۔ قرآن مجید نے ان دونوں صورتوں کو ممنوع قرار دیا ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ حکم الہی ان کی ممانعت کی اور لوگوں کو اس سے بچایا۔ یہ دونوں صورتیں اصطلاحِ قرآنی میں اسراف اور تبذیر کہلاتی ہیں۔ (۱) اسراف یہ ہے کہ جہاں پر جتنی خرچ کی ضرورت ہو، اس سے زیادہ خرچ کیا جائے، چاہے وہ کام اچھا ہی ہو، قابلِ تعریف ہو مگر اس میں ضرورت سے زائد خرچ اسراف ہے۔

ایک صحابی رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا:
 مس :- کیا وضو کرنے میں بھی اسراف ہو سکتا ہے؟ آپ نے فرمایا۔

ج :- ہاں! اگرچہ تم ایک یہستی ہوئی ندی ہی کے کنارے پر وضو کر رہے ہو۔

جواب بالکل واضح ہے۔ وضو جیسے عمل عبادت میں بھی اپنی ذرت سے زیادہ صرف کیا جائے تو یہ عمل اسراف ہوگا، اور اسراف کی اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں عریح ممانعت فرمائی ہے، لیکن اس جواب کی بلاغت پر غور کیجیے۔
 فن معاشیات کا ایک سوال اس سے حل ہو جاتا ہے۔ وہ سوال یہ ہے کہ رسد اگر کثیر ہو تو کیا طلب کو بھی بڑھا دینے کی اجازت ہے؟ میں تو کوئی ماہر معاشیات نہیں، ایک ماہر معاشیات اس کے خطرات سے پوری طرح واقف ہے کہ طلب کی زیادتی کا اثر قیمتوں پر، دورانِ زر پر اور افراطِ زر پر کیا پڑے گا۔

(۲) ناجائز خرچ و اخراجات کی دوسری قسم تبذیر ہے۔ لغت میں تبذیر کے معنی ہیں کھیتوں میں بیج کا چھٹنا اور پانی کو ایسا گندہ کر دینا کہ پانی کارنگ بدل جائے۔ اصطلاح شرعی میں اس کے معنی ہیں مال کا بیجا صرف کرنا، اپنے اس خرچ کی نمائش کرنا، اور اس پر فخر کرنا۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں عمل تبذیر سے اپنی نفرت کا اظہار فرمایا ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی شدت کے ساتھ ممانعت کی، بلکہ لوگوں کی عادتوں کو بدل دیا۔ ہمیں دولت مند صحابہ کرام مثلاً حضرت سعد بن عبادہ، حضرت عبدالرحمن بن عوف اور حضرت عثمان ذی النورین رضی اللہ عنہ وغیرہ کے اعمال میں کہیں تبذیر کا شائبہ بھی نہیں ملتا۔

ان پانچوں محل اخراجات کی آپ نے اپنے قول و فعل کے ذریعے سے پوری طرح وضاحت کی، اور جائز و ناجائز اخراجات و مصارف کے مابین ایسا خطِ فاصل کھینچ دیا کہ حضرت معاویہ بن ابی سفیانؓ لکھ پتی باپ کے لکھ پتی فرزند بھی اپنی خلافت و جلالت کے دور میں بیوند لگا ہوا کرتا پہن کر سڑک پر چلنے اور مسجد میں نمازوں کی امامت کرنے میں کوئی شرم محسوس نہیں کرتے تھے، حال آں کہ ان سے پہلے کے خوش حال لوگ جو دولت و جلالت میں ان سے بدرجہا کم تر تھے، اعلا درجے کا لباس اور قیمتی چادر دوش پر ڈالنے وغیرہ نکلنے میں شرماتے تھے۔ ابو جہل بن شریک، ابولہب بن عبدالمطلب اور جبہ بن ایہم کبھی یہ نہیں برداشت کرتے تھے کہ گھٹیا لباس میں لوگوں کے سامنے آئیں۔ یہودی دولت مند، ابوالحقیق، عبداللہ بن ابی، محسن بن اخطب ہمیشہ اپنی دولت کے مظاہرے کیا کرتے تھے اور جاہلی معاشرے کی ہمیشہ سے یہی کیفیت تھی کہ اسراف و تبذیر پر فخر کیا جاتا تھا۔ جاہلی عرب شاعری کا سارا ذخیرہ اس پر شاہد ہے کہ وہ کس طرح اسراف و تبذیر میں مبتلا تھے۔

پیدائش دولت

صرف دولت کی اس مختصر سی بحث کے بعد ہم جب پیدائش دولت پر غور کرتے ہیں تو نظر آتا ہے کہ

اس سلسلے میں حضور علی اللہ علیہ وسلم نے جو اصلاحی ہدایات دیں اور ان پر جس پابندی کے ساتھ عمل کرایا اُس نے معاشیات کی بگڑھی ہوئی شکل کو اصلاحات کے ذریعے سے سنوار کر خوش نما بنا دیا۔ درنہ حرص کے داغ سے پیدائشِ دولت کی جدوجہد کا چہرہ ہمیشہ گھناؤنا رہا ہے۔

آج کل فنِ معاشیات میں عواملِ پیدائشِ دولت چار یا پانچ بتائے جاتے ہیں۔ یہ محض دقت پسندی ہے حقیقتاً نہ سرمایہ عاملِ پیدائش ہے اور نہ ذہن منتظم اور نہ حوصلہ کار بار۔ سرمایہ پھیلی کسی محنت کا غیر صرف شدہ بچا ہوا حصہ ہے اور ذہن منتظم و حوصلہ انسانی محنت کی ایک قسم ہے۔ حقیقی عواملِ پیدائشِ دولت صرف دو ہیں، ایک زمین اور دوسرا انسان یعنی محنت۔ اس واقعیت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ ہم جن اشیا سے اپنی ضروریات کی تکمیل کرتے ہیں وہ سب بلا استثناء زمین یا معاشی زبان میں اصل قائم سے براہِ راست یا بالواسطہ ہمیں حاصل ہوتی ہیں۔ اور انھیں ہماری ضرورت میں کام آنے کے قابل جو طاقت بتاتی ہے وہ انسانی محنت ہے۔ اس لیے حقیقی عواملِ صرف دو ہیں: زمین اور انسان۔ یہ دونوں عوامل ایسے ہیں کہ ان کے پیدا کرنے میں ہمارا کوئی حصہ نہیں ہے۔ یہ تمام تر رب العلمین کا عطیہ ہیں شاید اسی حقیقت کو یاد رکھنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کی اولین سورہ کی اولین آیت میں اپنا تعارف کسی اور صفتِ الہیہ کے ذریعے سے نہیں کرایا بلکہ الحمد للہ رب العلمین کہا۔ ساری تعریفیں اس اللہ کو سزاوار ہیں جو سارے عالم والوں کا پالنے والا ہے۔ اور شاید اسی لیے بار بار یہ حقیقت یاد دلائی گئی ہے کہ زمین، آسمان، سورج، چاند، ستارے، بادل، بارش، کھیت، باغ، جانور، اور وہ لفظ بھی جس سے انسان پیدا ہوتے ہیں اللہ جل شانہ کے پیدا کیے ہوئے ہیں۔ کسی انسان کے بس کی بات نہیں کہ ان میں سے کچھ بھی بنا سکے۔ یہ عقیدہ و ایمان ہی نہیں ہے بلکہ حقیقت و واقعہ ہے جس سے انکار ہٹ دھرمی کے سوا کچھ بھی نہیں۔ اس واقعیت کے اثرات و نتائج کو دیکھتے علم المعیشت میں اس سے انقلابِ عظیم پیا ہو گیا۔ اور

بحق قول مرحوم علامہ اقبالؒ

اس سے بڑھ کر اور کیا فکر و عمل کا انقلاب

بادشاہوں کی نہیں، اللہ کی ہے یہ زمین

اللہ تعالیٰ کی عطا کی ہوئی کسی شے میں محنت کر کے روزی کمانے کا حق ہر انسان کو حاصل ہے اور جب وہ اپنی محنت سے اس شے کو ضروریات میں سے کسی ضرورت کی تکمیل کے قابل بنالے تو پھر اُس شے کا مالک ہے اور اُسے حق حاصل ہے کہ کسی کو مفت دے دے یا بتراضی طرفین اُس کے ہاتھ فروخت کر دے۔ اسی لیے ہدایتِ نبویؐ کے بہ موجب ذریعاً یا تائب کے پنی پر، خود روگد اس اور پیل پیل وغیرہ پر تیبہ جو پکڑ کر یا پال کر کسی نے نہ رکھے ہوں۔ ایسے جانور اور پرندوں پر کسی شخص کا کوئی ترجیحی حق نہیں ہوتا اور کسی کو یہ حق

حاصل نہیں کہ دوسروں کو اس سے استفادہ کرنے سے روکے۔

تبادلہ دولت

ہر شخص جو کچھ زمین یا باغ سے پیدا کرے یا اپنی صنعت و حرفت سے بنائے اس کو خود ہی خرچ کر دے، نہ ایسا ممکن ہے اور نہ یہ ممکن ہے کہ ضرورت مند تک ان تمام چیزوں کو ڈور دراز سفر کر کے خود پہنچائے۔ اس لیے تبادلہ دولت کے ایسے قواعد و ضوابط ضروری ہیں کہ کاشت کار صنایع یا صرف کنندہ پر ظلم نہ ہو سکے۔ اس کا بنیادی اصول قرآن مجید میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ تبادلہ دولت باہمی رضامندی سے ہو۔ ظلم و تعدی یا دھوکا و فریب کی آلودگی اسے ناپاک نہ بنا دے۔ اگر کوئی تبادلہ دولت کے اس بنیادی اصول کی خلاف ورزی کرے تو مسلمانوں پر واجب ہے کہ اس شخص کو سزا دیں۔ ”سورۃ المائد“ کی آیت ۳۳ میں ہر فسادی کو سزا دینے کا ذکر موجود ہے۔ مسلمانوں کو اختیار حاصل ہے کہ فسادی کو سخت سے سخت سزا دیں۔ کسی کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ بلا واسطہ یا بالواسطہ ایسی صورت پیدا کرے جس میں خریدار خریدنے پر یا فروشنده فروخت کرنے پر مجبور ہو جائے۔

اسی طرح ذخیرہ اندوزی، چور بازاری اور کسی چیز کو اس کا نقص بتائے بغیر فروخت کرنے کی ممانعت ہے اور یہ سارے جرائم دنیا میں قابل سزا اور آخرت میں موجب عذابِ عظیم ہیں۔ ہر اس مقام پر جہاں مسلمان با اقتدار ہوں مسلمانوں پر یہ فریضہ عائد ہوتا ہے کہ ایسے مجرموں کو سزائیں دیں اور معاشرے سے ان جرائم کو دفع کریں۔

تبادلہ دولت میں اتنی اصلاحات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کی ہیں کہ ان سب کا تفصیلی بیان کسی ایک مختصر سے مضمون میں نہیں سما سکتا، لیکن مندرجہ بالا حکم کے علاوہ تین احکام وہ ہیں جن کا مختصر بیان ضروری ہے:-

(۱) سٹہ کی بالکلیہ ممانعت:- فروخت کی جانے والی چیز اور اس کی قیمت دونوں کی غیر موجودگی میں ہر بیع یا معاہدہ بیع ناجائز ہے۔ بڑی سختی سے ایسی بیع یعنی معاملہ خرید و فروخت کو حرام قرار دیا گیا ہے۔ معاشی نقطہ نظر سے بھی سٹہ نہایت ہی غیر عادلانہ اور نقصان رساں معاملہ ہے۔ اس کی وجہ سے ضروری اشیاء پیدا کرنے والے کو کم سے کم قیمت ملتی ہے اور صارف کو اشیاء صرف کی زیادہ سے زیادہ قیمت ادا کرنی پڑتی ہے۔ یہ صورت غیر منصفانہ بلکہ صریحاً ظلم ہے، اس کی آپ نے ممانعت فرمادی۔

(۲) سُود کی حرمت:- سُود جسے عربی میں ربا کہتے ہیں، اس کی متعدد صورتیں ہوتی ہیں اور ہر صورت میں سُود حرام ہے، چاہے سُودی قرض لینے والے نے اسے اپنی ذاتی ضرورت کے لیے لیا ہو

یا کار باری ضرورت کے لیے، چاہے ربوا الفضل ہو یعنی اصل قرض دی ہوئی رقم پر کوئی اضافہ وصول کیا جائے یا ربوا النسیہ ہو یعنی کوئی شے فروخت کر کے یہ شرط لگادی جائے کہ اتنی مدت کے اندر اس کی قیمت ادا نہ کی جائے تو اس قدر زیادہ رقم ادا کرنی ہو۔ سود ہر صورت میں حرام ہے۔ اور اس شدت کے ساتھ اس کی حرمت بیان کی گئی ہے کہ جو لوگ حرمت کا حکم آجائے کے بعد بھی سود لیں تو ان کے خلاف اللہ و رسول کی طرف سے اعلان جنگ ہے۔

سود میں اضافہ بہ مقابلہ وقت تسلیم کیا جاتا ہے۔ حال آن کہ یہ قانون فطرت کے بالکل برخلاف ہے۔ کسی سرمایے میں بہ مقابلہ وقت کوئی اضافہ کبھی نہیں ہو سکتا۔ یہ قانون فطرت کے خلاف کھلی بغاوت ہے۔ سود کا ہر معاملہ ایک طرف معاہدہ ہوتا ہے اور ایک طرف معاہدہ دنیا کے کسی قدیم و جدید اصول قانون میں جائز نہیں ہے۔ سود کے ذریعہ سے اشیائے صرف کی قیمتوں میں غیر حقیقی اضافہ ہو جاتا ہے جس کا بوجھ غریب صراف پر پڑتا ہے۔ سود کی وجہ سے دولت کا بہاؤ ایک خاص طبقے کی طرف ہو جاتا ہے اور شدید معاشی ناہمواری پیدا ہو جاتی ہے۔ سود کی وجہ سے سادہ کار معاشی جدوجہد کی ضرورت محسوس نہیں کرتا اور دوسروں کی کمائی مفت کھاتا رہتا ہے۔ اس طرح ایک سود خوار معاشرے کا ایک بے عمل فرد بن جاتا ہے اس لیے معاشی سوجھ بوجھ کا یہی تقاضا ہے کہ سود کی حرمت پر زور دیا جائے اور اس لعنت سے معاشرہ انسانی کو نجات دلائی جائے۔

آن حضرت کی دیگر معاشی اصلاحات سے صرف نظر کر کے بھی دیکھا جائے تو سود کے خلاف جو آیات قرآنی نازل ہوئیں اور آپ نے جس شدت کے ساتھ اس پر عمل کرایا یہ بہت بڑی اصلاح اور معاشی نقطہ نظر سے بڑا دور رس انقلابی اقدام ہے۔

(۳) قانون وراثت :- قانون وراثت خود اپنی جگہ پر بڑی اہم معاشی اصلاح ہے۔ قدیم اقوام میں عام طور سے وراثت اکبر جسے انگریزی میں ہیریٹیج ہیریٹیج کا قاعدہ کہا جاتا ہے، رائج تھا۔ ایران میں، رومن حکومت میں، چین میں اور ہندستان میں یہ طریقہ رائج تھا کہ باپ کی وفات پر صرف اس کی سب سے بڑی اولاد وارث ہوتی تھی، دوسری اولاد کو یا وارثوں کو وراثت سے محروم سمجھا جاتا تھا اور چین و ہند میں تو عورت کبھی وارث ہوتی ہی نہ تھی۔

اس نا انصافی کی اصلاح قرآن مجید نے اس طرح کر دی کہ تفصیل کے ساتھ وارثوں کے حصے مقرر کر دیے۔ اس سے ایک فائدہ تو یہ ہوا کہ دولت ملال دار کی وفات کے بعد خود بہ خود تقسیم ہو گئی اور بڑی بڑی جائیداد کے وراثتی دولت مندوں کا کابل و بے عمل طبقہ ختم ہو گیا۔ دوسرا فائدہ یہ ہوا کہ دو بیھائیوں اور بیھائی بہنوں کے مابین محبت و الفت کے رشتوں کو باقی رہنے کا موقع میسر آ گیا۔ ورنہ وراثت اکبر اور عورتوں کی وراثت سے

بالکلیہ محرومی نے بھائی بہنوں کے مابین محبت و الفت کو جس طرح تباہ کیا ہے وہ ایک بڑی دردناک داستان ہے جس سے تاریخ کا ہر طالب علم واقف ہے۔

اسلام کے قانونِ وراثت پر جن مسلم و غیر مسلم علماء سے میری گفتگو ہوئی ہے ان سب نے اس کی تعریف کی ہے بہ جز ایک روسی سفیر صاحب کے، جنہوں نے فرمایا کہ دنیا میں کسی قانونِ وراثت کی ضرورت ہی نہیں۔ ان کا بیان ہے کہ روس میں بھی قانونِ وراثت ہے مگر نہ ہوتا تو اچھا تھا۔ یہ ان کا شخصی خیال ہے جس کے قائم کرنے میں وہ یہ بھولی گئے کہ قانونِ وراثت مرنے والے کی آخری تمنا کی تکمیل ہے، اب تک کوئی ایسا انسان پیدا نہیں ہوا جس کی مرتے ہوئے یہ تمنا نہ ہو کہ وہ جو کچھ چھوڑ کے جا رہا ہے چاہے وہ ایک پُرانا کبیل ہی کیوں نہ ہو، اس متروکہ سے اُس کی وفات کے بعد وہ لوگ فائدہ اٹھائیں جو زندگی میں اُس کے پیارے اور قریبی رشتہ دار تھے۔

البتہ بعض مسلمان بھائیوں نے اسلامی قانونِ وراثت پر دو اعتراضات کیے۔ دو ایک حضرات نے تو صرف اس موضوع ہی پر تفصیلی گفتگو فرمائی۔ مختصراً اس کی توضیح کر دینا ضروری سمجھتا ہوں تاکہ دوسرے اہل علم بھی صحیح طور پر بات کو سمجھ لیں۔

دایمہ الاعتراض یہ تھا کہ قانونِ وراثت میں یتیم پوتے کو دادا کی وراثت سے محروم نہ کیوں قرار دیا گیا ہے؟

جب کہ مورث کا دوسرا بیٹا موجود ہو تو پوتا محروم ہو جاتا ہے۔

(۲) دوسرا اعتراض یہ تھا کہ قانونِ وراثت میں بیٹی کو ایک حصہ اور بیٹے کو دو حصے کیوں دیے جاتے ہیں۔

پہلا اعتراض اس لیے ذہن میں آسکا ہے کہ وصیت اور وراثت کے سارے قانون پر غور نہیں کیا گیا ورنہ بات سمجھ میں آ جاتی۔ اور جب ان کے سامنے وصیت کے متعلق بتایا گیا تو معترض کی سمجھ میں بات آ گئی۔ ان دو امور پر غور کیجیے۔

ہر شخص پر واجب ہے کہ اگر وہ ضرورت سمجھے تو مال متروکہ کی ایک تہائی تک پوتے یا کسی غیر وارث کے لیے وصیت کر دے۔ اور وصیت اتنی ضروری چیز ہے کہ حسبِ فرمانِ نبویؐ کسی مسلمان پر ایک رات بھی نہ گزرنے پائے جب کہ اُس کا لکھا ہوا وصیت نامہ تیار نہ ہو۔

ولایت کا قبول کرنا اختیاری امر نہیں بلکہ لازمی اور اجباری ہے۔ کوئی چچا اپنے یتیم بھتیجے کا ولی بننے سے انکار کرنے کا مجاز نہیں ہے۔ اگر چچا کی مالی حالت کم زور ہو اور بھتیجے کی پرورش و پرداخت کا بوجھ نہ برداشت کر سکتا ہو تو اس کی درخواست پر بیت المال سے مناسب امدادی وظیفہ بہ طور استحقاق اُسے دیا جائے گا۔ چچا پر فرض ہے کہ وہ اپنے یتیم بھتیجے کی اپنی اولاد کی طرح پرورش و پرداخت کرے۔ حکومت کی انتظامیہ

اور عدلیہ دونوں پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ چچا کو اس ولایت کے لیے مجبور کرے۔

ان دونوں احکام کو یعنی وصیت اور ولایت کو دیکھیے تو یہ واضح ہو جائے گا کہ قانون وراثت نے یتیم پوتے کو بے یار و مددگار نہیں چھوڑ دیا ہے بلکہ اُس کو ہر طرح تحفظ عطا کیا ہے۔ رہا یہ سوال کہ اسے محروم باپ کا جانشین قرار دے کر وارث کیوں نہ قرار دیا گیا؟ تو اس میں بہت سی خرابیاں تھیں منجملہ ان کے خرابیاں تو ظاہر ہیں: ایک یہ کہ جو بیٹا مورث کا زندہ ہے وہ بغیر کسی وجہ کے آدمی وراثت سے محروم ہو جائے اور اس امکان سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ چچا کے دل میں جو یتیم بھتیجے کی محبت ہوتی ہے وہ اس کے مقابلے کی وجہ سے متاثر ہوتی، حال آں کہ پوتے کو بہ بہر حال اپنے چچا ہی کی ولایت میں جوان ہونا اور پروردان چڑھنا تھا۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ ہر شخص اپنے ہی باپ کی وراثت کا مستحق ہے۔ یہ اصول ہی قائم نہیں رہتا اس کو ایک مثال سے سمجھیے۔ مثلاً زید کے دو فرزند تھے۔ ایک حامد اور دوسرا محمود، حامد کا ایک فرزند علی۔ پہلے حامد کا انتقال ہو گیا۔ اس کے متروکہ مال میں حامد کے بھائی محمود کو حامد کے فرزند علی کے ہونے کی وجہ سے کوئی حصہ نہ مل سکا اور وہ علی کے باپ حامد کی وراثت سے محروم ہو گیا۔ اب تھوڑے دنوں کے بعد محمود کے باپ زید کی وفات ہوئی تو محمود اپنے باپ کا وارث ہوا۔ علی اپنے باپ حامد کا وارث ہوا تھا۔ اور محمود محروم ہو گیا تھا تو یہ کیسا انصاف ہوا کہ محمود کے باپ زید کا وارث علی ہو اور علی کے باپ حامد کی وراثت سے محمود محروم ہو پھر بھی چچا ہونے کی وجہ سے علی کی ساری ذمہ داری محمود پر عائد ہو جاتے دو تہ اعتراض یہ ہے کہ بیٹی کو ایک حصہ اور بیٹے کو دو حصے کیوں ملتے ہیں۔ اس کے لیے بیٹا اور بیٹی کی کیفیت پر غور کیجیے۔ بیٹے کو اپنی بیوی اور بال بچوں کا کفیل ہونا ہے یا اس وقت کفیل ہے، اُس کو ماہی استواری کی ضرورت بیٹی سے زیادہ ہے۔ بیٹی اور اُس کی اولاد کی کفالت اُس کے شوہر کے ذمے ہے، خود اُس کی اپنی ذات کا بار بھی اُس پر نہیں ہے۔ یہ کتنی بڑی بے انصافی ہوتی کہ اخراجات کا بوجھ جس پر ہے اس کے برابر حصہ پاتا جس کا اپنا بوجھ بھی دوسرے شخص پر ہے۔ کوئی دانش مند ایسا غلط فیصلہ نہیں کر سکتا اس لیے قرین انصاف اور تقاضائے ضرورت دونوں کا فیصلہ یہی ہے کہ بیٹے کو بیٹی سے دو گنی وراثت ملے۔

غرض یہ کہ اسلام ایک ہمہ گیر نظام حیات ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انسانی زندگی کے ہر رخ کی اصلاح فرمائی تو یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ آپ معاشی زندگی کی اصلاح نہ فرماتے۔ انسان کی ساری حرکت صرف معاشی نہیں ہوتی ہے، لیکن ہر انسان کے اعمال میں معاشی جہد کا بڑا حصہ ہوتا ہے۔ آپ نے بڑی توجہ کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا پیغام پہنچایا اور ایسی معاشی اصلاحات جاری فرمائیں جن کی وجہ سے حقیقتاً ایک نمونہ کا صالح معاشرہ پیدا ہو گیا۔ کاش کہ ہم مسلمان اپنی غفلت سے بیدار ہوں اور پھر سے ان ساری اصلاحات پر خلوص کے ساتھ عمل کر کے نمونے کا معاشرہ پیدا کر دیں۔

تربیت اخلاق میں تعلیم و تربیت کا مقام

جناب محترم الحاج کفایت اللہ

ایک عربی شاعر نے کہا ہے جس کا ترجمہ کچھ یوں ہے کہ :
 ”جس کے دل میں درد ہوتا ہے وہ کوئی ایسی چیز تلاش کرتا ہے جس سے اس کا درد دور ہوتا ہے۔“
 صاحبانِ فکر و نظر ہی نہیں، کراچی سے طورخم تک افرادِ ملت اس کے شاہد ہیں کہ حکیم محمد سعید اور ان کے رفقاء ہمدرد کو عرصہ دراز سے ملت کے انتشارِ ذہنی و فکری اور اس کے نتیجے میں انتشار اور افتراق ملی کا بے حد تعلق ہے۔ پس انھوں نے مذاکرہ ملی اخلاقیاتِ نبوی کا اہتمام کیا۔ آج ملک بھر کے درد مند حلقوں کی نگاہیں اس مذاکرہ ملی پر مرکوز ہیں۔ اور وہ یہ جانتے کے لیے بے تاب ہیں کہ ملک کے ممتاز علماء و اہل قلم اصلاحِ اخلاق کے سلسلے میں کیا علاج تجویز کرتے ہیں۔ اور مجھے جب یہ دعوت نامہ ملا تو آنے میں بیحد خوشی ہوئی۔ وہ اس لیے کہ میرے ذہن کے مطابق مجھے اصلاحِ اخلاق کا ایک سہل نسخہ معلوم ہے میرے خیال کے مطابق میرا تجویز کردہ علاج کچھ ایسا ہے کہ جب آپ اس کو لے کر ملک عزیز کے گوشے گوشے میں پھیل سمائیں گے تو انشاء اللہ تعالیٰ ملک میں اصلاحِ اخلاق کی صورتِ احوال میں بہتری کے نمایاں آثار دکھائی دیں گے۔ اس سے قبل کہ میں وہ علاج آپ کو بتاؤں میں اس کے سہل پن کے بارے میں کچھ اظہارِ خیال کرنا پسند کروں گا۔ بسا اوقات یوں ہوتا ہے کہ بہت سی چیزیں بڑی واضح ہوتی ہیں لیکن دماغ پہلے سے کچھ ایسے دقیق مسائل میں الجھا ہوتا ہے کہ وہ واضح اور نمایاں چیزوں کی طرف متوجہ نہیں ہوتا۔

اب اچھے اور بُرے اخلاق ہی کو سمجھیے! کون نہیں جانتا کہ کونسی چیز بُری ہے اور کونسی اچھی۔ خود قرآن کریم گواہ ہے:

فَالْقَسْوَاءُ فَجُورٌ هَاؤُلَاقُهَا -

(پھر تم نے اس کی بدی اور اس کی پرہیزگاری اس پر الہام کر دی)

وَكَهْدًا يَأْتِي النَّجْدِينَ -

(ہم نے انسان کے لیے خیر و شر کے دونوں نمایاں راستے دکھادیے ہیں)

مقصود و مطلوب یہ ہے کہ جہاں تک اچھے اور بُرے اخلاق کا تعلق ہے تو یہ تصورات تو ہمارے لاشعور میں اللہ تعالیٰ نے ودیعت فرمائے ہیں۔ ان تصورات سے تو ہماری فطرت آشنا ہے۔ پس مذاکرہ

مٹی میں تو جہاں اخلاق کے بجائے اصلاح کی طرف ہونی چاہیے، اور اصلاح بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بتائے ہوئے ارشادات کے عین مطابق۔ میں اپنے اس عہد پر قائم ہوں کہ اپنے خیال کے مطابق اصلاح اخلاق کے سلسلے میں علاج آپ کو بتاؤں گا (انشاء اللہ)، لیکن اس سے قبل ترمین اخلاق کے سلسلے میں تعلیم و تربیت کے کردار پر بھی میں نے کچھ گفتگو کرنی ہے۔

اصلاح اخلاق کے لیے ایک منظم کوشش کی ضرورت ہے۔ اس کے لیے ہمیں مکتبوں، مدرسوں، سکولوں، کالجوں، یونیورسٹیوں، مسجدوں، خانقاہوں کی امداد حاصل کرنی ہوگی۔ لیکن اس وقت میں چار اداروں کے کردار کے بارے میں کچھ کہنا پسند کروں گا کہ میرے نزدیک اصلاح اخلاق میں یہ ادارے بے حد مؤثر رول ادا کرتے ہیں۔ اور میرا ایمان ہے کہ اگر یہ چاروں ادارے مل کر تعلیم و تربیت کی ذمہ داری پوری کریں تو تعلیم و تربیت کا مقصد اولیں یعنی ترمین اخلاق حاصل ہو سکے گا۔ یہ چار ادارے حسب ذیل ہیں:

۱۔ گھر کی درسگاہ

۲۔ سماج کی درسگاہ

۳۔ اصطلاحی درسگاہ (مدرسہ، سکول، کالج، یونیورسٹی)

۴۔ حکومت و ریاست

اب ہم ترتیب وار ایک ایک ادارے کی کارکردگی پر روشنی ڈالیں گے کہ وہ تعمیر اخلاق کے سلسلے میں کیا کردار ادا کر رہے ہیں یا انہیں ادا کرنا چاہیے:

گھر کی درسگاہ

یہ غالباً ۱۹۵۲ء کا واقعہ ہے کہ یوپی کے صدر مقام لکھنؤ میں ایک انسانی بچہ جو بھیڑیوں کے جھپٹ میں پلا تھا اور سمیٹریوں کی طرح چلتا پھرتا اور بولتا تھا اور کھاتا پیتا تھا۔ ہسپتال میں داخل کیا گیا تھا۔ اس بچے کی تعلیم و تربیت کی بہت کوشش کی گئی۔ مگر سب بے سود۔ یہ بچہ اخلاقی لحاظ سے تو درکنار، ظاہری حرکات و سکنات کے اعتبار سے بھی انسان نہ بن سکا۔ یہ المیہ اُسے اس لیے پیش آیا کہ اس بچے کو ابتدا میں انسان بننے کی تربیت نہیں ملی تھی۔ اس واقعاتی مثال سے آپ گھر اور والدین کی تعلیم و تربیت کی اہمیت سمجھ سکتے ہیں۔ تعلیم و تربیت کے ماہرین کہتے ہیں اور صحیح کہتے ہیں کہ بچہ پیدا ہوتے ہی خارجی دنیا سے سیکھنا شروع کر دیتا ہے۔ ابتدائی پچھ سالوں میں بچہ جو کچھ اپنے ماحول سے جذب کرتا ہے وہ اس کی آئندہ کی ساری زندگی کی اساس و بنیاد بنتا ہے۔ زبان و طرز معاشرت ہی میں نہیں اخلاق، عمل، تہذیب اور مذہب میں بھی بچہ بالعموم اپنے والدین اور گھریلو ماحول کے تابع ہوتا ہے۔ رسول اللہ نے اس

حقیقت کو ان الفاظ میں واضح فرمایا ہے :

ما من مولود الا یولد علی الفطرۃ فابوالہ یھودا ذنہ او
ینصرانہ او یمجسانہ ۔

ترجمہ: ہر بچہ فطرت پر پیدا ہوتا ہے لیکن اس کے والدین اسے یہودی، عیسائی یا مجوسی بنا
دیتے ہیں ۔

اس گھر کی درس گاہ نے اگر ٹھیک کام کیا تو تعلیم و تربیت کی صحیح اور مستحکم بنیاد پڑ گئی۔ اور اب
اس بنیاد پر صحیح عمارت کی اونچی سے اونچی منزل تعمیر کی جاسکتی ہے۔ والدین نے جب بھی اپنی ذمہ داری
پہچانی اور پوری کی ہے تو ان کی گودوں میں حضرات اسماعیل، اسحاق اور یعقوب علیہم السلام جیسے انبیا
اور عبداللہ ابن عمر، عبداللہ ابن زبیر اور حسین ابن علیؑ جیسے صلحاء و جانناں پر وان پڑھے ہیں۔
ڈاکٹر اقبال نے والدین کی تربیت کی اہمیت اس شعر میں کیا خوب واضح کی ہے :

یہ فیضانِ نظر تھا یا کہ مکتب کی کرامت تھی

سکھائے کس نے اسماعیل کو آدابِ فرزندگی

لیکن اگر گھر یلو ماحول فاسد ہو جائے تو دنیا ایسے شیاطین سے بھر سکتی ہے جو دنیا کے امن و
سکون کو غارت کر میں۔ کسی ماہر نفسیات نے کیا خوب کہا ہے کہ دنیا کے ظالم اور مفسد انسان دراصل
شریہ اور بگڑے ہوئے بچے ہیں، جن کے ہاتھوں میں زمام اقتدار آگئی، اور انھوں نے دنیا کو ظلم و
فساد سے بھر دیا۔

سماج کی درسگاہ

انسان کی دوسری تعلیم وہ ہے جو اسے اپنے ماحول اور معاشرے سے ملتی ہے۔ سماج کے
اثرات اتنے شدید ہوتے ہیں کہ ان سے بچنا تقریباً ناممکن ہے۔ پریس، رسائل، اخبارات،
کتابوں کی بہتات، سینما، ریڈیو، ٹیلی وژن، ذرائع آمد و رفت کی بے انتہا سہولیت، تحریکات،
تنظیمات نے پوری دنیا کو ایک سماج بنا دیا ہے۔ اب موجودہ سماج کی کن کن فتنہ سامانیوں کا ذکر
کیا جائے اور ان سے بچ کر آدمی کہاں جاسکتا ہے۔ محسنِ عریاں ہے کہ ہمارا ہر طرف سے احاطہ کیے
ہوئے ہے۔ سینما کے فحش گانے بچے بچے کی زبان پر ہیں اور رومانی، فحش اور ڈاکہ زنی کی فلمیں
نوجوانوں کے اخلاق و کردار کا ستیاناس کر رہی ہیں۔ ان حالات سے مدہوش اور سرمست ہو کر
اگر نوجوان جنسی انارہ کی کاشکار ہو جائیں تو کیا اس کی ذمہ داری میں سماج برابرہ کا شریک نہیں؟

اگر سماج کی اصلاح کی بجائے تو وہ اصلاح اخلاق کا ذریعہ بن سکتا ہے۔ ایک صالح معاشرہ انسان کو وہ سب کچھ دے سکتا ہے جو کتابوں کے ذرائع اور رسمی درس گاہوں کی لفظی تعلیم نہیں دے سکتی۔ اس واسطے انسانیت کے سب سے بڑے معلم و مرتبی صلی اللہ علیہ وسلم نے سماج کی اصلاح کو انسان کا اہم فریضہ اور ایمان کا لازمی تقاضا قرار دیا ہے۔ اور حکم دیا ہے کہ جب بھی سماج میں کوئی برائی سراٹھائے اسے فی الفور کچل دیا جائے۔

من رای منکم منکرا فلیغیبرہ بیدہ فان لم یستطع فبلسانہ وان لم یستطع فبقلبہ وذلک اضعف الایمان

ترجمہ: تم میں سے جو کوئی برائی دیکھے تو اسے اپنے ہاتھ سے یا زبان سے بدل دے یا دل سے گویہ ایمان کا کمر درجہ ہے۔

حکومت و ریاست

اصلاح اخلاق کے سلسلے میں سب سے مؤثر حکومت و ریاست کا ادارہ ہے۔

الناس علی دین ملوکہم

ترجمہ: لوگ اپنے فرمانرواؤں کے طریقے پڑھتے ہیں۔

پہلے بھی صحیح تھا اور آج بھی درست ہے اور آئندہ بھی حقیقت رہے گا۔ حکومت جس

طرف چاہتی ہے لوگوں کو ہڈکائے جاتی ہے۔ اگر حکومت کا نظام اور اس کی پالیسی صحیح ہو تو غیر معمولی ذرائع اور وسیع ترین دائرہ اثرات کی حامل ہونے کے باعث وہ پورے سماج کو درست کر سکتی ہے۔ لیکن اگر حکومت کا نظام فاسد ہے تو وہ پورے سماج کو تعلیمی نظام سمیت، فساد و طغیان کے سیلاب میں بہائے جاتا ہے۔ قرآن مجید ایک صالح حکومت کا تعارف ان الفاظ میں کرتا ہے:

الذین ان مکنتھم فی الارض اقاموا الصلوٰۃ و اتوا الزکوٰۃ و امروا بالمعروف و نہوا عن المنکر

یعنی یہ وہ لوگ ہیں کہ جن کو ہم زمین میں اقتدار بخش دیتے ہیں تو نماز قائم کرتے ہیں اور زکوٰۃ دیتے ہیں لوگوں کو نیکی کا حکم دیتے ہیں اور برائی سے روکتے ہیں۔

اصطلاحی درسگاہ

اصطلاحی درسگاہ وہ ہے۔ جسے مدرسہ، سکول، کالج یا یونیورسٹی کہا جاتا ہے۔ انسان علوم و فنون میں آکر حاصل کرتا ہے۔ یہیں اس کی خوابیدہ صلاحیتیں پروان چڑھتی ہیں اور یہیں پر تربیت پا کر وہ اپنے سماج، اپنے ملک و قوم بلکہ دین کا معلم بن سکتا ہے یا مفسد اور مصل۔ تعلیم و تربیت کی سب سے اہم اور مرکزی کڑی معلمین ہیں۔ نصاب تعلیم ناقص ہو، تعلیمی پروگرام ادھورا ہو، درسگاہ کا ماحول موزوں نہ ہو، لیکن اساتذہ کی شخصیتیں پرکشش اور بہتر ہوں تو ان ساری کمیوں کی تلافی ممکن ہے۔ مگر اساتذہ صحیح نہ ہوں تو یہ کمی کسی طرح پوری نہیں ہو سکتی یہی دینی درسگاہوں سے ایسے اساتذہ کو چن چن کر نکال دینا چاہیے جو ہمہ وقت ہمارے طلبہ کے دلوں میں شکوک و شبہات پیدا کر رہے ہیں کہ اسلام کوئی ضابطہ حیات نہیں، نہ یہ کوئی تہذیب رکھتا ہے نہ تمدن، اور یہ کہ اسلام سیاسی اور معاشی لحاظ سے ایک چلا ہوا کار توں ہے۔ ایسے اساتذہ سے بڑھ کر عالم اسلام اور اسلامی اخلاق کا غدار کوئی نہیں۔

پیشتر اس کے کہ اب اس علاج کی طرف لوٹوں جس کا ذکر میں نے اوائل میں کیا تھا، میں اپنے مدعا کی وضاحت کے سلسلے میں تاریخ اسلام سے محض دوسرے واقعات پیش کرنے کی اجازت چاہوں گا۔

ستوڑوں کا ایک مہیلا، ایک اونٹ، ایک غلام، ایک لکڑی کا پیالہ ہمارے لے کر اور اپنی جگہ حضرت عثمان غنیؓ کو مدینہ کا عامل مقرر کر کے حضرت عمرؓ سفر فلسطین پر روانہ ہوتے ہیں، کبھی غلام اونٹ کی مہار پکڑ کر چلتا اور فاذق اعظم اونٹ پر سوار ہوتے ہیں اور کبھی اس کے برعکس۔ تاریخ انسانی کی عظیم شخصیتوں میں سے کون ہے جو حضرت عمر فاروقؓ کے اس عظیم کردار کی گرد کو بھی پہنچ سکے۔

اب دوسرا واقعہ سنیں! بلکہ آپ اسے متعدد بار سن بھی چکے ہیں کہ حضرت عمر بن عبدالعزیزؓ ایک رات دیا جلا کر کام کر رہے تھے اور دیا بیت المال کا تھا اور وہ کوئی سرکاری کام کر رہے تھے کہ اتنے میں کوئی صاحب تشریف لے آئے اور انہوں نے گفتگو شروع کی یہ گفتگو ذاتی معاملات کے متعلق تھی۔ تو آپ نے کہا:

”ذرا ٹھہر جاؤ! پھر آپ نے دیا بجھا دیا اور کہنے لگے کہ یہ بیت المال کا دیا ہے۔ تیل اس

میں بیت المال کا جمل رہا ہے۔ اس لیے ذاتی گفتگو میں یہ دیا نہیں جلی سکتا۔

یہ دو مثالیں دینے کا مقصد یہ ہے کہ اگر اصلاح اخلاق آپ چاہتے ہیں تو آواز دینے سے بات نہیں بنے گی۔ ان ہر دو واقعات میں آپ نے دیکھا کہ کسی نے کسی سے کچھ نہیں کہا۔ ہر ایک نے اپنے کردار کا بھر پور مظاہرہ کیا۔ حضرت عمر فاروقؓ نے یہ نہیں کہا کہ سادگی اختیار کرو۔ مسلمان کو اپنا مہمانی اور مساوی سمجھو، بلکہ ستوؤں کا تھیلا بھر کر باری باری اونٹ پر سواری کر کے اوز پیدل چل کر عملاً سادگی اور مساوات کا مظاہرہ قائم کر کے رہتی دنیا تک مثال قائم کی۔ اسی طرح حضرت عمر بن عبدالعزیزؓ نے یہ نہیں کہا کہ بے ایمانی نہ کرو، سرکاری اختیارات اور اموال کو ذاتی استعمال میں نہ لاؤ بلکہ یہ عملاً کر کے بتایا اور سنبھایا۔

اگر آپ اخلاقیات نبویؐ کو ملک عزیز میں جاری و ساری کرنا چاہتے ہیں تو جیسے میں نے عرض کیا علاج بہت آسان ہے۔ آپ سب کو چاہیے کہ اپنے اپنے گھروں، اپنے اپنے محلوں، اپنے اپنے دفروں اور اپنے اپنے فرموں میں آج سے ہی اخلاق کا مظاہرہ کیجئے۔ شنید ہے کہ آج کل یورپ میں یہ دعا چل نکلی ہے کہ:

O GOD, REFORM THE WORLD, BUT START WITH ME:

العقاد مذاکرہ اپنی جگہ درست، تقاریر میری بھی حیاتِ ملی میں ایک مقام رکھتی ہیں، قرار دادیں بھی اپنی افادیت رکھتی ہیں، لیکن علاج صرف اور صرف یہی ہے۔ کیونکہ کہنے والا کہتا ہے لیکن اگر خود عمل نہ کرے تو صرف یہ کہ اس کے کہنے کا کوئی اثر نہیں ہوتا بلکہ ایسا کہہ کر اللہ تعالیٰ پر بھی بہت گراں گزرتا ہے۔ جیسا ارشادِ خداوندی ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لِمَا تَقُولُونَ مَا لَا تَفْعَلُونَ كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللَّهِ أَنْ تَقُولُوا مَا لَا تَفْعَلُونَ ۝

اخلاقیات نبویؐ کیلئے؟ اس بارے میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے کس قدر مختصر ترین الفاظ میں فرمایا:

كَانَ خُلُقَهُ الْقُرْآنُ

یعنی وہ قرآن کے عملی پیکر اور تفسیر تھے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے اسوہ حسنہ سے اذیان و قلوب میں اس قدر انقلاب بپا کر چکے تھے کہ اس وقت روئے زمین پر ان کی قوم سے نہ زیادہ بہتر اور زیادہ صالح اور کوئی ایسی قوم نہ تھی جو ملی وحدت اور باہمی اعتماد کا قابل تقلید نمونہ پیش کر سکتی ہو۔ ان کے ایک فرد کا پیمان تمام ملت کا پیمان قرار پاتا تھا۔ ان میں کوئی ایسا نہ تھا جو کسی قیمت پر خریدیا جاسکتا ہو۔ یہ اس ذہنی تبدیلی کا نتیجہ تھا کہ ایک شخص کو کسریٰ کا تاج ملتا ہے اور وہ اسے اپنی

گڈی میں چھپا کر لاتا ہے اور بیت المال میں جمع کر دیتا ہے۔ لوگ اس سے پوچھتے ہیں کہ تمہارا کیا نام ہے؟ وہ کہتا ہے کہ میں اس لیے نہیں بتاتا کہ تم میری تعریف کرو گے، جب کہ سب تعریفیں اللہ ہی کے لیے ہیں۔ اور میں اس کے ثواب پر راضی ہوں۔ یہ اس قوم کا کردار ہے جو مالِ غنیمت پر ٹوٹ کر اُسے لوٹا کرتی تھی اور جس پر سورۃ انفال شاہد ہے۔

یہ قانونِ فطری ہے کہ جنگ فوجیں نہیں تو میں لڑا کرتی ہیں اور قوموں کا وہ زمانہ سنہری ہوتا ہے کہ جب ان کا ہر فرد مجاہد بننے میں فخر محسوس کرتا ہے۔ آئیے اللہ تعالیٰ و تبارک کی بارگاہ میں انتہائی عجز و انکسار سے یہ دعا کریں کہ یہ مذاکرہ ملی، اخلاقیاتِ نبویؐ کو عام کرنے کا ذریعہ بنے تاکہ نازک وقت آنے سے پہلے ملتِ پاکستانیہ اس فرمانِ ربانی کا مصداق بنے:

وَكَم مِّن فِئْتَةٍ قَلِيلَةٍ غَلَبَتْ فِئْتَةً كَثِيرَةً بِإِذْنِ اللَّهِ
 کتنی ہی قلیل جماعتیں ہیں جو اذنِ اللہ سے جماعتِ کثیرہ پر غالب آئیں۔

اخلاقی تحریک کیوں اور کیسے

جناب محترم پرفیسر رحیم بخش شاہین

اس وقت ہمارے معاشرے میں اخلاق کی جو حالت ہے اس کو دیکھ کر ہر آدمی پریشان ہے۔ اور اہل پاکستان کے اخلاق کا موازنہ کبھی امریکا اور برطانیہ کے لوگوں کے اخلاق سے کرتا ہے اور کبھی جرمنی اور جاپان کے باشندوں کے اخلاق سے۔ کبھی اہل چین کی اخلاقی ترقی کا ذکر کرتا ہے اور کبھی تقسیم برصغیر پاک و ہند سے پیشتر کے زمانے ہی کو اخلاقی لحاظ سے بہتر اور بہتر قرار دیتا ہے۔ یہ ساری تگ و دو صرف یہ ثابت کرنے کے لیے ہے کہ پاکستان کے مسلمانوں کی حالت انتہائی مخدوش ہے۔ ہر درد مند آدمی کو حال کے آئینے میں مستقل کا چہرہ انتہائی بھیانک نظر آتا ہے۔ ہر شعبہ حیات میں یہی نظر آ رہا ہے کہ اس میں حلال و حرام اور جائز و ناجائز کی تمیز اٹھ چکی ہے۔ صنعت و حرفت، سیاست و ریاست، ادب و صحافت اور تمدن و معاشرت غرض کہ ہر طرف اخلاقی بگاڑ اپنی انتہائی بھیانک صورت میں نظر آتا ہے۔

معاشرے کی معاشی سرگرمیوں کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس کی رگوں میں سودی کاروبار کا ابلسی خون گردش کر رہا ہے۔ سہ بازی، ذخیرہ اندوزی، اشیائے ضرورت کی مصنوعی قلت پیدا کرنے اور قیمتوں میں بلاوجہ اور من پسند اضافہ کرنے کے رجحان نے ہماری تجارتی اور کاروباری زندگی کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا ہے۔ ناقص اور مفز محنت اشیاء کا اشتهار بازی کے ذریعہ سے فروخت کرنا ذہانت کی دلیل تصور کیا جاتا ہے۔

سیاست و ریاست کی جو حالت ہے اس کی تفصیل ہمارے تقریباً ۳۶ سالہ دورِ آزادی پر پھیلی ہوئی ہے۔ اور ہر کہ و مہ پر الم نشرح ہے۔ اگر کسی کو اعداد و شمار اور حقائق و واقعات سے آگاہی مطلوب ہو تو زیادہ دور جانے اور عمیق مطالعے کی زحمت برداشت کرنے کی ضرورت نہیں، سابق حکومت کے چند سالوں کی کارکردگی موجودہ حکومت کی طرف سے شائع ہونے والے قرطاس ابیض میں دیکھی جاسکتی ہے۔ الزام تراشی، غنڈہ گردی، دھوکہ بازی اور جعل سازی سیاست کا طرہ امتیاز بن گیا ہے۔ اس طرح کی سیاست سے شہ پاک کو انتظامیہ نے سرخ فیتہ اور رشوت کا بو

چکر چلا رکھا ہے اس سے بھی سب لوگ بخوبی واقف ہیں۔

ادب و صحافت کی دنیا میں کذب و افترا اور عریانی و فحاشی کی حکمرانی ہے۔ اخبارات جس مکروہ انداز میں لوگوں کو لچر اور فحش فلموں کا شیدائی بنا رہے ہیں اور مختلف تقاریب میں شامل ہونے والی خواتین کی عریاں و نیم عریاں تصاویر سے منفی خواہشات بھڑکانے میں مصروف ہیں وہ انتہائی پریشان کن ہے۔ ڈائجسٹوں کی ایک بڑی تعداد پورے مشنری جذبے سے قوم کی اخلاقی روایات کی شکست و ریخت میں مصروف ہے، یہ ڈائجسٹ نہ صرف یہ باور کر رہے ہیں کہ زندگی زن، زر، زمین کا دوسرا نام ہے بلکہ مغربی تہذیب اور ہندو مذہب و عقائد کو دلکش صورت میں پیش کرنے میں بھی یہ ڈائجسٹ ایک دوسرے سے سبقت لے جانے میں کوشاں ہیں۔

تمدن و معاشرت کی حد تک، حصولِ زر کی بے لگام دوڑ میں شرکت کا اثر یہ ہوا ہے کہ شرم و حیا، عفت و پاکدامنی، امانت و دیانت، انوثت و محبت اور ایثار و قربانی کی اعلیٰ صفات دم توڑ رہی ہیں اور بے حیائی و بے شرمی، عصمتِ فردشی، خیانت و بددیانتی، عداوت و مخالفت، خود غرضی و نفس پرستی کو غلبہ حاصل ہو رہا ہے۔ کبھی کبھی ایسی خبریں بھی سننے میں آجاتی ہیں کہ جن میں انسانی مہر دی، دیانت اور فرض شناسی کا ذکر ہوتا ہے لیکن ان مثالوں کی حیثیت تاریک رات میں چمکتے ہوئے تگنوں کی سی ہے، ان سے تاریکی مٹ نہیں سکتی اور سچا اسلامی معاشرے کو جس اخلاقی معیار کا مالک ہونا چاہیے، اس کے لحاظ سے یہ مثالیں لائق ذکر بھی ہیں۔ تعلیم کے شعبے کی طرف آئیں تو وہاں بھی حالت کچھ مختلف نہیں۔ پولیس کا مقصد قانون کی حفاظت ہے اور کچھریاں حصولِ انصاف کا ذریعہ ہیں لیکن قانون کی مٹی کس طرح پولیس کے ہاتھوں پلید ہو رہی ہے اور کچھریوں میں حصولِ انصاف کتنا مشکل، پیچیدہ اور مہنگا ہے اس کی وضاحت کی ضرورت نہیں۔

اخلاقی بد حالی کے اس سیل بے پناہ میں عام آدمی تنکے کی طرح بہا جا رہا ہے۔ اس میں اگر کوئی قوتِ مدافعت تھی بھی تو وہ دم توڑتی جا رہی ہے۔ اس نے سمجھ لیا ہے کہ اس صورت حال کا مقابلہ کرنا عبث ہے۔ ایسا ہوتا آیا ہے اور ہوتا چلا جائے گا۔ یہ اخلاقی بے راہروی ان کی معاشرتی زندگی کا ایک لازمہ ہے۔ وہی شخص کامیاب و کامگار ہے جو رفا کارانہ طور پر اس کا ساتھ دے لہذا وہ بھی زمانے کے ساتھ چلنا ضروری سمجھتا ہے خواہ اس کے لیے اس کو بڑی سے بڑی اور پاکیزہ سے پاکیزہ اخلاقی قدروں کو قربان کیوں نہ کرنا پڑے۔

اس عالم میں جیب، نفاذِ اسلام کی آواز کان میں پڑتی ہے تو ہر درد مند مسلمان یہ سوچنے پر مجبور ہے کہ کیا محض قانون سازی اور اجرائے احکام سے یہ مقصد حاصل ہو سکتا ہے؟

اس کا جواب یہی ہے کہ "نہیں" اس کے لیے لازماً ذہنوں کو تیار کرنا پڑے گا اور اخلاقی اصلاح کی مہم چلائی پڑے گی۔ لیکن یہ کوئی آسان کام نہیں۔ یہ مسئلہ بذاتِ خود گہرے غور و فکر ہی کا متقاضی ہے۔

آج ہمارے سامنے یہ سوال بار بار آتا ہے کہ اس ہمہ گیر اخلاقی انحطاط کا سبب کیا ہے اور کیا اس کو ختم کیا جاسکتا ہے؟ اگر ایسا کرنا ممکن ہے تو اس کے لیے مناسب طریق کار کیا ہوگا؟ اگر دس آدمیوں کے سامنے یہ سوالات رکھے جائیں تو آپ کو کم و بیش دس ہی جواب مل جائیں گے اور غالباً ہر جواب دوسرے سے مختلف ہوگا۔ "فکر ہر کس بقدر ہمت ادست"، ہر شخص اپنے مشاہدے اور تجربے کی روشنی میں بات کرتا ہے۔ اس لیے ہمیں اس مسئلے کے بارے میں مختلف آرا کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ایک آدمی یہ خیال کرتا ہے کہ ہمارے اخلاقی انحطاط کا حقیقی سبب سیاست ہے۔ ہمارے سیاسی رہنما کسی قسم کے منابطہ اخلاق کے قائل نہیں۔ گریسی اقتدار ان کا مسلح نظر ہے اور وہ اس کے حصول کے لیے ہر طریقہ جائزہ بنا لیتے ہیں۔ دوسرا آدمی یہ رائے دیتا ہے کہ اخلاقی گراؤ کی اصل ذمے دار حکومت ہے۔ حکومت ایسے قوانین بناتی ہے جو عوام کو خواہ مخواہ غیر اخلاقی ذرائع تلاش کرنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ تیسرا آدمی معاشرتی ماحول کے دباؤ کو اخلاقی بدعنوانی کا باعث قرار دیتا ہے۔ معاشرے کا اجتماعی رویہ، محسوس رسوم اور رواج انسانی اخلاق کے سارے کس بل نکال دیتے ہیں۔ چوتھا آدمی اس اخلاقی انحطاط کی بنیاد معاشی ناہمواریوں اور اقتصادی ناانصافیوں میں تلاش کرتا ہے۔ اس کے نزدیک غربت و افلاس انسان کو چوری، ڈاکہ زنی، عصمت فروشی، رشوت خوری، خیانت وغیرہ پر مجبور کر دیتا ہے۔ اس کے خیالی میں معاشی فاسخ البالی سے ہر قسم کی اخلاقی خرابی کا سدباب کیا جاسکتا ہے۔ پانچواں آدمی ذرائع ابلاغ کو جملہ اخلاقی پستیوں کی جڑ قرار دیتا ہے۔ فرض جتنے منہ اتنی باتیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ سیاستدان، حکمران، قانون، معاشرتی رسم و رواج، غربت و افلاس، دولت و امارت اخلاق عامہ کی پستی یا بلندی میں ممدوم معاون ثابت ہوتے ہیں۔ سیاستدانوں کے مکرو فریب، حکمرانوں کی نفس پرستی و کینہ پروری، قانون کی بے عملی، معاشرے کا اخلاق دشمن رجحان، غربت کا احساس، امارت کا نشہ، اخبارات و رسائل، ریڈیو، ٹیلی ویژن اور سینما وغیرہ کی بُری تلقین اس پستی میں اضافے کا سبب ہے۔ یہ سب چیزیں پست اور مذموم اخلاقی صفات کو تسلسل اور دوام بخشنے والی ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان اسباب سے

بڑھ کر تباہ کن زندگی اور کائنات کے بارے میں ایک ایسا نقطہ نظر ہے جس میں حیوانیت کو انتہائی
خیال کیا جاتا ہے۔ شکم پروری اور نفس پرستی تہذیب و شائستگی کے ہزاروں سال پر پھیلے ہوئے
طویل سفر کا حاصل قرار پاتی ہے۔ یہی وہ خطرناک نقطہ نظر ہے جو اس وقت بڑی سرعت سے
ہمارے معاشرے پر غلبہ حاصل کرتا جا رہا ہے۔

اخلاقی حسن انسان کی فطری حس ہے، قدرت نے انسان کو پیدا کرنے کے ساتھ ہی اس
میں نیکی اور بدی کا شعور بھی ودیعت کر دیا ہے۔ انسان فطری طور پر جانتا ہے کہ کون سی بات
اچھی ہے اور کونسی بُری۔ اسی طرح وہ اخلاقی صفات کی خوبی و خرابی سے بھی باخبر ہے۔ پھر مذہب
عالم نے بھی اخلاقی قدروں کے بارے میں انسان کی رہنمائی کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اچھی اور بُری
اخلاقی صفات تمام انسانوں پر بالکل واضح ہیں۔ اس کے باوجود ہر دور کے انسان نے ان صفات
کی معنویت کو اپنے ذاتی مفادات اور جاہلی تعصبات کے تحت محدود کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس کے
نتیجے میں جو اخلاقی بگاڑ رونما ہوا اس نے پورے معاشرے کو ہلاکت و تباہی کا لقمہ ترنا دیا اور یہ
معاشرے تاریخ کا جزو بن گئے۔ لیکن بعد کے آنے والوں نے بھی ان کے انجام سے کوئی عبرت حاصل
نہیں کی۔ اخلاقی بے راہروی کا یہ سلسلہ عمر حاضر کی زبردست علمی و فلسفیانہ ترقی کے باوجود
جاری ہے۔ اقوام مشرق مغربی اقوام کی مادی ترقی سے اس حد تک متاثر ہیں کہ وہ اپنی اصلاح
اخلاق کے لیے بھی مغربی اقوام کی طرف دیکھ رہی ہیں، حالانکہ وہ قومیں خود زبردست اخلاقی انتشار
سے دوچار ہیں جن کی تہذیبی ترقی کے افسانے عام و خاص کی زبان پر ہیں۔ جو قومیں ترقی سے ہمکنار
ہیں اور علم، اخلاق اور تہذیب میں دنیا کی قیادت و سیاست کی دعویٰ دار ہیں تقریباً وہ سب
بنیادی طور پر خدا، وحی اور رسالت کے تصور سے محروم ہیں۔ ان کے نزدیک مذہب ایک غیر عقلی
رویہ ہے اور اگر اس پر ایمان ضروری ہے تو پھر یہ انسان کا نبی اور ذاتی معاملہ ہے۔ اجتماعی معاملاً
سے مذہب کو کوئی سروکار نہیں ہونا چاہیے، حتیٰ کہ اخلاق کی اصلاح و تعمیر کے سلسلے میں بھی وہ
مذہب کی رہنمائی قبول کرنے کو تیار نہیں۔ بیسویں صدی کے اواخر میں امریکا سے ایک اخلاقی تحریک
شروع ہوئی جس نے بعد ازاں یورپ کے ممالک کو بھی متاثر کیا۔ اس کے مقاصد میں یہ بات واضح
طور پر کہی گئی کہ انسانی زندگی کے تمام تعلقات میں خواہ وہ انفرادی ہوں یا اجتماعی، قومی ہوں
یا بین الاقوامی ایسے اخلاق کی اہمیت پر زور دینا جس میں مذہبی عقائد یا مابعد الطبیعی خیالات
کا کوئی دخل نہ ہو۔

اس طرح کی تحریکوں کے فروغ کا نتیجہ یہ نکلا کہ خیر، مسرت، کمال اور حق وغیرہ کی باتیں

کرنے کے باوجود یہ تو میں اور ان کے فلسفی ان چیزوں کی اصلیت و حقیقت سے آگاہ نہ ہو سکے
 ان سب باتوں کے متعلق ہر منکر کا نقطہ نظر دوسروں سے مختلف ہی نہیں متضاد بھی ہے۔ اخلاق
 حسن و قبح کا معیار کیا ہے؟ خیر و شر کے علم کا ماخذ کیا ہے؟ اخلاقی قوانین کی پشت پر کون سی قوت
 کار فرما ہے؟ وہ محرکات کیا ہیں جو انسان کو ان اصولوں کی پابندی پر آمادہ کرتے ہیں؟ ساری
 سوچیں اور سارے فلسفے ان سوالات کا جواب دینے سے قاصر ہیں۔ اس تمام ناز سائی کی
 وجہ یہ ہے کہ سوچنے والے ذہن کائنات، انسان اور حیات ایسی بنیادی حقیقتوں کے بارے
 میں صاف نہیں ہیں۔ کائنات کا خالق کون ہے؟ کائنات کے اندر انسان کی حیثیت کیا ہے؟
 انسانی زندگی کا مقصد کیا ہے؟ جب تک ان باتوں کا صحیح اور یقینی علم حاصل نہیں ہوتا،
 اخلاق کے کسی مسئلے کا حل ممکن نہیں۔

عصرِ حاضر کی ترقی یافتہ اقوام نے ان بنیادی حقائق کا مطالعہ بھی مذہب اور وحی کی
 رہنمائی کے بغیر کیا ہے۔ وہ کائنات اور زندگی کی روحانی بنیاد کا انکار کرتی ہیں اور مادہ پرستی
 پر فخر کا اظہار کرتی ہیں۔ اس کے نتیجے میں وہ اخلاق کی تعمیر کی اہم بنیاد سے محروم ہو چکی ہیں۔
 ان کے نزدیک اخلاق ایک روحانی ضرورت نہیں بلکہ ایک ایسا رویہ ہے جو شخصی اور گروہی
 مفادات کے تابع ہے لہذا انھوں نے اخلاق کی اصلاح اور تعمیر کے لیے قومی، وطنی، نسلی،
 طبقاتی، تجارتی اور کاروباری اغراض و مقاصد کا سہارا لینے میں عافیت خیال کی۔ لیکن ظاہر
 ہے کہ ان میں سے کوئی چیز بھی اخلاق کے لیے کوئی عالمگیر، مستقل اور مستحکم بنیاد مہیا نہیں
 کر سکتی۔ اس طرز عمل نے اخلاق کے دوسرے، تھرے معیار قائم کر دیے ہیں، ہر شخص اور
 ہر گروہ اپنا الگ اور منفرد معیار رکھتا ہے جو نہ صرف دوسرے اشخاص اور گروہوں سے
 مختلف ہوتا ہے بلکہ باہم متضاد بھی ہوتا ہے۔ ایک ہی ملک کے باشندے، ایک ہی قوم کے افراد
 اور ایک ہی معاشرے کے ارکان اخلاق کے جدا جدا اصولوں کے قائل ہیں۔ اب صورتحال
 یہ ہے کہ ایک آدمی ایک ذہین اور قابل جج، وکیل، استاد، سیاستدان اور تاجر ہے لیکن دوسری
 طرف اچھا انسان نہیں ہے۔ اس کی نجی اور شخصی زندگی ایک اخلاقی اصول کے تابع ہے اور اجتماعی
 اور معاشرتی زندگی دوسرے اصول پر مبنی ہے۔ پھر وہ جس گروہ سے تعلق رکھتا ہے اس کے باہمی
 معاملات ایک اخلاقی اصول کے مطابق سرانجام پاتے ہیں لیکن دوسرے گروہوں کے ساتھ معاملے
 کرتے ہوئے اس کے اصول تبدیل ہو جاتے ہیں اچھے سب لوگ اپنی قوم کے ساتھ جو اخلاقی
 رویہ اختیار کرتے ہیں دوسری قوموں کے ساتھ اس سے قطعی مختلف رویہ اپنانے میں فخر

محسوس کرتے ہیں۔ دنیا بھر میں قتل و خونریزی اور معاشی لوٹ مار کا بازار گرم کرنے والے لوگ وہی ہیں جو اخلاقی اخلاق کے دعویدار ہیں۔ اس اخلاقی زوال کے عالمگیر اثرات مغربی اقوام پر جس طرح مرتب ہو رہے ہیں اس کا اندازہ خود مغربی مفکرین کی تصانیف سے ہو سکتا ہے۔ وہ اس صورت حال کو انتہائی پریشان کن اور مایوس کن قرار دیتے ہیں لیکن اس کا کوئی مدد ان کے پاس نہیں ہے۔

سہ ماہیہ اس وقت دنیا کی سب سے بڑی طاقت ہے اور وہ سب سے زیادہ مہذب و متمدن ہونے کا دعوہ کرتا ہے۔ وہ زندگی کی جن آسائشوں، رنگینوں اور رعنائیوں سے ہمکنار ہے ان کا ذکر ہی سن کر ایشیائی لوگوں کی رال ٹپکنے لگتی ہے، لیکن اخلاقی اعتبار سے وہ کس منزل پر ہے اس کا اندازہ اس ایک واقعہ سے بخوبی کیا جاسکتا ہے جو ۱۳ جولائی ۱۹۷۷ء کی شام کو رونما ہوا۔ آسمانی بجلی گرنے سے نیویارک کے بہت سے ٹرانسپارٹ مرچل گئے جس کی وجہ سے پورے شہر کی برقی رو معطل ہو گئی۔ برقی رو کا معطل ہونا تھا کہ شہر میں قیامت آگئی۔ شہر تاریکی میں ڈوب گیا۔ لفظیں جہاں تھیں وہیں رک گئیں۔ لوگ ان میں پھنسے ہوئے تھے، کوشش کے باوجود نکل نہیں سکتے تھے۔ لوگ موم بتیاں تلاش کر رہے تھے لیکن اندھیرے میں نہ موم بتیاں مل رہی تھیں نہ دیا سلائی۔ گھروں کے اندر جو حالت تھی وہ تو الگ رہی اصل قیامت بنا روں اور کاروباری مراکز میں بپا ہوئی۔ سماج دشمن عناصر نے اس تاریکی سے خوب خوب فائدہ اٹھایا اور نہ بردست لوٹ مار مچائی۔ اس اندھیرے میں نہ تو دکاندار اپنے مال کی حفاظت کر سکتا تھا نہ چور پکڑ سکتا تھا۔ ہزاروں دوکانوں، اسٹوروں اور تجارتی عمارتوں میں ڈاکے ڈالے گئے اور کروڑوں روپے کا سامان لوٹ لیا گیا۔ شہر میں آتش زنی کی سولہ وارداتیں ہوئیں۔ چھ تلو عمارتیں اس آتش زنی سے شدید متاثر ہوئیں، لاتعداد کاریں چوری ہو گئیں شہر کے ہر محلے میں شراب کی بوتلیں ٹوٹی پڑی تھیں۔ مختلف علاقوں میں ان سماج دشمن عناصر نے گھروں میں گھس کر نہ صرف ڈاکے ڈالے بلکہ کئی جگہ سے مجرمانہ حملوں کی اطلاع بھی ملی۔ بعض مقامات پر غنڈوں نے پولیس کا باقاعدہ مقابلہ بھی کیا جس سے ۱۳۲ پولیس والے زخمی ہو گئے۔ چھوٹے دکاندار تو بالکل تباہ ہو گئے۔ ان تمام تر وارداتوں کے سلسلے میں پولیس نے تقریباً تین ہزار تین سو افراد کو گرفتار کیا۔

یہ تو نمونہ ہے امریکی تہذیب کا۔ اب آئیے برطانیہ کی طرف جس کی اخلاقی برتری کے نعرے تہذیب کے ایوانوں میں گونج رہے ہیں۔ برطانیہ نے جس طرح اہل مشرق کو حرم و آزار کا نشانہ بنایا، استعماری مفادات کے لیے جس طرح مشرقی اقوام کو باہم لڑا یا وہ ایک الگ داستان ہے، حال ہی میں وہاں غیر مقامی لوگوں پر جس طرح ظلم و ستم کیا گیا اس سے برطانیہ کے اخلاقی برتری کے نعرے کی اصلیت واضح ہو جاتی ہے۔

یہ اخلاقی انتشار اور افراتفری امریکا اور برطانیہ ہی کا خاصہ نہیں پر وہ معاشرہ اور قوم اس کا شکار ہوگی جس میں اخلاق کی تعمیر کے لیے روحانی عقائد اور مذہبی اصولوں کو پس پشت ڈالا جائے گا۔ اخلاق کی بہترین بنیاد وحی کے عالمگیر اور ابدی اصول بن سکتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں زندگی کا کوئی شعبہ بھی اس وقت تک انسانیت کے لیے مفید نہیں بن سکتا جب تک اس کی بنیاد وحی ربانی پر نہ رکھی جائے۔ وحی کا اصل کام یہ ہے کہ وہ انسانی اعراض کو ایک بڑے نصب العین کے تابع کر دیتی ہے اور یہ نصب العین ہے اللہ کی خوشنودی، اور یہ نصب العین بہت سی دوسری چیزوں سے وابستہ ہے، یعنی رسالت پر ایمان، آخرت کا عقیدہ، جزا و سزا کا لفظ وغیرہ ان سب کے مجموعے کو ہم ایمان کہتے ہیں۔ اسلام پہلے ایمان کی دعوت دیتا ہے اور پھر ان کی تعلیم دیتا ہے۔

زندگی کی ہر تعمیر سے پہلے عقائد کی تعمیر ضروری ہے انسانی اذنان و قلوب جب سے عقائد کو قبول کر لیتے ہیں تو پھر فکر و عمل کے میدان میں انقلاب لانا بہت آسان ہو جاتا ہے۔ اس کا یہ فطری طریقہ ہے۔ اسلام چونکہ دین فطرت ہے اس لیے اس نے یہی طریقہ پیش نظر رکھا ہے۔ اس نے سب سے پہلے کائنات اور حیات کے بارے میں انسانی ذہن کو غلط قسم کے خیالات اور توہمات سے نجات دلانی۔

کائنات کے متعلق اسلام یہ حقیقت ذہن نشین کراتا ہے کہ اس کا ایک خالق ہے۔ اس کا انتظام کرنے والا ہے، وہی سب مخلوقات اور انسانوں کا آقا و مالک ہے، ہر چیز فائدہ لیکن خالق ہمیشہ باقی رہنے والی ہستی ہے۔ وہ حکیم اور قادر مطلق ہے، وہ ظاہر و باطن کا جانتا والا ہے، انسان اس کا بندہ اور نائب ہے اور اپنے ہر کام کے لیے اللہ کے سامنے جوابدہ ہے۔ اس عارضی دنیا کے بعد دوسری دنیا یا آخرت لازماً آئے گی جس میں دنیا کی زندگی میں اس کی جسم سازی کا مکمل حساب ہوگا۔ اس کے مطابق وہ عذاب و ثواب اور جنت و دوزخ کا مستحق ہوگا۔ دنیا کی زندگی دراصل امتحان کی مہلت ہے۔ انسان کی سہولت کے لیے کائنات کی ہر چیز مستحق کر دی گئی ہے۔ اس کو نہ صرف اپنے جسم پر اختیار عطا کیا گیا ہے بلکہ نیکی باری، اطاعت و سرکشی کی راہیں بھی اس کو سمجھادی گئی ہیں۔ اس کی ابدی فلاح اس میں ہے کہ وہ اپنے آپ کو اللہ کے منشا کے تابع کر دے اور اس کے دل میں ہر وقت یہ احساس جاگتا رہے کہ اس کا واسطہ ایسی ہستی سے ہے جو اس کی حرکات و سکنات ہی نہیں اس کے خیالات و احساسات کی بار بار سے باریک تفصیل سے بھی بخوبی باخبر ہے اور جہزہ او سزا دینے کی پوری قدرت بھی رکھتی ہے

کائنات و حیات کا یہ تصور اس خیر اور بھلائی کو بھی متعین کرتا ہے جس کے لیے انسان کی ہر سعی و کوشش وقف ہونی چاہیے اور وہ کائنات کے رب کی خوشنودی کے سوا اور کچھ نہیں بھلائی کا یہ تصور انسان کی اخلاقی زندگی کا محور ہے۔ اس تصور کی روشنی میں اخلاقی صفات اپنی فطری اور اصلی صورت میں متعین طور پر سامنے آتی ہیں۔ رضائے الہی کو مقصود قرار دینے سے اخلاق کو نہ صرف بلند ترین غایت مل جاتی ہے جس کی بدولت اخلاقی نشوونما کے امکانات روشن تر ہوتے ہیں بلکہ ذاتی مفادات اور زمانی تغیرات سے بالاتر اخلاقی اقدار قائم ہو جاتی ہیں۔ کائنات و حیات کے اس تصور میں وہ قوت نافذہ بھی موجود ہے جس کا کسی بھی اخلاقی قانون اور ضابطے کی پشت پر ہونا ضروری ہے۔ اللہ کے حاضر و ناظر ہونے اور عالم غیب ہونے کا تصور، آخرت کی باز پرس کا اندیشہ، اللہ کے غضب کا ڈر اور ابدی زندگی کی نوابی کا خوف اخلاقی قانون کا دائمی پشتیبان ہے۔ یہ خوف جب انسان کے دل میں جاگزیں ہو جاتا ہے تو پھر اس قانون کی تعمیل کے لیے کسی پولیس، عدالت اور جیل کی ضرورت نہیں رہتی۔ یہ درست ہے کہ اسلام ایک رائے عامہ بھی اس اخلاق کے حق میں تیار کرتا ہے اور حکومت کو بھی اخلاق کی نگرانی کا ذمہ دار بناتا ہے، لیکن ان سب ذرائع سے بڑھ کر وہ اللہ کے خوف اور آخرت کی جوابدہی کے عقیدے کو مستحکم بنانا ضروری سمجھتا ہے۔ جب یہ عقیدہ مستحکم ہو جاتا ہے تو پھر اخلاق کی عمارت ناقابل شکست بنیادوں پر تعمیر ہو سکتی ہے۔ افراد معاشرہ کسی قانون، پولیس اور عدالت کے بغیر خود ہی ایک دوسرے کے حقوق اور مفادات کی نگہداشت میں سرگرم رہتے ہیں، یہی چیز ہے جو زندگی کی ہر سرگرمی کو دنیا کے دائرے سے نکال کر دین بنا دیتی ہے جو دیوانی اور فوجداری مقدمات کو صرف عدالتوں کے رحم و کرم پر نہیں چھوڑتی بلکہ آخرت کی نجات کے ساتھ مربوط کر دیتی ہے۔

یہ بنیادی تصور وہ محرکات بھی مہیا کرتا ہے جو انسان کو اخلاقی قوانین کے مطابق عمل کرنے پر ابھارتے ہیں۔ اللہ کو اللہ ماننا اس کی اطاعت و بندگی پر راضی ہو جانا اس کی مرضی و منشا کو مقصد حیات بنانا ان قوانین کی تعمیل کے اصل محرکات ہیں، جن کے بارے میں اسے یقین ہو کہ اس کے رب نے ان کا حکم دیا ہے، کیونکہ صرف اسی صورت میں اس کے لیے آخرت کی ابدی زندگی میں ایک شاندار مستقبل مہم ہے۔ اپنے رب کے سامنے جوابدہ ہونے کا تصور انسان کو اس کی رحمت کا امیدوار اور اس کے غضب سے خوفزدہ رکھتا ہے، لہذا وہ دنیا کی عارضی زندگی میں ہر قسم کی مشکلات کا مقابلہ کر کے آخرت کی کامیابی اور اللہ کی خوشنودی کے حصول میں کوشاں رہتا ہے۔ پھر اسلام نے اخلاقی قوانین کا ماخذ بھی مہیا کر دیا ہے۔

اس نے اخلاقی صفات کو محض عقل، علم، تجربہ، خواہشاتِ نفس کے بجائے ایک واضح معین ذریعے پر منحصر قرار دیا ہے اور وہ ہے کتاب اللہ و سنت رسول اللہ۔ یہ دونوں چیزیں مل کر اسلامی قانونِ اخلاق کے لیے ماخذ مہیا کرتی ہیں۔ یہ ماخذ ہنگامی، علاقائی یا گروہی نہیں بلکہ مستقل، دوامی اور عالمگیر قدر و قیمت کا مالک ہے اور زمانی و مکانی تغیرات سے محفوظ ہے۔ اس ذریعے اور ماخذ سے ہمیں جو ہدایات ملتی ہیں وہ ہر علاقے، ہر نسل اور ہر دور کے انسان کے لیے لائقِ تعمیل اور قابلِ عمل ہیں۔

پیغمبر اسلام اللہ کے آخری نبی اور رسول ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو قیامت تک آسمانوں کے انسانوں کے لیے رہنما بنایا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کے ذریعے سے دنیا کو جو اخلاقی نظام دیا ہے وہ ہر اعتبار سے جامع کامل اور ہمہ گیر ہے۔ اس میں ہماری زندگی کے چھوٹے چھوٹے معاملات سے لے کر قوموں کے مابین تعلقات کے لیے واضح ہدایات ملتی ہیں۔ اس نظام موجودگی میں کسی دوسرے ذریعے سے اخلاقی ہدایات لینے کا اب کوئی جواز نہیں رہا۔ اسلام نے نہ صرف اعلیٰ اور بلند اخلاقی صفات کو صفاتِ الہی کا عکس قرار دے کر بندوں کو خدائی اخلاقی صفات اپنانے کی تلقین کی بلکہ ان صفات کو سہل الحصول اور مرغوب بنانے کے لیے عبادات کا نظام بھی قائم کیا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اسلامی عبادات کے متنوع فوائد ہیں لیکن ان کی ایک اہم غرض و غایت اخلاقِ حسنہ کی تربیت بھی ہے۔ یہ جو انسان کو اپنے نفس پر قابو پانے کے قابل بناتی ہیں۔ اس کے معروف پر عمل کرنے اور منکر سے بچنے پر آمادہ کرتی ہیں۔

عبادات کے نظام سے کام لے کر حضور نے ایک ایسی جماعت تیار کر دی جو ان تمام صفات سے متصف تھی جن کی تلقین قرآن مجید نے کی اور جن کا عملی نمونہ حضور نے پیش فرمایا۔ صحابہ کرام کی اس جماعت نے صدق و صفا، امانت و دیانت، ہمدردی و عملساری، ایثار و قربانیت اور عدل و انصاف کی ایسی مثالیں قائم کیں جو آنے والے لوگوں کے لیے ہمیشہ مشعل رہی اور مینار نور کا کام دیں گی۔ قرآن کی تعلیمات، حضور کے اسوہ حسنہ اور صحابہ کرام کی زراعتِ مثالوں نے ہر دور کے مسلمانوں کے اخلاق و کردار کو سنوارنے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ یہی اخلاق کے یہی وہ عناصر ہیں جنہوں نے اس دور میں بھی ہمارے معاشرے میں بلند اخلاقی کردار کو سہارا دے رکھا تھا جو ہمارے زوال کا دور تھا۔ علم و فن، تہذیب و تمدن، سیاست و حکومت کے میدان میں ہم دوسری اقوام سے پیچھے رہ گئے تھے لیکن مجموعی طور پر ہمارے

ہم کی اخلاقی تعلیمات سے قطع نہیں ہوا تھا مگر گزشتہ صدیوں کے طویل غیر ملکی تسلط سے ہماری
 تہذیب کو جو ضعف پہنچا اس نے غیر اسلامی افکار و نظریات کی بلخار کی راہ ہموار کر دیا۔
 بلخار نے سب سے زیادہ ہمارے بنیادی عقائد کو توڑنے پھوڑنے کی کوشش کی۔ ہمارا جاہل
 بقہ رسم و رواج کی جگہ بندیوں میں پھنس کر رہ گیا اور ہمارا ذہن طبقہ اسلام دشمن قوتوں
 کے لیے ترنوالہ ثابت ہوا۔ مغرب کی مادی ترقی نے اس کی نگاہوں کو خیرہ کر دیا۔ اسلام کی
 اخلاقی تعلیمات اس کے نزدیک ازکار رفتہ اور فرسودہ قرار پائیں۔ مادی ترقی کے مقصود اور
 ممال و جاہ کے جذبے نے ہماری اخلاقی اقدار کے سارے نظام کو تہ و بالا کر دیا۔ آج ہم
 کسی سے ہنستے بولتے ہیں، کسی کو سلام کرتے ہیں، کسی کی خیریت دریافت کرتے ہیں، اظہارِ غم
 کرتے ہیں یا نمائشِ مسرت کرتے ہیں تو اللہ کی رضا کے لیے نہیں بلکہ ڈیل کاری کی کتابوں کے
 ازہ ترین ایڈیشن کے مندرجات پر پورا اتارنے کے لیے! ہم اگر کسی کو تحفہ دیتے ہیں تو اس لیے
 نہیں کہ حضورؐ کا فرمان ہے کہ "ایک دوسرے کو بدیہ بھیجا کر دو تو آپس میں محبت پیدا ہوگی اور
 یوں کی کدورت دور ہوگی۔" (مشکوٰۃ) بلکہ اس لیے کہ اس طرح ہمیں کسی سے مالی فائدہ پہنچنے کی
 توقع ہوتی ہے۔ یہ طرز عمل ہمارے اس طبقے کا ہے جس نے نہ جانے کن کن یونیورسٹیوں سے علم و فن
 کی کیسی کیسی سندیں لے رکھی ہیں۔

ہمارے تعلیم یافتہ طبقے کی حالت سے ہمارے عوام کا متاثرہ ہونا قدرتی عمل تھا اور ایسا ہی
 ہوا۔ اب شاید ہی کوئی طبقہ ایسا ہو جو اس مہیب اخلاقی بحران سے دوچار نہ ہو۔ ہمارے کسان،
 مزدور، اساتذہ، وکیل، عالم، رہنما، کارکن اور حاکم سب اخلاقی افلاس اور بے مایگی میں مبتلا
 ہیں، یہی وجہ ہے کہ کھیتوں، کارخانوں، تعلیم گاہوں، عدالتوں، انتظامی دفاتروں وغیرہ میں
 گہما گہمی ہونے کے باوجود قوم جہاں سے چلی تھی آج بھی وہیں کھڑی ہے۔ ہماری مثال قدیم داستانوں
 کے ان شہزادوں کی ہے جو ہر مقصود کی تلاش میں بڑے جوش اور جذبے سے نکلتے ہیں لیکن کسی
 خبیث جن کی قید میں آکر پتھر کے بت بن جاتے ہیں! مایوسی کی مکڑی نے ہمارے وجود کے ارد گرد
 ایسا جال اتن دیا ہے جس نے ہمیں اپنے انجام کے مشاہدے سے محروم کر دیا ہے۔ وقت کا ہر لمحہ
 سانپ کی طرح ہمیں ڈس رہا ہے اور ہر گھڑی ناگن کی طرح پھنکارتی سناٹی دیتی ہے۔ لیکن سوال
 یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا ہم ہمت نازدیں، ناموافق حالات کے سامنے سر تسلیم خم کر دیں، اخلاقی بے
 راہروی سے سمجھوتہ کر لیں اور اخلاقی صفات کی ترویج و ترقی کے اس منصب سے دست بردار
 ہو جائیں جس کے لیے حضورؐ کی امت کو مقرر کیا گیا ہے؟ میرا جواب ہے: ہرگز نہیں جب تک

ہمارے سینوں میں ایمان کی مشعل فروزاں ہے ہمیں تاریکیوں کے خلاف جنگ کرتے رہنا ہے
 ہمیں اپنی حد تک، اپنی سمیت کے مطابق صورت حال کو تبدیل کرنے کے لیے جدوجہد ضرور کرنی
 ہے۔ ایک چینی کہاوت میں کہتی اچھی بات کہی گئی ہے :
 "تاریکی کو کوسنے کے بجائے ایک دیا جلا لینا بہتر ہے"

موجودہ حالات کے تناظر میں اس کام کی اہمیت اور ضرورت پہلے سے کہی گئی ہے۔ یاد رہے
 بڑھ جاتی ہے۔ موجودہ حکومت نے پاکستان کے مقصد و وجود کی تکمیل کی غرض سے اسلامی
 نظام کے قیام کے لیے لائق ذکر پیش رفت کی ہے۔ اس نے معاشی ناہمواریوں کو دور کرنے
 کے لیے زکوٰۃ اور ایک صحت مند معاشرے کے قیام کے لئے اسلامی حدود و تعزیرات کے نفاذ
 کے ضمن میں ضروری اقدامات کیے ہیں۔ قومی وقار اور شخص کے لیے اردو زبان اور قومی لباس کی
 ترویج کے لیے کوششیں کی ہیں۔ حکومت کی ان باتوں کو لوگوں نے جس طرح سراہا ہے اس سے ان
 کی اسلامی نظام سے محبت اور قومی شخص سے لگاؤ کا پتہ ہوش اٹھا رہتا ہے۔ لیکن اس موقع
 پر ہمیں یہ حقیقت نظر انداز نہیں کرنی چاہیے کہ کوئی بیج کتنا ہی عمدہ کیوں نہ ہو اگر اس کو بونہ
 سے پیشتر زمین میں صحیح طور پر نہ چلا یا گیا ہو اور نہ زمین کو چھارہ جھنکار سے پاک نہ کیا گیا
 تو اس بیج سے مطلوبہ فصل حاصل نہ ہوگی۔ اس حقیقت کو ایک اور طرح یوں سمجھا جاسکتا
 ہے کہ دودھ ایک خالص اور مکمل غذا ہے لیکن اگر معدہ اس کو ہضم کرنے کی صلاحیت سے
 محروم ہو تو وہ جسم پر مطلوبہ فوائد مرتب نہ کر سکے گا۔ اسی طرح اگر کوئی قوم کسی نظام کو قبول کرنے
 کے لیے ذہنی اور اخلاقی طور پر تیار نہیں ہے تو محض قانون کے نفاذ سے اس نظام کے فوائد اور
 برکات منتظر عام پر نہیں آسکیں گے۔

اسلام ایک پاکیزہ نظام حیات ہے، یہ اپنے نفاذ کے لیے اس امر کا تقاضا کرتا ہے کہ
 دلوں اور دماغوں کو جمالت اور جاہلیت کی خرابیوں سے پاک کیا جائے۔ حضور نے یہی طریق
 کار اپنایا تھا۔ آپ نے اہل ایمان کا پہلے تزکیہ کیا اور پھر ان کو کتاب و حکمت کی تعلیم دی اور
 ان کو اسلامی احکام و ضوابط پر عمل کرنے پر آمادہ کیا۔ اگر اسلامی نظام کے نفاذ کے ساتھ اخلاقی
 تربیت کا کام جاری نہ رکھا گیا تو اسلامی نظام قانون کی کتابوں میں محفوظ ہو جائے گا لیکن
 عمل کی دنیا میں اس کا سکہ نہ چل سکے گا۔

اللہ کا شکر ہے کہ ہم اس وقت اخلاقی بحران سے دوچار ہونے کے باوجود بے حسی کا شکار نہیں
 ہیں، ہمیں احساس ہے کہ ہم ان اخلاقی اوصاف سے محروم ہیں جو امت مسلمہ کا طرہ امتیاز ہے۔

یہ احساس تقاضا کرتا ہے کہ ہم اپنی قوتوں کو مجتمع کر لیں۔ کیا یہ حقیقت نہیں کہ ہمارے ہاں خلاقیت بے راہروی اس لیے عام ہو رہی ہے کہ شرکی قوتیں بے لگام ہیں، منظم ہیں اور جبارانہ قدامت کر رہی ہیں؟ جبکہ اخلاقِ حسنہ کے شیدائی منتشر ہیں اور مدافعانہ جدوجہد پر قناعت لیے ہوئے ہیں۔ میرے خیال میں ہمیں سورہ والعر کو حزنِ جان بنانا چاہیے۔ ارشادِ باری

وَالْعَصْرِ ۝ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِي خُسْرٍ ۝ اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَّصَّوْا بِالْحَقِّ ۝ وَتَوَّصَّوْا بِالصَّبْرِ ۝

ترجمہ: زمانے کی قسم۔ انسان درحقیقت بڑے خسارے میں ہے سوائے ان لوگوں کے جو ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے اور ایک دوسرے کو حق کی نصیحت اور صبر کی تلقین کرتے رہے۔

صحابہ کرام کی نظر میں اس سورت کی اہمیت کیا تھی؟ اس کے بارے میں حضرت عبید اللہ بن جعفر الدارمی ابومدینہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کرام میں جب دو آدمی ایک دوسرے سے ملتے تھے تو اس وقت تک جہانہ موتے تھے جب تک ایک دوسرے کو سورہ والعصر نہ سنالیتے تھے۔ اس سورت میں عالمگیر اور ہمہ گیر خسارے سے بچنے کا طریق کار یہ بتایا گیا ہے کہ لوگ ایمان لائیں، عمل صالح کریں اور دوسروں کو نیکی اور مہربانی کی تلقین کریں۔ اس راہ میں جو مصیبتیں پیش آئیں ان کو برداشت کریں اور دوسرے ساتھیوں کو صبر کی تلقین کریں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی معاشرے کے قیام اور اصلاحِ اخلاق کی اہم مہم کو کامیاب بنانے کے لیے چار صفات اپنانے کی ضرورت ہے: ایمان، عمل صالح، نصیحتِ حق اور تلقینِ صبر۔ یہ چاروں صفات باہم لازم و ملزوم ہیں۔ نصیحتِ حق میں تعلیمِ اخلاق اور تلقینِ صبر میں تعمیر کردار کا مفہوم بھی پانا جاتا ہے۔

یوں تو اصلاحِ اخلاق ہم سب کی ذمہ داری ہے لیکن اس سلسلے میں سب سے زیادہ مؤثر اور فعال کردار تعلیم یافتہ افراد ادا کر سکتے ہیں۔ ان میں استاد، عالم، ادیب، شاعر، صحافی، حکیم، ڈاکٹر اور وکیل وغیرہ سب شامل ہیں۔ بجائے اس کے کہ ہر شخص دوسرے شخص کی طرف اور ہر شعبے کے لوگ دوسرے شعبوں کے لوگوں کی جانب دیکھتے رہیں ہر شخص اور گروہ کو اپنی حالت پر غور کرنا چاہیے، اپنا محاسبہ کرنا چاہیے۔ اور سب سے پہلے خود اپنا علاج کرنا چاہیے۔ اس کے بعد دوسروں کی اصلاح کا فریضہ بھی سرا انجام دینا چاہیے۔ اس عظیم فریضہ کی ادائیگی سے نہ تو

عوام بچ سکتے ہیں نہ حکام، نہ اخبارات و برسائل کے مالکان بچ سکتے ہیں نہ ذرائع ابلاغ کے کارپردازان۔ اگر اخلاق کے علمبرار چاہتے ہیں کہ وہ معاشرے میں ایک منطوق اقلیت بن کر نہ رہ جائیں تو انہیں معروف اخلاقی قدروں کی ترویج کے لیے مسلسل جدوجہد کا آغاز کرنا پڑے گا۔

نوٹ

اس مضمون کی تیاری میں مندرجہ ذیل کتابوں سے خاص طور پر استفادہ کیا گیا ہے:

- | | |
|------------------------------|---------------------------------|
| (۱) اخلاق اور فلسفہ اخلاق | از مولانا حفیظ الرحمن سیوہاروی |
| (۲) اسلام کا اخلاقی نقطہ نظر | از مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی |
| (۳) سیرۃ النبیؐ، جلد ششم | از مولانا سید سلیمان ندوی |
| (۴) زادِ راہ | از مولانا جلیل احسن ندوی |
| (۵) پیام انانیت | از مولانا سید ابوالحسن علی ندوی |
| (۶) تزکیہ نفس | از مولانا امین احسن اصلاحی |

عدل اجتماعی — تصور و نفاذ

جناب محترم ڈاکٹر امان اللہ خان

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝

”وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيَّ آدَمَ وَحَمَلْنَاهُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ
وَرَزَقْنَاهُمْ مِّنَ الطَّيِّبَاتِ وَفَضَّلْنَاهُمْ عَلَى كَثِيرٍ مِّمَّنْ
خَلَقْنَا تَفْضِيلًا“ (سورۃ الاسراء) ۱۷/۲۴

اور بے شک ہم نے افراد نسل انسانی کو عزت بخشی اور ان کو خشکی اور تری
میں سواریاں عطا کیں اور انہیں پاک چیزوں سے رزق دیا نیز بہت سی

ان چیزوں پر جو ہم نے پیدا کی ہیں ان کو فضیلت عطا کی۔

”لَقَدْ آرَسْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنَاتِ وَأَنزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتَابَ
وَالْمِيزَانَ لِيَقُومَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ“... (سورۃ الحديد) ۱۰۹/۲۵

(اور بے شک ہم نے اپنے رسول روشن دلیلوں کے ساتھ بھیجے اور ان کے ساتھ

کتاب اور میزان اتاری تاکہ لوگ عدل کے سہارے کھڑے ہو جائیں)۔

”سوشل جسٹس“ یا ”عدل اجتماعی“ کی اصطلاح عصر حاضر میں بڑی ہر دو لعزتہ ہوئی ہے،

اور بالعموم یہ سمجھا جاتا ہے کہ یہ ایک نیا تصور ہے جو تہذیب حاضر کا وضع کردہ ہے۔

یہ بات حقیقت پر مبنی نہیں ہے۔ اس کی اصل وجہ مختلف نظامات بالخصوص اسلامی نظام

حیات اور نبوی تعلیمات سے ناواقفیت ہے۔ سوشل جسٹس کے جدید تصور اور عدل اجتماعی

کے اسلامی تصور کا جب بہ نظر غائر تقابلی مطالعہ کیا جاتا ہے تو یہ امر واضح ہو جاتا ہے کہ

مغربی تصور ادھورا، نامکمل اور نسل انسانی کے لیے حقیقی معنوں میں نفع رساں نہیں۔

اس کے برعکس نبوی تصور عدل تمام پہلوؤں کے لحاظ سے کامل ہے اور اس میں افراد

نسل انسانی کے نفع، ان کی اصلاح اور تعمیر و سکون کی پوری پوری ضمانت موجود ہے۔

کتاب ”SOCIAL JUSTICE“ کے مشہور مصنف بالڈون (R.W. BALDWIN)

مغربی تصور کی اہمیت اور تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

" JOINTLY WITH ECONOMIC GROWTH, SOCIAL JUSTICE HAS BECOME THE FAVOURITE THEME OF POLITICAL PLATFORMS, ALMOST SUMMARY DEFINITION OF THE ACCEPTED GOAL OF MODERN SOCIETY. YET JUSTICE ITSELF IS ESSENTIALLY A QUALITY OF THE BEHAVIOUR OF ONE MAN TO ANOTHER, THAT IS OF MAN IN SOCIETY, SO THAT ALL JUSTICE IS SOCIAL JUSTICE

"SOMETIMES THE TERM MAY BE USED TO DISTINGUISH MORAL OR NATURAL JUSTICE FROM THE LEGAL JUSTICE OF THE LAWS ENFORCED BY PARTICULAR STATES. MORE OFTEN, HOWEVER, IT IS PROBABLY MEANT TO DESCRIBE JUSTICE IN THE BROAD FIELDS OF SOCIAL AND ECONOMIC POLICY, AS CONTRASTED WITH THE JUSTICE IN PERSONAL AND PRIVATE AFFAIRS WHICH THE LAW COURTS OF ALL AGES AND COUNTRIES HAVE TRADITIONALLY ADMINISTERED" (PAGE 1)

اجتماعی انصاف کے حصول کو جدید سوشلسٹی کا بنیادی مقصد قرار دینے والی تہذیب مغرب اس مقصد کے حصول میں کہاں تک کامیاب ہو سکی ہے اہل دانش بڑی اچھی طرح سے جانتے ہیں اور وہ اس ناکامی کے اس اہم ترین سبب سے بھی آگاہ ہیں کہ وہ اذکار و تصورات اور نظام جن کی بنیاد مخالف عقلی اور مادی ہے انسانوں کو انسانوں کے ساتھ پُر خلوص، پُر ایشارہ اور نفع رساں رویہ اختیار کرنے پر آمادہ نہیں کر سکتے۔ تجربے اور تاریخ نے اس

بات کی پوری پوری شہادت دے رکھی ہے۔

شوپن ہارپر من مفکر مغرب کی مادی و المادی تہذیب کے پیدا کردہ انسان سے مکمل طور پر نا امید ہو کر اسی لیے پکار اٹھا:

“MAN IS WOLF OF MAN”

بالڈون اجتماعی انصاف کے حصول کے سلسلے میں جس انسان پر کام کا آغاز کرتا ہے وہ بھی پیدائشی طور پر خود غرض واقع ہوا ہے۔

JUSTICE ACCEPTS THAT MEN ARE SELFISH, BUT STIPULATES THAT ONE SELF IS AS IMPORTANT AS ANOTHER, AND THEREFORE REGULATES THEIR CONFLICTING INTERESTS. (PAGE 230)

اس کے برعکس اسلام نے جس انسان پر کام کا آغاز کیا وہ عزت دار ہے، خدا کا نائب ہے، اعلیٰ ترین امانت کا حامل ہے اور لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ فِي أَحْسَنِ تَقْوِيمٍ کا مصداق اور ثُمَّ اجْتَبَاهُ رَبُّهُ فَتَابَ عَلَيْهِ وَهَدَىٰ کا خطاب یافتہ! اجتماعی عدل کی اگر یہ تعریف کی جائے کہ یہ ایک ایسے تصور کا نام ہے جس میں انسانوں کے معاشرتی، قانونی و عدالتی، معاشی اور سیاسی حقوق و فرائض کی نشان دہی کی جاتی ہے تو بے محل نہ ہو گا۔ اس تصور کے قیام سے مقصود ایک ایسا معاشرہ ہے جس میں اعتدال، توازن اور امن ہو۔ جو خوف سے پاک ہو، جس میں انسانوں کو ان کے مذکورہ بالا حقوق حاصل ہوں، ان کے تحفظ کی پوری پوری ضمانت ہو۔ اور ان حقوق کو پامال کرنے والوں کو ناکام بنانے کا پورا پورا انتظام ہو۔

ہماری یہ خوش بختی ہے کہ اجتماعی انصاف کے ان چاروں پہلوؤں کے بارے میں نہ صرف قرآن و سنت کی واضح تعلیمات موجود ہیں بلکہ اس کا عملی نمونہ اس معاشرے کی صورت میں موجود ہے جو سرکارِ دو عالم ہادیٰ دو جہاں رحمۃ اللعالمین صلی اللہ علیہ وسلم نے تشکیل دیا تھا۔

اصلاح فرد

اپنے فرد کی روحانی و اخلاقی اصلاح و تعمیر پر سب سے زیادہ توجہ فرمائی اور اپنے ساتھیوں کے دلوں کو روحانیت سے بھر دیا۔ رنگ و نسل، خاندان، علاقے اور وطن کے امتیازات کو مٹا دیا۔ انھیں عظمت و عزت کے ایک نئے تصور سے آگاہ کیا، اخوت و حریت کی تشکیل و تاسیس کی:

يَا أَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوا رَبَّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُمْ مِن نَفْسٍ وَاحِدَةٍ (نساء ۱)

يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاكُمْ مِنْ ذَكَرٍ وَأُنْثَىٰ وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوبًا وَقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوا إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللَّهِ أَتْقَىٰكُمْ . . . (مجموعہ ۱۳)

حدیث: لا فضل لعربی علی عجمی (مسند احمد بن حنبل)
انسانوں کو یہ سب حقوق انقلابِ فرانس اور یو این اد کے بنیادی انسانی حقوق کے چارٹر سے صدیوں پہلے عطا ہوئے۔

قانونی و عدالتی انصاف

عدل کے بارے میں قرآنی آیات لا تعدوا ہیں۔ ان کے حوالے سے عدل کا اعلیٰ ترین معیار قائم ہوا۔

قانون کے سامنے مساوات کی عملی مثالیں موجود ہیں۔ عدلیہ و انتظامیہ کی علاحدگی اسلامی تعلیمات کا جزو ہے۔

معاشی انصاف

- معاشی اصول و تعلیمات اسلام کے پورے نظام کا ایک اہم حصہ۔
- معیشت کی اساس اخلاق پر رکھی گئی۔
- نفع رسانی کا اصول "اما ما یتفیع الناس فیہکت فی الارض۔"
- گردشِ دولت اکتاز و استحکار کی ممانعت۔

• حلال و حرام کی تمیز، ربا کی حرمت، حرم و نجس کی ممانعت۔

• محنت کی عظمت و اہمیت۔

• زکوٰۃ - انفاق فی سبیل اللہ - قرضِ حسنہ۔

• اجتماعی کفالتِ عامہ۔

• معیشت کو درہم بہ درہم کرنے والے جملہ عناصر کا سدباب۔

سیاسی انصاف

۱ وعد اللہ الذین امنوا منکم و عملوا الصالحات لیستخلفنہم

فی الارض کما استخلف الذین من قبلہم۔

۲ امرہم شوریٰ بینہم

کلکم داع و کلکم رسولٌ عن سرعیتہ۔ (الحدیث)

عدل اجتماعی کے اس واضح، جاندار اور انتہائی نفع رسا تصور پر نبوی معاشرہ

قائم ہوا۔ خلافت راشدہ بھی اس کی ایک گرہ قدر عملی مثال ہے۔

صالح مسلمان حکمرانوں نے بھی ان تعلیمات پر حتی الامکان گامزن ہونے کی پوری

کوشش کی۔

دورِ حاضر میں اس کے نفاذ کی عملی تجاویز

فرد کی اصلاح، تعلیم و تربیت اس انداز پر ہو کہ اس کا دل روحانیت سے بھر جائے

کیونکہ دین کا مقصد ایک روحانیت بھرا دل ہی پورا کرتا ہے۔

اس سلسلے میں ہماری رہنمائی وہ عظیم طریقِ تعلیم و تربیت اور دستورِ تزکیہٴ نفوس کرتا

ہے جسے معلمِ انسانیت صلی اللہ علیہ وسلم نے اختیار فرمایا تھا۔

۵ فرد کی تعمیرِ شخصیت میں ہمارا نظامِ تعلیم اور بالخصوص نصابِ تعلیم بڑی بنیادی اور

فیصلہ کن حیثیت رکھتا ہے۔

جب تک جملہ نصابِ تعلیم کی اساس اسلامی اصولوں پر نہیں اٹھائی جاتی اور اسے

المادی مادی و لادینی اصول و افکار کی زد اور یلغار سے بچا نہیں لیا جاتا منتشر

اور الجھا ہوا ذہن رکھنے والے طلبہ و افراد پیدا ہوتے رہیں گے جن سے اجتماعی عدل

پامال ہوتا رہے گا۔

○ فرد کی روحانی تربیت و ارتقا کے بارے میں ذرائع ابلاغ کو اپنی ذمہ داری مستعدی سے پورا کرنی چاہیے۔

○ علمی اور فکری سطح پر جدید مادی و الحادی تہذیب کو پورے طور پر بے نقاب کرنے کی ضرورت ہے۔

○ قلوب و اذنان پر ہونے والے منفی اثرات کا موثر سدباب کرنے کی ضرورت ہے۔ اسی سلسلے میں نہ صرف مغرب سے آنے والے بدنیاتی پر مبنی لٹریچر پر کڑی نظر رکھنے کی ضرورت ہے۔ بلکہ ملک میں لکھے جانے والے پر بھی۔

○ اجتماعی عدل کے قیام کے لیے ایسے منظم اجتماعی اور فعال ادارے بنانے کی ضرورت ہے جن کی اساس نبوی تعلیمات ہوں اور جن کا انداز بھی نور نبوت سے مستفید ہو۔ نیز موجود اداروں کی تشکیل نو کا اہتمام بھی ہو۔ فلاح عامہ اور معاشرتی بہبود کے پروگراموں کو اور زیادہ منظم، وسیع، فعال اور حقیقی معنوں میں نفع رسا بنانے کی ضرورت ہے۔ احتساب و قانون کی قوت بھی اس سلسلے میں بڑا اہم کردار سرانجام دے سکتی ہے۔

اخلاق

نبوت سے اکتساب فیض کی شرط اور علامت

جناب محترم پروفیسر حافظ احمد یار

تَخَذِ الْعَفْوَ وَأُصْرًا بِالْعُرْفِ وَأَنْعَسْ مِنْ عَيْنِ الْجَاهِلِينَ (الاعراف ۱۹۹)

سیرت نگاران رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں سے ایک سے زیادہ نے اس سوال پر اپنے اپنے رنگ میں بحث کی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے آخری پیغام کی رسالت اور اپنے آخری نبی کی بعثت کے لیے اہل عرب کو ہی کیوں منتخب فرمایا؟

مشہور مصری مؤلف لطفی جمعہ نے اپنی کتاب "ثورة الاسلام و بطل الانبياء" کا آغاز ہی اس طرح کیا ہے:

في تاريخ العالم وقصص الحضارة الانسانية وفي اخبار العمران
وابناء المدن القديمة والحديثة صفحات غامضة
والغائر معقدة يقف الباحث والقارئ حيا لها صد هوشا
حائرا.....

.... ومن هذه الالغاز المعقدة اختيار العناية
الالهية جزيرة العرب لتكون مشرقا لانوار النبوة
ومصدر الرسالة الانسانية ومهد الحضارة العربية؛
دنیا کی تاریخ، انسانی تمدن کی داستان اور قدیم و جدید تہذیبوں کی کہانی میں کتنے
ہی ناقابل توجیہہ واقعات اور سبیلی یا معمر سے بھی زیادہ حیران کن چیزیں
سلنے آتی ہیں۔ جنہیں پڑھ کر یاسن کر آدمی محو سیرت رہ جاتا ہے۔
..... اور اسی قسم کے ناقابل فہم معموں میں سے یہ چینستان بھی ہے
کہ آخر اللہ تعالیٰ نے انوار نبوت و رسالت کی تجلی کا بنانے کے لیے جزیرۃ العرب
کو ہی کیوں منتخب کیا؟ (لطفی ص ۱)

اور کچھ آگے چل کر اہل عرب کا عموماً اور قریش کا خصوصاً حوالہ دیتے ہوئے یہی سوال دہرایا ہے،

بِمَا اخْتَارَهُمُ اللَّهُ لِيَكُونَ لَهُمْ مَصَدَقٌ مِنْ دِينِهِ وَمِنْ بَعْدِهِ

و مِنْ بَعْدِهِ دُونَ سَائِرِ خَلْقِهِ ؟

آخر اللہ تعالیٰ نے باقی ساری مخلوقات کو چھوڑ کر ان لوگوں ہی کو کیوں اس دین کا سرچشمہ اور اس کا مرکز و منبع بنانے کے لئے کیوں چن لیا ؟ (لطفی ص ۳۸)

اسی طرح سید سلیمان ندویؒ نے سیرۃ النبیؐ کی جلد چہارم میں عربوں کی خصوصیات اور خیرالام بننے کی صلاحیت کے عنوان سے ایک باب میں اس سوال کے جواب میں بحث کی ہے۔ موضوع پر تازہ ترین اور بہترین بحث مولانا ابوالحسن علی ندوی کی کتاب ”نبی رحمت“ میں کی گئی ہے۔ جس کے ایک باب کا عنوان ہے: ”محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جزیرۃ العرب میں کیوں مبعوث ہوئے؟“

اس قسم کے سیرت نگاروں نے اپنی اپنی دانش کے مطابق اس انتخاب ربانی کے لیے اہل عرب کے دنیا کی دوسری قوموں سے زیادہ اہل اور مستحق ٹھہرنے کے مختلف اسباب و نکات گنوائے ہیں۔ مگر ان سب میں مشترک چیز اہل عرب کی بعض خاص اخلاقی خوبیوں کا ذکر ہے جس نے ان لوگوں کی فطرت سلیمہ کو مسخ ہونے سے بڑی حد تک محفوظ رکھا۔

یہ سوالات کہ آخر اللہ نے اس وقت کی تمام مہذب اور متقدم قوموں کو چھوڑ کر عرب کے ان گناہ صحرائیوں کو اس منصبِ عظیم کے لئے کیوں چن لیا؟ اگر یہی نبیؐ ہندوؤں، بدھوں، یہودیوں یا چینوں، ایرانیوں اور رومیوں میں سے کسی ایک میں مبعوث کر دیئے جاتے تو کیا وہی نتائج حاصل نہ ہوتے؟ اور ویسا ہی انقلاب برپا ہو جاتا جو اہل عرب کے ذریعہ سے ہوا؟ — جو وقت کی ”بہترین طاقتیں SUPER POWERS“ تھیں کیا ان میں سے کوئی بھی بہترین امت بننے کے فرائض سرانجام نہیں دے سکتی تھی؟ کیے جاسکتے ہیں۔

بظاہر یہ سوالات لغو نظر آتے ہیں اس لئے کہ مصالِح کلیۃً اللہ کا احاطہ انسان کے بس کی بات نہیں ہے۔ اور اسی لیے خود قرآن کریم نے اس مسئلے پر یہ فیصلہ دے دیا ہے: **اللَّهُ أَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ مِصْرًا سَاءَةً (الانعام ۱۲۴)**۔ اللہ سب سے بہتر جانتا ہے کہ اس کا پیغام کہاں اور کس کے حوالے کیا جائے۔

اس اندازہ فکر سے غالباً ایک اور سوال کا جواب سامنے آسکتا ہے اور وہ یہ ہے کہ ہم
مسلمانوں میں آج اللہ کی کتاب اور اس کے آخری نبیؐ سے انتساب اور اسلام اسلام کے
نعرہ ماننے بے حد و حساب کے باوجود ان کے فیوض و برکات سے اکتساب کی علامات کیوں
نایاب ہوتی جا رہی ہیں؟ ————— کیا ہم کہیں عہد جاہلیت کے یہود و ہنود یا روم و
عجم کی طرح بعض ایسی بنیادی اقدار سے تو منحرف نہیں ہو گئے جو نبوت سے اکتساب فیض
کی شرط قرار دیا جاسکتا ہے؟

کہیں فساق کے اخلاق اپنا کہ ہم آیات مندرجہ ذیل کا مصداق تو نہیں بن رہے مثلاً
كالذین اوتوا الکتب من قبل فطال علیہم الامد فقتست

قلوبہم۔ وکثیر منہم فاسقون (الحمدید: ۱۶)

ان لوگوں کی طرح جن کو پہلے کتاب دی گئی تھی پھر ایک لمبی مدت ان پر گزر گئی تو ان
کے دل سخت ہو گئے اور آج ان کی اکثریت فاسقوں کی ہے۔

وما یضل بہ الا الفاسقین ؕ الذین ینقضون عہد اللہ من
بعد میثاقہ و یقطعون ما امر اللہ بہ ان یوصل و یفسدون
فی الارض۔ اولئک ہم الخاسرون (البقرہ: ۲۷)

اور وہ اس سے گمراہ کرتا (بھی) ہے تو ان بد عمل لوگوں کو جو لپکا قول قرار
کیے پیچھے خدا کا عہد توڑ دیتے اور جن تعلقات کے جوڑے رکھنے کو
خدا نے فرمایا ان کو توڑتے ہیں اور زمین میں بد عنوانیاں پھیلاتے ہیں۔ یہی لوگ
(آخر کار) نقصان اٹھائیں گے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ۲۳ سال کی قلیل مدت میں اہل عرب کی جس طرح کایا پلٹ
دی وہ عجائبات تاریخ کا سب سے بڑا عجوبہ ہے۔ عربوں کی اس قلب ماہیت اور تاریخ عالم
کے اس سب سے حیرت انگیز انقلاب کی اہمیت اور عظمت اور اس کے نتائج کی بہ گیری اور
وسعت کو سمجھنے کے لئے سیرت لگانہ ظہور اسلام کے وقت دنیا بھر کی عموماً اور اہل عرب
کی خصوصاً دینی، معاشی، سماجی اور اخلاقی حالت ————— بلکہ ان سب حالتوں کی
ابتدائی تصویر کشی کرتے ہیں۔ ہمارے موضوع کا تعلق اخلاقی حالت سے ہے

عجمی یعنی غیر عرب اقوام کی ناگفتہ بہ اخلاقی حالت کا بیان یوں تو کم و بیش سیرت یا
تاریخ اسلام کی ہر ایک کتاب میں مل جاتا ہے۔ لیکن ان تمام اخلاقی خرابیوں کی اصل اور اساسی

وجہ کا تجزیہ اور تذکرہ جس طرح حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی نے اپنی کتاب حجۃ اللہ البالغہ میں کیا ہے کسی اور کتاب میں اس کی مثال کم ملتی ہے۔ اور اگرچہ حضرت شاہ صاحب نے اپنے زمانے کی اصطلاحات اور دور کے رسم و رواج کی زبان میں بات کی ہے مگر معنایہ بڑی حد تک آج ہم پر منطبق ہوتی نظر آتی ہے، بلکہ اس میں ہماری اخلاقی بیماری کی صحیح تشخیص نظر آتی ہے۔

حضرت دہلوی کا یہ بیان اس لحاظ سے بھی اہم ہے کہ ان کے بعد آنے والے مؤلفین کو اس موضوع (چھٹی صدی مسیحی میں اقوام و مذاہب عالم کی حالت) پر لکھے ہوئے جدید یورپی مطبوعات و تالیفات سے استفادہ اور دائرہ نامے معارف (انسائیکلو پیڈیا) کے ذریعہ سے اپنی معلومات میں اضافے کا موقع ملاحظہ کا شاہ صاحب کے زمانے میں کہیں تک نہ تھا۔ اس لحاظ سے ان کا یہ بیان تاریخ اور فطرت انسانی کے بارے میں ان کے علم لدنی کا منظر معلوم ہوتا ہے۔

یہاں بوجہ قلت وقت حجۃ اللہ البالغہ کے اس اقتباس اور اس کے ترجمے کو حذف کیا ہے جو حجۃ اللہ کے مکتبہ المثنیٰ بغداد کے ایڈیشن کی جلد اول کے صفحہ ۲۲ - ۲۲۰ سے لیا گیا ہے۔ حضرت شاہ صاحب کی اس ساری تحلیل و تفصیل سے جو بات کھل کر سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ تعیش پسندی، تن آسانی اور دنیوی لذائذ و مفاخر کی خاطر تمام اخلاقی قدروں کو پامال کرنے والے لوگوں کے لئے بحیثیت ایک قوم یا ملت کے کیونکہ غیر معمولی افراد کی قلیل تعداد تو ہر جگہ ممکن ہے، نبوت سے اکتساب فیض کے امکانات بہت کم ہوتے ہیں خصوصاً اس درجے کا اکتساب جس سے خیرالام بننے کی صلاحیت پیدا ہو جائے (جیسا کہ صحابہ کرام کی صورت میں ہوا) یہ تو ہرگز ممکن نہیں ہوتا۔ اور شاید یہی وجہ تھی کہ مشیت اللہ نے ان اقوام کو اس منصبِ عظیم کا اہل نہ سمجھ کر نظر انداز کر دیا۔

اب دوسری طرف اگر اہل عرب یعنی ان لوگوں کے قبل از اسلام ردائیل و فضائل پر ایک نظر ڈالیں جو فیضانِ نبوت کی بدولت بہترین امت بن گئے تو ہم دیکھتے ہیں کہ ان کی دینی حالت تو ناگفتہ بہ تھی ہی ان کی اخلاقی حالت بھی سحت دگرگوں تھی۔ اور سیرت نگاروں نے بجا طور سے "شبِ ظلمت"، "عرب کا تاریک دور" اور "فسادِ بروج" وغیرہ عنوانات کے تحت اس کی کیفیت بیان کی ہے۔

یہ لوگ بغض و انتقام، سنگدلی و سفاکی، چوری اور رہزنی، قتل و غارت، بے پرواہی و بدتمیزی، زنا اور فواحش، نسی تعصب و غرور، قمار بازی و شراب نوشی اور دمنتر کشی

سود خودی میں ضرب المثل تھے اور ان سب معائب کی تفصیل سے ادب و تاریخ کی کتابیں بھری پڑی ہیں۔

لیکن سب معائب اور ساری خرابیوں کے باوجود مختلف عوامل نے ان کے اندر بنیادی اور اصولی اخلاق کے احساس کو بالکل مردہ نہیں ہونے دیا تھا۔ وہ محاسن اخلاق سے یکسر معری نہ تھے بلکہ اخلاقی تعلیمات کے قبول کرنے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ ان کے نظام اخلاق کے بدترین اجزا میں بھی اخلاقِ حسنہ کی ایک جھلک موجود تھی۔ شراب نوشی اور قمار بازی فیاضی اور سخاوت کا منظر تھی۔ دینترکشی کا رواج غیرت کا نتیجہ تھا۔ اور قبائلی عصیت دراصل قومی حمیت کی ہی بگڑی ہوئی شکل تھی۔ غیرت، پابندیِ عہد، شجاعت، فیاضی اور صلہ رحمی ان کے معروف اخلاق تھے۔ اسی طرح وہ معروف (مہلانی)، امانت، صدق الحدیث (راست گوئی) اور عفاف (پاکدامنی) کو کرم الخلق اور خصال الخیر میں شمار کرتے تھے۔ اور جس آدمی میں یہ صفات پائی جاتی تھیں اسے توقیر و تکریم کا مستحق سمجھتے تھے۔

یہ درست ہے کہ ان کے ہاں اخلاقِ حسنہ کی بنیاد زیادہ تر شہرت طلبی، حب جاہ اور ناموری پر تھی۔ تاہم ان کے اخلاق و اعمال میں ایسے عناصر و اجزا بھی شامل تھے جنہیں اسلام نے بھی محاسن و مکارم شمار کیا۔ مشہور حدیث: **خياركم في الجاهلية خياركم في الاسلام اذا فقهوا الجاهلية** (ص ۲۵ ص ۹۵) میں اسی "خياركم قبلہ اخلاق" کی طرف اشارہ ہے اس لئے کہ دوسری جگہ خود حدیث میں ہی **خياركم** کی تفسیر **خياركم** کا اسنکما اخلاقاً سے کی گئی ہے (الجوامع الصغیر ۲۵ ص ۹۵)

دورِ جاہلیت کے جن واقعات و حوادث میں اہل عرب خصوصاً اہل مکہ کے اخلاقی محاسن کی ایک واضح جھلک نظر آتی ہے اس کی ایک مثال تاریخ نے **حلف الفضول** کی صورت میں محفوظ رکھی ہے۔ عبداللہ بن جدعان کے مکان پر منعقد ہونے والے اس حلف میں رہیں کی وجہ تسمیہ جو بھی ہو، شامل ہونے والے قریش کے بعض شریف خانوادوں کے نمائندوں نے یہ سوچا تھا کہ وہ مکہ میں ظلم اور نا انصافی کے واقعات کو محض غیر جانبدار مہجر یا خاموش تماشائی کی حیثیت سے نہیں دیکھیں گے۔ بلکہ مظلوم کی عملی اور ٹھوس مدد کیا کریں گے۔ یہ حلف جسے سیرت نگار **اکرام حلف** و **اشرفہ سمع بہ فی العرب** (عربوں کی تاریخ کا سب سے شریفانہ اور بہترین معاہدہ) قرار دیتے ہیں، ابن ہشام کے مطابق اس کے اغراض و

مقاصد یوں تھے:

فتعاقدوا و تعاھدوا الا یجدوا بکۃ مظلوماً من اہلہا
وغیرہم ممن دخلہا من سائر الناس الا کالوامعہ و
کالواعلی من ظلمہ حتی ترد علیہ مظلمتہ۔

(سیرت ابن ہشام ج ۱ ص ۳۴ - ۱۳۳)

انصوں نے عہد و پیمان باندھا کہ مکہ میں متقامی یا غیر متقامی جس آدمی پر بھی
وہ کوئی ظلم ہوتے دیکھیں گے تو وہ سب مل کر مظلوم کی مدد کریں گے۔ اور
ظالم کو مجبور کر دیں گے کہ وہ مظلوم پر کینے کیے ظلم کی پوری پوری تلافی کرے۔

کہا جاسکتا ہے بلکہ کہا گیا ہے کہ اس معاہدے کا دائرہ نفاذ بہت محدود تھا۔ اس کا مقصد صرف حرم مکہ
میں مظالم کی روک تھام اور اس کا فائدہ بھی بالآخر اہل مکہ ہی کو تھا۔ تاکہ حرم کی عزت و حرمت لوگوں کے دلوں سے کم نہ
ہونے پائے۔ (لطیفی ص ۱۴۵)

مگر حضرات! کیا اپنے وطن عزیز کے کسی ایک شہر بلکہ کسی گاؤں میں بھی اس طرح کا کوئی ادارہ یا تنظیم
ہے؟ چلیے اپنے وطن یا شہر کی ساکھ کی خاطر ہی سہی۔ حالانکہ ایسا کرنا ہمارا دینی فریضہ ہے۔

پھر تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ اس معاہدے کے شرکاء نے اپنی بات کو صدق دلی اور
بے لاگ منصفانہ قوت کے ساتھ نافذ بھی کیا تھا (تفصیل کے لیے دیکھیے سیرت ابن کثیر

جلد ۱ ص ۶۲ - ۲۵۹)

آج یو اے او اور سلامتی کونسل تک میں مہذب ترین لوگ انصاف اور حق کو کس طرح
اپنی سیاسی مصلحتوں پر قربان کر دیتے ہیں، اسے سامنے رکھیں تو علف الفضول منعقد کرنے والوں
اخلاقی قوت، ان کی فطرت سلیمہ کا وزن اور ان کے اندر خیر الامم کے ہر اول دستوں میں شمولیت کے شرف
کی اخلاقی استعداد کا اندازہ ہوتا ہے۔

آٹھ دو جہاں خود بھی ربحم ۲۰ سال، عربوں کے اس سب سے شریفانہ معاہدے میں شامل
ہوئے تھے۔ آپ اس معاہدے سے بہت خوش تھے اور بعثت کے بعد بھی آپ نے اس کی تعریف و
تثمین کی۔

الغرض اگرچہ اہل عرب کی خوبیاں بھی جاہلی زمانہ کے خس و خاشاک میں دب کر رہ گئی تھیں
تاہم یہ ثابت ہے کہ ان میں بعض نہایت اچھے اخلاقی اوصاف موجود تھے۔ کم از کم حفاظتِ حق
اور اعانتِ مظلوم کی حد تک تو آج کی متمدن ترین اقوام بھی ابھی تک عرب جاہلیت سے بھی کچھ سیکھیں۔

ان کی بنا پر حضرت خدیجہؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ان الفاظ میں تسلی دی تھی :
 کلا واللہ ! ما یخزیک اللہ ابدًا انک لتصل الرحم وتحمل الکلی
 وتکسب المعدوم وتقوی الضیف وتعین علی نوائب الحق -

ترجمہ: جو ابراہیم بناری ص ۴۴

ہرگز نہیں بخدا اللہ تعالیٰ آپ کو کبھی رسوا نہیں کرے گا آپ رشتہ داری کا پاس لحاظ کرتے
 ہیں، دوسروں کا بوجھ ہلکا کرتے ہیں، محتاجوں کے کام آتے ہیں، مہمان نواز ہیں اور
 راہ حق کی تکلیفوں اور مصیبتوں میں مدد کرتے ہیں۔

مردوں میں سب سے پہلے ایمان لانے والے حضرت ابوبکر صدیقؓ تھے ان کے بارے میں بھی
 سیرت نگار لکھتے ہیں :

..... کان (ابوبکرؓ)

مرجلًا تاجرًا ذا خلق و معروف

..... حضرت ابوبکرؓ

یا اخلاق اور نیک دل تاجر تھے۔

حضرت ابوبکر صدیقؓ کے قبل اسلام اخلاقی محاسن کی ایک گواہی ابن الدغنه کے بیان میں
 ملتی ہے۔ یہ واقعہ یوں ہے کہ قریش کی ایذا رسانی سے تنگ آکر ابوبکر صدیقؓ بھی آنحضرت صلی اللہ
 علیہ وسلم سے اجازت لے کر غالباً حبشہ کی طرف ہجرت کے لئے روانہ ہوئے۔ مکہ مکرمہ سے دو
 ایک دن کے فاصلے پر انھیں ابن الدغنه ملا (اصل نام سبیعہ بن ربیع تھا اور وہ اس وقت
 احابیش کا سردار تھا، جو ایک مجموعہ قبائل تھا) اس نے پوچھا این یا ابوبکر۔ کہ تم کہاں چلے؟
 جب انھوں نے بتایا:

انصرحنی قومی فا ذونی و ضیقوا علی۔

کہ میری قوم نے مجھے نکلنے پر مجبور کر دیا ہے۔ انھوں نے مجھے بہت ہی اذیت
 پہنچائی اور سخت مصیبت میں ڈال دیا۔

تو ابن الدغنه نے کہا :

ولیمہ؛ فواللہ انک لتزین العشیوۃ و تعین علی نوائب
 الحق و تفعل المعروف و تکسب المعدوم و ارجع فانت فی جوارہ

داہن ہشام ج ۱ ص ۴۳ - ۴۲

یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ سجداً آپ تو قبیلہ کے مایہ ناز فرزند ہیں آپ مصیبت
 زندگان کی مدد کرتے ہیں نیکی اور سہلائی کے کاموں میں حصہ لیتے ہیں اور
 محتاجوں کے کام آتے ہیں۔ واپس چلیے میں آپ کی حفاظت کا ذمہ لیتا ہوں۔
 ہم ان دو مثالوں پر اکتفا کرتے ہیں ورنہ تمام کافین اولین صحابہ کرام میں قبل
 از اسلام ہی کسی نہ کسی خاص اخلاقی خوبی کے وجود پر دلالت کرنے والے واقعات مل
 سکتے ہیں۔

اور شاید اہل عرب کی محاسن شناسی اور محاسن پذیرسی کی اس صلاحیت اور اعمال و اخلاق
 میں حسن و جمال کی ستائش کی اہلیت کی بنا پر ہی ایسا ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب پاک کے
 محاسن و فضائل کے جمال بے مثال میں سے آپ کے ہم وطنوں کو سب سے پہلے آپ کے
 "خلق عظیم" ہی کی وہ جھلک دکھائی جس نے ان کے دل موہ لئے تھے۔ آنحضرتؐ کا قبل از بعثت
 ہی اپنے نام کے بجائے الصادق اور الامین کے لقب سے پکارا جانا تو سیرت کے مبتدی طالب علم
 کو بھی معلوم ہے (عیون الاثر ج ۱ ص ۷۴) مگر حقیقت یہ ہے کہ حضورؐ کے صاحب خلق عظیم
 ہونے کا تعلق بھی آپ کی قبل از بعثت زندگی سے ہے۔

تفصیل اس اجمال کی یوں ہے کہ اخلاقیات نبوی کے کسی بھی بیان میں آیت کریمہ
 وانک لعلی خلق عظیم

دکھ آپ کی اخلاقی عظمت تو یقیناً ایک مسلم امر ہے، کو کورس کے بند کی حیثیت حاصل ہے
 اس آیت سے اور اس کی تفسیر میں حضرت عائشہ سے مروی مشہور حدیث:

کان خلقه القرآن

دکھ آپ کا اخلاق تو قرآن تھا، سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرتؐ کے اخلاق کی
 تشکیل اور مکارم کی تکمیل قرآن کریم کے ذریعے اور اس کے مطابق ہوئی۔ مگر حضرات!
 قابل غور بات یہ ہے کہ یہ آیت کریمہ وانک لعلی خلق عظیم سورہ القلم کی چوتھی آیت ہے
 اور اس بات پر قریباً سب اہل علم کا اتفاق ہے کہ سورہ القلم بلحاظ نزول قرآن کریم کی
 دوسری یعنی بالکل ابتدائی دور کی مکی سورت ہے اور یہ آیت مبارکہ (وانک لعلی خلق عظیم)
 آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کی صداقت پر سب سے پہلی عقلی دلیل ہے جو قرآن کریم نے
 پیش کی ہے۔

اس مضمون کی دوسری آیات جو سورۃ یونس اور سورۃ عنکبوت میں آئی ہیں وہ بھی مکی

دور کی ہیں مگر بعد کی ہیں)

قرآن حکیم کا آپ کے نخلق عظیم کو بطور دلیل نبوت پیش کرنے سے مدحیہ پہلو کے علاوہ چند مزید امور سامنے آتے ہیں از الجملہ :

۱ - اولاً یہ کہ - اہل مکہ رجو جاہلیت عرب کے رذائل و فضائل کے نمائندہ قرار دیے جاسکتے ہیں، میں اتنی اخلاقی حس ضرور تھی کہ وہ اخلاقی عظمت پر مبنی اس استدلال سے قائل کیے جاسکتے تھے۔ اور یہی وجہ ہے کہ آنحضرت کے اخلاق عالیہ کی طرف یہ بلیغ اشارہ کرنے کے بعد اسی صورت کی اگلی آیات (۱۰ تا ۱۴) میں یہ بیان ہوا ہے کہ جو آدمی مجموعہ رذائل ہو، چاہے وہ کتنا ہی صاحب جاہ و مال ہو اُسے پہنچ سمجھو۔ فرمایا :

فلا قطع کل حلاف مہینہ ہمار، متشاء بنہینمہ مناع للخیر
معتد اثیمہ عتل بعد ذالک زنیم ان کان ذامال و بنین ہ
ر القلم ۱۴ - ۱۰)

ہرگز نہ دبو اس شخص سے جو قسمیں کھانے والا، پست فطرت، طعنہ جو، چغل نور مائع خیر، دھاندلی باز، بد عمل، جفا کار اور ساتھ ہی بداصل بھی ہے۔ محض اس بنا پر (چوہدری بنا پھرتا ہے) کہ بہت مال و اولاد رکھتا ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ مخاطبین "نخلق عظیم" اور ان آیات میں بیان کردہ رذائل تسعہ کے تغایر اور تباہی کو (CONTRAST) سمجھنے کی اہلیت رکھتے تھے۔

۲ - ثانیاً یہ کہ - اس آیت (وانک لعلی خلق عظیم) کے مضمون اور اس کے زمانہ نزول کو سامنے رکھنے سے یہ بات قطعی طور پر ثابت ہو جاتی ہے کہ آنحضرت قبل از بعثت ہی صاحب خلق عظیم تھے۔

محمد عزت دروزہ اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ :

و هذا یعنی المخلق العظیم الذی کان علیہ النبی علیہ السلام و
ستحق لهذا الشاء الربانی، قد کان تعلیٰ بہ قبل البعثۃ
و هو الذی آھلہ للاصطفاء والمہمۃ العظمی واللہ اعلم
بحیث یجعل من سالتہ (التفسیر الحدیث ج ۱ ص ۴۵)

اور یہ نخلق عظیم جس کی بنا پر آنحضرت اس شانے ربانی کے مستحق ٹھہرے، اس سے آپ یقیناً قبل از بعثت آراستہ ہو چکے تھے۔ بلکہ اسی چیز نے آپ کو اس برگزیدگی

اور اس منصبِ عظیم کا اہل بنا دیا تھا اور یوں تو اللہ تعالیٰ ہی خوب جانتا ہے کہ اس کی رسالت کے لیے کون اور کتنا موزوں ہے ؟ یوں لگتا ہے کہ قرآن کریم نے آنحضرتؐ کے خلق کی تشکیل یا تکمیل نہیں کی بلکہ اسے تدریجاً نمودار UNFOLD کیا ہے۔ قرآن و سنت میں اخلاقیات پر جو کچھ بھی بیان ہوا ہے وہ صرف آنحضرتؐ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلقِ عظیم کے خدو سخاں فی مملکت تصویر کشی ہے۔ اور اسی لیے آپؐ کی ذات گرامی کو امت کے لیے "اسوۂ حسنہ" قرار دیا۔ خود اسوہ کے لفظ میں عمل اور کمال کی موجودگی کا مفہوم پایا جاتا ہے۔

۳۔ - ثالثاً یہ کہ — اتنی بات تو ہم سب کو معلوم ہے کہ نبوتِ محمدیؐ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی صداقت پر جملہ عقلی و نقلی دلائل کی تبلیغ و اشاعت مسلمانوں پر فرض کفایہ ہے۔ اس لیے عہد رسالت اور قرن اول کی طرح آج بھی دنیا کے سامنے صرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صرف وہی معجزوں کو پیش کرنا کافی ہے۔ ایک قرآن دوسرے اخلاقِ انبیاءؑ۔ ابتداءً اسلام میں جو بھی مسلمان ہوا وہ یا قرآن سن کر متاثر ہوا، یا نبیؐ کا خلقِ عظیم دیکھ کر۔

اہل مکہ خلقِ محمدیؐ کا مشاہدہ کر سکتے تھے۔ مابعد النبیؐ ادوار میں دنیا کو اس کا مشاہدہ کرانے کی ذمہ داری امت پر ہے۔ اس لحاظ سے اس آیت مبارکہ لانگ لعلی خلقِ عظیم، کا تقاضا یہ ہے کہ ایک طرف اخلاقیات نبویؐ سے متصف اور متخلق ہونا ہر مسلمان پر واجب استطاعت، فرض عین ہے اور دوسری طرف اخلاقیات نبویؐ کا مطالعہ اور اس کی تبلیغ و اشاعت سب مسلمانوں پر فرض کفایہ ہے۔

۴۔ - رابعاً یہ کہ — آج بھی اسلام کی تبلیغ ان ہی لوگوں میں اور ان ہی قوموں میں زیادہ مفید اور موثر ہوگی جن کی اخلاقی حس زندہ ہے۔ نیز یہ کہ اسلام کی اشاعت کے لیے اس کے غلبہ کا دور ثانی لانے کے لیے اور فیوضِ زہرہ کات نبوت کو پھیلانے کے لیے صرف اور صرف گرمی گشتار، پروپیگنڈا اور اشتہار یا محض مذاکرے اور سینارہ نہیں، بلکہ اس کے ساتھ سب کے مشاہدہ اور تجربہ میں آنے والی زہرہ دست اخلاقی قوت درکار ہوگی۔ — اسلام جہاں بھی پہنچا ہے زیادہ تر صلحاً امت کے اخلاق و کردار کی بدولت پہنچا ہے۔

یہ بات کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ابتداءً سے ہی صرف اخلاقی تطریباتی تعلیم نہیں بلکہ عملی اخلاق پر زور دیا۔ اور توجید و رسالت، آخرت پر ایمان کی طرح محاسن اخلاق سے عملاً مزین ہونا مسلمانوں کی ایک لازمی خصوصیت — یا بالفاظِ دیگر نبوت سے

اَلکتابِ فیضِ کِی علامت قرار دیا ایسی ہے کہ یوں تو قرآن کریم کی متعدد آیات اور عہد رسالت کے بکثرت واقعات اور صحابہ کرام کے کارنامہ نامے حیات میں اس کا مشاہدہ کیا جا سکتا ہے۔ مگر ابتدائی دور کو پیش نظر رکھتے ہوئے صرف دو واقعات کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے۔

۱۔ حضرت ابوذر غفاریؓ پہلے پانچ یا سات مسلمانوں میں سے ہیں انہوں نے جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اعلان نبوت کے بارے میں سنا تو اپنے بھائی کو دریا یافت احوال کے لیے مکہ بھیجا۔ تو اس نے واپس جا کر آنحضرت کے بارے میں بھائی کو یہ رپورٹ دی تھی:

انه يا صر بالمعروف و ينهى عن المنكر و يامر بكارم

الاخلاق (طبقات ج ۴ ص ۲۲۴)

وہ بھلائی کا حکم دیتا، برائیوں سے منع کرتا ہے اور مکارم اخلاق کا حکم دیتا ہے۔

یہاں اخلاق کے ضمن میں "تعلیم، تلقین یا تبلیغ وغیرہ کے بجائے امر کا لفظ قابل غور ہے۔ اخلاق کا تعلق محض فکر و دانش سے نہیں قوت عمل سے ہے۔ یہ کچھ پڑھنے کی مشق نہیں بلکہ کچھ کرنے کی تربیت کا نام ہے۔

۲۔ ہجرتِ حبشہ نبوی میں ہوئی۔ نجاشی کے دربار میں حضرت جعفر بن ابوطالب نے اپنے معروف خطبہ میں جس طرح جاہلیت کی تصویر کشی کرنے کے ساتھ اسلام کا تعارف کرایا ہے اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ اخلاقی تربیت اور اصلاح عقائد کا کام ساتھ ساتھ اور ابتدائی سے شروع ہو گیا تھا بلکہ اس سے یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ نبوت سے اکتاب فیض کے بعد مسلمانوں کے عقائد و افکار کے ساتھ ان کے اعمال اور اخلاق میں کیا تبدیلی آجاتی تھی۔ اس خطبہ کے جتنے فقرے قابل غور ہیں۔ کہا:

ايها الملك كنا قوما اهل جاهلية نعبد الاصنام و

ناكل الميتة و ناتي الفواحش و نقطع الارحام و نسئ الجوار و

و يأكل القوي منا الضعيف

. حتى بعث الله رسولا منا عرف

نسبه و صدقه و امانته و عفافه

فدعانا الى الله لنوحده و نعبده و لا نشرك به شيئا

. و يا مرنا لصدیق الحدیث و اداء

الامانة وصله الرحم وحسن الجوار والكف عن المحارم
والدماء ونهاها عن الفواحش وقوى النور واكل مال اليتيم
..... فآمنابه

واتبعناه وحرمانا حرم علينا
وحللنا ما احل لنا - (سیرت ابن کثیر ج ۲ ص ۲۱ - ۱۸ ملخصاً)
اے بادشاہ! ہم پروردہ جاہلیت قوم تھے، بتوں کو پوجتے، مردار کھاتے
اور بے حیائیوں میں مبتلا تھے رشتہ داروں کا حق مارتے تھے اور یتیموں
کو دکھ دیتے تھے اور ہم میں سے جو طاقتور ہوتا وہ کمزور کو بھارتا کھا جاتا۔
..... پھر اللہ تعالیٰ نے ہم میں ایک رسول بھیجا جس کے
خاندان حسب و نسب اور جس کی سچائی، امانت اور پاکبازی سے ہم پہلے

سے واقف تھے
انہوں نے ہم کو ایک اللہ پر ایمان لانے اور صرف اسی کی عبادت کرنے کی دعوت
دی اور انہوں نے ہم کو سچ بولنے، امانت ادا
کرنے، رشتہ داروں کے حقوق کا خیال رکھنے، پڑوسی سے حسن سلوک کرنے،
نا جائز اور حرام باتوں اور خونریزی سے پرہیز کا حکم دیا بے حیائی کے کاموں،
جھوٹ بولنے اور یتیم کا مال کھانے سے منع فرمایا
بس ہم ان پر ایمان لائے اور ان کی پیروی کی
جو انہوں نے حرام قرار دیا اسے حرام مانا اور جو انہوں نے حلال بتایا اس
کو حلال تسلیم کیا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مکارم اخلاق کی اہمیت یوں بھی واضح فرمائی کہ بعض دفعہ
آپ زمانہ جاہلیت کے اصحاب مکارم و محاسن کی قدر دانی فرماتے اور ان کے اخلاقی کردار کو
بمنظر استحسان دیکھتے تھے۔

- ۱۔ عبداللہ بن جردعان ربانی (حلف الفضول) کو آپ نے کئی دفعہ تعریف بھرے الفاظ
سے یاد فرمایا۔ حالانکہ ساتھ یہ بھی فرمادیا کہ جس آدمی نے (ایمان لاکر) زندگی میں ایک
دفعہ بھی: اللھم اغفر لی خطیئتی یوم الدین نہ کہا ہو اس کی مغفرت کیسے ہو؟
- ۲۔ اسی قسم کا ایک واقعہ حاتم طائی کی بیٹی کا ہے وہ اسیر ہو کر جنگی قیدیوں کے ساتھ آئی

مختی - اُس نے آنحضرت کی خدمت میں یہ درخواست پیش کی :

یا محمد! هلک الوالد و غاب الوافد - فان رأیتان تخلی
عنا فلا تشمت فی احیاء العزب فانی ابنة نسید قومی وان ابی
کان یحیی الذمار و یفک المعانی و لیشبع الجائع و یکسو العاری
و لیقوی الضعیف و یطعم الطعام و یفرج عن المکروب و لم یرد
طالب حاجة قط
انا بنت حاتم طیئ -

فقال رسول الله صلی الله علیه وسلم :

یا جارية هذا صفتہ المؤمنین حقاً ولو کان ابوک اسلامياً
لترحمنا علیه - نخلوا عنها ! فان اباها کان یحب مکارم
الاخلاق والله یحب مکارم الاخلاق

حضور میرا باپ زمانہ فدیہ گزارہ - اگر مناسب جاتیں تو مجھے رہا کر دیں اور قبائل
عرب میں میری بے عزتی نہ ہونے دیں میں اپنے قبیلے کے سردار کی بیٹی ہوں -
میرا باپ لوگوں کو مصیبت سے نکالتا تھا وہ نیک شہرت کا مالک تھا، مہمان نوازی
کرتا تھا اور بھوکوں تنگوں کی ضروریات پوری کرتا تھا - اور اس نے کبھی کسی
حاجت مند کو خالی نہیں جانے دیا -

میں حاتم طائی کی بیٹی ہوں

تو آنحضرت صلی الله علیه وسلم نے فرمایا :

بچی ! یہ باتیں (جو تو نے بیان کیں) یہ تو ٹھیک ٹھیک اہل ایمان کی صفات ہیں -
اگر تیرا باپ مسلمان ہوتا تو ہم اس کے لئے دعائے رحمت بھی مانگتے - پھر حکم دیا
اسے رہا کر دیا جائے - کیونکہ اس کا باپ مکارم اخلاق کو پسند کرتا تھا - اور
اللہ تعالیٰ بھی مکارم اخلاق کو پسند فرماتا ہے -

یہ سن کر ایک صحابی ابو بردہ بن نیار کھڑے ہوئے اور سوال کیا - یا رسول اللہ کیا
مکارم اخلاق آپ کو - اس قدر پسند ہیں تو آپ نے فرمایا :

والذی نفسی بیدہ لایین حل احد الجنة الا بحسن الخلق -
(سیرۃ ابن کثیر ج ۴ ص ۱۳۲ ملخصاً)

قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضے میں میری جان ہے کہ کوئی ایک آدمی بھی جنت میں
تُحسَن عملی کے بغیر نہیں جائے گا۔

جب بھی ہم مکارم اخلاق اور اخلاقیات نبوی کی بات کرتے ہیں تو اس وقت ہمیشہ تعمیر کردار
کا مثبت پہلو مراد ہوتا ہے۔ اس درجہ کے حصول کے لیے منفی پہلو یعنی رذائل سے اجتناب ضروری
ہے۔ سزا اور مذمت و ملامت سے بچنا ایک بات ہے مگر انعام اور مدح و ثناء کا استفادہ ٹھہرنا
عظیم تر بات ہے۔ قرآن کریم میں تعمیر اخلاق کے ان دو مراحل کو ہی "اجتناب کبائر" اور "مسابقت
الی الخیرات" سے تعبیر کیا گیا ہے۔

۱۔ ان تجتنبوا کبائر ما تنہون عنہ فکفو عنکم سیئاتکم وندخلکم
من حلالکم یماً

یعنی جن باتوں سے تم کو منع کیا جاتا ہے اگر تم ان میں سے بڑے بڑے گناہوں سے
بچتے رہو گے تو تمہارے چھوٹے موٹے قصور محو کر دیں گے اور تم کو مقام عزت
میں جگہ دیں گے۔

۲۔ وکل وجهة هو موليها فاستبقوا الخیرات

اور ہر ایک قوم کا ایک مرکز توجہ (مطہج نظر) ہوتا ہے جس کی طرف وہ رخ کرتی
ہے۔ سو تم نیک کاموں میں سبقت لے جانے کی تگ و دو کرو۔

سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اخلاق
کا تربیت اور تکمیل کے لئے اسی ترتیب اور تدریج کو ملحوظ رکھا۔ آپ نے سب سے پہلے ان اصولی اور
بنیادی اخلاق پر زور دیا جو کم و بیش ہر معاشرے کے سلیم الفطرت افراد میں پائے جاتے ہیں۔
ایسے افراد میں اسلام کی طرف ایک فطری کشش موجود ہوتی ہے۔ اور ایسے شخص میں نبوت سے
اکتاب فیض کی ایک شرط یا اہلیت اور فطری استعداد موجود ہوتی ہے۔

دوسرے درجے پر وہ لوگ آئے جن میں پہلے سے یہ شرط یا وصف اخلاق عملاً موجود نہ
تھا۔ نبی سے تعلق ایمان قائم ہو جانے یعنی اسلام قبول کر لیا یا اسلام کا دعویٰ کرنے کے ساتھ ہی
یہ ضروری قرار دیا گیا کہ اب وہ کم از کم ان بنیادی اور اصولی اخلاق کی پابندی لازماً اختیار
کریں۔ اسلام لانے کے بعد مسلمان کھلانے کے بعد بھی اخلاق کا روز بروز بہتر نہ ہوتے جانا
اگر مطلق ایمان کے فقدان کا نہیں تو کم از کم نبوت کے فیض سے محرومی کا نشان ضرور

ہے۔

آنکہ از صدق و امانت بے خبر اور تمہید رسالت بے خبر

کار او گفتار بے کیف عمل اور نیام علم بے سیف عمل

لذت ایمان فراید در عمل مردہ آں ایمان کہ ناید در عمل (اقبال)

نبوت سے اکتسابِ فیض کا بلند ترین مرتبہ مکارمِ اخلاق ہیں جنہیں مقصودِ بعثتِ نبوی کہا گیا ہے۔

حدیث شریف ہے :

بعثتٌ لاتمم مکارمِ الاخلاق

(رونی روایہ) ومحاسن الاعمال

میں مکارمِ الاخلاق کو ایسا محاسنِ الاعمال کو، مکمل کرنے کے لیے بھیجا گیا ہوں۔

مسلمان ہوتے ہوئے بھی مکارمِ اخلاق کے اعلا درجے تک نہ پہنچ سکتا فیضِ نبوت سے

یکسر محرومی نہ سہی تاکم نصیبی کی علامت ضرور ہے۔ علامہ اقبال نے رموزِ بے خودی میں گداگر کے واقعہ میں اپنے باپ کی نصیحت کا ذکر کرتے ہوئے کہا :

آنکہ بہت تاب از سر انگشتش دو نیم رحمت او عام و اخلاقش عظیم

از بہارش زنگ و بوباید گرفت بہرہ از خلق او باید گرفت

ایک حدیث میں (جس کا متن اس وقت مستحضر نہیں) آیا ہے کہ اگر تم اللہ کے مال اپنے

درجہ و مرتبہ معلوم کرنا چاہو تو بس یہ دیکھ لو کہ تمہارے دل میں اللہ کا درجہ کیا ہے ؟

ہی اس کے مال تمہارا درجہ ہے۔ اسی طرح اگر یہ دیکھنا ہو کہ محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم

کے مال ہمارا درجہ کیا ہے ؟ کیونکہ مصطفیٰ سے بعد ہی تو بولہبی ہے، تو یہ دیکھ لینا چاہیے

کہ ہم نے اخلاقیاتِ نبوی سے کتنا حصہ پایا ہے ؟ اس لیے کہ خود مولائے عل نے فرمایا :

ان احبکم الیّ واقربکم منی یوم القیامۃ احسنکم اخلاقاً و

ان ابغضکم الیّ و البعدکم منی یوم القیامۃ مساویکم اخلاقاً

(مشکوٰۃ طبع دمشق ص ۹۷)

قیامت کے دن تم میں سے مجھے سب سے زیادہ پسند اور میرے زیادہ قریب وہ

ہوں گے جو تم میں سے بلحاظِ اخلاق زیادہ اچھے ہوں گے اور قیامت کے دن تم میں

سے مجھے سب سے زیادہ ناپسند اور مجھ سے زیادہ دور وہ ہوں گے جو تم میں

سے بلحاظِ اخلاق زیادہ برے ہوں گے۔

مفتاح المراجع

اس مقالے کی تیاری میں جو کتابیں سامنے تھیں ان میں سے اکثر کا ذکر متن میں حوالہ دیتے وقت مختصر نام کے ساتھ کیا گیا۔ اس کی وضاحت ذیل میں کی گئی ہے۔ کتابوں کے نام اسی ترتیب سے ہیں جس طرح مقالہ میں وہ وارد ہوئے ہیں۔ قرآن کریم کے حوالے سورۃ کا نام آیت نمبر کے ساتھ دیے ہیں۔

لطفی، لطفی جمعہ کی کتاب: "ثورة الاسلام و لطل الانبياء" طبع قاہرہ ۱۹۵۹ء
 نبی رحمت: مولانا ابوالحسن علی ندوی کی تالیف کا اردو ترجمہ (طبع لکھنؤ ۱۹۷۸ء)
 حجة اللہ البالغہ: حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی کی مشہور تصنیف۔ ایڈیشن مکتبہ المشنی
 بغداد سنہ ندارد

الجامع الصغير: مؤلفہ جلال الدین سیوطی طبع مصر سنہ ندارد
 ابن ہشام: سیرت رسول اللہ تصنیف عبدالملک بن ہشام طبع مصر تحقیق السفا
 وغیرہ (۱۹۵۵ء)

جواہر: جواہر البخاری: تلخیص بخاری از مصطفیٰ عمارہ طبع مصر ۱۳۷۶ھ
 - ۲۲ -
 التفسیر الحدیث: تالیف محمد عزت دروزہ۔ طبع مصر ۱۹۶۲ء
 طبقات: الطبقات الکبریٰ تالیف محمد بن سعد طبع بیروت ۱۹۷۰ء
 ابن کثیر: السیرۃ النبویہ تالیف حافظ ابن کثیر تحقیق مصطفیٰ عبدالواحد طبع بیروت ۱۹۷۶ء
 رموز: رموز بے خودی (ثنوی) علامہ اقبال طبع لاہور سنہ ندارد
 مشکوٰۃ: مشکوٰۃ المصابیح تالیف ابن الخطیب تبریزی طبع دمشق ۱۹۶۱ء
 - ۲۳ - صور: صور من حیاة الرسول تالیف امین درویدار طبع مصر ۱۹۵۳ء
 - ۲۴ - عیون الاثر: ابن سید الناس کی سیرۃ پر تالیف طبع بیروت ۱۹۷۸ء

اجتماعی عدل

جناب محترم ڈاکٹر سعید معین الحق

اخلاقیات نبوی کا مطالعہ مختلف جہتوں سے کیا جاسکتا ہے اور کیا جانا چاہیے، اور ہر جہت کے متعدد پہلو ہیں۔ ان میں سے ہر ایک اپنے مفہوم و معنی کے لحاظ سے نیران اثرات کی روشنی میں جو اسلامی معاشرے کی تشکیل و ترقی میں نمایاں ہوتے رہے ہیں یہ موضوع اس قدر وسیع ہے کہ اس کا مختصر بیان بھی ایک ایسے مقالے میں جس کو پیش کرنے کے لیے وقت محدود ہو، سمونا ممکن نہیں، اس لیے اس مقالے میں صرف چند ان خصوصیات اور واقعات کی نشان دہی کی گئی ہے جن سے اسلام میں اجتماعی عدل اور مساوات کے تصور اور اس کی عملی شکل کا تاریخی پس منظر میں اندازہ لگانے کے سلسلے میں مدد مل سکتی ہے۔ اسلام تاریخ عالم کا عظیم ترین انقلاب ہے۔ اس نظریہ کی صداقت ثابت کرنے کے لیے وسیع پیمانے پر شواہد موجود ہیں لیکن ہم اس موقع پر صرف چند واقعات کی طرف اشارہ کریں گے۔ اس انقلاب عظیم کا صحیح اندازہ لگانے کے لیے ہمیں معاشری اور فکری تاریخ کے بعض پہلوؤں کا غور مطالعہ کرنا ہوگا، خاص طور پر ان خامیوں کا جو کی جڑیں لعنت نبوی کے وقت معاشرے میں اتنی گہری اور مضبوط ہو گئی تھیں کہ اخلاقی معیارات عملی طور پر تقریباً ختم ہو چکے تھے۔

اس بحث کے سلسلے میں ایک اہم مسئلہ انسانی مساوات اور اجتماعی عدل کا ہے، چونکہ نسل انسانی ایک ہی باپ کی اولاد سے وجود میں آئی تھی یہ ظاہر ہے کہ ابتدائی دور میں سب انسان، حقوق اور حیثیت کے لحاظ سے برابر ہی رہے ہوں گے، لیکن زمانہ ماقبل تاریخ کے طویل ادوار میں ہمیں نہیں معلوم کہ وہ کیا عوامل اور محرکات تھے جن کے باعث انسان، غریب اور امیر اور کمزور اور طاقتور لوگوں کے طبقوں میں تقسیم ہوتا گیا۔ بہر حال تاریخی معلومات کی روشنی میں جب سے ہمیں انسانی زندگی کی حالت نظر آئی شروع ہوتی ہے تو یہ طبقاتی تقسیم صاف اور نمایاں طور پر دکھائی دیتی ہے۔ انیشنٹ لاء (ANCIENT LAW) کے مشہور مصنف میں

(MAINE) کی اس رائے سے اتفاق کیا جاسکتا ہے کہ غلامی کی ابتدا انسان کی اس پیدائشی اور عصبی نخصت کا نتیجہ ہے کہ وہ دوسرے کی قوت اور صلاحیت کو اپنے آرام اور فائدے کے لیے استعمال کرنا

چاہتا ہے۔ اور اس میں بھی شک نہیں کہ تمدن کی ترقی کے ساتھ ساتھ جہاں ایک طرف عیاشی آرام طلبی، اقتدار کی ہوس اور خود غرضی پھیلتی جاتی ہے، دوسری طرف مساوات انسانی کا تخیل اور اس کو قائم کرنے کی کوششیں کم سے کم تر ہوتی جاتی ہیں۔

مختصراً یہ کہا جاسکتا ہے کہ قدیم متمدن اقوام کی معاشری زندگی پر ایک بدنامہ داغ طبقاتی تقسیم تھی۔ اور اس پہلو کا بدترین مظاہرہ غلامی اور اس کی وسیع پیمانے پر تجارت کی شکل میں موجود تھا۔ غلاموں کو جانوروں کی طرح رکھا جاتا تھا۔ وہ اپنے آقاؤں کی دیگر منقولہ جائیداد کی طرح ملکیت سمجھے جاتے تھے اور ان کو (آقاؤں کو) ہر طرح کا، حتیٰ کہ جان لینے کا بھی حق تھا۔ طبقاتی تقسیم کا اثر امیر اور غریب طبقوں کی حیثیت اور اہل اقتدار اور عوام کی زندگیوں کے نمایاں فرق میں بھی نظر آتا تھا۔ سلطنتِ روم میں ایک طبقہ خصوصی اختیارات اور حقوق کا مالک تھا اور عام لوگ ان سے محروم تھے اور پلبین (PLEBEIAN) کہلاتے تھے، اور ہمارا بڑا صغیر تو اس لحاظ سے سب سے زیادہ طبقاتی تقسیم کا شکار تھا۔ یہاں ذات کی تقسیم انتہائی حد کو پہنچ گئی تھی اور معاشرے میں اس کی بڑیں اس قدر گہری ہو گئی تھیں کہ آج تک وہی کیفیت موجود ہے اور شدت ذات کے لوگ اچھوت سمجھے جاتے ہیں۔ ان خطرناک طبقاتی تقسیموں نے مختلف علاقوں کے معاشروں کو مساوات انسانی کے تخیل بلکہ ذکر تک سے محروم کر دیا تھا، اور یہ محسوس ہوتا تھا کہ طبقاتی تقسیم کا سلسلہ کبھی ختم نہ ہوگا، بلکہ بڑھتا ہی چلا جائے گا۔

اسلام جو انقلاب لایا اس کی بعض خصوصیات کی طرف اشارہ کرنے سے پہلے یہ نکتہ واضح کرنا ضروری ہے کہ اگرچہ اصحابِ سیر اور مسلم مورخین نے زمانہ جاہلیت کے عرب معاشرے کی خرابیاں اور نقائص تفصیل کے ساتھ بیان کی ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ رسول اکرمؐ کی بعثت اصلاحِ عالم کے لیے تھی۔

وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا رَحْمَةً لِّلْعَالَمِينَ ■

(الانبیاء ۱۰۷)

سے صاف ظاہر ہے۔ تاریخ عالم کی بعض تحریکات و عوامل کا گہرا اور تحقیقی مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان اقوام کے علاوہ جنہوں نے دین اسلام قبول کیا، دیگر اقوام نے بھی اسلام کے لئے ہونے بعض انقلابی اصولوں کو تسلیم کیا ہے۔ تاریخ کے طلبہ جانتے ہیں کہ انسانی حقوق کے تین بنیادی اصولوں یعنی اخوت، مساوات اور آزادی کا مطالبہ یورپ میں فرانسیسی انقلاب یعنی ۱۷۸۹ء کے بعد کیا گیا، لیکن اسلام ان اصولوں کو ساتویں صدی میں منو چکا تھا۔

القلابِ اسلامی

اب ہم اسلامی انقلاب کے چند پہلوؤں کی طرف اشارہ کرتے ہیں، ان کے ذکر سے پہلے یہ واضح کرنا نہایت ضروری ہے کہ اس عظیم انقلاب کے عظیم المرتبت قائد کی منفرد خصوصیت یہ تھی کہ جس اصول کی تعلیم دی جاتی تھی اس پر بدرجہ اتم خود آنحضرت اپنی نجاتی اور اجتماعی زندگی میں عمل فرماتے تھے۔ حضور کے اخلاقِ کریمہ کی تفصیلات ہمیں حدیث اور تاریخ کی کتابوں میں ملتی ہیں لیکن سب سے زیادہ اور نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ آپ نے اپنی زندگی کی بنیاد فقر پر رکھی اور ہر وہ زحمت برداشت کی جس کا غریب آدمی کو سامنا کرنا پڑتا ہے۔ وسیع فتوحات کے بعد بھی جب غنیمت کا مال بکثرت مدینہ آتا تھا آپ نے اپنے اصولوں سے ذرہ برابر انحراف نہیں کیا، حکمرانی کے لوازمات یعنی تخت و تاج، رہائشی محل اور قیمتی پوشاک وغیرہ تو کیا آپ نے اپنے لیے خصوصی نشست کا رواج بھی نہیں ڈالا۔

اسلام کی سب سے پہلی اور بنیادی تعلیم عقیدہ توحید پر مبنی تھی۔ ہم اس کے متعلق چند امور کا ذکر کرنا چاہتے ہیں۔ اس کے دینی پہلو پر یعنی شرک اور بت پرستی وغیرہ کے متعلق بہت کچھ کہا اور لکھا گیا ہے لیکن دنیوی امور پر اس کے اثرات کا جائزہ بہت کم مصنفین نے لیا ہے، دوسرا اہم اصول جو قابلِ غور ہے وہ اللہ تعالیٰ کی حاکمیت مطلق یا موجودہ دور کے محاورے میں انگریزی زبان کی اصطلاح:

(SOVEREIGNTY OF ALLAH) سے متعلق ہے۔ مغربی تہذیب اور تصورات سے جو لوگ متاثر

ہیں وہ ہمارے ان نظریات بالخصوص دنیوی امور میں ان پر عمل پیرا ہونے کے خیال سے سخت چراغ پا ہوتے ہیں۔ مغربی تہذیب نے خود کو ان پیچیدگیوں سے محفوظ رہنے اور دنیوی امور میں مطلق العنانی بہتے کیے یہ اصول ایجاد کیا کہ مذہب کا ان امور سے کوئی تعلق نہیں اور وہ ہر شخص کا ذاتی معاملہ ہے۔ یہ الفاظ دیگر انہوں نے سیاست اور مذہب کو ایک دوسرے سے علاحدہ اور بے تعلق تسلیم کر لیا۔ یہ ان کے لیے ممکن تھا کیونکہ ان کے پاس کوئی خدا کا دیا ہوا نظام حیات نہ تھا، اسلام نے بہ خلاف اس کے جو نظام دیا ہے وہ دینی اور دنیوی دونوں زندگیوں کے ہر پہلو پر حاوی ہے اور اس کی نظر میں ایک کو دوسرے سے الگ نہیں کیا جاسکتا۔ اس اہم نظریے کے تحت متعدد مسائل پر بحث کی جاسکتی ہے اور تاریخ کی روشنی میں اس کا وسیع پیمانہ پر تجزیہ کیا جاسکتا ہے۔ لیکن اس مقالہ میں ہم مساوات اور اجتماعی عدل کے صرف چند گوشوں کا تذکرہ کرنا چاہتے ہیں۔

جیسا کہ ابتدائی حصے میں ذکر کیا گیا ہے، انسانی تاریخ کے مختلف ادوار میں جو تہذیبیں اور تمدنی نظام ہائے زندگی منظر عام پر آئے اور ان کی سرپرستی میں جو معاشرے وجود پذیر ہوئے ان کی مشترک اور

اس خصوصیت طبقاتی تقسیم انسانی نظر آتی ہے۔ اس کی جڑ اور بنیاد انسان کی اس جہلی خواہش میں ملتی ہے کہ خود کو دوسرے لوگوں سے بہتر اور بالاتر سمجھتا ہے اور دوسروں کی محنت اور کارکردگی کے فوائد اور بیخ اپنی عیاشی اور آرام طلبی کے اسباب مہیا کرنے کے لیے استعمال کرنا چاہتا ہے۔ چنانچہ طبقاتی برتری قائم کرنے کے لیے مختلف اصول بنائے گئے جن میں نسل و رنگ، زبان، علمی استعداد اور طاقت خاص درجہ قابل ذکر ہیں۔ برصغیر میں آریائی تہذیب کی سرپرستی میں جس معاشرہ نے جنم لیا اور یہ وہاں پڑھا اس میں پیشہ کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل تھی، ایک اور ذریعہ اس طبقاتی تقسیم کا پر و ہتائی نظام (PRIESTHOOD) تھا۔ تاریخ اس سے ناواقف نہیں کہ ہندوستان میں برہمنی برتری اور درجہ میں کلیسا اور ریاست کی کشمکش سے کیا نتائج برآمد ہوئے۔ جہاں تک حکمرانی کے اصولوں کا تعلق تھا، ان عوامل نے شاہی مطلق العنانی کی حوصلہ افزائی کی۔ ان حالات میں جمہوریت کا تو ذکر ہی کیا، جمہور کے حقوق کا بھی سوال پیدا نہیں ہو سکتا تھا۔ حکمران کے الفاظ قانون بلکہ قانون سے بالاتر تصور کیے جاتے تھے، اور اس کے درباری اور فوجی سردار وغیرہ درجہ بدرجہ خصوصی حقوق اور اختیارات کے مالک بن جاتے تھے یا بنا دیے جاتے تھے اور عوام ہر طرح سے ان کی زیادتیوں اور مظالم کے نیچے پستے رہتے تھے۔

اب دیکھیے کہ اسلام کی انقلابی تعلیمات اور رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کے برگزیدہ اخلاق و اعمال نے انسانیت کے نام پر چھٹے ہوئے ان داغوں کو کس طرح بکیر مٹا دیا۔ اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ مسلم معاشروں میں بعد میں یہ خرابیاں رونما ہوئیں لیکن فرق یہ ہے کہ مسلمانوں نے ان لوگوں کو چاہے وہ حکمران ہی کیوں نہ ہوں خطا کار اور گنہ گار ٹھہرایا اور اکثر ظالم اور جاہل حکمرانوں کی آنکھوں نے مخالفت بھی کی، نظریہ توحید اور اللہ تعالیٰ کی حاکمیت نے اس خطرناک صورت حال کا خاتمہ نظری طور پر تو ہمیشہ کے لیے کر دیا، عملی لحاظ سے اس کا خاتمہ فوری طور پر عرب میں ہوا۔ اب حکمران سے لے کر غریب اور معذور ترین شخص ایک ہی سطح پر، یعنی خدا کی حاکمیت کے تحت آگیا۔ قانون کے بنیادی اصول بذریعہ وحی اور رسول اکرمؐ کی تشریحات اور عملی زندگی کے لباس میں انسان تک پہنچ گئے۔ ان کی ابدی حیثیت اور بالادستی پر کسی کو حرف گیری یا ان میں ترمیم کی کوئی گنجائش نہیں رہی۔ ان نظریات کا عملی نتیجہ یہ ہوا کہ انسان کی مطلق العنانیت خواہ وہ فرد کی ہو خواہ ایک جماعت کی قطعی طور پر ختم ہو گئی۔

ازمنہ قدیم اور قرون وسطیٰ میں ملوکیت کی تاریخ پڑھ کر اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ مطلق العنان حکمرانوں نے کیسے کیسے مظالم اور نا انصافیاں کی ہیں۔ دورِ حاضر میں پارلیمانی طرز

حکومت کو آزادی اور مساوات انسانی کا بہترین مظہر سمجھا جاتا ہے، لیکن بعض ممالک میں پارلیمان کے قانون سازی میں لامحدود اختیارات سے کس قدر عجیب و غریب نتائج پیدا ہو سکتے ہیں، اس کا اندازہ ہم بعض اخلاق سمونہ اور رنگ و نسل کے امتیازات سے لگا سکتے ہیں۔ یہ صورت حال اسی وجہ سے پیدا ہوتی ہے کہ بعض انسانوں یا جماعتوں کو دوسروں پر ترقی حاصل ہے، نسل پرستوں کے نزدیک ایک انسان کو دوسرے پر فوقیت صرف اس بنا پر حاصل ہے کہ وہ کسی خاص نسل سے تعلق رکھتا ہے یا اس کا رنگ دوسروں سے مختلف ہے۔ عدم مساوی کی یہ شکل اسلامی نظام میں اس لیے ممکن نہیں کہ میان حاکمیتِ اعلیٰ صرف اللہ تعالیٰ کو حاصل اور انسان اس دنیا میں صرف اس کا نائب، یا قرآنی الفاظ میں، "خلیفہ" ہے اور اس کے دیے ہوئے قوانین کی حد سے باہر نہیں جاسکتا۔ قرآن نے یہ نظریہ پیش کر کے کہ اللہ کے نزدیک ترقی کا صرف ایک ذریعہ تقویٰ ہے، انسانی مساوات کے نظریہ کو اس طرح قائم کر دیا کہ اس میں اب کسی ترمیم و تبدیلی کی گنجائش نہیں۔ متعلقہ آیت الحجرات - ۱۳ اے کی بہترین وضاحت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حجة الوداع کے موقع پر اپنے مشہور خطبے میں ان الفاظ میں فرمائی:

لوگو! ہاں بے شک تمہارا رب ایک ہے اور بے شک تمہارا باپ آدم علیہ السلام ایک ہے۔ ہاں عربی کو عجمی پر، عجمی کو عربی پر، سرخ کو سیاہ پر اور سیاہ کو سرخ پر کوئی فضیلت نہیں، مگر تقویٰ کے سبب سے۔

اس موقع پر آپ نے غلاموں کے متعلق یہ حکم دیا:

"تمہارے غلام! تمہارے غلام! جو خود کھاؤ وہی ان کو کھلاؤ اور جو خود پہنوں وہی ان کو پہناؤ۔" ۱۷

۱۷۔ بعض مفسرین نے اس آیت (الحجرات - ۱۳) کی شان نزول یہ بتلائی ہے کہ آنحضرت مدینہ کے بارے میں جا رہے تھے تو آپ نے ایک حبشی غلام کو دیکھا جو کہہ رہا تھا کہ مجھے صرف وہ شخص خریدے جو مجھ کو پانچوں نمازیں رسول اللہ کی اقتدا میں ادا کرنے کی اجازت دے۔ چنانچہ اس شرط پر اس کو ایک شخص نے خرید لیا۔ وہ غلام بیمار ہوا تو رسول اللہ اس کی عیادت کے لیے تشریف لے گئے۔ جب وہ مر گیا تو آپ اس کے جنازے میں شریک ہوئے۔ لوگوں میں پوچھ گیا کہ اس موقع پر یہ آیت نازل ہوئی ہے۔ اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ غلام کے مقابلہ میں حیثیت یا پیدائش کے لحاظ سے اس کے آقا کو بہتر حاصل نہیں۔

غلامی کو فوری طور پر بند کرنا ممکن نہ تھا اس لیے کہ عالمی تجارت کا ایک اہم مسئلہ بن چکا تھا۔ لیکن مولانا نے غلام کو آزاد کرنے اور اس کو جملہ حقوق، جن سے دوسری قوموں نے اس کو محروم کر دیا تھا، دلوانے کے لیے مختلف طریقوں سے نصیحت فرمائی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسلامی معاشرے میں غلام کی حیثیت دوسرے معاشروں سے قطعی طور پر مختلف ہو گئی۔ یہاں یہ خاندان کے ایک فرد کی طرح تھا اور اگر وہ باصلاحیت ہوتا تو ترقی کے لیے تخت و تاج کا مالک بھی بن جاتا تھا۔ ایک مرتبہ سلطان معز الدین غوری (د ف - ۶۳ / ۱۲۰۶) سے اس کے ایک امیر نے اظہار افسوس کرتے ہوئے ذکر کیا کہ اس کا کوئی بیٹا نہیں جو بعد میں اس کے تخت کا مالک ہو۔ سلطان نے فوراً جواب دیا کہ اُس کے ہزاروں غلام اس کے بیٹے ہی ہیں اور ہم جانتے ہیں کہ اُس کے کئی غلام سلطنت کے مختلف علاقوں پر حکمران ہوئے۔ اسلامی تاریخ کے صفحات میں زندگی کے مختلف شعبوں میں ہمیں نمایاں شخصیتیں ملیں گی جو ابتداً غلام تھیں لیکن بعد میں اعلیٰ مراتب و مناصب پر فائز ہوئیں۔ یہ بھی ہمیں معلوم ہے کہ سلطان فیروز تغلق نے جس کے پاس غلاموں کی بہت بڑی تعداد تھی ان کی تعلیم و تربیت کے لیے ایک علاحدہ محکمہ قائم کیا تھا۔ ایسے واقعات کی لا تعداد مثالیں ہمیں اسلامی تاریخ میں ملتی ہیں۔ جن سے یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ دوسری قوموں میں جو غلام کی حیثیت اور غلامی کا تصور تھا اس کا اسلام میں غلام کے تصور سے کوئی مقابلہ نہیں ان دونوں میں صرف لفظی مماثلت ہے۔

اس مختصر مقالے کے اختتام سے پہلے ہم اس امر پر زور دینا چاہتے ہیں کہ قرآن پاک کے احکامات نے اسلامی معاشرے پر یہ لازم کر دیا ہے کہ وہ انوث اور مساواتِ انسانی کو ہر نظام میں ضروری سمجھے۔ یہاں آزادی، مساوات اور انوثِ انسانی بے معنی الفاظ نہیں۔ مطلق العنانی کسی شکل میں بھی خواہ وہ ایک فرد کی ہو خواہ ایک جماعت کی قابلِ برداشت نہیں۔ ان تمام تعلیمات کا عملی زندگی میں مجموعی طور پر یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اسلامی معاشرے کی بنیاد صرف فلاح اور دنیوی بہبود پر ہی نہیں بلکہ انسانی اخلاق کے اعلیٰ معیارات پر ہے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث میں جس میں آپؐ نے فرمایا ہے کہ:

”میں اعلیٰ اخلاق کی تکمیل کے لیے مبعوث کیا گیا ہوں۔“

اسی حقیقت کی طرف اشارہ ہے۔

۷۔ نخلبنہ مذکورہ کے مختلف حصے سیر اور حدیث کی کتابوں میں کہیں کہیں مذکور ہیں۔ دیکھو علامہ شبلی کی سیرت النبی - جلد ۲ - مزید دیکھو ابن سعد جلد ۲ صفحہ ۱۸۵۔

میدانِ جنگ اور اخلاقیات نبوی

جناب محترم بریگیڈیئر گلزار احمد

اخلاق، انسان کے اس طرز عمل کا نام ہے جو وہ دوسرے انسانوں کے ساتھ رو رہتا ہے اور جس کے اثر کے تحت اجتماعی زندگی کے دوران اس سے مختلف اعمال سرزد ہو رہتے ہیں۔ انسان کا طرز عمل اس کے اخلاق کا پتہ دیتا ہے جو اس فلسفہ پر مبنی ہوتا ہے جس وہ اپنی زندگی کو استوار کرتا ہے۔ اس فلسفے کی بنیاد انسان کے ایمان و ایقان پر مبنی ہوا ہے جسے اس نے اپنے معبود کے متعلق اپنے قلب و ذہن پر ثبت کیا ہوتا ہے۔ فلسفہ زندگی مستقل مقام نہیں رکھتا، اس کا وجود ایسی مستقل بنیاد پر ہوتا ہے جو دلائل و براہین سے ماورا ہو کر انسان اور خالق کائنات کے تعلق کو واضح کرتی ہے۔

جس انسان کا ایمان ہو کہ یہ کائنات از خود وجود میں نہیں آئی بلکہ اس کا ایک خالق ہے جس نے اس کی تخلیق کا مقصد بھی پیش نظر رکھا ہے، وہ اس کائنات کی وسعتوں، اس کی بلندیوں، اس کے عجائب اور ان کے اندر مضمر قوتوں کو ہمہ وقت لگا ہوں کے سامنے رکھتا ہے۔ جو ہوں کائنات پر اس کا غور و فکر بڑھے گا اسی مناسبت سے اس کے قلب و ذہن خالق کائنات کی بزرگی اور قوت کا تصور گہرا ہوتا جائے گا۔ اس تصور کا نتیجہ ہو گا کہ اس کا ہر قول و فعل خالق کائنات کے احکام کے تابع رہے گا۔

جو انسان خالق کائنات کے وجود کا منکر ہو گا یا خالق کائنات کے تصور کو شرک و شکوک کے نتیجے میں دھندلا دے گا اس کے ذہن سے جزا و سزا اور عمل و احتساب کا خیال محو ہو جائے گا۔ ان حالات میں ہر عمل منتہائے مقصود بن گیا ہے اور انسان ہر رُکاوٹ، ہر خوف، ہر طرح کی پریشانی کے خیال سے آگے ہو کر اپنے شب و روز کو صرف خواہشاتِ نفس کے تابع بناتا ہے اور یوں غیر ذمہ دارانہ رویہ کو حاصل زندگی کا مقام عطا کر دیتا ہے۔ یہ سب کچھ صرف اس لیے ہوتا ہے کہ اس کے فلسفہ زندگی کی تہ ایمان و ایقان کی مضبوط بنیاد سے عاری

ہوتی ہے۔

خاتم الرسل، سید البشر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جس نظام زندگی کی بنیاد رکھی اس کی اساس وحدتِ خداوندی پر ہے۔ اس کے علاوہ اس نظام زندگی کا اہم نکتہ یہ ہے کہ یہ نظام زندگی خود خالق کائنات کا عطا کردہ ہے۔ وحدتِ خداوندی اور حاکمیتِ الہ العالمین پر استوار کیے ہوئے نظام زندگی کو حضور اقدس نے اپنی پوری زندگی پر محیط کر کے ایک ایسی مثال قائم کی ہے جو قیامت تک کے لیے ہر موقع و محل پر کمال اخلاقیات کا مقام رکھتی ہے۔ اس بے مثل زندگی کے بہت سے پہلو ہیں۔ ہر پہلو اپنی جگہ پر مکمل مگر ساتھ ہی ساتھ دوسرے پہلوؤں کے ساتھ ہم آہنگ ہے۔ ان ہی مختلف پہلوؤں میں سے اہم ترین پہلو جنگ، یعنی میدانِ کارزار کی زندگی کا پہلو ہے۔ جنگِ خاک و خون سے برد آزما ہونے کا نام ہے۔ اس کے دوران جذبات کی شدت پر قابو رکھنا نامکن نہیں تو مشکل ضرور ہوتا ہے۔ آج کی اس مجلس میں اس بات کا مطالعہ مقصود ہے کہ حضور سرورِ کونین رحمۃ اللعالمین نے میدانِ جنگ اور اس سے متعلق امور کے دوران کس طرح کے اخلاق بطور مثال پیش کئے۔ بادی النظر میں عجیب سی بات محسوس ہوتی ہے کہ بوسہتی سراپا رحمت ہے، جو محبت و شفقت کا پیکر ہے، جو رحم و کرم میں کمال انسانی کی مثال ہے، جو عفو و درگزر اور عطا و بخشش میں اپنا ثانی نہیں رکھتی اور جس بزرگ و برتر انسان کو خالق جن و بشر نے رحمۃ اللعالمین کے خطاب سے نوازا ہے، ان کے اخلاقیات کو اس پس منظر سے متعلق کیا جائے جو قتل و خون اور تباہی و بربادی کا منظر ہو۔ اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اخلاقیات کا یہی پہلو سب سے زیادہ توجہ طلب ہے اس لیے کہ جنگ کے دوران انسانی تیور غضب اور غصے کی انتہا کو پہنچ جاتے ہیں اور افراد و تفریط یا نا انصافی سے بچنا مشکل ہو جاتا ہے۔ مگر خون کی ندیوں کی موجودگی میں رحم و کرم اور عفو و درگزر سے کام لینا ہی حقیقی معنوں میں اخلاقیات کی معجز نما مثال بنایا جاسکتا ہے۔

اہل عرب اور خاص طور پر ان کے شعرا اپنے باپ دادا کی شجاعت کی داستانیں انتہائی رنگ آمیزی سے پیش کیا کرتے تھے۔ ان کے اشعار میں داستان طرازی زیادہ ہوتی تھی اور حقیقی شجاعت کم تر اور وقتی۔ اہل عرب لوٹ مار قسم کے غزوہ کے عادی تھے۔ وہ پُر استقلال لڑائی کے عادی نہ تھے اور اس لیے صف آرا لڑائی کے متحمل نہ ہو سکتے تھے۔ بدر و احد کی لڑائیاں جس طور پر لڑی گئیں وہ اس خیال کی شاہد ہیں۔ علاوہ بریں ہیشاق مدینہ کی

شق نمبر ۲۳ سے بھی واضح ہوتا ہے کہ عرب کا ہر باشندہ دلیر نہ تھا مگر اللہ کی حاکمیت کو قبول کرنے والا ہر فرد صبر و استقلال کی وجہ سے بہادری کا منظر بن گیا تھا۔ دورِ جدید میں مستشرقین سے استفادہ کرنے والے مسلمان مفکرین بھی اس گمراہی کا شکار ہو گئے ہیں کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی کامیابیوں اور آپ کے اخلاقیات کی بنیاد اہل عرب کی شجاعت، ان کی مہمان نوازی اور ان کے مضبوط کردار پر استوار ہوئی تھی۔ یہ خیال انتہائی گمراہ کن ہے۔ قرآن پاک تازہ واردانِ حلقہٴ اسلام کا موت کے خوف سے گر گر پڑنے کا ذکر کرتا ہے۔ غزوہٴ تبوک تک ایسے افراد موجود تھے جو جنگ میں عدم شمولیت کے لیے بہانے بناتے رہے۔ اس لیے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے سپاہیانہ خصائل، آپ کی بے مثل جرات اور آپ کے صبر و استقلال کی اساس آپ کے گرد و پیش پر نہیں تھی بلکہ خالقِ ممالک کائنات کی مشیت اور نہ نظر آنے والے ارادوں کا اسے نتیجہ تصور کرنا چاہیے۔

آپ کے والد ماجد کا انتقال آپ کے پیدا ہونے سے قبل ہو گیا تھا۔ آپ والدہ ماجدہ کی شفقت سے بھی نا آشنا رہے تھے۔ دادا کو بھی قدرت نے اتنی مہلت نہ دی کہ سیادت و قیادت کے طور طریقے سکھائے جاتے۔ چچا تو کفالت کی ذمہ داریوں سے بھی بمشکل عہدہ بردار ہو سکتے تھے۔ یعنی آپ حقیقی معنوں میں امی تھے۔ علاوہ ازیں آپ از اول تنہا پسند تھے اور جوانی کے ایام کا زیادہ حصہ غارِ حرا میں گزارا کرتے تھے۔ وہاں عرب کا ماحول یا عرب کی داستانوں کا اثر کیسے ہو سکتا تھا۔ وہاں تو تصور کائنات اور انہماک در خالق کائنات ہوا کرتا تھا۔ آپ کے اخلاق اس پوشیدہ امرِ ربی اور مشیتِ خالق کائنات کے ماتحتوں استوار ہوئے تھے جس نے لفظِ کن کے بعد سے آدم اور ان کی اولاد کی پیش رفت اور تربیت ان خطوط پر کی تھی جن کی آخری کڑی، آخری دین، آخری وحی اور آخری رسول نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر پہنچ کر تاقیامت نسلِ انسانی کے لیے مشعلِ راہ بنی رہی تھی۔

جنگِ فرد کی زندگی پر تو اثر انداز ہوتی ہی ہے، اجتماعی سطح پر معاشرتی دھاروں کو بدلنے اور نیا رخ دینے میں بھی جنگِ انتہائی اہم کردار ادا کرتی ہے۔ ہجرتِ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد سے مکہ والوں نے اعلانِ جنگ کے بعد مدینہ پر حملے کرنے شروع کر دیئے تھے۔ یہ جنگ نو سال تک جاری رہی۔ اس جنگ کے دوران ریاست و مملکتِ مدینہ کے تمام تر وسائل ملت و مملکتِ اسلامیہ کے دفاع و تحفظ کے لیے استعمال کئے گئے۔ اس طویل جنگ کے سائے حضور پر نور صلی اللہ علیہ وسلم کے پورے مدنی دور پر چھائے رہے۔ ظاہر ہے کہ ریاستِ مدینہ کے انتظامی،

معاشی اور معاشرتی امور پر حالتِ جنگ کے اثرات پڑتے رہے ہوں گے مَخْذُوا حِذْرَ كُمْ
 کا یہی نتیجہ مرتب ہو سکتا تھا، یعنی زندگی کے ہر پہلو کی حفاظت اور ملت کے ہر فرد اور اس
 کی ہر شے کا تحفظ۔ یورپ کا عالم انسانی ملی جنگ (NATIONAL WAR) کی اصطلاح سے
 انیسویں صدی عیسوی میں پولین کی جنگوں کے ذریعہ سے روشناس ہوا، مگر نیاٹے اسلام کو حضور
 کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم تیرہ صدیاں قبل ملی جنگ کے جذبات سے آگاہ فرما چکے تھے۔
 اس جنگ اور اس کے ہر غزوہ کے دوران ملت کے ہر فرد کی دولت اور اس کی ذات
 کو ہر ممکن طریقے سے استعمال میں لایا گیا۔ اس لیے اس جنگ کو بہر معنی کُلّی جنگ یعنی
 (TOTAL WAR) بھی کہا جاسکتا ہے۔

جیسا کہ اشارہ کیا جا چکا ہے جنگ فرد اور معاشرہ دونوں پر اثر انداز ہوتی
 ہے۔ اس لیے کہ جنگ کے مطالبات نہ مانہ امن کے مطالبات سے قدرے مختلف ہوتے ہیں۔
 اور فرد و جماعت کو اپنی زندگی اور اس سے متعلق نظریات کو حالاتِ جنگ اور مطالباتِ
 جنگ سے ہم آہنگ کرنا پڑتا ہے۔ ۹ سال کے طویل عرصے کی جنگ کا اثر یہ ہوا کہ جنگ کے
 سایہ تلے مرتب ہونے والے معاشرے کے افراد کے کردار و اخلاق کی تربیت مادی برحق نے
 ایسے خطوط پر استوار کی تھی کہ وہ عین میدانِ کارزار میں شفقت و محبت اور رحم و کرم
 کے جذبات کا اظہار کر سکتے تھے اور زمانہ امن کے صلح کن ماحول میں عزم و استقلال اور
 انتہائی شدت سے کلمہ حق کی پاسداری اور تحفظ کرتے رہتے تھے۔ یہی مکمل کردار تھا جس کے
 اظہار نے خیر البشر خاتم الرسل صلی اللہ علیہ وسلم کے تربیت یافتہ اور ان سے صدیوں بعد
 آنے والے نام لیوانِ رسولِ مکی و مدنی نے بھی جنگ ختم ہوتے ہی بدترین مفتوح دشمن کا عزت
 و آبرو، اس کے مال و متاع اور اس کے زنا و مرد کو مکمل آزادی عطا کر دی اور جنگ کے
 دوران کی شدتِ جذبات کو نفرت کی جانب مسخ نہ کرنے دیا۔

یہ سب کچھ اس لیے ہوتا رہا کہ جس ادنیٰ برحق کی سیرت کے مطابق عمل کرنا وہ اپنے
 لیے باعثِ سعادت سمجھتے تھے اس نے عمر بھر کے دشمنوں کو کالتشیب لکھنا لیا کہ
 کے سینے سے لگا لیا تھا اور ان کے لیے زمانہ مابعد جنگ کو حسین اور خوش رنگ بنا دیا تھا۔
 جنگ کو فتح تو ہر سپہ سالار کر سکتا ہے مگر زمانہ مابعد جنگ کی فتح صرف اولین سپہ سالارِ فوج
 اسلامیہ کا خاصہ رہا ہے۔

جس نظامِ زندگی کو عملاً آپ انسانیت کے سامنے پیش کر رہے تھے، اس کے فلسفے

کی بنیاد وحدت و حاکمیتِ خداوندی پر استوار ہوئی تھی اور خالق کائنات کا حکم تھا کہ جب میری راہ میں سفر کر رہے ہو تو چاہے وہ دفاعی جنگ کا سفر ہی کیوں نہ ہو زیادتی سے بچے رہنا۔ اس لیے کہ اللہ زیادتی کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ یہ لَا تَعْتَدُوا کا حکم ہی تھا کہ جس کی روشنی میں آپ نے عمر بھر کے دشمنوں کو لا تَشْرِبُ لَكُمْ الْيَوْمَ کہہ کے بندہ بے دام بنا لیا تھا۔

اسلام کی بنیاد ہی حاکمیتِ خداوندی پر ہے۔ یہ ایسا اساسی نکتہ ہے کہ حضور اقدس نے اسے میثاقِ مدینہ میں بھی شامل کیا تھا۔ اگر یہ کہا جائے کہ ریاستِ مدینہ کے وجود میں آنے کے ساتھ ہی یہ اعلان کر دیا گیا تھا کہ اس ریاست میں قانونِ خداوندی نافذ ہو گا تو یہ بہر معنی درست ہو گا۔ سلسلہ ہجرتی میں حضور کی جانب سے عطا کردہ میثاقِ مدینہ کی شق ۲۸ کے الفاظ ہیں:

”اگر اس دستاویز سے متعلق تمہارے درمیان کوئی اختلاف پیدا ہو جائے تو معاملہ اللہ اور اللہ کے رسول کو پیش کیا جائے گا۔“

میثاقِ مدینہ میں یہ بات بھی مصدقہ طور پر تسلیم کر لی گئی تھی کہ حاکمیتِ خداوندی کے اثر اور اس کے نتیجے میں مسلمانوں کے اخلاقِ مضبوط ہو گئے تھے۔ اس اہم اور تاریخی دستاویز کی شق نمبر ۲ کے الفاظ ہیں:

”چونکہ مسلمان اللہ پر ایمان رکھتے ہیں اس لیے (جنگ کے دوران) دوسروں کی نسبت ان کا صبر و استقلال قوی تر ہوتا ہے اور انہیں اللہ کی جانب سے ہدایت عطا ہوتی ہے۔“

صبر و استقلال کو تو اللہ تبارک تعالیٰ، اللہ کی جانب سے عطا کردہ نعمت قرار دیتا ہے اور وہ مگر اللہ پر ایمان لانے اور اس کے نازل کردہ احکام کے مطابق زندگی کو سمیت عطا کرنے کا۔ آپ نے یہ صبر و استقلال ہر میدانِ جنگ میں دکھایا اور دکھایا گیا۔ اور اس کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ کی نصرت سے فتوحات حاصل ہوئیں۔ احد اور حنین کے دو اہم میدانوں میں جب لڑائی کا رخ مسلمانوں کے خلاف تھا تو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی بے مثل بہادری نے فوج کو دوبارہ یکجا کیا اور دونوں موقعوں پر حالات یکسر بدل گئے۔

یہ اخلاقیات نبوی کا وہ پہلو ہے جو فنِ جنگ کے ماہرین سمجھنے سے قاصر رہے ہیں کہ

اپنے کسی طرح کی جنگی تربیت، تجربہ یا مشاہدہ کے بغیر بگڑے ہوئے حالات کو سنوارنے کے لیے جس طرز عمل کی ضرورت ہوتی ہے وہ کس طرح حاصل کیا تھا۔ اخلاقیاتِ نبوی کا یہ پہلو وحدتِ خداوندی پر مکمل ایمان کا نتیجہ تھا۔ غازیہ ثور کی تنہائیوں میں، بدر کے دوران پختہ کارہ کا نڈار کی سی مضبوط گرفت کے وقت، اُحد کے میدان میں دشمن کے قیامت خیز گھوڑوں کے باوجود، غزوہٴ احزاب میں خندق کھودنے سے لے کر عرب کے اجتماعِ عظیم کے منتشر ہونے تک، حدیبیہ کی تاحد شہادت بیعت کے فیصلہ پر غور کرتے ہوئے، خیبر کے بارہ قلعوں کی تسخیر کے دوران، اور حنین کی تنگ وادی میں دشمن کے بڑھتے ہوئے سیلاب کے بالمقابل اخلاقیاتِ نبوی کے صبر و استقلال کی بنیاد خالق رب العالمین پر وہ محکم ایمان تھا جو تا قیامت عاشقانِ ختم الرسل صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے مینارِ نور بن کر ہدایت کے سامان مہیا کرتا رہے گا۔

مکہ اور مدینہ کے درمیان اعلانِ جنگ کے بعد کئی چھوٹے چھوٹے معرکے پیا ہو چکے تھے مگر پہلا صفِ آراء معرکہ بدر کے مقام پر ہوا۔ اس روز قریش مکہ کا لشکر باجے گا جے اور جذباتِ ابھارنے والے زرمیہ و رجزیہ اشعار کی صداؤں کو بلند کرتے ہوئے مدینہ کے مٹی بھر مجاہدوں پر حملہ کے لئے آگے بڑھا۔ سراپا رحمت نے حکم دے رکھا تھا کہ جب تک لڑائی کا باقاعدہ آغاز نہ ہو بدر کے واحد چشمہ سے دشمن کو پانی پینے سے نہ روکا جائے۔ کہاں خون کی ندیاں بہنے کا یقین اور کہاں دشمن کو اپنے قبضے میں لیے ہوئے چشمہ سے پانی پی کر تازہ دم ہونے کی اجازت! دشمن کے غصے کے مقابلے میں رحم و کرم کا یہ ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر! یہی اخلاقیاتِ نبوی کا وہ پہلو ہے جسے "خلقِ عظیم" کا نام دیا گیا ہے۔

بدر کی لڑائی مابعد جنگ کی اخلاقیات کی مثال بھی پیش کرتی ہے۔ بدر میں قریش کے شتر قیدی لیے گئے تھے۔ ان کے ساتھ انتہائی ہمدردانہ سلوک کیا گیا۔ حضور اقدس نے احترامِ آدمیت کا جو بلند مقام قائم کیا ہے وہی بقائے انسانیت کا ضامن ہو سکتا ہے۔ ان جنگی قیدیوں کو جس آسانی سے اور جن آسان شرائط پر آزاد کیا گیا وہ دورِ جدید کے لشکر سازوں اور کارپردازانِ حکومت کے لیے مشعلِ راہ کا کام دے سکتا ہے۔

جنگی قیدیوں کا سوال یہ خیال بھی ذہن کے پردے پر ابھارتا ہے کہ کیا وجہ تھی کہ حضور اقدس تو دشمن کے قیدی حاصل کر لیتے تھے مگر آپ کی نوسالہ جنگ کے دوران آپ کا ایک آدمی بھی جنگی قیدی نہ بنایا جاسکا۔ یہی نہیں بلکہ راقم الحروف کے مطالعہ میں ایسی ایک مثال بھی نہیں

آئی کہ دورِ شیخین میں دنیا کی دو بڑی مملکتیں کسی مسلمان سپاہی کو میدانِ جنگ میں قیدی بنا سکی ہوں۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ جو حاکمیت خداوندی پر ایمان رکھتے ہوں وہ قرآن و سنت کے علاوہ کسی دوسرے قانون کو نہ تسلیم کرتے ہیں اور نہ اس کے تحت زندگی گزارنا قبول کرتے ہیں۔ ان کی ننگا میں شکست کھا کر غیر اللہ کے قانون کو قبول کرنا کفر کے مترادف ہے۔ دورِ نبوی اور دورِ خلافت راشدہ کی مسلمان افواج کا یہ عمل اخلاقیاتِ نبوی کے پر تو کے طفیل تھا۔

غزوہٴ احزاب کے دوران جب پورے عرب کے قبائل کا طوفان اٹھ کر مدینہ اور اسلام کو ختم کرنے کے لیے آیا تھا اس وقت آپ کے فیصلہ کے مطابق نصف شہر کے گرد نو ہزار گز لمبی خندق کھودنی تھی۔ اس دفاعی تیاری کے دوران آپ نے اپنی فوج کے ادنیٰ ترین سپاہی کے ساتھ مل کر جو مصائب برداشت کیے اور جس صبر و استقلال سے تقریباً ایک ماہ کے محاصرے کے دوران ہی کماندارِ اعظم کے فرائض انجام دیے وہ اخلاقیاتِ نبوی کی صورت میں مساواتِ انسانی کا ایسا درس ہے جس پر وہی عمل پیرا ہو سکتے ہیں جو الہیت و حاکمیت خالقِ العالمین اور رسالت و نبوتِ مصطفوی پر ایمان رکھتے ہوں۔

حدیبیہ میں قیام کے دوران حضرت عثمانؓ سیفر کے طور پر مکہ گئے تھے انھیں واپسی میں غیر متوقع دیر لگ گئی۔ افواہ مشہور ہو گئی کہ مکہ والوں نے ان کو قتل کر دیا ہے۔ آپ نے فوراً صحابہ سے بیعتِ جہادِ تاشہادت لی اور کاملاً نیتے ہوتے ہوئے مکہ پر حملہ کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ سیفر کا قتل ریاست و مملکت کی حاکمیت کے خلاف للکار کے مترادف تھا۔ جو حاکمیت اللہ کی قائم کردہ حدود کی مطابقت میں قائم کی گئی ہو اس کے سیفر کا قتل اللہ کی حاکمیت کو للکارنے کا مقام رکھتا ہے اور وہ اعلانِ جنگ سے بڑھ کر جنگ کا آغاز متصور ہوتا ہے۔ اسی لیے خاتم النبیین کے لیے اس مسئلے میں صحیح مثال قائم کرنی تھی تاکہ مابعد کی مسلمان ریاستوں کے سربراہوں کے لیے نشانِ راہ واضح رہے۔ آپ کے اس عزم کی نتہ میں وہ محکم ایمان باللہ تھا جس کی مثال تاریخِ عالم میں کہیں نہیں ملتی۔ عین میدانِ جنگ میں اخلاقیاتِ نبوی کے اس فیصلے کو احترامِ ذاتِ مومن کا مقام حاصل ہے۔ جب حضرت عثمانؓ صحیح و سالم واپس لوٹ آئے اور مکہ والوں نے آپ کے اس عزم کو دیکھ کر دس سال کے لیے جنگ بندی پر رضامندی ظاہر کی تو آپ نے یہ جنگ بندی اور وقتی صلح چند ایسی شرائط پر قبول فرمائی جو بادی النظر میں مسلمانوں کے مفاد کے خلاف نظر آرہی تھیں۔ مگر اللہ یا حکم تھا کہ جب دشمن صلح کی جانب جھکے تو تم بھی اس جانب جھک جاؤ۔

اللہ کے اس حکم کی موجودگی میں آپ صلیح کی پیش کش کو ٹھکرا نہ سکتے تھے۔ سرور کونین کا یہ فیصلہ اتنا اہم ہے کہ خالق ارض و سما نے اسے فتح کے نام سے یاد فرمایا ہے اور وعدہ فرمایا تھا کہ اس فیصلے کے محرک بننے والے اصحابِ خاتم الرسل جنہوں نے درخت کے نیچے آپ کے ہاتھ پر بیعت جہاد تا حد شہادت کی تھی انہیں جلد ایک جنگی فتح سے نوازا جائے گا۔ تاریخ شاہد ہے کہ اللہ کا یہ وعدہ جلد پورا ہوا۔ صادق الموعد رسول آخر الزمان نے اس وعدہ پر یقین رکھتے ہوئے آنے والے غزوہ کے لئے سولہ ہزار کی جمعیت کے خلاف صرف ان چودہ سو اصحاب کو ساتھ جانے کی اجازت دی جنہوں نے ببول کے درخت کے سائے میں ریاست مدینہ کی آزادی کی ضمانت اور حاکمیت خداوندی کی شہادت کے طور پر اپنا سب کچھ قربان کرنے کا وعدہ کیا تھا۔

جنگ آزما ہونے والے اور تباہی کا عزم لے کر حملہ کرنے والے دشمن کے خلاف

عفو و درگزر سے کام لینے کے لیے جس بلند اخلاق کی ضرورت ہوتی ہے وہ اولین سپہ سالار افواج اسلام کے علاوہ تاریخ جنگ میں کہیں نظر نہیں آتا۔ بنوقینقاع اور بنو نضیر میثاق مدینہ کی خلاف ورزی کرتے ہوئے جاسوسی، فتنہ و فساد، بغاوت اور درپردہ دشمن کی مدد کرنے کے مرتکب ہوئے تھے، مگر آپ نے انہیں بخش دیا اور ان کی تمام منقولہ دولت ان کو ملے جانے کی اجازت دے دی۔ اسی طرح سریئہ ذات الاطلاق غزوہ حنین و طائف، سریئہ قطیفہ اور سریئہ مٹے کے قیدیوں کو معافی مانگنے پر بغیر فدیہ کے بخش دیا۔ تاریخ جنگ میں کئی سپہ سالاروں نے جنگیں جلتی ہیں اور دشمن پر حکومت کے ذریعہ سے نئے قوانین اور نیا نظام عاید کیا۔ مگر یہ تبدیلیاں ہمیشہ بحسب قبول کی گئیں۔ حضور واحد سپہ سالار ہیں جنہوں نے جنگ جتنے کے بعد مابعد جنگ زمانے کو بھی کامیابی سے سر کیا۔ آپ نے پرانے معاشرتی نظام کو یکسر بدل دیا تھا اور اک نیا سیاسی و اقتصادی نظام دے کر ایسے انقلاب کا آغاز کیا تھا جو آج صدیوں تک کم و بیش جاری ہے اور اس کی نشاۃ نو کے آثار نمودار ہو رہے ہیں اب تک ان چودہ صدیوں میں جہاں کہیں یہ نظام زندگی نافذ کیا گیا وہاں خوش حالی اور امن و سکون میں اضافہ ہوا اور ہر مقام پر اس کا خیر مقدم کیا گیا۔ میدان جنگ میں اخلاقیات نبوی کا ایک نمایاں پہلو یہ بھی رہا ہے کہ آپ کے نقش قدم پر چلنے والے، آپ کی سنت کو برقرار رکھتے ہوئے، عفو و درگزر سے کام لیتے رہے ہیں۔ جب مسلمان دور فاروقی میں بیت المقدس میں داخل ہوئے تو کسی کا بال بیکانہ ہوا۔ مگر جب عیسائی

اسی بیت المقدس میں داخل ہوئے تو شہری آبادی کے خون کی ندیاں بہانی گئیں مگر چھپانے سے سال
بعد جب مسلمان دوسری بار اس شہر میں داخل ہوئے تو پھر بھی امن و امان اور عفو و درگزر کی ہی
فراوانی نظر آئی۔

بیسویں صدی عیسوی میں مسلمانوں کو ایک بار پھر اس مقدس سرزمین سے نکال باہر کیا
گیا ہے۔ اس بار پھر منظالم کی انتہا نہ رہی جو اب بھی جاری ہیں۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا وجہ ہے
کہ مسلمانوں کے خلاف ہر مقام پر اور ہر دور میں جنگ کے نتیجے میں منظالم ڈھائے گئے مگر جب
مسلمانوں نے جنگ فتح کی تو انہوں نے رحم و کرم کی بارش کر دی۔ اس کی وجہ صرف ایک ہے
مسلمان سپہ سالاروں کے سامنے ہمیشہ سنت خاتم الرسل صلی اللہ علیہ وسلم رہی ہے اور دیگر اومان
کے فاتح کسی ایسی مثال کو سامنے رکھنے سے قاصر ہیں۔ میدان جنگ میں اخلاقیات نبوی کا یہ کمال ہے
کہ صدیاں گزر جانے کے بعد بھی آپ کی سنت بنی نوع انسان کو رحم و کرم اور عفو و درگزر کا سبق
دے رہی ہے اور اللہ کا دیا ہوا رحمتہ للعالمین کا لقب اتنا ہی زندہ و پائندہ ہے اور رہے
گا جتنا کہ اور سارا کلام ربانی ہے۔

معلم اور تعمیر کردار

سیرت طیبہ کی روشنی میں

جناب محترم ڈاکٹر احمد محی الدین

قرآن و سنت میں معلم اور تعمیر کردار کا ذکر بکثرت موجود ہے۔ اللہ تعالیٰ معلم ہے اور انبیاء بھی معلمین ہیں۔ انبیاء کرام کی معلمانہ حیثیت کی تعلیم و تربیت کا خلافت کریم نے خصوصی اہتمام فرمایا ارشاد ہے:

اور اللہ تعالیٰ نے آدم کو سب چیزوں کے اسماء کا علم دیا۔ (البقرہ: ۳۳)۔

پھر فرمایا:

رحمن نے قرآن کی تعلیم دی۔ (الرحمن: ۱-۲) اور پھر سورہ علق میں فرمایا:

پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم، آپ (پہر جو) قرآن (نازل ہوا کرے گا) اپنے رب

کا نام لے کر پڑھا کیجیے۔ جس نے (مخلوقات کو) پیدا کیا۔ جس نے انسان کو

خون کے لوتھڑے سے پیدا کیا۔ آپ قرآن پڑھا کیجیے اور آپ کا رب بڑا کریم

ہے۔ جس نے (کھسے پڑھوں کو) قلم سے تعلیم دی اور عموماً انسان کو (دوسرے

ذرائع سے) ان چیزوں کی تعلیم دی جن کو وہ نہ جانتا تھا۔ (علق: ۱-۵)

اللہ تعالیٰ نے نبی آخر زمان صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم و تربیت کا خاص اہتمام فرمایا۔

پروہ دگار عالم نے نبی کریم کو روشن چراغ (سراجاً منیراً) کہا۔ حدیث نبوی ہے:

ادبنا ربی فأحسن تادیبنا

یہی وجہ ہے کہ نبی کریم کا مناسب نبوت میں تعلیم دنیا خصوصاً حیثیت رکھتا ہے۔ اس

ضمن میں میں قرآن کریم کے دوستوں پر اکتفا کروں گا۔

حقیقت میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں پر احسان کیا جبکہ ان میں ان ہی کی جنس سے ایک

ایسے پیغمبر کو بھیجا کہ وہ ان لوگوں کو اللہ تعالیٰ کی آیتیں پڑھ پڑھ کر سناتے ہیں۔

اور ان لوگوں کی صفائی کرتے ہیں۔ اور ان کو کتاب اور فہم کی باتیں بتاتے رہتے

ہیں۔ اور بالیقین یہ لوگ قبل سے صریح غلطی میں تھے۔ (آل عمران: ۱۶۴)

”وہی ہے جس نے ناخواندہ لوگوں میں ان ہی میں سے ایک پیغمبر بھیجا۔ جو ان کو اللہ تعالیٰ کی آیتیں پڑھ پڑھ کر سناتے ہیں اور ان کو (عقائد باطلہ اور اخلاق ذمبیہ سے) پاک کرتے ہیں۔ اور ان کو کتاب اور دانشمندی (حکمت) سکھاتے ہیں۔ اور یہ لوگ پہلے سے کھلی گمراہی میں تھے“۔ (جمعہ : ۲۰)

خود پیغمبر اسلام نے معلم کہلاتے ہوئے ہمیشہ خوشنودی کا اظہار فرمایا۔ اس سلسلے میں حضرت عبداللہ بن عمروؓ سے ایک حدیث مروی ہے۔ جس کا ترجمہ یوں ہے :

(ایک مرتبہ) رسول اللہؐ دو مجلسوں میں سے گزرے جو مسجد میں منعقد ہوئی تھیں آپؐ نے فرمایا : دونوں مجلسیں بھلائی پر ہیں۔ لیکن ان میں ایک دوسری سے بہتر ہے۔ ان دونوں مجلسوں یا جماعتوں میں سے ایک عبادت میں مصروف ہے اور خدا تعالیٰ سے دعا کر رہی ہے۔ اور اس سے اپنی خواہش و رغبت کا اظہار کر رہی ہے۔ اور دوسرے لوگ سو وہ دینی بصیرت حاصل کر رہے ہیں اور جاہلوں کو علم سکھا رہے ہیں۔ لہذا یہ لوگ بہتر ہیں۔ اور میں بھی معلم ہی بنا کر بھیجا گیا ہوں (وانہا بعثت معلماً)

آخری معلم کی حیثیت میں آپؐ نے اپنے مشن کی وضاحت یوں فرمائی :

إِنَّمَا بُعِثْتُ لِأَتَمِّمَ مَكَارِمَ الْأَخْلَاقِ
 (میں تو اس لیے بھیجا گیا کہ اخلاقِ حسنہ کی تکمیل کروں)
 ایک اور جگہ فرمایا :

إِنِّي أُرِيدُ إِلَّا الْإِصْلَاحَ مَا اسْتَطَعْتُ وَمَا تَوْفِيقِي إِلَّا بِاللَّهِ -
 (میرا مقصد اصلاحِ معاشرہ ہے جتنا مجھ سے ممکن ہو۔ اور نہیں ہے میری توفیق مگر جو خدا مجھے دے)

ان ارشادات سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ حضورؐ کے پیش نظر تعلیمِ اسلامی کے دو پہلو رہے : ایک پہلو کے اعتبار سے وہ محض فرد کی اصلاح و تکمیل ہے۔ لیکن دوسرے پہلو کے لحاظ سے وہ ایسی اصلاح و تکمیل ہے جس کا نتیجہ معاشرتی بہبود ہے۔ ایک معلم کی حیثیت سے فرد کی انفرادی زندگی اور اس کی حیاتِ اجتماعیہ کی اصلاح ہمہ وقت آپؐ کے پیش نظر رہی۔ اس اعتبار سے آپؐ کی مساعی کا مقصد فرد کی ایسی تعمیر کرنا ہے جس سے وہ انفرادی اور اجتماعی طور پر کائنات کے لیے رحمت بن سکے۔ اسی لیے حضورؐ نے ایسی تعلیم اور ایسے علم سے

پناہ مانگی جس کا اثر انسان کی عملی زندگی پر نہ ہو۔
 اللَّهُمَّ إِنِّي أَعُوذُ بِكَ مِنْ عِلْمٍ لَا يَنْفَعُ ۝
 (اے اللہ میں ایسے علم سے تیری پناہ مانگتا ہوں جو نفع نہ دے)

معلم کا معیار

دنیا کے آخری معلم کی حیثیت سے آپ نے معلم کا ارفع ترین معیار نہ صرف وضع فرمایا بلکہ اس کی عملی تفسیر زندگی بھر پیش کی۔ معیار کے عناصر حسب ذیل ہیں :

- الف۔ معلم کی زندگی کا کوئی پہلو پردہ میں نہ ہو۔
 ب۔ اس کی ہر زبانی تعلیم کے مطابق اس کی عملی مثال بھی سامنے موجود ہو۔
 ج۔ اس کی اخلاقی زندگی میں یہ جامعیت ہو کہ وہ انسانوں کے ہر کارآمد گروہ کے لیے اپنے اندر اتباع اور پیروی کا سامان رکھتی ہو۔

معلم کا یہ مختصر مگر جامع معیار تربیت اساتذہ کا سرعنوان ہونا چاہیے۔ اور دورِ حاضر کے مسلمان اساتذہ کی علمی کم مائیگی اور تدریس سے بے رغبتی کا علاج یہی ہے کہ ان کے نظام تربیت کو مذکورہ معیار کی روشنی میں از سر نو ترتیب دیا جائے اور اس پر سختی سے کار بند رہا جائے، تاکہ اصلاحِ اعمال کا عمل سہل اور سریع ہو۔ یہ اس معیار کی عملی تفسیر ہے۔ حضورؐ کی درس گاہِ اعظم کو دیکھو تو معلوم ہوگا۔ ایک عمومی جامعہ ہے جس میں انسانی ترقی کی ہر قوت نشوونما پا رہی ہے۔ خود معلم کی ذات پوری جامع ہے جس کے اندر علم و فن کا ہر شعبہ اپنی جگہ قائم ہے۔ اور ہر جنس اور ہر مذاق کے طالب علم آتے ہیں اور اپنے اپنے ذوق اور استعداد کے مطابق کس کمال کر رہے ہیں۔

جہاں حضورؐ نے معلم کے لئے ایسا جامع معیار عملاً پیش کیا، دنیا کے آخری معلم نے اپنی تعلیم میں حکمِ خداوندی اور عقلی دقیقہ رسی، امرتہ بانی اور حکمِ فطرت اور کتاب و حکمت کی آمیزش کی۔ آپؐ کے پیش رو انبیاء کی تعلیم میں یہ آمیزش نہیں ملتی۔ حضورؐ نے نہ صرف معلم کے لیے ایک ابدی اور جامع معیار عملاً پیش کیا بلکہ قرآن حکیم اور اپنے طرزِ عمل سے اصولِ تعلیم و تدریس بھی وضع فرمائے۔ ان میں چند ایک حسب ذیل ہیں :

الف - کیا تم دوسروں کو نیکی کا حکم دیتے ہو اور خود اپنے کو بھول جلتے ہو؟ (لقبرہ: ۴۴)
 ب - تو اپنے رب کے راستے کی طرف دانائی اور اچھی نصیحت سے بلا - (سج: ۱۲۵)
 ج - تم دونوں اس سے نرمی سے باتیں کرنا - (طلہ: ۴۴)
 د - اور تو ان کو نصیحت کر اور ان سے کہہ ان کے دل تک پہنچ جانے والی بات (نساء: ۶۳)
 س - اپنے اپنے موقع پر سختی اور نرمی دونوں فرماتے۔

س - فضائل کو عمدہ تشبیہوں کے ساتھ اس طرح پیش فرماتے کہ سننے والا فضائل کی طرف مائل ہو
 ص - رذائل کو قابل نفرت صورتوں میں اس طرح پیش فرماتے کہ سننے والا اس سے روگردان ہو
 ط - خاص خاص لوگوں کو ان کی مناسبت طبع دیکھ کر ان کو خاص خاص طور پر نصیحتیں فرماتے۔
 ع - مختلف اخلاقی باتوں پر بیعت لیتے۔

ن - حضورؐ ایک سوال کرتے - سوال سن کر لوگ متوجہ ہوتے - مگر اس سے پہلے کہ لوگ
 جواب دیں حضورؐ خود ہی جواب دیتے۔

ق - کبھی حضورؐ آپ ہی آپ سوال کرتے اور اس کو بار بار دہراتے۔ حاضرین اس بار بار
 کی تکرار سے اس کی اہمیت کا پورا اندازہ کر لیتے۔ اور مشتاق ہو کر پوچھتے۔ جس کا اثر
 ان کی رگ رگ میں سرایت کر جاتا۔

ل - بلاغت کے مختلف اسلوبوں سے کلام کے مقصد کو ذہن نشین کرتے۔

یہ فرست خاصی طویل ہے۔ مذکورہ اصولی تعلیم و تدریس سے اس حقیقت کا اندازہ
 بخوبی لگایا جاسکتا ہے، کہ دنیا کے آخری معلم نے اصولوں کا ایک ایسا ضابطہ عملاً پیش
 فرمایا جس کے تحت تعلیم و تربیت حاصل کرنے والے جاہل افراد انسانی معراج کی رفعتوں
 کو چھونے لگے۔ ہمارے تدریسی مسئلوں اور تعلیمی کوتاہیوں کی چارہ گری مذکورہ رہنما اصولوں
 کی روشنی میں بسہولت ممکن ہے۔ افکار مغرب کی خوشہ چینی آخر کب تک؟ بالخصوص جب ان
 افکار و تجربات کی بنیاد محدود احوال و کیفیات پر ہو۔

اسلامی نظامِ تعلیم

حضورؐ نے جہاں معلم کے لئے عملی معیارات مقرر فرمائے اور تعلیم و تدریس کے مؤثر
 اصول وضع فرمائے۔ وہاں اسلامی نظامِ تعلیم کے بنیادی تصورات کی نہ صرف نشان دہی
 فرمائی بلکہ ان تصورات کی اپنے اسوہ حسنہ سے توضیح بھی فرمائی۔ ان بنیادی تصورات کا تعلق

دین، انسان، علم و معرفت، حکمت، عدل، اعمال و آداب، تکمیل انسانیت سے ہے۔ ان تصورات پر انسان غور کرنے تو اسے بہت کچھ مل سکتا ہے تصور دین سے اسے مقصد حیات حاصل ہوگا۔ تصور انسان سے علوم انسانی کی بے کرانی۔ تصور علم و معرفت سے تجربات و مشاہدات وغیرہم۔

محدود وقت کے پیش نظر میں نے معلم کی حیثیت سے حضور کے تین تعلیمی احسانات کا مختصراً ذکر کیا ہے۔ میں چاہوں گا کہ ان کا محض اعادہ کر دوں۔ یہ تین تعلیمی احسانات ہیں: معلم کے لئے ایک جامع معیار، پیچیدہ پیچیدہ اصولِ تعلیم و تدریس اور اسلامی نظامِ تعلیم کے بنیادی تصورات۔ ان تینوں میں جو قدر مشترک ہے وہ ہے ان کی آفاقی، اخلاقی اور روحانی اساس۔ بد قسمتی سے یہی اساس ہمارے موجودہ نظامِ حیات میں مفقود ہے۔ اور اس کے بٹھ مختلف شعبہ ہائے حیات تضادات و انتشارات کا شکار ہیں، جن میں شعبہ تعلیم بھی شامل ہے۔ معلم انسانیت نے اپنے بے مثال معلمانہ کردار و عمل سے ایک مختصر عرصے میں ایک ایسا معاشرہ قائم کیا جس کا ہر فرد جذبہ عمل، قوتِ تخلیق اور عرفانِ حق سے سرشار تھا۔ آپ نے ان امور کی بھی وضاحت کی کہ قرآنی تعلیمات حصولِ علم، تحقیق و تدقیق، مادی ترقی، سائنسی ایجادات کی کوئی حدیں مقرر نہیں کرتیں۔ صرف ان کے حصول اور استعمال کو پابند آداب کرتی ہیں تاکہ حیات انسانی کو مادی اقدار کے ساتھ ساتھ روحانی اور اخلاقی اقدار پر قائم کیا جاسکے۔ ماضی یا موجودہ دور میں تعلیم کی مادی اور روحانی، اخلاقی اقدار کے مابین عدم توازن نے ہی انسانوں اور معاشروں کو تباہ کن بحرانوں سے دوچار کیا ہے۔ ہماری سوچ اور ہمارے عمل میں خارج پرستی اور خارج پسندی اس درجہ در آئی ہے کہ اجتماعی اعتبار سے آج کا عالمی معاشرہ خود بینی و خود آگہی کی صفات سے کم و بیش محروم ہے۔ توہیں اور معاشرے ایسے اصول و نظام ہائے تعلیم کے فروغ کے لیے کوشاں ہیں جو انہیں مخصوص ظاہری کردار کے حامل افراد مہیا کر سکیں۔ لیکن تعلیمی نظریات اور مادی سہولتوں میں بے پناہ پیش رفت کے باوجود ہر معاشرہ ہر قسم کے بحرانوں سے دوچار ہے۔ تعلیم ہی کو سمجھیے۔ بڑھتی ہوئی تعلیمی سہولتوں کا مسئلہ، معیارِ تعلیم کا مسئلہ، وسائل کی کمیابی کا مسئلہ، ریاست کے اساسی نظریے کی ترویج کا مسئلہ، مروج نظامِ تعلیم کی صلاحیت و اہلیت کا مسئلہ بین الاقوامی تعلیمی پیش رفت سے استفادے کا مسئلہ، زیر تعلیم نسل کی خالی ایاضی، تاریک جانی، کم لگا ہی، بے لفظی اور تشنہ لبی کا مسئلہ، اور نظامِ تعلیم کی محکومی و تقلید اور زوالِ تحقیق کا مسئلہ۔ میرے نزدیک یہ آخری دونوں مسئلے ہماری فوری توجہ کے طالب ہیں۔

ہمارے گرد و پیش میں پھیلے ہوئے معاشرے بھی کم و بیش ایسے ہی تعلیمی حالات و کوائف سے دوچار ہیں۔ گزشتہ پندرہ بیس برسوں میں تعلیم کے میدان میں عالمی سطح پر ایک ایسی سوج بھری ہے جو تعلیم کی میکانکی توضیح کے ساتھ تعمیر کردار پر زور دے رہی ہے۔ آج کے دور میں اہل فکر و نظر ہر تعلیمی مرحلے میں تعمیر کردار کو بڑی اہمیت دے رہے ہیں اور مغرب و مشرق کے قابل قدر ادارے اپنے مضامین میں اس امر کی واضح نشان دہی کر رہے ہیں کیونکہ معاشرے کا تعداد مادی فوائد و ترقی کے حصول کے باوجود ناآسودہ ہیں اور ان کا مستقبل مبہم و غیر یقینی اس کی غالباً سب سے بڑی وجہ یہ رہی ہے کہ جدید دور نے انسان کو محض ایک تخلیقی فعلیت تک محدود سمجھا۔ حالانکہ انسان تخلیقی فعلیت کے ساتھ ساتھ اخلاقی اور روحانی فعلیت بھی ہے جو خدا تک پہنچ کر ہی دم لیتی ہے۔ لہذا کسی بھی نظام تعلیم میں ان دونوں اقسام کی فعلیتوں کی تعلیم و تربیت کا اہتمام ضروری ہے۔ اور معلم انسانیت نے اپنے اسوہ حسنہ، طلب علم اور تربیت خاص سے صحابہ کرام کے لیے اس کا اہتمام کیا۔ آپ معلم انسانیت کے مذکورہ تینوں تعلیمی احسانات کا استحصال کریں، تو آپ کو یہ محسوس کرنے میں کوئی دقت پیش نہیں آئے گی کہ ہر مرحلہ میں فرد کی اصلاح اور حیات اجتماعیہ کی بہبود آپ کے پیش نظر رہی۔

تعمیر کردار کا سرچشمہ اعتقادات ہیں۔ اور اس کا منظر عادات و اطوار، جب تک اعتقادات درست نہ ہوں، عادات و اطوار صحیح نہیں ہو سکتے۔ افکار بدلنے ہی سے اعمال میں انقلاب پیدا ہو سکتا ہے۔ اور یہی نکتہ خاص تھا حضورؐ کی تعلیمات کا اور بعد کے مسلمان مفکرین نے اس نکتے کی تصریحات کر کے دنیا پر عظیم علمی احسانات کیے، جن کی مثال مستقبل میں بھی ملنا محال ہے۔ جیسے کہ میں نے پہلے عرض کیا ہے کہ انسان کی تخلیقی فعلیت کے ساتھ ایک روحانی اور اخلاقی فعلیت بھی ہے۔ اسی حقیقت کے پیش نظر معلم انسانیت نے تعلیم کے مقاصد کی بنیاد دینی امور و عقائد اور دنیوی مقاصد دونوں پر رکھی۔ اور فرمایا:

”تم میں افضل ترین وہ نہیں جو اس دنیا کو دوسری دنیا کی خاطر نظر انداز کر دیتا ہے۔ یا آخرت کو اس دنیا کی خاطر۔ بلکہ افضل وہ ہے جو دونوں کے لیے کام کرتا ہے۔“

تعلیم کی جو دینی اساس آپ نے مقرر فرمائی اس میں خدا پر ایمان، قرآن حکیم بطور سرچشمہ علم و ہدایت، خدا کے نزدیک انسانوں کا برابر ہونا، ایمان کی صفات پر یقین و عمل وغیرہ شامل ہیں۔ اس طرح تعلیم کے دنیوی مقاصد میں آپ نے حسب ذیل امور شامل فرمائے:

- ۱ - علوم محمودہ کے لیے سعی بلیغ کرنا -
- ب - مظاہراتِ فطرت کا گہرا تجربہ باقی مطالعہ کرنا -
- ج - ہر فرد کے لیے تعلیم کے موزوں ، مساوی مواقع فراہم کرنا -
- د - اختیاری مضامین کا انتخاب طالب علم کی ذاتی صلاحیتوں اور دلچسپیوں کی روشنی میں کرنا -

۱ - حصولِ علم و فن کے لیے باضابطہ تدریس و رہنمائی کا اہتمام کرنا -
ان مقاصد کے حصول اور انسان کی تخلیقی ، روحانی اور اخلاقی صلاحیتوں کی تربیت کرنے اور انہیں کاملاً بروئے کار لانے کے لیے تربیت اساتذہ کا ضابطہ وضع فرمایا - جس میں ضروری ہے کہ استاد کو قرآنِ حکیم کی جزئیات کا پورا پورا علم ہو - اور وہ عمومی اور سائنسی علوم کے علاوہ وجدانی صلاحیتوں کا بھی حامل ہو - تربیت اساتذہ کے لیے مسلمان مفکروں نے اصولِ منضبط کیے ان میں سے چند ایک حسب ذیل ہیں :

- ۱ - تعلیم کے باب میں صاحبِ شریعت کی اقتدا کرے -
- ب - شاگردوں پر شفقت کرے اور انہیں اولاد کے برابر سمجھے -
- ج - شاگرد کو نصیحت کرنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کرے -
- د - جہاں تک ممکن ہو شاگرد کو بری عادتوں سے کنایتاً اور پیار کے ذریعے منع کرے -
- س - استاد جو علم سکھاتا ہو ، شاگرد کے دل میں اس علم کے مقابلے میں دوسرے علوم کی برائی پیدا نہ کرے -
- س - شاگرد کے سامنے بیان کرنے میں اس کی سمجھ پر کفایت کرے -
- ص - استاد اپنے علم کے مطابق عمل کرتا ہو - اس کے قول و فعل میں کوئی تضاد یا اختلاف نہیں ہونا چاہیے -

ان مختصراً بیان کردہ اصولوں پر نظر کریں - تو صاف معلوم ہوگا کہ یہ اصول دینِ فطرت کے تقاضاؤں اور انسانی اہلیتوں کو سامنے رکھ کر وضع کیے گئے ہیں - اور تادمِ تاریخ عالم گواہ ہے ، کہ اساتذہ جب تک ان پر کاربند رہے ، انہوں نے بے بدل عالموں اور قابلِ رشک انسانوں کی تخلیق کی - یہ فطری اصولِ تعمیر کردار ہم نے اکثر نظر انداز کر دیے ، اور جدید نظریاتِ تعلیم میں ان کا دخل عمل ہائے نام رکھا - البتہ دینی مدارس میں ان اصولوں کی پابندی کسی طور پر ہو رہی ہے اور ہمارا مشاہدہ ہے کہ عقائد و نظریات کی پختگی کے اعتبار سے دینی مدارس کے

فاضلین عام تعلیمی اداروں کے فاضلین سے بہتر ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ تعلیمی افراتفری کے اس دور میں ان اصولوں کا وقتِ نظر سے مطالعہ کیا جائے۔ اور ان کی قابلِ فہم صورت کی ضروری اشاعت کرنے کے ساتھ ساتھ اس پر عمل درآمد کا اہتمام کیا جائے۔

تربیتِ اساتذہ

مسلمان اہل فکر نے جہاں مطالعہ سیرتِ پاک کی روشنی میں اساتذہ کی تربیت کے لیے کچھ اصول منضبط کیے وہاں انھوں نے معلمِ انسانیت کے کردار و عمل کی روشنی میں طلبہ کی سیرت کی نشوونما اور اخلاقی تربیت کے لیے کئی ایک مفید اصول متعین کیے اور ان کی تفصیلاً تشریح کی۔ یہاں چند ایک کا ذکر ضروری سمجھتا ہوں۔

”بچے کی تہذیب و تربیت ایک نہایت ضروری امر ہے۔ وہ اپنے والدین اور اساتذہ کے پاس ایک امانت ہے۔“

بچے کے لیے سب سے زیادہ ضروری پاکیزگی، نفس ہے۔

۱۔ بچے میں پہلے غذا سے رغبت پیدا ہوتی ہے۔ اس لیے اس کی تعلیم کی ابتدا کھانے کے آداب سے کر لینی چاہیے۔

ب۔ بچے کو محنت اور مشقت کا عادی بنایا جائے۔

ج۔ بچے کو سادہ اور سفید کپڑے پہننے کا شوق دلایا جائے۔

د۔ جب بچہ کوئی اچھا کام کرے تو تعریف کر کے اس کا دل بڑھانا چاہیے۔ اور اس کو انعام و صلہ دینا چاہیے۔

۴۔ دن کے وقت سونے سے منع کرنا چاہیے۔

۵۔ اس بات پر کڑی نظر رکھنی چاہیے کہ بچہ کوئی کام چھپا کر نہ کرے۔

۶۔ ہر روز کچھ پیدل چلنا اور ورزش کرنا بچے کے لیے ضروری ہے۔ نیز مناسب کھیل کھیلنے کا موقع دیا جائے۔

۷۔ اپنے پڑھنے لکھنے کے عمدہ سامان پر فخر و غرور نہیں کرنا چاہیے۔ اس امر کی بچے کو سخت تاکید کی جائے۔

ک۔ بچہ غریب ہو تو اسے بتایا جائے کہ کسی سے کچھ لینا حوصلہ مندی کے خلاف ہے۔

ل۔ جب تک کسی ایک فن کے متعلق کچھ نہ کچھ معلومات حاصل نہ کر لے کسی دوسرے فن

کی طرف توجہ نہ دے۔

ن۔ تمام علوم کی تحصیل کا مقصود خوشنودی خدا ہے۔

ق۔ جتنے بھی عمدہ علوم ہیں، ان کو حاصل کرنے کی کوشش کرے۔

نظا ہر مذکورہ اصول معمولی معلوم دیتے ہیں۔ مگر ان کی بنیاد طویل انسانی تجربات اور امور ربانی اور احکام فطرت پر ہے۔ اس لیے ان کی تاثیر سے انکار ممکن نہیں۔ بشرطیکہ ان پر اساتذہ خلوص سے عمل کریں۔ دراصل بچے کی فطرت اس درجہ پیچیدہ نہیں جس قدر مغربی اہل فکر نے تاثر دینے کی کوشش کی ہے۔ فطرت انہی تمام تر بوقلمونیوں کے باوصف سادہ ہے اور ویسے ہی بچے کی فطرت۔ یہی وجہ ہے کہ معلم انسانیت نے تعلیم اطفال اور تعمیر کردار کے لیے قرآن کرم اور اپنے کردار و عمل سے جو اصول منضبط کرائے ان کی افادیت اور تاثیر کسی بھی شک و شبہ سے بالاتر ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم عصری تقاضوں کی روشنی میں انکی تشریحات مرتب کریں۔ ان کی موزوں اشاعت و تبلیغ کریں اور انہیں تعلیمی نظام کے مختلف مدارج کا ضروری جز بنائیں۔ حصول و اشاعت علم و فن کے عمل کو موثر اور منظم بنائیں۔ اس سلسلے میں ضروری سہولتوں کو انسانی حقوق کی روشنی میں عام کریں۔ اس سارے عمل میں سیرۃ النبی اور صحابہ کبار کے علم و عمل سے استفادہ کریں۔

اخلاقیاتِ نبوی

جناب محترم ڈاکٹر برہان احمد فاروقی

جس نقطہ نظر سے یہاں نبوی اخلاقیات (جس کا ماخذ علمِ باوجودی ہے) کی وضاحت مطلوب ہے، اسے انسانی استعداد کی زائیدہ اخلاقیات سے متمیز کیے بغیر سمجھا ہی نہیں جاسکتا۔ ہمارے تاریخی سرمایہ علم میں ہمارے معلمین اخلاق نے انسانی اخلاقیات اور نبوی اخلاقیات میں جو التباس پیدا کر دیا ہے اس کو رفع کیے بغیر نہ تو دونوں قسم کی اخلاقیات کے درمیان امتیازات واضح ہو سکتے ہیں اور نہ نبوی اخلاقیات تک رسائی ممکن ہے۔ اس لیے امتیازات کو سمجھنے کے لیے بحث کی ابتدا انسانی استعداد کی زائیدہ اخلاقیات اور اس کے فکری پس منظر کے تجزیے سے کی جاتی ہے۔

اخلاقیاتِ قدما کے نزدیک

اخلاقیات شعورِ اخلاقی کا علم ہے۔ یہ ایک نصب العین یعنی انتہائے مقصود (غایت) کا علم ہے غایت خیر کہلاتی ہے۔ اس لیے اخلاقیات خیر کا علم ہے۔

کائنات اور انسان کی خیر

لیکن خیر کے تصور کو بالذات یعنی اپنے بسط معنی میں استعمال کیا جاسکتا ہے یا اسے مختلف اسناد کے حوالوں سے قبول کیا جاسکتا ہے۔ یہ کائنات کی خیر ہو سکتی ہے (افلاطون) یا عالم من حیث شکل کی غایت، جس کی طرف انسان اور اس عالم کی عظیم حرکت میں ہر چیز کو محیط ہے۔ یہ اس کائنات کے ایک جزو کی خیر ہو سکتی ہے۔ یعنی انسان کی خیر بحیثیت انسان۔ یہ اس کی فطرت من حیث الكل کی خیر ہو سکتی ہے جس میں اس کی صحت، فادغ البالی، مسرت، تہذیب، علم وغیرہ سب کچھ شامل ہے۔ یا یہ فطرت انسانی کے کسی مخصوص پہلو کی خیر ہو سکتی ہے، یعنی انسان کی خیر اس کے کردار کے حوالے ہے۔

۔۔۔ ماہیت خیر کی جستجو اور ماقبل سقراط فلاسفہ

اب ماہیت خیر کی جستجو، یعنی اخلاقیاتی جستجو تاریخِ فکر میں ان تمام مدارج کو لیے ہوئے ہے۔ ماقبل سقراط فکر کا تعلق فلسفہ نظری سے ہے۔ فلسفہ عملی سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ اس کا مسئلہ یہ ہے کہ کنہ کائنات کیا ہے؟ اس کا مسئلہ یہ نہیں کہ ماہیت خیر کیا ہے؟ بہر کیف جو کوئی کل حقیقت پر غور کر رہا ہے۔ یعنی فلسفی۔ وہ اس عالم میں انسان کے، یعنی اپنے مقام و منصب پر غور کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اس نکتے (یعنی انسان کے تعلق) پر غور و نغوض مذہبی اور اخلاقی غور و نغوض کی جانب رہنمائی کرتا ہے۔ اس طرح فلاسفہ قدیم کے افکار کے وہ تمام اجزا جو ہم تک پہنچے ہیں، ماہیت خیر کے بارے میں نہایت عمیق اور دقیق بیانات ہیں۔

لیکن یہ بیانات غیر مربوط ہیں، عامی فکر کی طرح غیر آہنگ ہیں اور ماہیت خیر کی جستجو کے طور پر کسی طریق و منہاج کے مطابق ایک منظم، مرتب اور باقاعدہ فکر کی حیثیت نہیں رکھتے۔

سوفسطہ کا ظہور

اس کے بعد سوفسطہ کا ظہور ہوتا ہے۔ علمائے دانش کا یہ گروہ فنِ حیات اور زندگی میں آگے بڑھنے کے فن کے مقبول اساتذہ پر مشتمل تھا۔ زندگی بسر کرنے کے فن میں یقیناً چند نیکیوں پر عمل پیرا ہونا بھی شامل ہے۔ یہ فن نیکیوں کے ایک مربوط نظام کو بھی محیط ہے اور ایک حد تک فکر کو نیکیوں پر بھی مرکوز رکھتا ہے۔ لیکن اس کا اولین تعلق نیکیوں کی ماہیت کی جستجو سے نہیں بلکہ نیکی سے اس کا سروکار ذائقہ کامیابی کی حد تک ہے۔ نیکی کے جزو قابلیت ہونے کی حد تک سوفسطائی فلسفہ اخلاقی کردار کا علم نہیں ہے۔

ماقبل سقراط فلاسفہ کا کوئی اخلاقی فلسفہ نہ تھا

اس طرح ماقبل سقراط فلاسفہ کی نسبت یہ نہیں کہا جاسکتا کہ ان کا کوئی اخلاقیاتی فلسفہ بھی تھا۔ قبل اس کے کہ کوئی اخلاقی مسئلہ پیدا ہو، اخلاقیاتی وقوف اور انسانی امتیاز کا پختہ ہوجانا ضروری ہے۔ پہلے مرکب کا وجود ہوتا ہے، پھر بیط کی نوبت آتی ہے۔ پہلے ہمارے سامنے واقعات ہونے چاہئیں، تب ہی ان پر غور کر سکتے ہیں۔ واقعات علمی تحقیقات کی جانب رہنمائی کرتے ہیں، کیونکہ ان کے درمیان تضاد اور التباس ہی سے اخلاقیاتی غور و فکر کی تحریک ہوتی ہے۔

(یہ تضاد والتباس سوفسطا نے پیدا کیا تھا۔ جہاں تک مابعد الطبیعیات کا تعلق ہے، نظریات کی کثرت نے انہیں تشکک بنا دیا تھا)

سقراط کا فلسفہ اخلاق

سقراط کا موقف یہ ہے کہ :

- ۱۔ نیکی علم ہے کیونکہ ہر فرد اپنی خیر کی تلاش میں ہے اور اسے نیکی تب ہی حاصل ہوگی جب وہ جانے گا کہ یہ اس کی خیر ہے۔ لہذا اچھائی اور برائی کا علم حاصل ہونا چاہیے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ علم علت ہے اور نیکی معلول ہے۔ لیکن اس کا میلان یہ ہے کہ علم کو سب سے بلند و بالا رکھا جائے۔
- ۲۔ نیکی مفید ہے۔ غایت سے ضرور مسرت اور فائدہ حاصل ہوتا ہے۔ اس کا فی الحقیقت مطلب یہ ہے کہ نیکی دراصل خوشگوار ہے اور لذت ہی غایت اصلی ہے۔

یونانی ذہن کے نزدیک نیکی اور لذت ہم آہنگ ہیں

یونانی ذہن دونوں خصائل — نیکی اور لذت — کو مخالف قرار نہیں دیتا۔ حقیقتاً یہ غایت قصویٰ کو مسرت کے اندازہ میں تصور کرنے سے نیکی کو لذت میں تبدیل کر دیتا ہے۔ اس کی حالت ایسی نظر آتی ہے جیسے ایک بچہ، یا ایک مہمول آدمی، جس کے لئے ابھی زندگی کی وحدت ختم نہیں ہوئی۔ زندگی کی وحدت واقعی اور معیاری دونوں ایک ہی سمت میں ہیں، مسلسل ہیں اور متمیز نہیں۔ یہ جدا جدا نہیں۔ ان دونوں کے درمیان شکاف نہیں ہے۔ ایک بچہ یا ایک مہمول آدمی نیک کرداری یا نیکی کو ایک آسان کارنامہ سمجھتا ہے، جس کی بدولت اسے دوسروں پر فوقیت حاصل ہوتی ہے، جس سے بالعموم اسے نفع اور طمانیت دونوں چیزیں حاصل ہوتی ہیں۔ وہ فرائض کے ایک محدود اور متعین دائرے میں زندگی بسر کر رہا ہے جنہیں وہ آسانی سے انجام دے سکتا ہے، جنہیں زمین کے بسنے والے اور اس کے زمانے کے سب لوگ سراہتے ہیں۔ وہ اخلاقیات کو غایت کی صورت میں تصور کرتا ہے۔ خواہش اور اس کی تکمیل کے طور پر۔ اس کے نزدیک فرض اور لذت ہم آہنگ ہیں۔

دور وسطیٰ کی اخلاقیات تکمیل فرائض میں متصور ہوتی ہے

ازمنہ وسطیٰ میں مذہب کے دور میں انسان بالغ ہو جاتا ہے۔ ازمنہ وسطیٰ میں زندگی کی وحدت ٹوٹ کر ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتی ہے۔ انسان حیاتِ ارضی سے بیزار ہو جاتا ہے۔ اور وہ قدم

(ETERNITY) کا باسی ہو جاتا ہے۔ ایک لامحدود وجود اس کے سامنے آجاتا ہے۔ وہاں سے اس کے فرائض کی ابتدا ہوتی ہے، جنہیں اس دنیا کی زندگی سے ہرگز نہیں ناپا جا سکتا۔ ان فرائض کے نتیجے میں لذت شاد و نامادری پیدا ہوتی ہے اور جہاں اسے لذت حاصل ہوتی ہے، وہ فانی لذتوں کے لیے کوئی ذوق ہی نہیں رکھتا۔ اس طرح وہ فرائض اور تسکین خواہشات (لذت) کو متضاد سمجھتا ہے۔ دونوں کے درمیان شکاف وسیع تر ہوتا جاتا ہے۔ وہ اخلاقیات کو قانون کی صورت میں تکمیل فرائض کے انداز میں احکام خداوندی کے طور پر تصور کرتا ہے۔

ہمارے معاین اخلاق کے علمی ولولے کا اثر

ہمارے معاین اخلاق اور فلاسفہ نے جب قرآن مجید کی اس آیت پاک سے ولولہ علم اخذ کیا

هَلْ يَسْتَوِي الَّذِينَ يَعْلَمُونَ وَالَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ ۝

تو ان کے ذہن اور دل سے انسانی علم اور علم بالوحی کے درمیان فرق کا شعور محو ہو گیا اور وہ سب انسانی استعداد ہی کے زائیدہ علم الاخلاق کو نبوی اخلاقیات تصور کرتے رہے۔

ترقی یافتہ انسانی اخلاقیات اور اخلاقیات نبوی

اخلاقیات یا علم الاخلاق کی دو قسمیں ہیں؛ ایک وہ اخلاقیات جو انسانی استعداد علم کے زائیدہ علم کی حیثیت رکھتی ہے۔ اور دوسری وہ جو اخلاقیات نبوی کی حیثیت رکھتی ہے اور علم بالوحی سے ماخوذ ہے۔ انسانی اخلاقیات کا موضوع فضائل اخلاق ان کا معیار اور ان کی مابعد الطبیعیاتی اساس ہے۔ اس کا مسئلہ یہ ہے کہ فضائل اخلاق کیا ہیں؟ ان کا معیار کیا ہے اور ان کی مابعد الطبیعیاتی اساس کیا ہے؟ اس کا وظیفہ معیار اخلاق کے حوائج سے فضائل و درذائل اخلاق کی توجیہ ہے۔ اس کا منہاج یہ ہے کہ پہلے مختلف قسم کے فقیہوں سے اخلاقی قضیے کو متمیز کیا جائے، مثلاً؛

مکان اچھا ہے (رہائش کے لئے)

گھوڑا اچھا ہے (سواری یا بار برداری کے لیے)

منظر اچھا ہے (اس لیے کہ فرحت بخش ہے)

محاسب اچھا ہے (کیونکہ حساب صحیح کرتا ہے)

طیب اچھا ہے (کیونکہ اس کے علاج سے جلد شفا ہوتی ہے)

آدمی اچھا ہے (کیونکہ اس کی سیرت اچھی ہے)

بینائی اچھی ہے (کیونکہ دور اور نزدیک کی چیزیں بغیر عینک کے صاف نظر آتی ہیں)
 صحت اچھی ہے (کیونکہ بغیر کان کے دماغی اور جسمانی محنت کی جاسکتی ہے)
 سیرت اچھی ہے (کیونکہ عمل اچھا ہے)

فطریہ اچھا ہے (کیونکہ علمی توجیہ ہو جاتی ہے)

گہرا اچھا ہے (کیونکہ سوال آسانی سے حل ہو جاتا ہے)

عمل اچھا ہے (کیونکہ وہ ایک معیار پر پورا اترتا ہے)

ان تفایا میں صرف تین قیضے اخلاقی قیضے ہیں۔ آدمی اچھا ہے۔ سیرت اچھی ہے۔ عمل اچھا ہے۔
 لہذا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ معیار کیا ہے؟ یہی انسانی استعداد کی زائیدہ اخلاقیات کا بنیادی
 مسئلہ ہے۔

انسانی استعداد کی زائیدہ اخلاقیات کی نشوونما کے بہت سے ارتقائی مدارج ہیں جن سے گزرنے
 کے بعد وہ اس مرحلے پر پہنچی ہے کہ اخلاقیات نبوی کے حوالے سے اپنی کمی پورا کر سکے۔

انسانی اخلاقیات کی نشوونما اقدام و خطا کے طریقے سے ہوتی ہے۔ کبھی یہ سوچا گیا کہ مقصود معیار
 کیا ہے؟ اس کے معنی یہ تھے کہ جس عمل سے مقصود حاصل ہو وہ نیکی ہے اور جس عمل سے مقصود حاصل نہ ہو
 وہ بدی ہے۔ اور مقصود کبھی تو خواہش کی تکمیل منظور ہوا، کبھی خواہش کی نفی منظور ہوا، کبھی
 عقلی تقاضے کی تکمیل منظور ہوا، کبھی عقلی تقاضا خواہش اور عقل دونوں کی متناسب تکمیل طے پایا۔ پھر یہ
 مشکل پیدا ہوئی کہ دونوں کا تناسب کیسے متعین ہوگا؟ اس طرز فکر نے مصلحت پرستی کو اخلاق بنا دیا۔
 حالانکہ انسان کا شعور اخلاقی اس سے بغاوت کرتا ہے۔

چونکہ انبیا کی تاریخ نے نوع انسانی کو دو قسم کی وراثت سپرد کی ہے: ایک انفسی وراثت، جو
 انسان کے باطن میں ہے، جس کی طرف اس آیت پاک میں اشارہ ہے:

وَرَجِيْۤ اَنْفُسِكُمْ اَفَلَا تَبْصُرُوْنَ ۝

اور دوسری آفاقی وراثت جو قرآن مجید ہے، جس سے نبوی اخلاقیات اخذ کی جاسکتی ہے۔
 تاریخ انبیا کی انفسی وراثت فجور و تقویٰ کے امتیاز، ربوبیت کے اقرار، اپنے نفس کی بصیرت
 اور امانت کی ذمہ داری کے احساس پر مشتمل ہے اور پورے عالم انسانی میں، کسی نہ کسی درجے میں، کم
 یا زیادہ یہ احساس موجود ہے کہ جو نشوونما نہ پاسکے، اس کا عدم اور وجود برابر ہو جاتا ہے۔ اسی
 لا شعور کو نشوونما دیکر، جس کی طرف اس آیت پاک میں اشارہ ہے:

فَطَرَهُ ۙ لِلّٰہِ الَّتِیْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَیْہَا

جسے بالقوہ فطرت کہہ سکتے ہیں، جسے نشوونما دیکر ایک زندہ طاقت بنا کر اس کے تحت بالفعل فطرت
 انسانی کو منضبط اور منقاد بنانے کے لئے انبیاء علیہم السلام کی بعثت ہوتی رہی، جس کے لئے علم بالوحی
 سے روشنی (تعیین غایت)، رہنمائی (لاٹکھ عمل) اور ہدایت غایت تک پہنچانے کا ضامن طریق کار میسر
 آتا رہا، جس کے زیر اثر انسانی استعداد کی زائیدہ اخلاقیات ارتقا پذیر ہو کر مقصود کے بجائے "اخلاقی حکم"
 کو معیار بنانے کے مقام عروج پر فائز ہوئی، جس کے معنی یہ ہیں کہ جو فعل اخلاقی حکم کی پیروی کی نیت
 سے صادر ہوتا ہے وہ نیکی ہے اور جو فعل اخلاقی حکم کی خلاف ورزی میں صادر ہوتا ہے وہی بدی ہے!
 اول تو ذہن انسانی حیات انسانی کو تمام فضائل اخلاق سے مزین کرنے کے لیے اخلاقی احکام کا احاطہ
 کرنے سے قاصر ہے اور اگر وہ اخلاقی احکام کا احاطہ کر بھی سکے تو بھی صرف یہ مسئلہ تو حل ہو جائے گا کہ
 فضائل اخلاق کیا ہیں اور ان کا معیار کیا ہے، مگر انسانی استعداد کا زائیدہ نظام اخلاقیات اس وقت
 تک مکمل نہ ہو سکے گا جب تک اخلاقیات نبوی کے حوالے سے پہلے یہ مسئلہ حل نہ ہو کہ زندگی فضائل اخلاق
 کے نمونے پر ڈھلے تو کیونکر۔ اس لیے اخلاقیات نبوی مقدم ہے اور انسانی استعداد کی زائیدہ اخلاقیات
 مؤخر ہے۔

لہذا نبوی اخلاقیات کا مسئلہ بعثت نبی علیہ التسلیم والتحیہ کے حوالے سے متعین ہو سکتا ہے۔
 نبوی اخلاقیات (علم الاخلاق)، کو علم بالوحی یعنی وحی قرآنی سے اخذ کرنا ضروری ہے۔ محمد رسول اللہ
 نے فرمایا ہے:

بُعِثْتُ لِأَتِمَّةٍ مَّكَارِمِ الْأَخْلَاقِ

یعنی میں مکارم اخلاق کے اتمام کے لیے مبعوث کیا گیا ہوں — مگر یہاں یہ عذر کرنا ضروری
 ہے کہ انسانی زندگی سب فضائل و محاسن و مکارم سے مزین ہو جائے بلکہ اتمام مکارم اخلاق اس
 وقت میسر آئے گا جب بدی کے مقابلے میں نیکی کو کسی قسم کا اضمحلال نہ ہو سکے۔ اس کا مطلب یہ ہے
 کہ غایت بعثت وہی ہے جو اس آیت پاک میں بیان ہوئی ہے:

هُوَ الَّذِي أَرْسَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدَىٰ وَدِينِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ
 كُلِّهِ ط وَ لَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُونَ ۝

مگر جب سے ہم نے انسانی استعداد کے زائیدہ علم اور علم بالوحی کے مابین امتیاز سے صرف نظر کیا ہے
 ہم انسانی استعداد ہی کی زائیدہ اخلاقیات کو نبوی اخلاقیات سمجھتے رہے ہیں۔ جسے اس میں شک ہو وہ
 حضرت مولانا سلیمان ندوی کی سیرت النبی کی چھٹی جلد کو غور سے دیکھے تو نظر آئے گا کہ (معاذ اللہ) اللہ تعالیٰ
 اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے شاگرد ہیں، کیونکہ اس میں فضائل اخلاق بھی ارسطوی کے بیان ہوئے

ہیں۔ عفت، شجاعت، حکمت اور اس الحسنت عدالت اور معیار افراط و تفریط کے درمیان نقطہ اعتدال جو ارسطو کو بھی نہیں معلوم کہ افراط و تفریط کی دو انتہاؤں کے درمیان کہاں واقع ہے اور اس کا مطلب یہ ہے کہ نیکی اور بدی کے درمیان نوعیت کا نہیں بلکہ مدارج کا فرق ہے۔ جو بدی افراط سے پیدا ہوتی ہے اس میں بدی کو کچھ کم کرنے سے وہ نیکی بن جائے گی اور جو بدی تفریط سے پیدا ہوتی ہے اس میں بدی کا اضافہ کرنے سے وہ نیکی بن جائے گی۔ جب سے ہمارے ذہن سے علم بالوحی اور انسانی علم کے درمیان امتیاز محو ہوئے ہیں ہم نے لوٹ کر نہیں دیکھا کہ ہمارے تمام معلمین اخلاق — ابن مسکویہ، محقق طوسی، محقق دوانی — اپنی عظیم الشان تصانیف میں ارسطو ہی کے فلسفہ اخلاق کی جگالی فرماتے رہے ہیں۔ ابن مسکویہ کی تہذیب الاخلاق تو ارسطو کی نیکو میکن اسٹیکس کا پتہ بہ ہے اور محقق طوسی اپنی اخلاق نامہری کے دیباچے میں یوں رقمطراز ہیں کہ: میرا کوئی شیوہ بجز ارسطو کے فلسفہ اخلاق کی ترجمانی کے نہیں ہے۔ اور محقق دوانی نے بھی ارسطو ہی کا فلسفہ اخلاق اخلاقِ جلالی میں پیش کیا ہے۔ شیخ اکبر حضرت محی الدین ابن عربی نے بھی اپنے فلسفہ اخلاق پر مشتمل رسالے میں ارسطو ہی کے فضائل اخلاق کو فضائل اخلاق سمجھا ہے جو دور جاہلیت کے وتن پرستی کے ماحول میں فضائل اخلاق متصور ہوں تو ہوں مگر نبوی اخلاقیات کی روشنی میں ان کی حیثیت فضائل اخلاق سے مختلف نہیں رہ جاتی۔

انسانی علم اور علم بالوحی

جب تک انسانی علم اور علم بالوحی کے درمیان امتیازات پیش نظر نہ رہیں، علم بالوحی سے استفاضہ ممکن نہیں۔ انسانی علم تو اس استعداد کے قوت سے فعل کی طرف آنے کا نتیجہ ہے جس کی طرف اس آیت پاک میں اشارہ ہے:

عَلَّمَ آدَمَ الْأَسْمَاءَ كُلَّهَا

یہ استعداد اور اس سے پیدا ہونے والے علم کی نشوونما اقدام و خطا کے انداز میں ہوتی رہی ہے۔ اس لئے اس کی نشوونما کا اتمام کو پہنچنا تو کجا اس کے اتمام کا رخ بھی متعین نہیں ہو سکا اور انسانی فکر تضادات میں الجھ کر رہ گیا اور انسانی ذہن کا نر اسیرہ علم یہ طے نہ کر سکا کہ اخلاق کا معیار "مقصود" ہے یا "حکم" ہے کیونکہ بار بار معیار کے باب میں رائے بدلتی رہی۔ بخلاف اس کے نبوی علم و سبب نمائش، بذلِ مجرد اور فضلِ محض ہے۔ وحی سے ماخوذ ہے،

احتمالی خطا سے پاک ہے، ہمیشہ سے کامل ہے۔

انسانی علم اور علم بالوحی میں امتیاز

انسانی علم اور علم بالوحی کے درمیان امتیازات کو سمجھنے کی اولین شرط یہ ہے کہ پہلے علم اور عمل کے درمیان امتیاز کو سمجھا جائے کیونکہ علم کا موضوع حقیقت محسوس ہے اور عمل کا موضوع مقصود ہے۔

علم کا مسئلہ یہ ہے کہ حقیقت کیا ہے۔ اور عمل کا مسئلہ یہ ہے کہ مقصود حاصل کیسے ہو؟
علم کی ابتدا شک سے ہوتی ہے۔ عمل کی ابتدا یقین سے ہوتی ہے۔
علم میں ادراک اہم ہے۔ عمل میں ارادے کو اہمیت حاصل ہے۔
علم کا بنیادی تصور جبر ہے۔ عمل کا بنیادی تصور اختیار ہے۔
علم کا وظیفہ توجیہ و تعلیل ہے۔ عمل کا وظیفہ تخلیق نتائج ہے۔

علم کے مضمرات — یعنی وہ شرائط جن کے پورا ہونے کے ساتھ علم مشروط ہے — یہ ہیں کہ ایک طرف ناظر ہو، دوسری طرف منظور ہو۔ ناظر میں ادراک کی صلاحیت ہو اور منظور الیا ہو جو ناظر کی استعداد سے ادراک میں آسکے تو علم حاصل ہوگا۔ — بخلاف اس کے عمل کے مضمرات یہ ہیں کہ ایک طرف فعال عامل ہو، دوسری طرف مقصود ہو۔ حصول مقصد کی جدوجہد کی راہ میں مزاحمت ہو اور فعال عامل کی جانب سے مزاحمت کی فراحت ہو تو مقصود حاصل ہو کر رہے گا۔

لہذا انسانی استعداد کی زائیدہ اخلاقیات کا مسئلہ یہ ہے کہ فضائل اخلاق کیا ہیں؟ ان کا معیار کیا ہے؟ اور ان کی ما بعد الطبیعیاتی اساس کیا ہے؟ درمیان یہ یاد رہے کہ جس ما بعد الطبیعیات کا مطالبہ انسانی استعداد کی زائیدہ اخلاقیات کو ہے اس کی استعداد انسانی کو عطا نہیں کی گئی،

بعثت نبوی کا مقصود حیات انسانی کے انفرادی (اخلاقی)، اجتماعی (معاشرتی)، معاشی (سیاسی) اور بین الاقوامی پہلوؤں میں انقلاب لانا ہے۔ اور وحی قرآنی کا پیغمبرانہ قیادت کی دعوت انقلاب میں اسے ہدایت فراہم کرنا ہے۔ اخلاق کا تعلق افراد اور معاشرے سے ہے کیونکہ پیغمبرانہ قیادت جن خصائص کا حامل معاشرہ پیدا کر کے اس کے ذریعے بین الاقوامی سلج پر دین حق کو غالب کرنا چاہتی ہے وہ یہ ہیں:

- معاشرہ نوع انسانی کی وحدت کے تصور پر مبنی ہو۔
- اخلاقی جدوجہد کرنے والے روحانی الذہن افراد پر مشتمل ہو۔
- ان کی جدوجہد کا رخ یہ ہو کہ فرد اور معاشرہ ہر قسم کے خوف اور غم سے محفوظ رہے۔

نبوی اخلاقیات کے مسائل

لہذا انقلابی اخلاقیات نبوی کے مسائل یہ ہیں :

- ۱ زندگی کے انفرادی (اخلاقی) پہلو کی اصلاح طلب خاصیت کیا ہے ؟
- ۲ اس اصلاح پذیری کا تصور کیا ہے ؟
- ۳ کس نصب العین کے حوالے سے اصلاح ہوگی ؟
- ۴ حصولِ نصب العین کے یقین کی اساس کیا ہے ؟
- ۵ حصولِ نصب العین کا نتیجہ نیز لائحہ عمل کیا ہے ؟
- ۶ اس پر عمل پیرا ہونے کی عملی اساس کیا ہے ؟
- ۷ عملی جدوجہد کو پرکھنے کا معیار کیا ہے ؟
- ۸ اس جدوجہد میں کامیابی کا نمونہ کمال کیا ہے ؟ اور
- ۹ وہ محرک عمل کیا ہے جو استقامت دلادے اور انحراف نہ کرنے دے۔

انسانی استعداد کی زائیدہ اخلاقیات نہ تو تصادات سے پاک ہو سکی ہیں نہ نتیجہ نیزی کی ضمانت سے متصف ہیں۔ جس کی وجہ یہ ہے کہ ان کا مسئلہ ہی اس سے زیادہ نہیں ہے کہ فضائل اخلاق کیا ہیں اور ان کا معیار کیا ہے ؟

انسانی علم اور علم بالوحی میں التباس

علم بالوحی (قرآنی علم) پیغمبرانہ قیادت کی انقلابی جدوجہد کے مسائل کو حل کرنے کے لیے نازل ہوا ہے جو انقلاب کو نتیجہ نیز بنانے کے لیے انسانی استعداد کے زائیدہ علم کی حاجت مندی سے بے نیاز کرتا ہے۔ مگر مذہبی ذہن کی معذوری یہ ہے کہ وہ یہ تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں ہے کہ قرآن مجید کے ایک ایک لفظ اور زیر زبر کے محفوظ ہونے کے باوجود قرآنی علم نے انسانی استعداد کے زائیدہ علم کی حاجت مندی سے بے نیاز کر دیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مذہبی ذہن نے قرآنی مفہوم میں اسے کتاب سمجھنے کے بجائے لغت کے حوالے سے تورت کی تمثیل پر قیاس کر کے صرف اوامر و نواہی کا لکھا ہوا ضابطہ تصور کیا ہے۔ اور تورت کی معذوری یہ تھی کہ اس کی پیروامت زوال میں مبتلا ہو جانے کے بعد صرف تورت کے حوالے سے نئے

مشت کے بغیر زوال سے نہ نکل سکی تھی۔ اس لیے مذہبی ذہن کے نزدیک امت مسلمہ کی معذوری بھی یہی ہے کہ وہ بھی زوال پر پہنچ کر قانون سازی کے بہار زوال سے اس لیے نہیں نکل سکتی کہ جب وحی قرآنی سے ایک دفعہ اوامر و نواہی کا علم حاصل ہو گیا تو وہ انسانی علم بن گیا۔ اور اب یہ انسان ہی کی ذمہ داری ہے کہ وہ اس حکام شرعی کی پیروی کرے تو اصلاح پذیر ہو، نہ کرے تو گمراہی میں مبتلا رہے۔

شرع کو اخذ کیا گیا اور منہاج سے صرف نظر کیا گیا

در اصل اس موقف کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ آیت
 وَلِكُلِّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَمِنْهَا جَاہٌ
 میں مذہبی ذہن نے اپنی توجہ صرف ”شرع“ پر مرکوز رکھی اور ”منہاج“ سے صرف نظر کر لیا حالانکہ منہاج وہ طریق کار تھا جس کے ذریعے زندگی شرعی اقدار و فضائل کے نمونے پر ڈھلتی کیونکہ علم بالوحی کا تو مسئلہ ہی یہ تھا کہ حیات انسانی کو اپنے انفرادی (اخلاقی)، اجتماعی (معاشرتی، معاشی، سیاسی) اور بین الاقوامی پہلوؤں میں جس نمونے پر ڈھلنا چاہیے وہ ڈھلے کیونکہ؟

دوسری وجہ تکمیل دین کے قرآنی مفہوم کو مسخ کر کے اسے تکمیل فقہ قرار دینا ہے۔ ایک اور وجہ اس حقیقت کو نظر انداز کر دینا ہے کہ موثرات زندگی (اخلاق، علم، مذہب، معاشرت، معیشت، سیاست) کے بدل جانے سے زندگی کے تقاضے احکام فقہ کی خلاف ورزی ہی سے پورے ہو سکتے ہیں۔ یہ سب کچھ قرآن مجید سے قانون حیات اخذ کرنے کے بجائے صرف فقہی قانون کو اخذ کرنے کا نتیجہ ہے۔ قانون سازی اس وقت تک موثر رہی جب تک سلاطین غلبے اور اقتدار سے محروم نہیں ہوئے۔ جب سلاطین اقتدار سے اور قانون قوتِ نافذہ سے محروم ہوا تو قانون بے اثر ہو گیا۔ اگر ”کتاب“ کا قرآنی مفہوم پیش نظر رہتا ہوتا تو اسے لغت کے حوالے سے اوامر و نواہی کا لکھا ہوا ضابطہ سمجھنے کے بجائے قانون حیات کا ماخذ سمجھ کر اس سے زندگی طلب کی جانی چاہیے تھی۔

کتاب کا قرآنی مفہوم

کتاب کا قرآنی مفہوم سمجھنے کے لیے قرآن مجید میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس اندازہ مخاطب پر غور کرنا ضروری ہے۔

وَمَا كُنْتَ تَدْرِي مَا الْكِتَابُ وَلَا الْإِيمَانُ

دکھو یہ بات آپ کا ادراک ذاتی نہیں ہے کہ کتاب کیا ہے اور ایمان کیا ہے بلکہ آپ کو وحی سے معلوم ہوا ہے

اگر کتاب کو کتاب سمجھنا وحی کے ساتھ مشروط نہ ہوتا تو توریت تو پہلے سے موجود تھی ہی قرآن مجید سے کتاب کے جس مفہوم کی نشاندہی اس آیت میں کی گئی ہے اسے ان آیات کے حوالے سے سمجھنا فروری ہے:

لِكُلِّ أُمَّةٍ أَجَلٌ

دہر امت کے لیے ایک فیصلہ کن ساعت ضروری ہے

لِكُلِّ أُمَّةٍ أَجَلٌ كِتَابٌ

دہر فیصلہ کن ساعت کے لیے کتاب ضروری ہے

جب تک یہ بات سمجھ میں نہ آئے کہ امت کے تعلق میں فیصلہ کن ساعت کے اندر فیصلہ یہ ہوتا ہے کہ کونسی امت اپنے اعمال کی بنیاد پر اس بات کی حقدار ہے کہ وہ باقی رہے اور ترقی کرے اور کونسی امت اپنے اعمال کی بنا پر مٹا دیے جانے کی سزا وار ہے۔ اس وقت تک یہ بات سمجھ میں نہیں آسکتی کہ فیصلہ کن ساعت سے کتاب کا کیا تعلق ہے؟ کتاب کا مفہوم کافروں پر قرآن مجید کے اس طنز کے حوالے سے

لَا هُدًى وَلَا كِتَابٌ مُّذُنِّرٌ

نہ حیات بخشی کا مٹا من مقصود ہے نہ اس مقصود تک پہنچانے کا حتمی نتیجہ خیز عمل ہے اور کافروں پر اس طنز کا جواز تب ہی پیدا ہوتا ہے جب قرآن مجید خود وہ کتاب اور ہدایت ہو۔

نبوی اخلاقیات کے مسائل کا حل

لہذا

نبوی اخلاقیات کے مسائل کا حل یہ ہے:

(۱) زندگی کے انفرادی (اخلاقی) پہلو کی اصلاح طلب خاصیت انسان کی بالفعل فطرت یعنی جبلی داعیات، طبعی خواہشات اور نفسانی تقاضوں کا اپنے آپ کو بلا قید پورا کرنے کا میلان اور اس کا مجموعہ اضرار ہونا ہے، جس کی نشاندہی اس آیت پاک میں

کی گئی ہے :
 زَيْنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوَاتِ مِنَ النِّسَاءِ وَ الْبَنِينَ وَ الْقَنَاطِيرِ
 الْمُتَقَنَطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَ الْفِضَّةِ وَ الْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَ الْأَلْعَامِ
 وَ الْخَرَّتِ ذَٰلِكَ مَتَاعُ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا

(۲) اصلاح پذیری کا تصور یہ ہے کہ انفرادی زندگی ضبط و انقیاد کی پابند بنائی جائے
 اور اس میں فاعل اخلاق کے اپنے متعلق اور دوسروں کے تعلق میں جن فضائل کا
 پیدا کرنا ضروری ہے وہ پیدا کیے جائیں۔

(۳) اس زندگی میں ہر تبدیلی نصب العین کے حوالے سے لائی جاسکتی ہے۔ اور وہ
 نصب العین جس کے حصول کی جدوجہد کے ضمن میں اخلاقی فضائل پیدا ہوئے بغیر نہیں
 رہ سکتے، انسان مرتضیٰ یعنی ایسا انسان بننے کا نصب العین ہے جس سے اللہ راضی
 ہو۔

(۴) اس نصب العین کے حاصل ہو کر رہنے کے یقین کی اساس انسان کی مابعد الطبیعی نعت
 سے جس کی طرف اس آیت پاک میں اشارہ ہے :

فِي الْفُسُكُمُ أَفَلَا تُبْصِرُونَ

یہ انسان کی فطرت کا بالقوہ پہلو ہے جس کی نشاندہی اس آیت پاک میں کی گئی ہے :

فِطْرَةَ اللَّهِ الَّتِي فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا

فطرت انسانی کا یہ پہلو مجبور و تقویٰ کے امتیاز، ربوبیت کے اقرار، اپنے نفس کی
 بعیرت اور امانت کی ذمہ داری کے احساس پر مشتمل ہے جن کی طرف ان آیات میں

اشارہ ہے :

الْمَهْمَا فُجُورًا هَا وَ تَقْوَاهَا

أَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ قَالُوا بَلَىٰ

بَلَىٰ الْإِنْسَانُ عَلَىٰ نَفْسِهِ بَصِيرَةٌ

إِنَّمَا عَرَضْنَا الْأَمَانَةَ عَلَى السَّمَوَاتِ وَ الْأَرْضِ وَ الْجِبَالِ فَأَبَيْنَ أَنْ
 يَحْمِلْنَهَا وَأَشْفَقْنَ مِنْهَا وَ حَمَلَهَا الْإِنْسَانُ إِنَّهُ كَانَ ظَلُومًا جَهُولًا

(۵) کائنات کی ساخت میں مضمروہ قانون نشوونما جو اپنی بنا صیت میں ناقابل تغیر ہے
 اور ناقابل شکست ہے، مزاحمت اور مزاحمت کا قانون ہے۔ جس کی تشکیل قرآن مجید

میں ان الفاظ میں کی گئی ہے :

بَجَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا مِّنَ الْمُجْرِمِينَ

ہم نے ہر نبی کے لیے مجرموں میں سے ایک دشمن پیدا کر دیا)

یہ دشمن جب پیغمبرانہ دعوت کی مزاحمت کرتا ہے تو اس مزاحمت کی مزاحمت سے دعوت
نتیجہ خیر ثابت ہوتی ہے ۔

جب اخلاقی کمال کے حصول کی جدوجہد میں بالفعل فطرت مزاحم ہوتی ہے تو فحور و
تقویٰ کے امتیاز اور ربوبیت کے اقرار کے حوالے سے بالقوہ فطرت اس مزاحمت
کی مزاحمت سے بالفعل فطرت، رجلی داعیات، طبعی خواہشات اور نفسانی تقاضوں
پر غالب آتی ہے۔ اور اسے ضبط و انقیاد کا پابند بنانے میں کامیاب ہوتی ہے۔

(۶) اس کا لائحہ عمل عبادت کے ذریعے ایثار، انفاق اور احسان کے جذبات کو نشوونما
دیتا ہے۔

(۷) اس کی عملی اساس اخلاق اور معیشت کے درمیان باہمی جواہی اضافی مستفانی اور
وجوبی تعلق کا ادراک ہے۔ جس کی طرف اس آیت پاک میں اشارہ ہے :

لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتَّى تُنْفِقُوا مِمَّا تُحِبُّونَ

اگر تم اس وقت تک نیکی حاصل نہیں کر سکتے جب تک اس میں سے خرچ نہ کرو جو تمہاری
فطرت میں پسندیدہ ہے)

انفاق فاعل اخلاق کی تو نیکی ہے اور اس انفاق سے مستفید ہونے والے کے حق میں
معیشت ہے۔ اور یوں اخلاق اور معیشت کا وجوبی تعلق متصور ہوتا ہے اور اس
کی نتیجہ خیزی کا امکان نہیں۔

(۸) اخلاقی فضائل کا معیار نبوی اخلاقیات میں تو ”حکم“ ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ جو
فعل منزل من اللہ حکم کے اتباع سے صادر ہو وہ اخلاقی فضیلت رکنی ہے اور
جو ”حکم“ کی خلاف ورزی کی نیت سے سرزد ہو وہ اخلاقی ردالت (بدی) ہے۔

بخلاف اس کے انسانی استعداد کی زائیدہ اخلاقیات کی رو سے مقصد معیار ہے،
جس کے معنی یہ ہیں کہ جس عمل سے مقصود حاصل ہو وہ نیکی ہے اور جس سے حاصل

نہ ہو وہ بدی اور ہمارے معلمین اخلاق ابھی تک جاہلیت کے اخلاقی معیار کی پیروی
سے نہیں نکلے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو کبھی واعظین کرام کی زبان سے افراط و تفریط کے درمیان

نقطہ اعتدال کے معیار اخلاق کی تبلیغ بلکہ ارسطو کی ایسی معیار اخلاق بھی سننے میں نہ آتا۔

نمونہ کمال

نبوی اخلاقیات کی رو سے نمونہ کمال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل ہے :
لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ
لِمَن كَانَ يَرْحُوا اللَّهَ وَالْيَوْمَ الْآخِرَ

استقامت کا محرک

نبوی اخلاقیات کی رو سے ایسا محرک محمد رسول اللہ کی تصدیق اور تکذیب کا، یعنی اسلام اور کفر کا تضاد ہے اور انسان کے لا شعور میں یہ حقیقت جاگزیں ہے کہ ہر کامیابی کے لیے فضائل اخلاق ضروری ہیں۔ اگر فضائل و رذائل کے امتیاز سے شعور عاری نہ ہو تو پہلا تضاد خواہش اور فرض کے درمیان متصور ہوگا۔ اور دوسرا خواہشات کے غلاموں اور فرض کی ادائیگی کے ذمہ داروں کے درمیان۔ اور یہی وہ تضاد ہے جس سے پیدا ہونے والی مزاحمت کی مزاحمت سے اخلاقی فتح وابستہ ہے !

دعوت و تبلیغ

رسول اکرم کا عزم و استقامت

جناب محترم ڈاکٹر الیس ایم۔ زمان

مجھے اپنی معروضات کا آغاز اس اعتراف و اعتذار کے ساتھ کرنا ہے کہ
و محققین کے اس مقتدر اجتماع میں کوئی علمی و تحقیقی مقالہ پیش خدمت نہ
کر رہا ہوں۔ محترمی حکیم صاحب نے محض اپنی روایت کریمانہ کے پاس خاطر سے
اور دانشوروں کی اس محفل میں حاضر ہونے کا بلاوا ارسال فرمایا تو ان کی کہ
گستری و عزت افزائی پر اظہار تشکر کے ساتھ اپنی جوانی تخریر میں گزارش کی
”اخلاقیات نبوی کے موضوع پر مذاکرہ ملی کے اہتمام کے لیے مبارکباد
تو آپ کو کل عالم دے گا، یہ گنہگار صمیم قلب سے آپ کا شکر یہ ادا
کرتا ہے کہ یہ موضوع میری، میرے بچوں کی، میرے احباب اور اقربا
اور رفقاء کی اور میری قوم کی شدید ترین ضرورت ہے۔

ایک ماہرِ نباض کی طرح آپ نے ہماری انفرادی و اجتماعی زندگی
کی دکھتی رگ۔ ہماری رونہ برونہ انحطاط پذیرہ اخلاقی اقدار۔ کو پکڑا
ہے، ایک طبیبِ سہاذق کی طرح اس مہلک مرض کے نسخہء کھسیا۔
اخلاقیات نبوی۔ کی نشاندہی کی ہے اور پھر قومی سطح پر اس کی طرف
توجہ دلانے کے لیے ہمدرد کے وسائل اور معروف تجربہ کو کام میں
لانے کی روایت جاری رکھنے کا عزم کیا ہے۔ یہ مرض واقعہً اہل
درد اور اہل مرض کی فوری توجہ کا مستحق ہے۔ کہ بندے بندے
کو لاسوق ہے۔ کونسی و باہوگی جس نے اپنے ہلاکت آفرین بچے اس ظالمانہ
وسعت کے ساتھ انسانوں کے قلب میں پیوست کیے ہوں کہ کوئی
اعلیٰ یا اسفل، حکیم یا جاہل نہ بچا ہو۔ ستم یہ کہ مرض معلوم و معلوم
طبیب مشفق و رحیم بلکہ رحمتہ للعالمین، اس کی دعوتِ عام برائے

اہل انام۔ مگر معاذ اللہ کیا ہولناک منظر ہے کہ مریض اپنے رستے ناسور
 اپنے ہی ناخنوں سے کریدتے توپتے چلے جائیں، لہو لہان ہوتے جائیں،
 پر اپنے مرض کو آسان خیال کریں اور درخور اعتنا نہ سمجھیں یا سرے
 سے مرض ہی نہ مانیں۔ اور اس طرح اپنے رستے ناسوروں کو بہائم کی طرح
 بھنبوڑتے ہوئے بے بس ہو ہو کر گرتے جائیں۔ اجتماعی خودکشی کرنے
 والوں کا یہ خود فراموش جرم غیفر!!! کاش کوئی آواز اخلاق ہم منطلوموں
 کو اس قاتل بے حسی کی کیفیت سے بیدار کر کے ان گنہگار زخموں پر طبیب
 شرب صلی اللہ علیہ وسلم کا عطا کردہ مرہم رکھ سکے۔ اور ہم گنہگاروں
 کے ابدی تشکر کی سزاوار ہو۔ آخر میں اس دلی تمنا کا اظہار تھا کہ ا
 ”مجھ گنہگار کی دعا بھی بے آرزو بھی کہ یہ مذاکرہ ملی و علمی و تحقیقی مقالاتِ فاضلہ
 کے وزنی پشاورہ کے بجائے اہل درد کی عارفانہ صدائے صدق ہو، سچی آواز اخلاق ہو۔“
 مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی رحمۃ اللہ اپنی کتاب ”سیرت سرور عالم“ جلد اول کے
 مقدمہ میں ارشاد فرماتے ہیں :

”یہ ایک حقیقت ہے کہ قرآن اور سیرتِ محمدی علی صاحبہا الصلوٰۃ و
 السلام دو نو ہی بحرِ ناپیدا کناہ ہیں۔ کوئی انسان یہ چاہے کہ ان کے تمام معانی
 اور فوائد و برکات کا احاطہ کرے تو اس میں کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا۔ البتہ
 جس چیز کی کوشش کی جا سکتی ہے وہ بس یہ ہے کہ جس حد تک ممکن ہو آدمی
 ان کا زیادہ سے زیادہ فہم حاصل کرے اور ان کی مدد سے روحِ دین تک
 رسائی پائے۔“

یہ ہماری خوش نصیبی ہے کہ نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کی گرامی شخصیت انبیاء و مصلحین
 عالم میں اس لحاظ سے مسلمہ طور پر شانِ امتیاز کی حامل ہے کہ آپ کی حیاتِ طیبہ کا ہر پہلو
 تاریخ کی پوری روشنی میں ہے۔ شمعِ رسالت کے پروانوں نے آپ کے احوال و اخبار و فضائل
 ہی نہیں ہر ہر ادا کو آنے والی نسلوں کے لئے محفوظ کر لیا۔ اور ہر دور میں حاملینِ علم کا ایک
 معزز و محترم گروہ نسلًا بعد نسل ابلاغ کے اس مقدس و طیبے پر سرفراز ہوتا رہا۔ نہ ہے
 نصیب اس امت کے جس کا نورِ بصیرت، ابدی ہدایت کا نسخہ کیمیا ہر تحریف و تغیر سے مترا اور

لے ابوالاعلیٰ مودودی: سیرت سرور عالم۔ جلد اول، لاہور، ادارۃ ترجمان القرآن، ۱۹۷۹ء (طبع دوم)، ص ۳۶

جس کے ہادی و مولا کا اسوہ حسنہ و کا بلہ مثل آئینہ مصفا۔ اور حیف اس قوم کی بے نصیبی پر جو روح کو حرارت ایمان بخشنے والی، آدمی کو انسان بنانے والی، بلکہ معراج انسانیت تک پہنچانے والی اس برقی قوت کے سرچشمہ سے اپنے آپ کو منقطع کر لیتی ہے جو ہدایت کے آفتاب عالمتاب کی حیات بخش شعاعوں سے فرار اختیار کرتی ہے۔ اور اندھیروں کی وادی میں فروزاں چمکیلی مگر نہ ہرٹی روشنیوں کی طرف لپکتی ہے۔ اور اس طلسمات کے سحر میں مسکور ان متعفن اور اذیت ناک ناسوروں سے بے خبر ہے جو ان مسموم شعاعوں میں پک رہے ہیں جن میں ان کا وجود گل رہا ہے۔ صدائے ہجرس برابر سنائی دے رہی ہے، مگر کچھ کان بہرے ہو چکے، کچھ اسے پہچانتے نہیں، کچھ خوفزدہ ہیں، کچھ کان کھڑے ہوتے ہیں مگر زبان کو لبیک کا یارا نہیں۔ کہاں ہیں وہ نفوس قدسیہ جن کی آواز ان بیمار دوتوں اور مفلوج جسموں میں حرارت نہ لیست دور ا دے۔ ان کو کشاں کشاں طیبِ یثرب کے قدموں میں لا ڈالے جہاں دوا بھی ہے شفا بھی ہے۔ یہیں سے ان کی ابتداء تھی یہیں انتہا بھی ہے۔ انہی قدسی قدموں کے صدقے اس کی اٹھان تھی، اڑان تھی۔ یہیں اس کا ملجا بھی ہے ماویٰ بھی۔

ہر سال ہمارے ناں میلاد کی محفلیں سمجتی ہیں۔ تقاریر کا انعقاد ہوتا ہے، مذاکرے، شعروں، جلسوں، جلوسوں کا اہتمام ہوتا ہے۔ ماہ و سال اپنے ناگزیر سفر میں محو نترام رہتے ہیں پر دانش و تحقیق کے پشاوروں تلے دبے دانشوران ملک و ملت نے کبھی سر اٹھا کر حساب کیا کہ ہم کتنے قدم آگے بڑھے ہیں اس قدر مقدس نقش پا کی طرف جسے نشانِ منزل بنانے کے عہد کے ساتھ ہم نے آزادی کا سفر شروع کیا تھا، محلِ فکر بھی ہے اور مقامِ فکر بھی کہ۔

۱ ہم اس پیغمبر و فاکیش کے نام لیوا جس نے مشرکین کے ہاتھوں منطوم و مجبور پانہ پانہ نجر نو جوان ابو جندل کو ڈوبتے دل اور ڈبڈباتی آنکھوں کے ساتھ اس کے والد سہیل بن عمرو کے سپرد کر دیا کہ صلح کی بات طے پا چکی تھی۔ گو عہد نامہ حدیبیہ ابھی لکھا نہیں گیا تھا، نہ اس پر دستخط ہوئے تھے۔

ہم نے بھی اپنے خالق و مالک سے ایک عہد کیا جس کی صدائے بانہ گشت ہمارے بچوں، بوڑھوں، مردوں، عورتوں کی زبان کا ورد ہو گئی۔ پاکستان کا مطلب کیا لا الہ الا اللہ

ع۔ ابن ہشام، السیرۃ النبویہ، القسم الثانی، مصر، مصطفیٰ البیانی الحلیبی، ۱۳۷۵ھ / ۱۹۵۵ء، ص ۳۱۸

کالعرہ قریہ قریہ گاؤں گاؤں گوسنجا۔ ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو رتبہ جلیل نے ایک مرد
عظیم کے ہاتھوں اپنا وعدہ پورا فرما دیا۔ ہمارے حصے کی شوق باقی رہی۔ ۳۵ برس
ہونے کو آئے ہیں اس عرصے میں ایک نئی نسل جوان ہو کر کہولت کو پہنچ گئی۔ کیا ہم
اپنا قرض اتار چکے؟ ہم نے ارض پاکستان کو لا الہ الا اللہ کا جیتا جاگتا نقشہ بنانے میں
کہاں تک پیش رفت کی؟ ہماری انفرادی و اجتماعی زندگی پر کہاں تک اخلاقیات
و تعلیمات محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا رنگ چڑھا؟

دستوری یا قانونی بحث پیش نظر نہیں، ہمارے معاشرے کے عملی خدو و خال
پر نگاہ ہے، ذرا اپنے گرد و پیش کا جائزہ لیں۔ کہاں تک اس میں اسلامی معاشرے
کی شان ہے۔ اخبارات کے کالم گواہ ہیں کہ قتل، حادثاتی ہو یا ارادی، روز کا معمول
بن چکا ہے۔ ڈاکہ زنی کوئی چونکا دینے والی خبر نہیں رہی۔ فحاشی اور بدکاری کی
بعض لرزہ خیز مثالیں حتیٰ کہ مقدس رشتوں کی پامالی اگر شاذ و نادر کے ضمن میں بھی آئیں
تو تقویٰ اور خدا ترسی کے رجحان کے تشویشناک فقدان کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔ پچھلے
دنوں وفاقی شرعی عدالت نے ایک دس سالہ معذور بچی کی آبرو ریزی کی کوشش کے
الزام میں سزا یافتہ ایک ملزم کی اپیل مسترد کی۔ یہ گوجرانوالہ کے ایک نواحی گاؤں میں نامعلوم
افراد نے انتہائی سفاکی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ایک چار سالہ معصوم لڑکے کو نامعلوم
وجوہ کی بنا پر مسجد میں لے جا کر ذبح کر دیا۔ لے۔ قرآن میں ارشاد ہوا اللہ مسرفون کو دوست
نہیں رکھتا، جن کے بندے وہ ہیں جو خرچ کرتے ہیں تو اسراف نہیں کرتے، نہ سبھل سے کام لیتے
ہیں بلکہ باہ اعتدال اختیار کرتے ہیں۔ ایک سرکاری ادارے کے حالیہ سروے کے مطابق
لاہور کے شہری پان سگرٹ پر روزانہ ۹ لاکھ روپے صرف کرتے ہیں۔ پشاور میں ہر گھنٹے
تین لاکھ کی نسوار استعمال کی جاتی ہے۔ شادی بیاہ جہیز، بری کی مسرفانہ نمائشوں سے
کون واقف نہیں۔ تعلیمی اداروں اور سرکاری دفاتر میں نظم و ضبط کی روز بروز گرگول
حالت، تجارت میں چھوٹے اور بڑے پیمانے پر دیانت کے اصولوں کے بجائے جلدانہ جلد
زراندوزی کا رجحان جس کی ظالم چکی میں عزیز اور میانہ طبقہ بری طرح پس رہا ہے، انہوت

سے۔ روزنامہ جنگ مورخہ ۲۲/۱۲/۱۹۸۱ء کے روزنامہ نوائے وقت مورخہ

۱۲/۱۸/۱۹۸۱ء ۶:۱۴:۲۵ و ۳۶:۱۴:۲۵ القرآن لے ۶۷:۲۵، القرآن لے روزنامہ نوائے وقت ۱۲/۱۸/۱۹۸۱ء

و محبت کی روایات خواب و تخیال، جھوٹ اور منافقت کی گرم باز آہی، رشوت ستانی، حلال و حرام سے بے نیازی - آخر ہم غور کیوں نہیں کرتے؟ ہمارے دلوں، دماغوں پر قفل کیوں پڑ گئے ہیں؟ اخلاق باختگی کے ذریعہ سے اجتماعی خود کشی کا یہ عمل کیوں جاری ہے؟ کب تک جاری رہے گا؟ اس تباہ کن سیلاب کے سامنے بند باندھنے کے لئے کوئی منظم تحریک کیوں نہیں اٹھتی؟

شاید میں نے تصویر کے تاریک رخ پر زیادہ زور دیا ہو مگر مجھے اس میں سرسبز شبہ نہیں کہ ہمارے قومی و انفرادی اخلاق کی گرتی دیوار کو ہمارا دینے کے لئے ہمیں اخلاق محمدی کی دعوت کو اسی عزم کے ساتھ عام کرنا ہوگا، اسی استقلال، اسی صبر و استقامت کے ساتھ چلنا ہوگا جس کی روشن مثال ہمیں صرف اسی انسانِ کامل کے اسوہ کاملہ میں مل سکتی ہے۔ بلاشبہ اس راہ میں بھاری مشکلات ہیں۔ ان کا حل تجدیدِ عہد کے ساتھ وہ عزم و ثبات چاہتا ہے جس کا نمونہ ہمیں نبی کریم کی حیاتِ طیبہ کے ہر دور میں ملتا ہے۔ مکہ معظمہ میں اعلانِ نبوت فرماتے ہی آپ کو کن مسائل سے پالا نہیں پڑا، ہجرت کے بعد کیا کیا نازک مقام آئے۔ محمد مصطفیٰ کی سیرتِ طاہرہ عزم و استقلال کی ایک طویل داستان ہے۔ یہاں صرف چند اشارات ممکن ہیں جو یقیناً انسانی عزم و استقامت اور ہمت و استقلال کی تاریخ میں سنگِ میل اور منارہٴ انوار کی حیثیت رکھتے ہیں۔

عبدالرحمن عزام اپنی مختصر مگر نہایت خوبصورت اور ایمان افروز کتاب بطل الابطال میں لکھتے ہیں:

وَالنَّاسُ جَمِيعًا طَلَابُ الْحَقِّ اَمْ يَجِبُ اَنْ يَكُوْنُوْا كَذٰلِكَ وَقَدْ
ضَرَبَ لَهُمْ مُحَمَّدٌ نِ الْمَثَلُ الْاَعْلٰى..... وَهُوَ الْمَثَلُ الْاَعْلٰى لِلثَّبَاتِ
عَلَى الْحَقِّ وَالِدَّعْوَةِ اِلٰى اَنْ يَكُوْنَ النَّاسُ كَافَّةً لِلّٰهِ عِبِدًا وَّ
فِيْنَا بَيْنَهُمْ اِنْخَوَانًا۔

ترجمہ: سب انسان حق کے منشا ہی یا دم از کم، انہیں ایسا ہونا چاہیے۔ ان سب کے لئے محمد نے سب سے اعلیٰ سب سے ارفع مثال قائم فرمائی... ہاں وہ مثال اعلیٰ ہیں، حق پر ثابت قدمی میں اور سب انسانوں کے نام اس دعوت میں کہ وہ اللہ کے بندے اور آپس میں بھائی بھائی بن جائیں؟

بشہ: ۲۴: ۴۴، القرآن، عبدالرحمن عزام، بطل الابطال، القاہرہ، ۱۳۴۳ھ / ۱۹۵۴ء، ص ۱۸

۶۱۰ء میں عرب کے شہر مکہ میں اس دعوت کا آغاز بڑا جو کہم کا کام تھا۔ بقول کارلائل محمد کاوردو تاریخوں سے نور کا ظہور تھا۔ مگر جیسا کہ سرولیم میوٹر (SIR W. MUIR) نے اعتراف کیا ہے

اصلاح کی دعوت کبھی اتنی دشوار اور منزل مراد سے اتنی بعید نہ تھی جتنی محمد کے ظہور کے وقت باہر اصلاح کا عمل کبھی ایسی خوبی سے تکمیل پذیر نہ ہوا تھا جیسا آپ کی وفات کے وقت ہو چکا تھا۔

شاید اسی لیے ریزنڈ باسور تھ سمتھ (REV. BOSWORTH SMITH) نے شرح صدر کے ساتھ کہا: ”محمد بلا اختلاف مصلحین عالم میں سب سے عظیم تھے۔“

عزم و ثبات

آئیے دعوت حق میں عزم و ثبات کی اس لازوال داستان کے چند ابواب پر نظر ڈالتے ہیں۔

آپ کی ولادت قریش کے اس معزز خاندان میں ہوئی جس کا منصب بیت اللہ کی ولایت اور اہتمام کی رعایت کی بنا پر عربوں کے پرہیت کا سامنا تھا۔ تعظیم و تقدیس کی اس میراث کو خیر باد کہہ کر سرے سے اس نظام کے اہتمام کا عزم جو اس میراث کا بنیادی ستون تھا، بڑے دل گردے کا کام تھا، کتنا بڑا امتحان تھا! موروثی شوکت و سطوت پر ضرب کاری لگانے کے لیے کیسے عظیم عزم کی ضرورت تھی! مگر محمدؐ کی ہمت کے قدم ذرا بھی لڑکھائے؟ دعوت حق کی راہ میں یہ گراں قدر میراث کچھ بھی آڑے آئی؟ محمدؐ کے پائے ثبات نے کہیں بھی لغزش کھائی؟ یہ سنت ابراہیمؑ کا انقلابی احیاء تھا۔

تبلیغ حق کا دائرہ وسعت پذیر ہوا تو مخالفت کا طوفان بھی اٹھ کھڑا ہوا۔ ذہنی پشت پناہی کا لحاظ کریں تو ابوطالب آپ کا سب سے بڑا سپہا رہے۔ رؤساء قریش ابوطالب کے پاس دو ٹوک بات کہنے کے لیے آئے۔ عتبہ، شیبہ، ابوسفیان، ابوہبیل، ولید بن مغیرہ، عاص بن وائل سبھی تھے۔ ابوطالب اس نازک صورت حال کا احساس کر کے آنحضرتؐ سے مخاطب ہوئے: ”جانِ عم! مجھ پر اتنا بار نہ ڈال جو میں اٹھانہ سکوں۔“ یہ آسرا بھی ٹوٹنے نظر آیا۔ پر کیا مجال جو قدم لڑکھڑائے ہوں۔ ناقابل شکست عزم کے ساتھ محمدؐ کے یہ الفاظ زبان سے نکلے اور جریدہ عالم پر نقش دوام بن کر ثبت ہو گئے۔

وَاللّٰهُ نُوٌّ وَضَعُوا الشَّمْسَ فِي يَمِينِيْ وَالْقَمَرَ فِي شِمَالِيْ عَلٰى اَنْ اَتْرَكَ هٰذَا الْاَمْرَ

۱۰۔ عبدالرحمن عزام۔ لعل الابطال ص ۳۰۔

حَتَّىٰ يُظْهِرَهُ اللَّهُ آوَاهُكَ فِيهِ مَا تَرَكْتَهُ ۗ

ترجمہ: بخدا اگر یہ لوگ میرے دائیں ہاتھ میں سورج اور میرے بائیں ہاتھ میں چاند لاکر رکھ دیں کہ میں اس مہم کو چھوڑ دوں تو ہرگز نہیں چھوڑوں گا تا آنکہ خدا اسے غالب کر دے یا میں خود اس راہ میں نثار ہو جاؤں۔

حق کے ساتھ عشق کی کوئی حسین تر مثال نظر آئے گی؛

دھمکیاں کارگر ہوتی دکھائی نہ دیں تو دایم تحریریں پھیلا یا گیا قریش کی طرف سے عتبہ بن ربیعہ آنحضرتؐ کے پاس آیا۔ ریاست، دولت، زوانج ہر حال پھیلاتا گیا۔ عتبہ خاموش ہوا تو آپؐ نے فرمایا۔ ابوالولید کہہ چکے؛ کہا ہاں! فرمایا میری بھی سنا بھر سورہ جم السجدہ کی آیات تلاوت فرمائیں، عتبہ واپس گیا تو وہ عتبہ نہ تھا، سرداران قریش سے کہا: میری مانو تو اس شخص کو تنہا چھوڑ دو۔ میں نے جو کلام اس سے سنا اس کی عجب شان ہوگی۔ اگر عرب غالب آگئے تو تمہارا مطلب پورا ہوا اور اگر وہ غالب آیا تو اس کا ملک تمہارا ملک ہوگا۔ قریش پکار اٹھے۔ بس عتبہ پہ بھی جادو چل گیا۔ کابل عیاری کے ساتھ قریش نے یہ لالچ بھی دیا کہ ایک سال تم لات و عزیزی کی عبادت کرو، ایک سال ہم تمہارے خدا کی عبادت کریں گے۔ سورہ الکافرون کی دو ٹوک آیات اس کا جواب تھیں۔

اب جسمانی ایذا کا حربہ آزمایا جاتا ہے۔ جسے صداقت شعار مانتے تھے، اپنی امانتوں

کانگریں بناتے تھے، اس کے لیے نت نئے عسقم ایجاد کیے جاتے ہیں، آپؐ کے راستے میں کانٹے پکھائے جاتے ہیں، آنکھوں میں دھول ڈالی جاتی ہے، پتھر مارے جاتے ہیں، عتبہ بن ابی معیط آپؐ کے گلے میں چادر ڈال کر یوں بل دیے جاتا ہے کہ آپؐ کا دم گھٹنے کے قریب ہے ابوبکر صدیقؓ موقع پر پہنچتے ہیں اور اس ناہنجار ستمگاہ سے آپؐ کی گلو خلاصی کراتے ہیں۔ خدا کا نبی حرم میں سر بسجود ہے مشرکین کی ایک ٹوٹی طنز و تمسخر کا شور برپا کر رہی ہے۔ ان میں سے ایک شقی اٹھتا ہے اور مذربوسہ اونٹ کا اوجھ غلاط سمیت آپؐ کے اوپر ڈال دیتا ہے۔

آپؐ کے ساتھی بھی قریش کے مظالم سے محفوظ نہیں۔ ان میں سے وہ جو بے سہارا ہیں، مستضعفین ہیں ظالموں کا خصوصی تختہ عمشق۔ حضرت بلالؓ میں اور امیہ بن خلف کا ہور و ہنفا

۱۔ شبلی: سیرت النبی ص ۲۱-۲۲۰۔ ۲۔ ابن ہشام: ۲۹۳ ابن سید الناس، عیون الاثر: ۱۰۵ ابن کثیر، السیرۃ النبویہ تحقیق: مصطفیٰ عبدالواحد، الحزب الاول القاہرہ، مصطفیٰ بابی المجلدی ۱۳۸۴/۱۹۶۲ ص ۵۰۳-۵۰۵۔ ۳۔ شبلی سیرۃ النبی ص ۲۲۲ ابن سید الناس عیون الاثر فی فنون المغازی والشمالی والسیرا ص ۱۰۶۔

حرب کی دوپہر آفتاب نصف النہار پر بلائی کی تنگی پشت، کبھی آہنی زمرہوں میں ملفوف ننگا جسم انگاریے
 سی جھلستی ریت بیسنے کے اوپر بوجھل تپتے پتھر مگر سینے کے اندر حرارتِ ایمان۔ زبان پر احد احد۔ ابن کثیر کی روایت
 ہے کہ اس حال میں قریش ان مظلوموں سے جو چاہتے کہلو تے مگر بلائی کی زبان سے ہر حال میں احد احد ہی نکلتا رہا۔
 بالآخر ابو بکر صدیق نے انہیں ان کے ظالم آقا سے خرید کر آزاد کیا ان کے ہاتھوں میں سلسلے کا یہ ساتواں کار خیر تھا۔
 اس سے پہلے انہوں نے عامر بن فہیرہ (شہید بیڑ معونہ)، ام عبیسہ، زینیرہ فہدیہ
 اور اس کی بیٹی اور حضرت عمرؓ جو اس وقت ایمان نہیں لائے تھے، کی کنیز لبینہ کو
 اسی طرح ان کے آقاؤں کے ستم سے نجات دلائی تھی۔ عبداللہ بن جعدان کے
 آزاد کردہ غلام صہیب بن سنان، صفوان بن امیہ کے غلام ابو فکیہہ، جناب بن اللہ
 جیسے بے آسرا لوگ، ظالموں کے ظلم کا بدترین تختہ مشق تھے۔ جناب کو دیکھتے کوٹلوں پر
 لٹایا گیا اور سینے پر ایک بد بخت پاؤں رکھ کر کھڑا ہوا کہ کروٹ نہ لے سکیں۔ مدتوں بعد
 یہ واقعہ جناب نے حضرت عمرؓ کو سنایا تو پیٹھ کھول کر دکھائی جو برص کے داغ کی طرح
 بالکل سفید تھی۔ مگر آل یاسر۔ اسلام کے اولین شہیدوں کے اس خاندان نے جو ستم سے
 ان کے ستنے کو بھی حوصلہ چاہیے۔ جناب یاسر۔ ان کی اہلیہ سمیہ، ان کے بیٹے عمار بنو مخزوم کی
 غلامی میں ظلم کے یکساں شکار۔ حضورؐ کا گزر ہوا فرمایا: "صبراً یا آل یاسر۔ موعیدکم الجنة"
 چشم فلک یہ بھی دیکھی ہے کہ عمار کے بائیں پاؤں میں رستی سے ایک اونٹ بندھا ہے، دائیں
 پاؤں میں دوسری رستی جو دوسرے اونٹ کے گلے سے بندھی ہے، عمار کی پھٹی پھٹی آنکھیں ذہن
 میں ایک کرناک موت کا نقشہ مگر دل دریائے ایمان۔ دونوں اونٹ مخالف سمتوں میں
 ہانکے جلتے ہیں۔ ایک جس طرح دو لخت ہو جاتا ہے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ سمیہ کے
 قلب سے ابو جہل کا نیزہ پار ہو جاتا ہے۔ اور وہ اپنے خالق و مالک کے دربار میں جا پہنچتی
 ہیں۔ مساکین تو مساکین عثمان، ابو ذر، زبیر بن عوام، سعید بن زید جیسے ذی حیثیت شرفا
 بھی اپنے مشرک اکابر کے ظلم سے محفوظ نہ تھے۔

وہ جو رحمت اللعالمین بھی ہے۔ امت کے لیے مجسم رحمت و ایثار بھی۔ اس کے دل پر کیا نہ
 گزرتی ہوگی۔ آخر اپنے بے بہار ساتھیوں کو جیشہ روانہ فرماتا ہے "اے ماں اس صاحبِ عزیمت
 کی جلالتِ شان یہ ہے کہ جو دست و بازو ہیں انہیں دار لاماں بھیج دیتا ہے اور خود اذیت کی

۱۔ ابن کثیر: السیرۃ النبویہ: ۴۹۴، ۴۹۵، ۴۹۶، ۴۹۷، ۴۹۸، ۴۹۹، ۵۰۰، ۵۰۱، ۵۰۲، ۵۰۳، ۵۰۴، ۵۰۵، ۵۰۶، ۵۰۷، ۵۰۸، ۵۰۹، ۵۱۰، ۵۱۱، ۵۱۲، ۵۱۳، ۵۱۴، ۵۱۵، ۵۱۶، ۵۱۷، ۵۱۸، ۵۱۹، ۵۲۰، ۵۲۱، ۵۲۲، ۵۲۳، ۵۲۴، ۵۲۵، ۵۲۶، ۵۲۷، ۵۲۸، ۵۲۹، ۵۳۰، ۵۳۱، ۵۳۲، ۵۳۳، ۵۳۴، ۵۳۵، ۵۳۶، ۵۳۷، ۵۳۸، ۵۳۹، ۵۴۰، ۵۴۱، ۵۴۲، ۵۴۳، ۵۴۴، ۵۴۵، ۵۴۶، ۵۴۷، ۵۴۸، ۵۴۹، ۵۵۰، ۵۵۱، ۵۵۲، ۵۵۳، ۵۵۴، ۵۵۵، ۵۵۶، ۵۵۷، ۵۵۸، ۵۵۹، ۵۶۰، ۵۶۱، ۵۶۲، ۵۶۳، ۵۶۴، ۵۶۵، ۵۶۶، ۵۶۷، ۵۶۸، ۵۶۹، ۵۷۰، ۵۷۱، ۵۷۲، ۵۷۳، ۵۷۴، ۵۷۵، ۵۷۶، ۵۷۷، ۵۷۸، ۵۷۹، ۵۸۰، ۵۸۱، ۵۸۲، ۵۸۳، ۵۸۴، ۵۸۵، ۵۸۶، ۵۸۷، ۵۸۸، ۵۸۹، ۵۹۰، ۵۹۱، ۵۹۲، ۵۹۳، ۵۹۴، ۵۹۵، ۵۹۶، ۵۹۷، ۵۹۸، ۵۹۹، ۶۰۰، ۶۰۱، ۶۰۲، ۶۰۳، ۶۰۴، ۶۰۵، ۶۰۶، ۶۰۷، ۶۰۸، ۶۰۹، ۶۱۰، ۶۱۱، ۶۱۲، ۶۱۳، ۶۱۴، ۶۱۵، ۶۱۶، ۶۱۷، ۶۱۸، ۶۱۹، ۶۲۰، ۶۲۱، ۶۲۲، ۶۲۳، ۶۲۴، ۶۲۵، ۶۲۶، ۶۲۷، ۶۲۸، ۶۲۹، ۶۳۰، ۶۳۱، ۶۳۲، ۶۳۳، ۶۳۴، ۶۳۵، ۶۳۶، ۶۳۷، ۶۳۸، ۶۳۹، ۶۴۰، ۶۴۱، ۶۴۲، ۶۴۳، ۶۴۴، ۶۴۵، ۶۴۶، ۶۴۷، ۶۴۸، ۶۴۹، ۶۵۰، ۶۵۱، ۶۵۲، ۶۵۳، ۶۵۴، ۶۵۵، ۶۵۶، ۶۵۷، ۶۵۸، ۶۵۹، ۶۶۰، ۶۶۱، ۶۶۲، ۶۶۳، ۶۶۴، ۶۶۵، ۶۶۶، ۶۶۷، ۶۶۸، ۶۶۹، ۶۷۰، ۶۷۱، ۶۷۲، ۶۷۳، ۶۷۴، ۶۷۵، ۶۷۶، ۶۷۷، ۶۷۸، ۶۷۹، ۶۸۰، ۶۸۱، ۶۸۲، ۶۸۳، ۶۸۴، ۶۸۵، ۶۸۶، ۶۸۷، ۶۸۸، ۶۸۹، ۶۹۰، ۶۹۱، ۶۹۲، ۶۹۳، ۶۹۴، ۶۹۵، ۶۹۶، ۶۹۷، ۶۹۸، ۶۹۹، ۷۰۰، ۷۰۱، ۷۰۲، ۷۰۳، ۷۰۴، ۷۰۵، ۷۰۶، ۷۰۷، ۷۰۸، ۷۰۹، ۷۱۰، ۷۱۱، ۷۱۲، ۷۱۳، ۷۱۴، ۷۱۵، ۷۱۶، ۷۱۷، ۷۱۸، ۷۱۹، ۷۲۰، ۷۲۱، ۷۲۲، ۷۲۳، ۷۲۴، ۷۲۵، ۷۲۶، ۷۲۷، ۷۲۸، ۷۲۹، ۷۳۰، ۷۳۱، ۷۳۲، ۷۳۳، ۷۳۴، ۷۳۵، ۷۳۶، ۷۳۷، ۷۳۸، ۷۳۹، ۷۴۰، ۷۴۱، ۷۴۲، ۷۴۳، ۷۴۴، ۷۴۵، ۷۴۶، ۷۴۷، ۷۴۸، ۷۴۹، ۷۵۰، ۷۵۱، ۷۵۲، ۷۵۳، ۷۵۴، ۷۵۵، ۷۵۶، ۷۵۷، ۷۵۸، ۷۵۹، ۷۶۰، ۷۶۱، ۷۶۲، ۷۶۳، ۷۶۴، ۷۶۵، ۷۶۶، ۷۶۷، ۷۶۸، ۷۶۹، ۷۷۰، ۷۷۱، ۷۷۲، ۷۷۳، ۷۷۴، ۷۷۵، ۷۷۶، ۷۷۷، ۷۷۸، ۷۷۹، ۷۸۰، ۷۸۱، ۷۸۲، ۷۸۳، ۷۸۴، ۷۸۵، ۷۸۶، ۷۸۷، ۷۸۸، ۷۸۹، ۷۹۰، ۷۹۱، ۷۹۲، ۷۹۳، ۷۹۴، ۷۹۵، ۷۹۶، ۷۹۷، ۷۹۸، ۷۹۹، ۸۰۰، ۸۰۱، ۸۰۲، ۸۰۳، ۸۰۴، ۸۰۵، ۸۰۶، ۸۰۷، ۸۰۸، ۸۰۹، ۸۱۰، ۸۱۱، ۸۱۲، ۸۱۳، ۸۱۴، ۸۱۵، ۸۱۶، ۸۱۷، ۸۱۸، ۸۱۹، ۸۲۰، ۸۲۱، ۸۲۲، ۸۲۳، ۸۲۴، ۸۲۵، ۸۲۶، ۸۲۷، ۸۲۸، ۸۲۹، ۸۳۰، ۸۳۱، ۸۳۲، ۸۳۳، ۸۳۴، ۸۳۵، ۸۳۶، ۸۳۷، ۸۳۸، ۸۳۹، ۸۴۰، ۸۴۱، ۸۴۲، ۸۴۳، ۸۴۴، ۸۴۵، ۸۴۶، ۸۴۷، ۸۴۸، ۸۴۹، ۸۵۰، ۸۵۱، ۸۵۲، ۸۵۳، ۸۵۴، ۸۵۵، ۸۵۶، ۸۵۷، ۸۵۸، ۸۵۹، ۸۶۰، ۸۶۱، ۸۶۲، ۸۶۳، ۸۶۴، ۸۶۵، ۸۶۶، ۸۶۷، ۸۶۸، ۸۶۹، ۸۷۰، ۸۷۱، ۸۷۲، ۸۷۳، ۸۷۴، ۸۷۵، ۸۷۶، ۸۷۷، ۸۷۸، ۸۷۹، ۸۸۰، ۸۸۱، ۸۸۲، ۸۸۳، ۸۸۴، ۸۸۵، ۸۸۶، ۸۸۷، ۸۸۸، ۸۸۹، ۸۹۰، ۸۹۱، ۸۹۲، ۸۹۳، ۸۹۴، ۸۹۵، ۸۹۶، ۸۹۷، ۸۹۸، ۸۹۹، ۹۰۰، ۹۰۱، ۹۰۲، ۹۰۳، ۹۰۴، ۹۰۵، ۹۰۶، ۹۰۷، ۹۰۸، ۹۰۹، ۹۱۰، ۹۱۱، ۹۱۲، ۹۱۳، ۹۱۴، ۹۱۵، ۹۱۶، ۹۱۷، ۹۱۸، ۹۱۹، ۹۲۰، ۹۲۱، ۹۲۲، ۹۲۳، ۹۲۴، ۹۲۵، ۹۲۶، ۹۲۷، ۹۲۸، ۹۲۹، ۹۳۰، ۹۳۱، ۹۳۲، ۹۳۳، ۹۳۴، ۹۳۵، ۹۳۶، ۹۳۷، ۹۳۸، ۹۳۹، ۹۴۰، ۹۴۱، ۹۴۲، ۹۴۳، ۹۴۴، ۹۴۵، ۹۴۶، ۹۴۷، ۹۴۸، ۹۴۹، ۹۵۰، ۹۵۱، ۹۵۲، ۹۵۳، ۹۵۴، ۹۵۵، ۹۵۶، ۹۵۷، ۹۵۸، ۹۵۹، ۹۶۰، ۹۶۱، ۹۶۲، ۹۶۳، ۹۶۴، ۹۶۵، ۹۶۶، ۹۶۷، ۹۶۸، ۹۶۹، ۹۷۰، ۹۷۱، ۹۷۲، ۹۷۳، ۹۷۴، ۹۷۵، ۹۷۶، ۹۷۷، ۹۷۸، ۹۷۹، ۹۸۰، ۹۸۱، ۹۸۲، ۹۸۳، ۹۸۴، ۹۸۵، ۹۸۶، ۹۸۷، ۹۸۸، ۹۸۹، ۹۹۰، ۹۹۱، ۹۹۲، ۹۹۳، ۹۹۴، ۹۹۵، ۹۹۶، ۹۹۷، ۹۹۸، ۹۹۹، ۱۰۰۰، ۱۰۰۱، ۱۰۰۲، ۱۰۰۳، ۱۰۰۴، ۱۰۰۵، ۱۰۰۶، ۱۰۰۷، ۱۰۰۸، ۱۰۰۹، ۱۰۱۰، ۱۰۱۱، ۱۰۱۲، ۱۰۱۳، ۱۰۱۴، ۱۰۱۵، ۱۰۱۶، ۱۰۱۷، ۱۰۱۸، ۱۰۱۹، ۱۰۲۰، ۱۰۲۱، ۱۰۲۲، ۱۰۲۳، ۱۰۲۴، ۱۰۲۵، ۱۰۲۶، ۱۰۲۷، ۱۰۲۸، ۱۰۲۹، ۱۰۳۰، ۱۰۳۱، ۱۰۳۲، ۱۰۳۳، ۱۰۳۴، ۱۰۳۵، ۱۰۳۶، ۱۰۳۷، ۱۰۳۸، ۱۰۳۹، ۱۰۴۰، ۱۰۴۱، ۱۰۴۲، ۱۰۴۳، ۱۰۴۴، ۱۰۴۵، ۱۰۴۶، ۱۰۴۷، ۱۰۴۸، ۱۰۴۹، ۱۰۵۰، ۱۰۵۱، ۱۰۵۲، ۱۰۵۳، ۱۰۵۴، ۱۰۵۵، ۱۰۵۶، ۱۰۵۷، ۱۰۵۸، ۱۰۵۹، ۱۰۶۰، ۱۰۶۱، ۱۰۶۲، ۱۰۶۳، ۱۰۶۴، ۱۰۶۵، ۱۰۶۶، ۱۰۶۷، ۱۰۶۸، ۱۰۶۹، ۱۰۷۰، ۱۰۷۱، ۱۰۷۲، ۱۰۷۳، ۱۰۷۴، ۱۰۷۵، ۱۰۷۶، ۱۰۷۷، ۱۰۷۸، ۱۰۷۹، ۱۰۸۰، ۱۰۸۱، ۱۰۸۲، ۱۰۸۳، ۱۰۸۴، ۱۰۸۵، ۱۰۸۶، ۱۰۸۷، ۱۰۸۸، ۱۰۸۹، ۱۰۹۰، ۱۰۹۱، ۱۰۹۲، ۱۰۹۳، ۱۰۹۴، ۱۰۹۵، ۱۰۹۶، ۱۰۹۷، ۱۰۹۸، ۱۰۹۹، ۱۱۰۰، ۱۱۰۱، ۱۱۰۲، ۱۱۰۳، ۱۱۰۴، ۱۱۰۵، ۱۱۰۶، ۱۱۰۷، ۱۱۰۸، ۱۱۰۹، ۱۱۱۰، ۱۱۱۱، ۱۱۱۲، ۱۱۱۳، ۱۱۱۴، ۱۱۱۵، ۱۱۱۶، ۱۱۱۷، ۱۱۱۸، ۱۱۱۹، ۱۱۲۰، ۱۱۲۱، ۱۱۲۲، ۱۱۲۳، ۱۱۲۴، ۱۱۲۵، ۱۱۲۶، ۱۱۲۷، ۱۱۲۸، ۱۱۲۹، ۱۱۳۰، ۱۱۳۱، ۱۱۳۲، ۱۱۳۳، ۱۱۳۴، ۱۱۳۵، ۱۱۳۶، ۱۱۳۷، ۱۱۳۸، ۱۱۳۹، ۱۱۴۰، ۱۱۴۱، ۱۱۴۲، ۱۱۴۳، ۱۱۴۴، ۱۱۴۵، ۱۱۴۶، ۱۱۴۷، ۱۱۴۸، ۱۱۴۹، ۱۱۵۰، ۱۱۵۱، ۱۱۵۲، ۱۱۵۳، ۱۱۵۴، ۱۱۵۵، ۱۱۵۶، ۱۱۵۷، ۱۱۵۸، ۱۱۵۹، ۱۱۶۰، ۱۱۶۱، ۱۱۶۲، ۱۱۶۳، ۱۱۶۴، ۱۱۶۵، ۱۱۶۶، ۱۱۶۷، ۱۱۶۸، ۱۱۶۹، ۱۱۷۰، ۱۱۷۱، ۱۱۷۲، ۱۱۷۳، ۱۱۷۴، ۱۱۷۵، ۱۱۷۶، ۱۱۷۷، ۱۱۷۸، ۱۱۷۹، ۱۱۸۰، ۱۱۸۱، ۱۱۸۲، ۱۱۸۳، ۱۱۸۴، ۱۱۸۵، ۱۱۸۶، ۱۱۸۷، ۱۱۸۸، ۱۱۸۹، ۱۱۹۰، ۱۱۹۱، ۱۱۹۲، ۱۱۹۳، ۱۱۹۴، ۱۱۹۵، ۱۱۹۶، ۱۱۹۷، ۱۱۹۸، ۱۱۹۹، ۱۲۰۰، ۱۲۰۱، ۱۲۰۲، ۱۲۰۳، ۱۲۰۴، ۱۲۰۵، ۱۲۰۶، ۱۲۰۷، ۱۲۰۸، ۱۲۰۹، ۱۲۱۰، ۱۲۱۱، ۱۲۱۲، ۱۲۱۳، ۱۲۱۴، ۱۲۱۵، ۱۲۱۶، ۱۲۱۷، ۱۲۱۸، ۱۲۱۹، ۱۲۲۰، ۱۲۲۱، ۱۲۲۲، ۱۲۲۳، ۱۲۲۴، ۱۲۲۵، ۱۲۲۶، ۱۲۲۷، ۱۲۲۸، ۱۲۲۹، ۱۲۳۰، ۱۲۳۱، ۱۲۳۲، ۱۲۳۳، ۱۲۳۴، ۱۲۳۵، ۱۲۳۶، ۱۲۳۷، ۱۲۳۸، ۱۲۳۹، ۱۲۴۰، ۱۲۴۱، ۱۲۴۲، ۱۲۴۳، ۱۲۴۴، ۱۲۴۵، ۱۲۴۶، ۱۲۴۷، ۱۲۴۸، ۱۲۴۹، ۱۲۵۰، ۱۲۵۱، ۱۲۵۲، ۱۲۵۳، ۱۲۵۴، ۱۲۵۵، ۱۲۵۶، ۱۲۵۷، ۱۲۵۸، ۱۲۵۹، ۱۲۶۰، ۱۲۶۱، ۱۲۶۲، ۱۲۶۳، ۱۲۶۴، ۱۲۶۵، ۱۲۶۶، ۱۲۶۷، ۱۲۶۸، ۱۲۶۹، ۱۲۷۰، ۱۲۷۱، ۱۲۷۲، ۱۲۷۳، ۱۲۷۴، ۱۲۷۵، ۱۲۷۶، ۱۲۷۷، ۱۲۷۸، ۱۲۷۹، ۱۲۸۰، ۱۲۸۱، ۱۲۸۲، ۱۲۸۳، ۱۲۸۴، ۱۲۸۵، ۱۲۸۶، ۱۲۸۷، ۱۲۸۸، ۱۲۸۹، ۱۲۹۰، ۱۲۹۱، ۱۲۹۲، ۱۲۹۳، ۱۲۹۴، ۱۲۹۵، ۱۲۹۶، ۱۲۹۷، ۱۲۹۸، ۱۲۹۹، ۱۳۰۰، ۱۳۰۱، ۱۳۰۲، ۱۳۰۳، ۱۳۰۴، ۱۳۰۵، ۱۳۰۶، ۱۳۰۷، ۱۳۰۸، ۱۳۰۹، ۱۳۱۰، ۱۳۱۱، ۱۳۱۲، ۱۳۱۳، ۱۳۱۴، ۱۳۱۵، ۱۳۱۶، ۱۳۱۷، ۱۳۱۸، ۱۳۱۹، ۱۳۲۰، ۱۳۲۱، ۱۳۲۲، ۱۳۲۳، ۱۳۲۴، ۱۳۲۵، ۱۳۲۶، ۱۳۲۷، ۱۳۲۸، ۱۳۲۹، ۱۳۳۰، ۱۳۳۱، ۱۳۳۲، ۱۳۳۳، ۱۳۳۴، ۱۳۳۵، ۱۳۳۶، ۱۳۳۷، ۱۳۳۸، ۱۳۳۹، ۱۳۴۰، ۱۳۴۱، ۱۳۴۲، ۱۳۴۳، ۱۳۴۴، ۱۳۴۵، ۱۳۴۶، ۱۳۴۷، ۱۳۴۸، ۱۳۴۹، ۱۳۵۰، ۱۳۵۱، ۱۳۵۲، ۱۳۵۳، ۱۳۵۴، ۱۳۵۵، ۱۳۵۶، ۱۳۵۷، ۱۳۵۸، ۱۳۵۹، ۱۳۶۰، ۱۳۶۱، ۱۳۶۲، ۱۳۶۳، ۱۳۶۴، ۱۳۶۵، ۱۳۶۶، ۱۳۶۷، ۱۳۶۸، ۱۳۶۹، ۱۳۷۰، ۱۳۷۱، ۱۳۷۲، ۱۳۷۳، ۱۳۷۴، ۱۳۷۵، ۱۳۷۶، ۱۳۷۷، ۱۳۷۸، ۱۳۷۹، ۱۳۸۰، ۱۳۸۱، ۱۳۸۲، ۱۳۸۳، ۱۳۸۴، ۱۳۸۵، ۱۳۸۶، ۱۳۸۷، ۱۳۸۸، ۱۳۸۹، ۱۳۹۰، ۱۳۹۱، ۱۳۹۲، ۱۳۹۳، ۱۳۹۴، ۱۳۹۵، ۱۳۹۶، ۱۳۹۷، ۱۳۹۸، ۱۳۹۹، ۱۴۰۰، ۱۴۰۱، ۱۴۰۲، ۱۴۰۳، ۱۴۰۴، ۱۴۰۵، ۱۴۰۶، ۱۴۰۷، ۱۴۰۸، ۱۴۰۹، ۱۴۱۰، ۱۴۱۱، ۱۴۱۲، ۱۴۱۳، ۱۴۱۴، ۱۴۱۵، ۱۴۱۶، ۱۴۱۷، ۱۴۱۸، ۱۴۱۹، ۱۴۲۰، ۱۴۲۱، ۱۴۲۲، ۱۴۲۳، ۱۴۲۴، ۱۴۲۵، ۱۴۲۶، ۱۴۲۷، ۱۴۲۸، ۱۴۲۹، ۱۴۳۰، ۱۴۳۱، ۱۴۳۲، ۱۴۳۳، ۱۴۳۴، ۱۴۳۵، ۱۴۳۶، ۱۴۳۷، ۱۴۳۸، ۱۴۳۹، ۱۴۴۰، ۱۴۴۱، ۱۴۴۲، ۱۴۴۳، ۱۴۴۴، ۱۴۴۵، ۱۴۴۶، ۱۴۴۷، ۱۴۴۸، ۱۴۴۹، ۱۴۵۰، ۱۴۵۱، ۱۴۵۲، ۱۴۵۳، ۱۴۵۴، ۱۴۵۵، ۱۴۵۶، ۱۴۵۷، ۱۴۵۸، ۱۴۵۹، ۱۴۶۰، ۱۴۶۱، ۱۴۶۲، ۱۴۶۳، ۱۴۶۴، ۱۴۶۵، ۱۴۶۶، ۱۴۶۷، ۱۴۶۸، ۱۴۶۹، ۱۴۷۰، ۱۴۷۱، ۱۴۷۲، ۱۴۷۳، ۱۴۷۴، ۱۴۷۵، ۱۴۷۶، ۱۴۷۷، ۱۴۷۸، ۱۴۷۹، ۱۴۸۰، ۱۴۸۱، ۱۴۸۲، ۱۴۸۳، ۱۴۸۴، ۱۴۸۵، ۱۴۸۶، ۱۴۸۷، ۱۴۸۸، ۱۴۸۹، ۱۴۹۰، ۱۴۹۱، ۱۴۹۲، ۱۴۹۳، ۱۴۹۴، ۱۴۹۵، ۱۴۹۶، ۱۴۹۷، ۱۴۹۸، ۱۴۹۹، ۱۵۰۰، ۱۵۰۱، ۱۵۰۲، ۱۵۰۳، ۱۵۰۴، ۱۵۰۵، ۱۵۰۶، ۱۵۰۷، ۱۵۰۸، ۱۵۰۹، ۱۵۱۰، ۱۵۱۱، ۱۵۱۲، ۱۵۱۳، ۱۵۱۴، ۱۵۱۵، ۱۵۱۶، ۱۵۱۷، ۱۵۱۸، ۱۵۱۹، ۱۵۲۰، ۱۵۲۱، ۱۵۲۲، ۱۵۲۳، ۱۵۲۴، ۱۵۲۵، ۱۵۲۶، ۱۵۲۷، ۱۵۲۸، ۱۵۲۹، ۱۵۳۰، ۱۵۳۱، ۱۵۳۲، ۱۵۳۳، ۱۵۳۴، ۱۵۳۵، ۱۵۳۶، ۱۵۳۷، ۱۵۳۸، ۱۵۳۹، ۱۵۴۰، ۱۵۴۱، ۱۵۴۲، ۱۵۴۳، ۱۵۴۴، ۱۵۴۵، ۱۵۴۶، ۱۵۴۷، ۱۵۴۸، ۱۵۴۹، ۱۵۵۰، ۱۵۵۱، ۱۵۵۲، ۱۵۵۳، ۱۵۵۴، ۱۵۵۵، ۱۵۵۶، ۱۵۵۷، ۱۵۵۸، ۱۵۵۹، ۱۵۶۰، ۱۵۶۱، ۱۵۶۲، ۱۵۶۳، ۱۵۶۴، ۱۵۶۵، ۱۵۶۶، ۱۵۶۷، ۱۵۶۸، ۱۵۶۹، ۱۵۷۰، ۱۵۷۱، ۱۵۷۲، ۱۵۷۳، ۱۵۷۴، ۱۵۷۵، ۱۵۷۶، ۱۵۷۷، ۱۵۷۸، ۱۵۷۹، ۱۵۸۰، ۱۵۸۱، ۱۵۸۲، ۱۵۸۳، ۱۵۸۴، ۱۵۸۵، ۱۵۸۶، ۱۵۸۷، ۱۵۸۸، ۱۵۸۹، ۱۵۹۰، ۱۵۹۱، ۱۵۹۲، ۱۵۹۳، ۱۵۹۴، ۱۵۹۵، ۱۵۹۶، ۱۵۹۷، ۱۵۹۸، ۱۵۹۹، ۱۶۰۰، ۱۶۰۱، ۱۶۰۲، ۱۶۰۳، ۱۶۰۴، ۱۶۰۵، ۱۶۰۶، ۱۶۰۷، ۱۶۰۸، ۱۶۰۹، ۱۶۱۰، ۱۶۱۱، ۱۶۱۲، ۱۶۱۳، ۱۶۱۴، ۱۶۱۵، ۱۶۱۶، ۱۶۱۷، ۱۶۱۸، ۱۶۱۹، ۱۶۲۰، ۱۶۲۱، ۱۶۲۲، ۱۶۲۳، ۱۶۲۴، ۱۶۲۵، ۱۶۲۶، ۱۶۲۷، ۱۶۲۸، ۱۶۲۹، ۱۶۳۰، ۱۶۳۱، ۱۶۳۲، ۱۶۳۳، ۱۶۳۴، ۱۶۳۵، ۱۶۳۶، ۱۶۳۷، ۱۶۳۸، ۱۶۳۹، ۱۶۴۰، ۱۶۴۱، ۱۶۴۲، ۱۶۴۳، ۱۶۴۴، ۱۶۴۵، ۱۶۴۶، ۱۶۴۷، ۱۶۴۸، ۱۶۴۹، ۱۶۵۰، ۱۶۵۱، ۱۶۵۲، ۱۶۵۳، ۱۶۵۴، ۱۶۵۵، ۱۶۵۶، ۱۶۵۷، ۱۶۵۸، ۱۶۵۹، ۱۶۶۰، ۱۶۶۱، ۱۶۶۲، ۱۶۶۳، ۱۶۶۴، ۱۶۶۵، ۱۶۶۶، ۱۶۶۷، ۱۶۶۸، ۱۶۶۹، ۱۶۷۰، ۱۶۷۱، ۱۶۷۲، ۱۶۷۳، ۱۶۷۴، ۱۶۷۵، ۱۶۷۶، ۱۶۷۷، ۱۶۷۸، ۱۶۷۹، ۱۶۸۰، ۱۶۸۱، ۱۶۸۲، ۱۶۸۳، ۱۶۸۴، ۱۶۸۵، ۱۶۸۶، ۱۶۸۷، ۱۶۸۸، ۱۶۸۹، ۱۶۹۰، ۱۶۹۱، ۱۶۹۲، ۱۶۹۳، ۱۶۹۴، ۱۶۹۵، ۱۶۹۶، ۱۶۹۷، ۱۶۹۸، ۱۶۹۹، ۱۷۰۰، ۱۷۰۱، ۱۷۰۲، ۱۷۰۳، ۱۷۰۴، ۱۷۰۵، ۱۷۰۶، ۱۷۰۷، ۱۷۰۸، ۱۷۰۹، ۱۷۱۰، ۱۷۱۱، ۱۷۱۲، ۱۷۱۳، ۱۷۱۴، ۱۷۱۵، ۱۷۱۶، ۱۷۱۷، ۱۷۱۸، ۱۷۱۹، ۱۷۲۰، ۱۷۲۱، ۱۷۲۲، ۱۷۲۳، ۱۷۲۴، ۱۷۲۵، ۱۷۲۶، ۱

حقیقتوں اور موت کے امکانات کے سامنے سینہ سپر رہتا ہے۔

نبوت کے ساتویں سال کے آغاز کے ساتھ بنو ہاشم (باستثنائے ابولہب) شعب ابی طالب میں پناہ لینے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ قریش نے بنی ہاشم کے مقاطعہ کا عہد نامہ در کعبہ پر آویزاں کر دیا ہے۔ کامل تین سال شدتِ مصائب میں گزر رہے ہیں، مگر درسِ لا الہ الا اللہ دینے والا نخطرہ کے دریا سے گزر کر بیت اللہ میں حاضر ہوتا ہے اور باوا زبیر بلند خدا کا پیغام بندوں کے نام تلاوت فرماتا ہے۔

اعلانِ نبوت کو دسواں سال ہے۔ ابوطالب رخصت ہوئے، پھر سیدہ خدیجہ نے بھی داعیِ اہل کی پکار پر عین منجد ہار میں اس رفیق کی رفاقت توڑ دی تہ جس کو کلمی اڑھا اڑھا کر بارہ نبوت اٹھانے کی تشفیاں دی تھیں۔ عم نصیر بھی گیا، رفیقِ وزیر بھی رخصت ہوا۔ مصائب کی آندھیاں طوفان بن گئیں، پر پیغمبر سے کہ اپنی دھن میں تن من دھن اسی طرح دعوتِ حق کے راستے میں لٹنے کو تیار۔ ام القریٰ کے دلوں کی کھیتی ہری ہوتی نہیں لگتی تو قبائل کا رخ کرتا ہے۔ ستائش و صلہ سے تو خیر واسطہ ہی کیا، طعن و تشنیع، طنز و تمسخر کے تیروں کی بوچھاڑ خندہ پیشانی سے قبول کرتا، گالی کے بدے دعائیں دیتا، پتھر کھا کر لہو لہان ہو کر مارنے والوں کے لیے رحمتیں مانگتا چلا جاتا ہے۔ چاروں اور اندھیرا ہے پر اس واقفِ اسرارِ حقیقت کو ایک لحظہ کے عشرِ عشر کے لیے بھی خفیف سا تردد، شبہ یا شک نہیں ہوتا۔ اسے یقین ہے کہ یہ بستی اور اس کے باسی ایک دن انوارِ حق سے ضرور منور ہوں گے۔ عام الحزن میں بھی محمدؐ کی آنکھیں فتحِ مبین پر لگی ہیں۔ نبی کریمؐ کے صدق و خلوص اولوالعزمی اور ثبات و استقامت کی اس سے بڑھ کر کیا دلیل ہوگی کہ مکہ کے تیرہ سالہ تبلیغی دور کا حاصل مشکل سے دوسو نفوسِ قدسیہ تھے، مگر سخت ترین آزمائش و مصیبت میں بھی آپؐ کا دل اپنے مشن کے بارے میں ہلکی سی مایوسی سے بھی آشنا نہ ہوا۔ اور ماں آپؐ کے عزم و استقامت کا پرتو یہ بھی تھا کہ ان نفوسِ قدسیہ میں سے جن کی زبان پہ کلمہ لا الہ الا اللہ ایک بار جاری ہوا کسی ایک نے بھی رونگے کھڑے کر دیے ولے مظالم سے گزر کر بھی کبھی پلٹنے کا نہ سوچا۔ معنی کہ آپؐ کے ان اہل بیت نے جو بالا اعلانِ اسلام بھی نہیں لائے سخت ترین مصائب کے اندر بھی کبھی آپؐ سے بیزاری کا اظہار کرتے ہوئے یہ اشارہ تک نہ کیا کہ اے باد صبا! ہم آدرہ تست۔

طائف

یوں تو آپؐ کی تیرہ سالہ مکی زندگی ابتلاء و امتحان کی ایک مسلسل داستان ہے، مگر سفرِ طائف

۱۹ ابن ہشام، السیرة، ۵۱، ۳۵۰-۳۵۱-۳۵۲-۳۵۳، شبلی، سیرة النبی، ۲۴۹

تو ایسے شدید جسمانی اور ذہنی و نفسیاتی صدمات پر منتج ہوا کہ پٹان سا عزم بھی ان کے سامنے ریزہ ریزہ ہو جاتا۔ ابوطالب اور خدیجہؓ کی شفقت و محبت سے محرومی کا داغ ابھی تازہ ہے۔ ابولیب کی زہرہ سیادت بنو ہاشم کا قبائلی تحفظ بھی اب ختم ہو چکا۔ قریش کی ایذا رسانیاں اور چہرہ دستیاں زوروں پر۔ دس سال کی پڑ آشوب کشت کاری کے بعد مکہ کی زمین اب خدا کے نبی کے لئے بخر ہو چکی جس سے کوئی نیا گل بوٹا پھوٹتا دکھائی نہیں دیتا، سردارانِ ثقیف کے ایمان لانے کی امید کا پراغ آپ کو تن تنہا طائف میں لاتا ہے، مگر وہاں کے تینوں رؤساء، عمرو بن عمیر کے سخت پسند بیٹے بختراز و استہزاء کے ساتھ پیش آتے اور اپنے خدم و حشم کو آپ کی ایذا رسانی پر مامور کرتے ہیں۔ غلاموں، نادانوں کا یہ انبوه چینٹا چینگھاڑنا بد کلامی کرتا آپ کے تعاقب میں ہے۔ راستے کے دونوں طرف بھی اشرار قطار اندر قطار موجود رسول خدا کے ہر اٹھتے قدم کا استقبال پتھروں سے کرتے ہیں۔ مولانا پاؤں کے ساتھ آپ شہر سے باہر ایک باغ میں پناہ لیتے ہیں، مگر اس حال میں بھی غیر البشر کی زبان سے دشمنوں کے لیے زہر دینا نکلتی، نہ اپنے مالک و مولا پر ایمان و یقین میں سر ہو کوئی تزلزل واقع ہوا۔ نبی کے ہاتھ اٹھتے ہیں اور یہ فریاد زبان پر جاری ہوتی ہے:

اللَّهُمَّ اِيكَ اشْكُو ضَعْفَ قُوَّتِي وَ هَوَانِي عَلَى النَّاسِ يَا اَرْحَمَ الرَّاحِمِينَ اَنْتَ رَبُّ الْمُسْتَضْعَفِينَ وَاَنْتَ مَرْبِّي اِلٰى مَنْ تَكَلَّمِي
اِنْ لَمْ يَكُنْ بِكَ غَضَبٌ عَلٰى فِلا اَبَايَ

ترجمہ: بارالہا میں تجھ سے ہی اپنی طاقت کے ضعف کا دکھراکتا ہوں، تیرے پاس ہی شکایت کرتا ہوں کہ لوگوں کے لیے میں کوئی چیز نہیں! ارحم الراحمین تو کمزوروں کا وارث، تو میرا بھی مالک و مولا ہے، تو مجھے کس کے سوائے کرے گا؟ ہاں اگر تو مجھ پر ناخوش نہیں تو مجھے کسی بات کی پروا نہیں؟

خدا نے تدوین و کریم نے اپنے بندے کی پکار کو سنا اور فرمایا:

فَا صَبِرْ كَمَا صَبَرَ اُولُو الْعِزِّ مِنْكَ الشُّسْلِ (سورة الاحقاف ۲۶، ۳۵)

کئی سال بعد عائشہ صدیقہ نے آپ سے پوچھا کہ آپ پر کوئی دن معرکہ اُحد سے سخت تر بھی آیا؟ آپ نے طائف کے واقعہ کا ذکر فرمایا۔ ۸ھ میں محمد مدنی کا مکہ میں فاتحانہ داخلہ اپنی مثال نہیں رکھتا مگر ۱۱ سال قبل طائف سے بے نیل و مرام واپسی پر بے یار و مددگار مطعم بن عدی کے جوار میں محمد کی تم کا گھر پہنچنا بھی اپنی نظیر نہیں رکھتا۔ اس سے بڑھ کر آپ کی صداقت اور اپنے رب پر ناقابل شکست اعتماد کی دلیل کوئی نہیں کہ سفر طائف کے بعد بھی محمدؐ کی کاتبینہ سفر جاری رہا۔

دشمنوں نے ایذا رسائی کا ہر حربہ آزمایا، ابلاغ عامہ کے ماہرین کی طرح کذب و افتراء اور تمسخر و استہزا کے ہنگامے میں آپ کے پیام کو اڑا دینے، دبا دینے کی کوشش بھی کی۔

وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا لَا تَسْمَعُوا لِهَذَا الْقُرْآنِ وَالْغَوَافِیْهِ نَعْلَمُكُمْ
تَغْلِبُونَ ۝ (۲۶:۴۱)

بے سہارا، مگر وفا کیش ساقیوں پر ظلم توڑ کر بھی رحمتِ عالم کے لیے شدید ذہنی و روحانی کرب کا سامان کیا۔ مگر آپ کے عزم و استقلال کے سامنے بے بس ہو کر رہ گئے۔ ابو بکر صدیقؓ وہ مردِ جمہوری جو مدینہ کے چاروں طرف منڈلاتے ہوئے خطرات کے باوجود اسامہ بن زید کے لشکر کو آقا کے حکم کی تعمیل میں شام روانہ کرنے سے نہ ہچکچایا، غارِ ثور کے دمانے پر گھڑی موت کے پاؤں دیکھ کر تشویش میں ڈوب گیا، مگر اس گھڑی محمدؐ کی آواز رفیقِ دمساز اور معلمِ دلنواز تھی: لَا تَحْزَنُوا إِنَّ اللَّهَ مَعَنَا! اُمّ کے معرکہ نے مدینہ کے گھروں میں صفِ ماتم بچھا دی تھی، مگر عزم و ہمت کا یہ پہاڑ اگلے روز ہی اپنے زخمی ساتھیوں کے ساتھ دشمنوں کے تعاقب میں تھا۔ معرکہ حنین میں ہزاروں جہاں نثار تھے پر بنو ہوازن کے تیروں کی بارش میں سراپا انتشار تھے۔ ایسے میں صرف اَنَا النَّبِيُّ لَا كَذِبُ! کی آواز پر ہی ٹوٹی ہمتیں بند رہی تھیں۔

خاتمہ کلام

میں نے اپنی گزارشات میں کوئی نئی بات نہیں کہی۔ اس قصہ پارینہ کی باز خوانی سے مدعا یہ ہے کہ محمدؐ کی غلامی و حلقہ بگوشی پر فخر کرنے والوں میں جہاں بیسیوں سیاسی، ادبی اور پیشہ ورانہ تنظیمیں موجود ہیں وہاں ایک ایسی تحریک بھی اٹھنی چاہیے جس کے علمبردار اور داعیان اپنے مادی و مولا کے عزم کی پنگا رہی سے وہ شمع روشن کریں جو ہمارے معاشرے کے ہر شعبے میں اسوۂ محمدیؐ کا احیاء کرے اور ملتِ اسلامیہ کے اصل تشخص کو اس طرح زندہ کرے کہ لا الہ الا اللہ ہمارا شعار ہو۔ اسلام کی بنیادی عبادات کی پابندی ہماری پہچان ہو اور اخلاقِ محمدیؐ کی عاشقانہ تقلید ہمارا طرہ امتیاز ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ تمام بنیادی اسلامی عبادات کا مقصد اولین ہی یہی ہے کہ بندہ اپنی ہستی اور ہر شے کو اپنے خالق و مالک کے سامنے تسلیم کر دے۔ اسی بنیاد پر ہر کارم اخلاق کی محکم عمارت اٹھتی ہے، حقیقتِ صلوة کیا ہے؟ إِنَّ الصَّلَاةَ تَنْهَى عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْكَرِ (خانہ کھلی بدکاری اور ربر، ہرانی سے روکتی ہے) حقیقتِ صوم کیا ہے؟ الْقَوْمُ صِبْغَةَ الشَّيْطَانِ حَرَبِہ کے خلاف یہ مومن کی ڈھال ہے۔ حج کیا ہے؟ اپنے رب کی طرف مکمل ہجرت۔ طواف کیا ہے؟ انسان کے قدیم روایتی و علامتی اندازہ میں ریتِ کعبہ پر سب کچھ نچھاور کر دینے کا اظہار و اقرار۔

ہم اللہ تعالیٰ کی اس رحمت و نعمت کا ضرور شکر کریں کہ اس نے ہمیں مسلمان پیدا فرمایا، مگر دل و دماغ کی گہرائیوں سے پوری سنجیدگی اور انتہائی خلوص کے ساتھ یہ اعتراف (CONFESSION) بھی کریں کہ ہمارا اسلام رسمی اور اس سے ہمارے نسبت محض موروثی ہے، ہمیں ابھی مشکلاتِ کالہ کی دہلیز پہ قدم رکھنا ہے۔ ایمانی و روحانی معنی میں مشرف بہ اسلام ہونا ہے۔

انفرادی و ملی سطح پر اس عجز و انکسار اور اس عزم و استقلال کے ساتھ مساجد و مدارس، دفاتر و محاکم، اساتذہ و طلاب، سرمایہ و مزدور، تجارت و حرفت، مرد و زن، بچے، بوڑھے ہر سمت سے بنیادی عبادات کی پابندی اور آوازہ اخلاق پر لبیک کی دعوت بلند ہونی چاہیے۔ بنیادی عبادات اور پاکیزہ اخلاق سے ہی ملتِ اسلامیہ کا سچا تشخص اُبھرتا ہے۔ اسی اسلحہ کے ساتھ ہی ہم نے پھر و انگِ عالم میں انسانوں کے دل و دماغ تسخیر کیے تھے۔ اور اس کے بغیر کسی اور قوت کے بل پر اسلام کی نشاۃ ثانیہ کی عمارت کھڑی نہیں کی جاسکتی۔ اس تحریک کے اجراء کی ذمہ داری ایک سے دوسرے کے شانوں پر ڈالنے سے ہم اپنے فرض سے سبکدوش نہیں ہو سکیں گے۔ ملتِ اسلامیہ کا ہر فرد اس کا مکلف ہے اور افراد سے مل کر ہی قوم بنتی ہے۔

افراد کے ہاتھوں میں ہے اقوام کی تقدیر ہر فرد ہے ملت کے مقدر کا ستارہ

اس سلسلے میں نوجوانوں اور طلبہ و طالبات پر خصوصی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔

قوم کے اندر یہی طبقہ حریتِ فکر اور قوتِ عمل کا سب سے بڑا منظر ہوتا ہے اور اکثر بڑوں کی مصالح پسندی اور سودے بازی سے آزاد۔ کیا یہ ممکن ہے کہ وہ اخلاقِ محمدی کا علم سنبھالنے کے لئے سیاسی گروہ بندیوں کو خیر باد کہہ دیں۔ خود اخلاقِ محمدی کی تصویر بنیں اور معاشرے کے ہر چھوٹے بڑے ادنا و اعلا طبقہ میں موجود مادہ پرستی، زرخیزی اور اخلاقِ فردوسی بددیانتی و فرض ناشناسی کے خلاف جہاد کریں۔ تشدد، کبر و نخوت اور نیکی کے غرور کے ساتھ نہیں، بلکہ محمدی رحمت و محبت اور شانِ فقر و انکسار کے ساتھ۔ اسوہ محمدی کی تقلید ہی ہمارے زندگی ہے۔

از رسالت در جہاں تکوین ما

از رسالت دین ما آئین ما

اخلاقی تعلیمات رسول اکرم

جناب محترم پروفیسر اکرام الرحمن

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت تاریخ انسانی کا عظیم ترین واقعہ ہے۔ آپ نے صحرائے عرب کی کلیتہً غیر مہذب اور غیر منظم قوم کو پرچم توحید کے سائے میں تہذیب و تمدن کا ایسا سبق دیا کہ وہ لوگ تبلیغ و تلقین کے سلسلے میں جہاں کہیں بھی گئے وہاں کی اجتماعی زندگی کے لیے ابر رحمت ثابت ہوئے یہی نہیں کہ ان کو نور ابدی کا صحیح راستہ دکھایا بلکہ اپنے بلند اخلاق اور اوصاف حمیدہ سے لوگوں کے دل مسخر کر لیے۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمان رسول کریم کی بعثت سے سو سال کے اندر ہی چین سے لے کر ہسپانیہ تک چھا گئے اور جہاں بھی پہنچے ان کے ذاتی کردار، جذبہ خلوص و ایثار سے متاثر ہو کر ملحدین حلقہ اسلام میں داخل ہوتے رہے۔ مملکت انڈونیشیا کے وسیع اور گھنے جنگلات، ملائیشیا کے خوب صورت بحری ساحل، پاکستان کے زرخیز میدان، دریائے دجلہ و فرات کی سرسبز وادیاں، عرب کے نخلستان، دریائے نیل کا آبِ زواں، البرز کی برفانی چوٹیاں اب بھی عظمتِ اسلام کی گواہی دیتی ہیں۔

مسلمانوں کی عظمت، شان و شوکت، اسلامی ممالک کی موجودہ وسعت، ہمارے ان برگزیدہ اسلاف اور دین کے عظیم مبلغین و مجاہدین کے مساعی کی مرہونِ منت ہے جنہوں نے حضور نبی کریم کی اخلاقی تعلیمات سے بہرہ ور ہو کر نئے عزم اور ولولے کے ساتھ دین کی خدمت کے لیے اپنے وطن کو خیر باد کہا اور وطن غیر میں جا کر اسلام کی اشاعت میں اپنی عمریں نثار کر دیں۔ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے آج دنیا میں تقریباً تمام ممالک میں اللہ کے نام لیوا موجود ہیں اور ایک اندازے کے مطابق ان کی مجموعی آبادی ۹۰ کروڑ سے کم نہیں ہے۔ تاریخِ عالم شاید یہی کہ قوموں کے عروج و زوال میں اخلاقی اقدار کو ہمیشہ بڑا دخل رہا ہے۔ قوموں نے اس کی بد دولت ترقی کی اعلا منزلوں کو پایا ہے اور جس قوم نے اپنے اخلاقی اقدار کو فراموش کر دیا وہ تنزلی کی جانب بڑھتی رہی اور کچھ عرصے کے بعد معدوم ہو گئیں۔ صدیاں گزرنے کے بعد اگر ہم اپنے معاشرے پر طائرانہ نظر ڈالیں تو کیا ہم یقین سے کہہ سکتے ہیں کہ ہمارا معاشرہ اسلامی ہے؟ کیا ہمارا معاشرہ ترقی کی طرف مائل ہے یا انحطاط پذیر؟ کیا ہم اپنے نبی کریم کی اخلاقی تعلیمات پر عمل پیرا ہیں یا فراموش کرتے جا رہے ہیں؟ کیا ہم اپنے خود کے پیدا کیے

و تے مسائل میں اتنے اُلجھ گئے ہیں جہاں سے واپسی کا راستہ نہیں؟ ان تمام حالات کا تجزیہ میں تو یہ صاف اور عیاں ہے کہ ہم نے وہ حاصل نہیں کیا جو ہمیں حاصل کرنا چاہیے تھا، کیوں کہ ہم نے اپنے نبی کریم کے اس آفاقی پیغام کو یکسر بھلا دیا ہے جو ہمارے دین کا ستون ہے۔ یعنی حضورؐ کی اخلاقی تعلیمات۔

اسلام نے دین کے عقائد نہایت سائنٹیفک، مدلل اور موثر طریقے سے پیش کرنے کے ساتھ اخلاق کا بھی ایک ایسا واضح تصور لوگوں کے سامنے رکھ دیا جس سے قرآن کے سننے اور پڑھنے والے ہر شخص کو صاف صاف معلوم ہو گیا کہ اسلام کس قسم کے اخلاق پسند کرتا ہے۔ اور کس قسم کے ناپسند کرتا ہے۔ انسانیت کا کون سا نمونہ اُس کے نزدیک بُرا ہے جسے وہ بدلنا اور ختم کر دینا چاہتا ہے اور کون سا نمونہ اچھا ہے جسے وہ تیار کرنا، پروان چڑھانا اور فروغ دینا چاہتا ہے۔ بُرائی اُس کی نگاہ میں کیا ہے۔ اس کے پیدا ہونے کے اسباب کیا ہیں؟ کیا شکلیں وہ انسانی زندگی میں اختیار کرتی ہیں اور کیا چیزیں اُسے نشوونما میں مُمد و معاون ہیں۔ اس کے برعکس بھلائی اُس کی نظر میں کیا ہے۔ کیا چیز اس کا سرچشمہ ہے اور کس طرح اس کے ظہور کی راہیں کھلتی ہیں اور کن شکلوں میں اس کا ظہور ہوتا ہے۔ اُس نے بتایا کہ اسلام کا مقصد بُرائی کے اسباب کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنا اور بھلائی کی راہوں کو ہموار کرنا، انہیں زیادہ سے زیادہ کشادہ کرنا اور افراد سے لے کر معاشرہ تک ہر شعبہ حیات میں برائیوں کی جگہ بھلائیوں کو قائم کر دینا ہے۔ یہ بیان اسلامی دعوت میں اتنا مفصل، اتنا صریح، اتنا دل نشیں اور عقل عام کے لیے اس قدر قابل فہم تھا کہ جاہلیت کے معاشرے میں صدیوں سے جو لوگ اخلاقی پستیوں میں مبتلا تھے اُن کے لیے بھی یہ سمجھنا کچھ دشوار نہ تھا کہ واقعی انسانیت کا وہ نمونہ بدترین ہے جسے اسلام بُرا کہہ رہا ہے۔ اور وہی نمونہ بہترین ہے جس کے سانچے میں وہ افراد اور معاشرے کو ڈھالنا چاہتا ہے۔

اللہ رب العزت ارشاد فرماتا ہے۔ "اور قسم ہے نفسِ انسانی کی اور اس ذات کی جس نے اسے ہموار کیا اور پھر اس کی بدی اور اس کی پرہیزگاری اس پر الہام کر دی۔ یقیناً فلاح پا گیا وہ جس نے نفس کا تزکیہ کیا، اور ناسراد ہو گیا وہ جس نے اس کو دبا دیا۔"

سورۃ والتین میں خدائے عزوجل فرماتا ہے۔

لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ فِي أَحْسَنِ تَقْوِيمٍ ثُمَّ رَدَدْنَاهُ أَسْفَلَ سَافِلِينَ ۝

مگر ہم نے انسان کو بہترین ساخت پر پیدا کیا۔ پھر اُلٹا پھیر کر ہم نے اسے سب نیچوں سے نیچ کر دیا، سوائے اُن لوگوں کے جو ایمان لائے اور جنہوں نے نیک اعمال کیے۔"

اللہ تعالیٰ نے انسان کو فکر و فہم اور علم و عقل کی بلند پایہ قابلیتیں بخشی ہیں جو کسی دوسری مخلوق کو نہیں بخشیں۔ مگر جب وہ ایمان و عملِ صالح کی راہ اختیار کرنے کے بجائے اپنے جسم و ذہن کو بُرائی کی طرف مائل کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اُس کو ڈھیل دیتا ہے۔

یہ ایک ایسی حقیقت ہے جو معاشرے کے اندر بہ کثرت مشاہدے میں آتی ہے کہ حرص، طمع، خود غرضی، تشے بازی، کمینہ پن، غیظ و غضب اور ایسی دوسری بُری خصلتوں میں سے جس خصلت میں بھی آدمی مستغرق ہوتا ہے اخلاقی حیثیت سے مغلوب ہو کر رہ جاتا ہے۔ ان حقائق کو بیان کرنے کے ساتھ قرآن نے واضح طور پر نفسِ انسانی کی تین الگ الگ قسمیں بیان کی ہیں۔ ایک نفسِ امارہ، جو انسان کو بُرائی کی طرف اُکساتا ہے۔ دوسرا جو انسان کو بُرائی کے خیالِ خواہش، ارادے اور فیصلے تک ہر مرحلے پر ٹوکتا ہے۔ اور اُس کا ارتکاب کر گزرنے کے بعد ملامت کرتا ہے۔ تیسرا وہ جو بُرائی کی راہ چھوڑ کر بھلائی کی راہ اختیار کرتا ہے اور دنیا میں سرخرو ہوتا ہے۔ اس قسم کے نفس کو قرآن نے خدا کا پسندیدہ نفس قرار دیا ہے۔ قرآن نے تاریخی واقعات کے پیرائے میں اخلاقی تعلیمات کو بیان کیا ہے اور یہ بھی بتایا ہے کہ اچھے اوصاف، اخلاق و اعمال کیا ہیں جن سے اسلام افراد اور معاشرے کو آراستہ دیکھنا چاہتا ہے۔

قرآن حکیم میں اللہ تعالیٰ عدل اور احسان اور رشتہ داروں کی مدد کا حکم دیتا ہے اور بُرائی بے حیائی اور ظلم و زیادتی سے منع کرتا ہے اور وہ تمہیں نصیحت کرتا ہے تاکہ تم سبق حاصل کرو۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب نے عملاً یہ دکھا دیا کہ وہ بھلائیوں اور نیکوں کی زبان سے کہنے کی نہیں ہیں بلکہ اسلام نے جس زندگی میں بھی راہ پالی ہے وہ ان بھلائیوں سے آراستہ ہو گئی۔

صالح معاشرہ

قرآن میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ اسلام کا مقصد صرف صالح افراد تیار کرنا ہی نہیں ہے بلکہ انھیں جوڑ کر ایک صالح معاشرہ بنانا بھی ہے، کیوں کہ نوعِ انسانی کی فلاح اس میں منحصر ہے۔ ایمان، حسنِ عدل، حق و صداقت، صبر و استقامت یہ چار صفات ہیں جن پر نوعِ انسانی کی فلاح کا دار و مدار ہے پہلا ایمان یعنی اس بات پر پورا یقین کہ صرف اللہ وحدہ لا شریک ہی خالق، مالک، رازق، حاجت روا، معبود اور حاکمِ مطلق ہے جس کی بندگی و اطاعت کرنی چاہیے اور اللہ کے رسول کی لائی ہوئی ہدایت ہی برحق ہے جس کی پیروی ہمارے اوپر فرض ہے۔ موجودہ زندگی عارضی ہے اس کے بعد ایک دوسری مستقل اور پائیدار زندگی بھی آنے والی ہے جس میں ہم کو اپنے ان اعمال کا حساب دینا ہوگا جو ہم نے دنیا میں کیے ہیں۔ یہ ایمان فلاح پانے والے اور خسارے سے بچنے کے لیے شرطِ اول ہے، کیوں کہ اس کے علا

دوسری ایسی کوئی چیز نہیں ہے جو سیرت و اخلاق اور کردار کے لیے ایک مضبوط بنیاد فراہم کرتی ہو جس پر ایک پاکیزہ زندگی کی عمارت قائم ہو سکتی ہو۔

حسن ایمان کے ساتھ نیک اعمال خسارے سے بچنے کی دوسری لازمی شرط ہے۔ تیسری چیز حق گوئی معاشرے کو اخلاقی زوال اور انحطاط سے بچانے کی ضامن ہوتی ہے۔ آخر میں صبر ہے، یہ غلط ضبط، تحمل، برداشت، ثابت قدمی، ارادے کی مضبوطی، ہمت اور جرأت کے ساتھ کسی باطل طاقت کے مقابلے میں ڈٹ جانے کے لیے بولا جاتا ہے۔ قرآن مجید میں اس لفظ کو اتنے وسیع معنی میں استعمال لیا گیا ہے کہ مومن کی پوری زندگی صبر کی زندگی بن جاتی ہے۔

اخلاقی تعلیم وہ نئی کیمیا تھا جس کا کوئی توڑ مشرکین قریش اور کفار عرب کے پاس نہ تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اسلام کے خلاف خواہ کیسی ہی الزام تراشیاں وہ کرتے تھے، لیکن یہ حقیقت ہے کہ کوئی معقول آدمی یہ باور نہ کر سکتا تھا کہ ایسی اعلیٰ درجے کی اخلاقی تعلیم کوئی خود غرض یا مجنون یا ساحریا کا ہن دے سکتا ہے۔ دنیا میں بہت سے انبیاء کرام داعیان اور مصلحین تشریف لاتے۔ تقریباً سب نے اخلاقیات کا درس دیا، لیکن یہ دیکھنا ہے کہ انہوں نے اخلاقی واعظوں کا خود کیا عملی نمونہ پیش کیا، لیکن اس کے برعکس مکہ کا معلم ”اُتیٰ پکار کر کہتا تھا۔“

”جو ہمیں کرتے وہ کہتے کیوں کہو“

نمونہ عمل

وہ خود اپنی تعلیم کا آپ نمونہ تھا۔ سالوں کے مجمع عام میں جو کچھ کہتا تھا گھر کے خلوت کدے میں اُسی طرح نظر آتا تھا۔ اخلاق و عمل کا وہ نکتہ جو دوسروں کو سکھاتا تھا وہ خود اُس کا عملی پیکر بن جاتا ہے۔

چند صحابہ نے آکر حضرت عائشہؓ سے درخواست کی کہ حضرتؓ کے اخلاق بیان کیجیے۔ انہوں نے پوچھا کہ کیا تم قرآن نہیں پڑھتے؟ پھر آپؓ نے فرمایا: ”آپؐ کا اخلاق ہم تن قرآن ہے۔“ قرآن الفاظ ہیں اور حضورؐ کی سیرت طیبہ اُس کی عملی تفسیر۔ اسی لیے باری تعالیٰ نے فرمایا: ”بے شک تمہارے لیے رسول اللہؐ کی زندگی ایک بہترین نمونہ ہے۔“

اقہات المؤمنین میں حضرت عائشہؓ سے بڑھ کر کسی نے آپؐ کے اوصاف تفصیل سے نہیں بیان کیے۔ فرماتی ہیں:

”کہ اے حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت کسی کو بُرا بھلا کہنے کی نہ تھی۔ بُرائی کے بدلے بُرائی نہیں

کرتے تھے بلکہ درگزر کرتے تھے اور معاف فرمادیتے تھے: آپ نے کبھی کسی سے ذاتی معاملے میں انتقام نہیں لیا۔ آپ نے نام لے کر کبھی کسی مسلمان پر لعنت نہیں کی۔ آپ نے کسی کی کوئی درخواست رد نہیں کی۔ حضرت علیؓ جو آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے تربیت یافتہ تھے آغاز نبوت سے آخر عمر تک ۲۳ برس آپ کی خدمت اقدس میں موجود رہے تھے۔ ایک دفعہ حضرت امام حسنؓ نے اُن سے حضورؐ کے اخلاق و عادات کے متعلق سوال کیا۔ حضرت علیؓ کرم اللہ وجہہ نے فرمایا آپؐ حندہ جبین، نرم خو، مہربان طبع تھے۔ سخت مزاج نہ تھے۔ بات بات پر شور نہیں کرتے تھے۔ کوئی بُرا حکم مُنہ سے نہیں نکالتے تھے۔ عیب جو اور تنگ دل نہ تھے۔ ضرورت سے زیادہ بات نہیں کرتے تھے۔ کوئی دوسرا بات کرتا تو جب تک وہ بات ختم نہ کر لیتا چُپ سنا کرتے۔ دوسروں کے مُنہ سے اپنی تعریف سُننا پسند نہیں کرتے تھے۔ نہایت فیاض، نہایت راست گو، نہایت نرم طبع، نہایت خوش صحبت تھے۔ اگر کوئی دفعاً آپؐ کو دیکھتا تو مرعوب ہو جاتا، لیکن جیسے جیسے آشنا ہوتا جاتا آپؐ سے محبت کرنے لگتا۔

حضرت ہند بن ابی ہالہ جو گویا آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے آغوش کے پروردہ تھے وہ بیان کرتے ہیں کہ آپؐ نرم خوتھے، سخت مزاج نہ تھے، کسی کی توہین روا نہیں رکھتے تھے۔ چھوٹی چھوٹی باتوں پر اظہارِ شکر فرماتے تھے۔ کسی چیز کو بُرا نہیں کہتے تھے، کھانا جس قسم کا سامنے آتا تناول فرماتے اور اُس کو بُرا بھلا نہ کہتے۔ کوئی اگر کسی امرِ حق کی مخالفت کرتا تو آپؐ کو غصہ آ جاتا اور حق کی پوری حمایت کرتے لیکن اپنے ذاتی معاملے پر کبھی آپؐ کو غصہ نہیں آتا تھا اور نہ کسی سے انتقام لیا کرتے تھے۔ آپؐ کے تمام اخلاق و اعمال پختہ و مستحکم تھے۔ کبھی تمام عمر اُن میں ایک ذرہ فرق نہیں پیدا ہوا۔ عدل و انصاف سے کام لیتے تھے۔ اکثر یہ معمول تھا کہ گھر میں نقدی چیز موجود ہوتی تو جب تک کُل خیرات نہ کر دی جاتی گو میں آرام نہ فرماتے۔ آپؐ کے اخلاق و عادات میں جو وصف سب سے نمایاں تھا اور جس کا اثر ہر موقع پر نظر آتا تھا وہ ایثار تھا۔ اولاد سے آپؐ کو بے انتہا محبت تھی۔ آپؐ میں قناعت اور مہمان نوازی حد درجہ تک تھی۔ دوست و احباب سے تحفے قبول فرمالتے تھے بلکہ آپؐ نے اُس کو محبت کا بہترین ذریعہ فرمایا ہے۔ کبھی کسی کا احسان گوارہ نہ فرماتے۔ عدم تشدد آپؐ کا و طیرہ خاص تھا۔ قصاص میں نہایت احتیاط فرماتے۔ مداحی اور تعریف کو بھی ناپسند فرماتے تھے۔ ہر چیز میں سادگی اور بے تکلفی پسند فرماتے تھی، تواضع اور خاک ساری کی راہ سے اکثر معمولی کپڑے استعمال فرماتے تھے۔ آپؐ کی نظر میں امیرِ غریب، صغیر و کبیر، آقا و غلام سب برابر تھے۔ گھر کا کام کاج خود کرتے، کپڑوں میں پیوند لگاتے۔ گھر میں خود جھاڑ دیتے، غلاموں اور مسکینوں کے ساتھ بیٹھتے اور اُن کے ساتھ کھانا کھانے سے پرہیز نہ کرتے۔ شرم و حیا کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ دوسروں کے کام کر دینے میں خوشی محسوس کرتے۔ ابتدا سے

نتہا تک اسلام کا ایک ایک کارنامہ آن حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عزم و استقلال کا مظہر ہے۔ آپ شجاعت کے پیکر تھے۔ سیکڑوں مصائب و خطرات اور بیسیوں معرکے اور غزوات پیش آئے، لیکن پامردی اور ثبات کے قدم نے لغزش نہیں کھاتی۔ راست گفتاری، ایفائے عہد، زبرد قناعت، عفو و حلم جیسی صفاتِ حسد کے آپ پیکر تھے۔

غریبوں اور محتاجوں کے ساتھ نہایت محبت و شفقت سے پیش آتے تھے۔ دشمنوں کے حق میں بھی دُعا کرتے تھے۔ بچوں اور غلاموں پر نہایت شفقت فرماتے تھے اور حیوانات پر بھی رحم فرماتے تھے۔

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ پاک تمام دنیا کے لیے رحمت بن کر آئی تھی۔ آپ نہایت رحم دل اور رقیق القلب تھے۔ بیماروں کی عیادت میں دوست و دشمن، مومن و کافر کسی کی تفریق نہ تھی۔ بیمار کی عیادت کا بہت اچھی طرح خیال رکھا کرتے تھے۔ کبھی کبھی ظرافت کی باتیں بھی فرماتے تھے۔

آن حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اخلاقی تعلیم کے طریقوں پر ایک نظر ڈالنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ اپنی تعلیم میں سختی اور نرمی کے موقع و محل کو خوب پہچانتے تھے اور اس پر عمل فرماتے تھے۔ حقوق و فرائض، فضائلِ اخلاق اور آداب کے سلسلے میں آن حضرت کی جامع تعلیمات موجود ہیں۔ جن کو تفصیل کے ساتھ بیان کرنا یہاں ممکن نہیں ہے، لیکن یہ حضور کی ذاتِ اقدس تھی کہ ان تمام اخلاقی تعلیمات پر جو انہوں نے دیں، خود عمل کر کے دکھایا۔ اسلام کا فلسفہ اخلاق کتنا مکمل، اس کی تعلیم کتنی کامل اور اس کے تہذیب و تمدن کے اصول کتنے اعلا اور اس کے اخلاقی تربیت کے نظریے کتنے اعلا و ارفع ہیں۔ اور یہ سب کچھ نبی "اُمّی" علیہ الصلوٰۃ والسلام کی زبان سے ادا ہوا۔ اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت کی کوئی اور دلیل نہ بھی ہوتی تو یہی ایک چیز کافی تھی کہ جس بلندی تک حکمائے زمانہ اور قوموں کے معلم پہنچنے سے قاصر رہے، معلم "اُمّی" صلی اللہ علیہ وسلم کسی انسانی تعلیم کے سہارے کے بغیر وہاں تک پہنچ گئے۔ اور اُس قوم کو جو تہذیب و تمدن سے نا آشنا، اخلاقِ عالیہ سے بیگانہ اور سلیقہ و شعور سے قطعی نا آشنا تھی اُسے نہ صرف اخلاق و تمدن کے ایسے بلند حکیمانہ اصول اور نظریے سکھائے بلکہ اپنی تعلیم و تربیت سے مستقبل میں ان میں ایسی جلا پیدا کر دی کہ دُنیا ان کے اخلاقی جلووں کو دیکھ کر حیران و ششدر رہ گئی۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی وہ پیش گوئی پوری ہوئی جو ابراہیم ہی نسل کے خاتم المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد کے لیے کی گئی تھی۔ "یعنی ایسا نبی جو ان امتیوں کو اللہ کے احکام اور اخلاق و حکمت سکھائے اور ان کو اپنی تعلیم و تربیت سے پاک و صاف کر کے نکھارے۔ یہ نکھارنے والا آیا اور

نکھار کر دُنیا کو پُر بہار بنا گیا۔ صلی اللہ علیہ وسلم“

ہمیں فخر ہے کہ ہم اس پیکرِ اخلاق پیغمبرِ آخر الزماں سرورِ کونین آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی امت میں ہیں جس کی اخلاقی تعلیمات کا چشمہ فیض ہر خاص و عام، ہر دور اور ہر خطے کے لیے ہے ہمارا فرض ہے کہ حضورؐ کی اخلاقی تعلیمات پر نہ صرف خود عمل کریں بلکہ تحریکِ آوازِ اخلاق کو پاکستان کے چپے چپے میں پھیلائیں تاکہ ہمارا معاشرہ حقیقی معنوں میں اسلامی معاشرہ بن جائے جو مسلمانوں میں ایثار، اخوت، یگانگت اور اتحاد کا جذبہ پیدا کرنے کا ضامن ہو اور یہ امر پاکستان کی سالمیت و بقا اور عظمت کے لیے ضروری ہے۔

محکومی اور آزادی

جناب محترم جسٹس (رٹائرڈ) قدیر الدین احمد

امت محمدی کے لئے سیرت اقدس کا ایک حیرت انگیز رُخ

ابتدائیہ

مندرجہ بالا عنوان کو منتخب کرنے کا محرک ایک تو یہ احساس ہوا کہ محکومی سے اور عقیدت سے جو دو قسم کی تابعداریاں پیدا ہوتی ہیں ان کے فرق کو بیان کیا جائے، تاکہ گہری عقیدت اور محبت کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے جو خدمات انجام دی جاتی ہیں ان میں اور کسی حاکم کے حکم کو بجالانے میں جو زحمت اٹھانی پڑتی ہے اس میں جو تضاد ہے اس طرف اشارہ کیا جاسکے۔ دوسرا محرک آج کل کا یہ عام تاثر ہے کہ جتنا زیادہ نفاذ اسلام کا پورا ہوا گا۔ اتنی ہی کثرت سے پابندیاں بڑھیں گی اور احکام جاری ہوا کریں گے یہاں تک کہ معاشرہ ان میں جکڑ کر رہ جائے گا اور جو حقوق بہت خود اعتمادی باقی ہے اس کا بھی خاتمہ ہو جائے گا۔ نیز روایات کے مقابلے میں عقل اور سمجھ کا استعمال باعثِ فہم بن جائے گا۔ اس کے برعکس ہمارا دعوایہ یہ ہے کہ اگر ایسا ہوا تو وہ اسلام کا صحیح نقشہ نہیں ہوگا۔ کیونکہ اسلام انسان کو ہر طرح کی غلامی سے چھڑانے کے لیے آیا ہے۔ اس نے ہماری طرح طرح کی قیود کی زنجیروں کو توڑا ہے۔ وحدانیت کا سبق سکھا کر سینکڑوں بتوں، دسیوں اجرامِ فلکی اور بیسیوں جانوروں کی عبادت سے آزادی دلائی ہے۔ قوانینِ فطرت کے وجود کو اچھی طرح بتا کر توہمات کی جڑیں کاٹی ہیں۔ غیب کے علم کو فقط اللہ کا علم بتا کر بنجومیوں اور پیشین گوئی کرنے والوں سے نجات بخشی ہے۔ قسم قسم کے بے معنی اور نقصان دہ رسم و رواج کی پابندی کو غیر ضروری ظاہر کر کے ان سے بچھا چھڑایا ہے۔ باپ دادا کے ان طور طریق سے جو انہوں نے بلا علم اور دلیل اختیار کیے تھے، ہم کو محفوظ کر دیا ہے۔ ظالم حکام کی بے حد بداعتدالیوں کے آگے سر جھکانے کو ایمان کی کمزوری قرار دیا ہے۔ ایسے ایسے خود سر علما اور فضلا کی حکومت سے انسان کی گردن چھڑائی ہے۔ جیسے قدیم وقت کے یہودیوں کے دینی پیشوا ہوا کرتے تھے۔ ایسی تعلیم کی یہ برکت تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ایسی امت کی تعمیر کر دی جس میں خود اعتمادی بدرجہ اتم

موجود تھی اور جو علم اور عقل کی قدر و قیمت کو دنیا کی ساری قوموں سے زیادہ جانتی تھی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ اور آنحضرت کا زمانہ ایسی تاریخ پیش کرتے ہیں جو جسمانی آزادی سے لے کر ذہنی آزادی تک کی ایک مثالی تاریخ ہے۔ ان مختصر سی سطور میں اس تاریخ کے اسی رخ کا ایک سرسری سا عکس پیش کرنے کی خواہش ہے۔ واقعات تو نئے نہیں ہو سکتے لیکن تاریخ کے بہت سے رخ ہو سکتے ہیں۔

غلاموں کی شہنشاہی

مثلاً ایک مغربی مصنف نے لکھا ہے کہ قرآن اور سنت رسول اللہ نے غلامی کی زندگی کو آزادی سے زیادہ شیریں بنا دیا تھا۔ دیانتدار غیر مسلموں کے لیے یہ دیکھنا آسان تھا کہ جب اسلام آیا تو اس نے کس طرح غلاموں کو آقاؤں کے ہم پلہ کر دیا بلکہ سارے کم درجہ کے افتخارات کو مٹا کر نیک اور پاک زندگی کو دینی اور دنیاوی مراتب کی بنیاد بنا دیا۔ غلاموں کے ساتھ بد سلوکی کو نعدائے لائیزال کی ناخوشی کا باعث بنا دیا۔ ہوتے ہوتے غلام اور ان کے خاندان دنیائے اسلام میں بڑے بڑے سلاطین اور شہنشاہ بنے جس کو دیکھ کر تاریخ عالم اپنی آنکھیں ملتی رہ گئی۔

شعب ابی طالب

یہ تو ایک ایسا رخ تھا جس کو دور سے بھی دیکھا جاسکتا تھا۔ مگر چند اور بھی رخ ہیں جن کو حلقہ بگوشان اسلام اور فدایان محمد عربی نے اپنے دلوں کی گراہیوں میں محسوس کیا اور اپنی مرضی سے اختیار کی ہوئی جاں نثاریوں کو اپنی زندگیوں کے لیے فخر کا سرمایہ سمجھا۔ تاریخ اسلام کے وہ تین سال جن میں سارے مسلمان ایک وادی میں قید ہو کر رہ گئے تھے اکثر مورخین کی آنکھوں سے اس طرح اوجھل ہو جاتے ہیں کہ گویا وہ تین لمحے تھے۔ مگر شعب ابی طالب جس میں خدائے واحد کے نام لینے والوں کو طویل مدت کی قید ہوئی تھی۔ اس کو ایک کھلا ہوا سا ہٹلر کے بنائے ہوئے کیمپوں کی قسم کا ایک کیمپ سمجھنا چاہیے۔ اس میں کل مسلمان جو ایک مٹی بھر انسان تھے قید تھے وہ قید ہٹلر کی قید سے زیادہ سخت اس وجہ سے تھے کہ وہاں بجائے کسی کی کھلانے پلانے کی ذمہ داری کے دشمنوں کا مقصد بھوکا پیاسا مارنا تھا۔ بچے بھوک سے بلکتے تھے اور ماؤں کے دودھ خشک ہو گئے تھے۔ وہ قیدی پتے کھاتے تھے اور بوتلوں کے چمڑے کو پانی میں ابال کر اگلنے پر بھی مجبور ہو گئے تھے۔ رمانی کی واحد شرط یہ تھی کہ اپنے محبوب راہبر محمد بن عبد اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جاں نثاری کو ترک کر کے انہیں دشمنوں کے حوالے کر دیا جائے۔

اس شرط کو پورا کرنے کی ان قیدیوں کو آزادی تھی۔ وہ محکوم بس اپنی ہی عقیدت اور محبت کے تھے۔ اگر وہ چاہتے تو اس مصیبت کو جسے انھوں نے چھتیس مہینے یا ایک ہزار دن جھیلا ایک آن میں ٹال دیتے۔ بات بس اتنی تھی کہ اپنی ہی مرضی کی عقیدت مندانہ محکومی کے دائرے سے دو قدم باہر نکل جاتے۔ مگر مشکل یہ تھی کہ محکومی جسموں کی نہیں بلکہ دلوں کی تھی۔ دل محکوم تھے، گو جسم آزاد تھے یہ مثال ساری امت کے بیک وقت مشترکہ احساس محکومی اور آزادی کی ہے۔ جب مسلمانوں کی تعداد بڑھ کر کثیر ہو گئی تو پھر ایسی مثال کا ظہور نہیں ہو سکتا تھا۔

زید بن حارثہؓ

لیکن اس وقت اس سے پہلے اور اس کے بعد صدائے مثالیں شخصی محکومی اور آزادی کی ایسی ملتی ہیں کہ جن کو دیکھ کر انسان کی عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ وہ سوچ میں پڑ جاتا ہے کہ کیا غلامی کی مجبوری عشق و محبت کی مجبوری کے آگے ایک کھیل ہوتی ہے۔ کھیل اس طرح کہ جب انسان مجبور ہو تو اسے ہر ایک مصیبت کو برداشت کرنا ہی پڑتا ہے اور وہ کسی دن آزاد ہو جانے کی امید بھی کر سکتا ہے۔ مگر جب اسے اختیار ہو کہ اپنی مرضی سے آزاد ہو جائے لیکن وہ پھر بھی غلامی ہی کو ترجیح دے تو اس آزاد محکومی سے رہائی نہیں مل سکتی۔ حضرت زید بن حارثہؓ کا قصہ سنئے کہ ان کے ماں باپ جس قافلے میں تھے وہ لٹ گیا۔ اس وقت یہ بچے تھے، ان کو لوٹنے والوں نے لے جا کر فروخت کر دیا۔ خریدار سے حضرت خدیجہ الکبریٰؓ نے خرید لیا پھر اپنی تجارت کے ایجنٹ محمد بن عبداللہؓ کو بطور تحفہ دے دیا۔ اس غلام کے والد فراق میں سرگرداں پھرتے رہے اور رورور کر ان کا دل آب ہوتا رہا۔ آخر کار ایک مدت کے بعد ان کو معلوم ہوا کہ ان کا بیٹا غلامی میں ہے۔ چنانچہ وہ اس کے آقا کے پاس پہنچے اور محبت پوری کا واسطہ دیکر بیٹے کی رفاقت طلب کی۔ اس زمانے میں کوئی اپنا غلام کب کسی کو مفت میں دیتا تھا۔ غلام کا باپ ہونا کوئی نئی بات نہ تھی۔ ان حالات میں یہ درخواست بے معنی تھی۔ مگر رسول خداؐ نے ایک باپ کی خواہش کو قبول فرمایا۔ البتہ شرط یہ لگائی کہ زید کے ساتھ زبردستی نہیں ہوگی بلکہ جو ان کی خواہش ہوگی وہی کیا جائے گا۔ باپ کو امید ہوئی ہوگی کہ بیٹے کی غلامی کا وقت ختم ہوا اور اب وہ باپ کی شفقت سے فیضیاب ہوگا۔ انہیں شاید معلوم نہیں تھا کہ ان کے بیٹے کی محکومی اس کی آزادی سے زیادہ لطیف اور پڑ بھار ہے۔ وہ حضور رسالت مآبؐ کی قربت کو کب ترک کرنے والا ہے۔ اس نے کہا کہ اس کے آقا کا فراق اس کے لیے قابل برداشت نہیں ہے اور زبانِ حال سے جتا دیا کہ:

صد جان فدائیت کہ دہم دامت از دست
 دشوار بدست آمد و آساں نہ فروشم
 باپ جب خالی ہاتھ لوٹے ہوں گے تو رسول اللہ کی غلامی سے شفقتِ پدیری کا مقابلہ
 کر کے دل میں یا تو نادم اور یا بہت ہی خوش ہوئے ہوں گے۔

چارہ جہاں نثار

یہ واقعہ تو ایک فرد کے آزادی کو قبول کرنے سے انکار کا تھا۔ انہوں نے اپنے باپ
 کے آغوش کی آزادی کو رسول خدا کی غلامی پر قربان کر دیا۔ اب ایک دو واقعات ایک ایسی
 جہاں نثاری کے ملاحظہ کیجئے کہ جن کی غایت سوائے نبی اسلام کی ذات اور ان کے دین پر قربان
 ہو جانے کے اور کچھ نہ تھی۔ وہ محکومی ایمان کی اور عشق رسول کی تھی جس میں کسی قسم کی دنیاوی
 پابندی کا نام تک نہ تھا۔ اپنی آنکھوں کے سامنے وہ نقشہ لائیے جب جنگ احد میں گھسان کا
 رخ تھا۔ افواہ پھیل گئی تھی کہ محبوب خدا شہید ہو گئے۔ نتیجہ میں ہر طرف سرا سیمگی چھا گئی تھی
 اور بے ترتیبی برپا ہو گئی تھی۔ جو جہاں تھا وہیں شہرہ رہ گیا تھا، مگر تھوڑی ذمیر میں کسی نے
 آنحضرت کو پہچان کر آواز دی کہ وہ حیات ہیں۔ اس خبر سے جہاں مسلمانوں کے دل بڑھے و ماں
 قریش نے بھی ان کو دیکھ کر انہی پر ہلہ بول دیا اور ہر طرف سے ایک ہی مرکز پر وار ہونے لگے۔ یہ
 دھاوا اس قدر شدید تھا کہ شمع نبوت کے گل ہو جانے کا خطرہ نظر آ رہا تھا۔ اس وقت آنحضرت
 نے مناسب سمجھا کہ مسلمانوں کو عین اس مقام سے مطلع کریں جہاں آپ گھرے ہوئے تھے۔ اس وقت
 ان کی طرف جانا ہی جان دینے کے برابر تھا۔ چنانچہ آنحضرت نے للکار کر فرمایا :

”کون مجھ پر جان دیتا ہے !“

یہ سن کر زیاد بن سکن پانچ الفارے کر جہاں نثاری کے لیے بڑھے ان میں سے ایک نے
 داد شجاعت دیکر جہاں فدا کر دی۔ مولانا شبلی فرماتے ہیں :

”حضرت زیادؓ کو یہ شرف حاصل ہوا کہ آنحضرت نے (اسی کیفیت میں) حکم دیا
 کہ ان کا لاشہ (میرے) قریب لاؤ۔ لوگ اٹھا کر لائے (اس وقت ان میں) کچھ کچھ
 جان باقی تھی۔ (انہوں نے حضور کے) قدموں پر (اپنا) منہ رکھ دیا اور اسی
 حالت میں جان دی۔“

بچہ ناز رفتہ باشد نہ جہاں نیاز مندے

کہ بوقت جہاں سپردن کسرس سیدہ باشی

پہرہ ورنہ شمع

جنگ عظیم ہو گئی آنحضرت مجروح ہوئے مگر حیات تھے لیکن مدینہ میں ان کے وصال کی خبریں پھیل گئی تھیں اس لیے مدینہ والے بیتاب تھے کہ آنحضرت کی خیریت معلوم ہو جائے۔ انصار میں ایک خاتون تھیں جن کا نام عقیقہ تھا۔ ان کے باپ، بھائی، شوہر سب اس معرکہ میں شہید ہو گئے تھے وہ بھی حضور کی خیریت معلوم کرنے شہر سے باہر آئی تھیں۔ لوگ بارہا بارہی ان کے ایک ایک رشتہ دار کی موت کا حال سناتے تھے مگر وہ ہر خبر کے بعد پوچھتی تھیں کہ رسول اللہ کیسے ہیں لوگ کہتے کہ وہ بخیر ہیں۔ یہ سن کر شکر ادا کرتی۔ لیکن اپنی آنکھوں سے دیکھنے کے لیے آگے بڑھتی جاتیں۔ بالآخر اپنی آنکھوں سے چہرہ مبارک دیکھا تو بے اختیار لپکار اٹھیں:

”تو ہے تو سب مصیبتیں پیچ ہیں۔“

یہ حال سننے والے بتائیں کہ یہ محکومی تھی یا آزادی؟ میں کہوں گا کہ ہاں یہ آزادی تھی، جسم کی، جہاں کی، وسعت دنیا میں اپنے ارادوں کی۔ مگر محکومی تھی دل کی، شعور کی، ایمان کی، ضمیر کی اور عشق پاک کی۔ جو لپکار لپکار کر کہہ رہا تھا کہ:

سر دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی

ملکہ بران عالم کے محبوب

ایک خاتون پہ پی کیا منحصر ہے۔ جو بھی مسلمان تھا وہ آنحضرت کے نور کا پہرہ ورنہ تھا۔ ہر مرد اور عورت کا دل چاہتا تھا کہ زیادہ سے زیادہ تعظیم کرے۔ اور اس کو کام بجالائے۔ بڑے بڑے رتبے والے بلکہ مدبران عالم میں شمار ہونے والے بزرگ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوشش کرتے تھے۔ اوروں کا تو ذکر ہی کیا جب ابو بکر صدیق اور عمر فاروق اپنا زیادہ سے زیادہ مال و متاع ان کے قدموں پر نثار کرنے کو اپنے لیے اعزاز سمجھتے تھے اور ان کے خیال میں بس انہی کے دلوں کو یہ راز معلوم تھا کہ وہ اس میں ایک دوسرے سے آگے بڑھنا چاہتے تھے۔ مگر بھانپنے والے ایسے رازوں سے کب بے خبر ہوتے ہیں۔ چنانچہ ایک دفعہ مال حاضر کرنے میں جو ان صاحبان میں محبت کی کشمکش ہوئی وہ استفہ مشہور ہے کہ اقبال نے اس کو نہایت سلیقہ اور پراثر انداز میں نظم کیا ہے۔

عمل صالح سے دلی لگاؤ اور بادۂ محبت و عقیدت کی سرشاری کا بولنقشہ شاعر نے سادہ الفاظ میں کھینچا ہے وہ
 کلام عارفانہ کا ایک دلکش نمونہ ہے۔ انظم شروع ہی اس طرح کرتے ہیں کہ :
 اک دن رسول پاکؐ نے اصحاب سے کہا دین مال راہق میں جو ہوں تم میں مالدار
 ارشاد سن کے فرط طرب سے عمر اٹھے اس روزان کے پاس تھے درہم کئی ہزار
 دل میں یہ کہہ رہے تھے کہ صدیق سے فرور بڑھ کر رکھے گا آج قدم میرا راہوار
 جب وہ مال پیش کر چکے تو مقدار کو دیکھ کر حضور سرور عالم نے پوچھا کہ اپنے اہل و عیال کے
 لیے بھی کچھ رکھا ہے :

کی عرض نصف مال ہے فرزندوزن کا حق

باقی جو ہے وہ ملت بیضا پہ ہے نثار

اتنے میں وہ رفیق نبوت بھی آگیا جس سے بنائے عشق و محبت ہے استوار

لے آیا اپنے ساتھ وہ مرد وفا سرشت ہر چیز جس سے چشم جہاں میں ہوا غنبار

جب سرور کائنات نے ان سے دریافت کیا کہ گھر میں بھی کچھ چھوڑا ہے تو جواب دیا کہ

پروانے کو چراغ ہے بیل کو پھول بس

صدیق کے لیے ہے خدا کا رسول بس

یہ ہے وہ محکومی جس کی لطافت صراٹوں کی آزاد ہواؤں سے زیادہ لطیف اور خوشبو کی پھیلنے

والی لپٹوں سے زیادہ معطر کرنے والی ہے اس درد مندانہ محکومی کے آگے بے مقصد آزادی کا غرور کیا

پتیرے اس پھیکی آزادی سے کوئی پوچھے کہ :

بہ جہان درد منداں تو بگو چہ کار داری

تب و تاب ماشناسی دل بے قرار داری

امت مسلمہ کے دل کی امنگ

حکم برداری کے طور پر اور محبت کی تسکین کے واسطے جان نثار کرتے ہیں بہت بڑا فرق ہے۔ سب سے

بڑا حاکم وہ ہے جو آرزوں پر حکومت کرے اور دلوں کا مالک بن جائے جو عزت اور تعظیم اور دلاری

اس کی ہوتی ہے وہ بڑے سے بڑے حاکم یا ظالم شہنشاہ کی بھی نہیں ہو سکتی۔ رسول خدا کے متعلق

مشہور ہے کہ وہ اپنے اصحاب کے ساتھ بلا لحاظ مرتبہ نبھاؤ کرتے تھے۔ یہ پسند نہیں فرماتے تھے

کہ آپ کے ساتھی تعظیم کے لیے کھڑے ہوا کریں۔ ہمیشہ نیچی آواز اور نرم لہجے میں خطاب فرماتے تھے۔

بے ادبی کو خندہ پیشانی سے معاف کر دیا کرتے تھے۔ مگر جب مسلمان تھے وہ ان کے علم کے پروانے تھے۔ جن لوگوں نے سلاطین اور شہنشاہوں کے دربار دیکھے تھے وہ وہاں خوف کی اور یہاں محبت کی حکمرانی کے فرق کو جانچ لیتے تھے۔ تاریخ گواہ ہے کہ معاہدہ حدیبیہ سے پہلے جب مسلمان کمزور تھے اور صلح کی پیشکش کی گئی تھی تو قریش کا سفیر عروہ بن مسعود ثقفی حالات دیکھنے کے لیے آیا اور رسول اللہ سے گفتگو کرنے کے بعد واپس جا کر رپورٹ دی۔ اس میں مسلمانوں کے حالات کا جائزہ لیا اور ان کے قائد کے متعلق بھی رائے زنی کی اس نے جو کیفیت بیان کی وہ مولانا شبلی کی زبانی سنیے وہ فرماتے ہیں :

”عروہ نے رسول اللہ کے ساتھ صحابہ کی حیرت انگیز عقیدت کا جو منظر دیکھا اس نے اس کے دل پر عجب اثر کیا۔ قریش سے جا کر کہا کہ میں نے قیصر و کسریٰ اور نجاشی کے درباروں کے دربار دیکھے ہیں مگر یہ عقیدت اور وارفتگی کہیں نہیں دیکھی۔ محمد بات کرتے ہیں تو سناٹا چھا جاتا ہے۔ کوئی شخص ان کی طرف نظر بھر کر نہیں دیکھ سکتا۔ وہ وضو کرتے ہیں تو جو پانی گرتا ہے اس پر خلقت ٹوٹ پڑتی ہے۔ اور وہ اپنے مومنہ کا لعاب تھوکتے ہیں تو عقیدت کیش ہاتھوں ہاتھ لے کر پیروں اور ہاتھوں پر مل لیتے ہیں۔“

ظاہر ہے کہ عروہ جس کا کام عظیم الشان درباروں میں سفارت کرنا تھا، ان درباروں میں یہ منظر کیونکر دیکھتا وہاں تو گرفت فرماتے۔ ہتھیاروں سے لرے ہوئے اور بچاق چو بند سپاہی تھے جو آنا فانا میں ہر بے ادب کو سزا دینے کے لیے مستعد رہتے تھے۔ اس کے مقابلے میں یہاں کا دربار سادہ اور یہاں کے درباری ادب بلکہ تہذیب و تعظیم کے دائرے سے آگے بڑھ کر عقیدت مندی کی قدم بوسی کو اپنی عزت اور اپنے لیے روت سمجھتے تھے۔ یہ وہ محکومی تھی جس کا قصیدہ اگر خود آزادی لکھے تو بعید نہیں۔

رائے پر اعتراض کی اجازت

اس محکومی، عقیدت مندی اور وارفتگی کی ایک خاص صفت اور بھی تھی جس کو اس بے مثل قائد کی تعلیم و تربیت کی بند نبیالی اور اعلا ہمتی کا معجزہ کہنا چاہیے۔ وہ صفت یہ تھی کہ یہ دارفتگان محبت اور عقیدت، اپنی جان، اپنا مال، اپنا دل اور اپنا ایمان تو اپنے قائد اور اس قائد کے مالک کے ہاتھ فروخت کر چکے تھے۔ مگر نہ اس رسول نے اور نہ اس کے اللہ نے ان کی عقلوں کو خرید لیا تھا۔ خدائے قدوس نے بار بار عقل استعمال کرنے اور علم حاصل کرنے کی تاکید اسی رسول کے ذریعہ سے اپنے کلام پاک میں کی ہے۔ سوچنے، سمجھنے، اپنے کان اور اپنی آنکھوں کو استعمال کرنے کی اس قدر سخت تاکید کی ہے کہ اس سے زیادہ شدت ممکن نہیں ہے۔ سورہ اعراف (نمبر ۷) آیت نمبر ۱۷۹ میں ارشاد

ہے کہ :

اُن کے پاس دل ہیں مگر وہ اُن سے سوچتے نہیں ۔
اُن کے پاس آنکھیں ہیں مگر وہ اُن سے دیکھتے نہیں ۔
اُن کے پاس کان ہیں مگر وہ اُن سے سنتے نہیں ۔
وہ جانوروں کی طرح ہیں بلکہ اُن سے بھی زیادہ گٹے گزرے ۔
یہ وہ لوگ ہیں جو عقلمندی میں کھو گئے ہیں ۔

میرے علم میں نہیں ہے کہ کسی اور دینی یا دنیوی قائد نے ہوش و حواس اور عقل کو استعمال کرنے کی ایسی حتمی تاکید کی ہو ۔ اس تعلیم و تلقین کا اثر یہ تھا کہ پیغمبر خدا نے جہاں اس کا حکم خدا کی اطاعت سکھائی وہاں مسلمانوں میں یہ جرات بھی پیدا کی کہ جب محمد بطور ایک بندہ خدا کے کسی دنیاوی معاملے میں اپنی رائے کا اظہار فرمائیں تو مسلمان بھی بطور بندگانِ خدا کے اس سے اختلاف کر سکیں ۔ ایسے متعدد مواقع پر صحابہ نے اپنی رائے کا اظہار کیا ہے اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے قبول بھی فرمایا ہے ۔ اس بیان کی وضاحت طویل ہو سکتی ہے مگر اختصار کو مد نظر رکھتے ہوئے صرف ایک واقعہ بیان کیا جاتا ہے جسے آپ صاحبانِ ضرور پہلے سے جانتے ہوں گے ۔ مگر واقعہ کی اہمیت کے لحاظ سے اس کا اعادہ بے جا نہ ہوگا ۔

ہوا یہ کہ جنگ خندق جاری تھی اور مسلمان ایک ماہ سے محاصرے میں تھے ۔ کھانے پینے کے سامان اور ہر قسم کی ضروریات پر دشمنوں نے کڑی پابندی لگا دی تھی ۔ سب پر کئی کئی وقت کے نالغے گزر رہے تھے اچھے اچھے مسلمان دشمنوں کی فوج کے دل بادل کو دیکھ کر پریشان نظر آ رہے تھے کہ ایسی حالت میں غنیم کی طرف سے یہ شرط پیش کی گئی کہ مدینہ کی سالانہ پیداوار حملہ آوروں کو دنیا منظور ہو تو محاصرہ اٹھالیا جائے گا ۔ رسول اللہ ﷺ حالات کو دیکھ کر تشویش محسوس کر رہے تھے ۔ چنانچہ آپ نے یہ شرط قبول کر لی اور ایک تہائی پیداوار دینے کی شرط پر صلح کر لی ۔ لیکن فیصلہ کرنے سے پہلے سعد بن عبادہ اور حضرت سعد بن معاذؓ کو جو روسائے انصار تھے بلا کر مشورہ فرمایا ۔ تو انھوں نے دریافت کیا کہ یہ تجویز اللہ کے حکم سے ہے یا آپ کی ذاتی رائے ہے ۔ حضور نے جواب دیا کہ یہ ان کی اپنی رائے ہے ۔ یہ سن کر ان مشیروں نے اسے نامنظور کر دیا ۔ آنحضرت نے انہی کی رائے پر عمل فرمایا اور خدا نے عزوجل نے مسلمانوں کو فتح سے سرفراز فرمایا ۔

مقصدِ اعلا کے لیے حکومت

آنحضرت کے مشیروں کا یہ سوال قابلِ غور ہے کہ ایک تہائی پیداوار دیکر صلح کرنے کی تجویز خدا کے حکم سے کی گئی یا حضور اقدس کی ذاتی رائے ہے۔ اس سوال میں بڑی گہرائی تھی۔ اور جواب سن کر اس رائے کو اختیار نہ کرنے کا واقعہ اس سے بھی زیادہ اہم ہے۔ سب سے پہلے تو ہیرت کی بات یہ ہے کہ ایک طرف تو محبت، عقیدت اور فارتگی کی یہ کیفیت تھی کہ ہر امتی اپنے رہبر اور محسنِ اعظم کی جان تو جان ان کی برآن اور ایک آواز پر فدا ہو جانے کے لیے تیار رہتا اور دوسری طرف ان کے دل میں اس خیال کا آنا تھا کہ آنحضرت کی کوئی ذاتی تجویز جو خالص دنیاوی معاملات سے متعلق ہو تو اس کو قبول کرنا لازمی امر نہیں۔ یہ جرأت بغیر آنحضرت کی مرضی کے پیدا نہیں ہو سکتی تھی۔ ذرا تصور فرمائیے کہ وہ کیا تعلیم و تربیت ہوگی جس نے آنحضرت کی ذات اور رسالت کے نازک فرق کا استقدر صاف نقشہ ان صاحبان کے ذہن میں محفوظ کر دیا تھا۔ یہ بھی خیال میں رکھیے کہ اُس معلمِ اعلا کی شخصیت کس قدر بلند ہوگی جو اپنی رائے کے بعد دوسری رائے کو اختیار کرنے کی جسارت پیدا کرتا تھا۔ لیکن اُس کی عظمت ان کے دلوں میں ذرہ برابر نہیں گھٹتی تھی۔ میرے علم میں نہیں ہے کہ کسی اور دینی یا دنیوی قائد نے ہوش و حواس اور عقل کو استعمال کرنے کی ایسی عسقی تاکید کی ہو۔ میرے دل سے پوچھیے تو یہ تعلیم ایک مردہ قوم میں ہمت اور خود داری کی جان ڈالنے کے برابر تھی۔

مقہور اس غور کرنے پر معلوم ہو جاتا ہے کہ آنحضرت کی عظمت ان کے دلوں میں کیسے گھٹی جب کہ ساری امت کو یقین کامل تھا کہ آنحضرت کا مقصد ان کے ذہنوں کو غیر اللہ کی پابندیوں سے آزاد کرنا، ان میں خود اعتمادی کی تعمیر کرنا تھا۔ اس عزم کے لیے حضور ان کے ارادوں کو قوی کرنا ان میں حق کی خاطر جرأتِ استقلال کو پیدا کرنا اور اپنی تعلیم و تکریم کو حدود کے اندر سمیٹ دینا چاہتے تھے ان کی عزت اور عظمت، عقیدت اور حکم برہاری کی جو کیفیت تھی اس کو حدود کے اندر رکھنا بڑا دشوار مرحلہ تھا۔ اگر آنحضرت اس خصوص میں ذرا بھی ڈھیل دیتے تو ان کے بعد کے معتقد اور جاں نثار ان کو انانیت کے درجے سے اٹھا کر درجہ خداوندی میں پہنچا دیتے میرے سب ان ہی کی ہیرت انگیز دور بینی کا نتیجہ ہے کہ اپنی ذاتی اطاعت کو گھما کر عمل کی آزادی کے موقعے دیے۔ اسی کا نتیجہ یہ ہے کہ ان کی امت آج کی ساری اور قوموں کی نسبت شرک سے دور ہے۔

ایک سجدہ

حضور رسالت مآب کے نزدیک ہر وہ چیز جو شانِ خداوندی میں کہیں دور سے بھی شرکت کا وہم پیدا کر دے قطعی ناروا تھی۔ اس بارے میں مولانا حالی کی مسدس کا مندرجہ ذیل ایک بند ہمیشہ

دہرائے کے قابل رہے گا۔ میں جب اس کو پڑھتا ہوں تو میرے دل میں آنحضرت کی عظمت کے احساس کی ایک نئی رو پیدا ہوتی ہے۔ یہ بند شاعرانہ تخیل کا شاہکار نہیں ہے بلکہ اس کا ہر ایک مصرعہ رسالت مآب کے ایک قول کا رواں ترجمہ ہے۔ ذرا غور کیجیے کہ آنحضرت کا ارشاد کیا تھا۔ ارشاد تھا کہ:

بنانا تہ تربت کو میری صنم تم نہ کرنا میری قبر پر سر کو خم تم
 نہیں بندہ ہونے میں کچھ مجھ سے کم تم کہ بیچارگی میں برابر ہم ہیں ہم تم
 مجھے حق نے دی ہے بس اتنی بزرگی
 کہ بندہ ہوں اُس کا اور ایلچی بھی

وحدانیت کی یہ تعلیم بس ایک ہستی کی بندگی کی اجازت دیتی ہے اور وہ ہستی خدائے لایزال ہے۔ اس کے علاوہ کسی اور کے آگے سر جھکانا یا کسی اور سے نیرو و شر کا واسطہ قائم کرنا خلاف حکم الہی ہے۔ جو دل اس ایک حضور ہی میں جھک گیا وہ کسی اور سے نہ لالچ رکھ سکتا ہے اور نہ مرعوب ہوتا ہے۔ یہ ایک غلامی ایسی ہے کہ جو اس میں داخل ہو کر حلقہ بگوش ہو گیا وہ دنیا کے سارے سر بلندوں کے سامنے سرفراز ہو گیا۔ البتہ شرط یہ ہے کہ ایک ہی حضور میں سجدہ کرے اور دنیا بھر سے بندگی کا رشتہ توڑ دے۔ لیکن یہ ثابت قدمی آسان نہیں کیونکہ بہت سے اہل اقتدار اور بہت سے محکوموں پر یہ خاق گزرتی ہے۔ کسی اور سے تو میں کچھ کہنے کے قابل نہیں، اپنے ہی دل سے کہتا ہوں کہ:

یہ ایک سجدہ جسے تو گماں سمجھتا ہے
 ہزار سجدوں سے دیتا ہے آدمی کو نجات

ذہن کی لا محدودیت

نعمت کے دینے والوں، طاقت کے شکنجے میں کسے والوں اور کہہ و فرسے لہزا دینے والوں کی پیدا کی ہوئی لالچ اور ان کے پھیلا ہوئے خوف سے دل کو یہ سجدہ جو تحفظ دیتا ہے وہ تو انسان آنکھوں سے بھی دیکھ سکتا ہے۔ مگر وحدانیت میں اعتقاد سے ذہن کو جو وسعت حاصل ہوتی ہے اور اس سے کائنات کا جو تصور پیدا ہوتا ہے وہ انسان کی شخصیت کو بدل دیتا ہے۔ اس کے ذہن میں اُس کا رشتہ مہ و انجم سے استوار ہو جاتا ہے۔ اس کو ایک ایسی قوتِ ناظمہ کا احساس ہو جاتا ہے جو اس کے روحانی وجود کو اس کرہ ارض سے باہر لے جاتا ہے۔ وہ اپنی ساخت اور کائنات کی ساخت میں یگانگت کا تصور کرنے لگتا ہے اور فطرت سے ہم آہنگی کا سامان دیکھتا ہے۔ اس وحدت کے خیالات، احساسات اور تصورات ارضی حوادث کو یک لخت سیکڑ کر حقیقہ کہہ دیتے ہیں اور انسان کے آگے اختیار اور انتخاب

کی درازہ اور وسیع راہیں کھل جاتی ہیں۔ ارتقاے حیات کا وہ منظر سامنے آتا ہے کہ جب زندگی مادہ سے بلند ہو کر روحانی مدارج میں داخل ہوتی ہے۔ یہ منظر جتنا ہے کہ انسان بلند ہو کر حقیقتِ کلی کی طرف بڑھ سکتا ہے۔ کیونکہ انسان کے ذہن اور آرزوؤں میں برابر تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں۔ جس مرتبہ کا انسان ہوتا ہے اسی درجے کی تبدیلی کا اُس کو تجربہ ہوتا ہے۔ رسولِ خدا کی معراج کسی اور کو نصیب نہیں ہو سکتی۔ مگر اقبال نے جدید خیالات اور رجحانات کے مطابق اس کی جو شرح کی ہے وہ ہر مسلمان کو نہایت ارفع اور پُر تمکین آزادی کی بشارت دیتی ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ :

سبق ملا ہے یہ معراجِ مصطفیٰ سے مجھے

کہ عالمِ بشریت کی زد میں ہے گردوں

اس شعر کے روحانی اور طبیعیاتی مضمرات کے مد نظر کیا یہ مناسب نہ ہو گا کہ اس کو یک گونہ اس آیت کریمہ کی شرح متصور کر لیا جائے جس میں ارشاد باری تعالیٰ ہوتا ہے :

الْمُتَرَدِّدَاتِ اللّٰهُ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ وَاَسْبَغَ عَلَيْكُمْ نِعْمَهُ ظَاهِرًا وَبَاطِنًا ط (سورہ لقمان ۳۱، ۲۰)

ترجمہ : کیا تم نہیں دیکھتے کہ اللہ نے زمین اور آسمانوں کی ساری چیزیں تمہارے لیے مسخر کر دی ہیں اور اپنی کھلی اور چھپی نعمتیں تم پر تمام کر دی ہیں۔

اس خوشخبری کے بعد کیا شک ہے کہ دین اسلام کی محکومی وہ شے ہے جس کی ہر کاب زمین اور آسمان کی حکومت ہے۔ اسلامی زندگی احکام اور پابندیوں کا پلندہ نہیں ہے۔ وہ محکومی اور مجبوری اور دنیاوی طاقتوں کی غلامی نہیں ہے۔ عیسائیت کی تاریخ نے ثابت کر دیا کہ دینی پیشواؤں کی حکومت بھی ایک قسم کی دنیاوی سلطنت ہوتی ہے۔ مسلمانوں کو اللہ نے اس سے بھی آزادی دی ہے۔ سچی اسلامی زندگی وہ ہے جس میں مسلمانوں کو تشخیر کائنات کے وسائل پر قدرت حاصل کرنے کے مواقع میسر ہوں۔ فکر اور عمل کی یہ ہمت اور یہ آزادی انسانیت کے لیے اسلام کا خاص تحفہ ہے۔

کَلَّا تَقْتُلُوا اور کَلَّ يَوْمَ حَلْوٰنِي نشان میں خدا کی خصوصی رحمت امت محمدی کے لیے

ہے۔ جس زندگی میں یہ نہیں وہ سمجھے ہوئے دلوں کی محفل اور خاموش چراغوں کی رات ہے۔ ایسی دنیا اسلام کی دنیا نہیں ہو سکتی۔ اسلامی کائنات وہ ہے جس میں :

عروجِ آدمِ خاکی سے انجم سے جاتے ہیں

کہ یہ ٹوٹا ہوا تارِ امیرِ کامل نہ بن جائے

اخلاق نبوی کی روشنی میں

اسلام کا سیاسی مزاج

جناب محترم الین۔ ایم۔ ظفر

عنوان کی ترتیب عہد ہے؛ یعنی اخلاق نبوی کا مزاج اسلام کا۔ اسی ترتیب سے آج یہاں سیاست کے موضوع پر گفتگو ہوگی۔ سیاست سے مراد ایک ماڈرن مملکت کی بھرپور سیاست ہے جس میں قائد کی صلاحیت، عوام کی تربیت، جماعت کی تشکیل، شوریٰ کا نظام اور جمہوریت وغیرہ شامل ہے۔

ابن خلدون نے سیاست کی تعریف یوں کی تھی۔ سیاست وہ قانونی حکمت عملی ہے جس کی قوت سے اجتماعی کردار اور مصالح عامہ کا تحفظ کیا جاتا ہے اور حکومت کا نظم چلایا جاتا ہے دیکھنے میں جس طرح یہ بہت بڑا موضوع ہے اسی طرح یہ اتنی ہی بڑی اہمیت بھی رکھتا ہے اس لیے میں یہ سمجھتا ہوں کہ موجودہ زمانے کے تقاضوں کو سامنے رکھتے ہوئے اس پر قدرے تفصیلاً ہی سے گفتگو ہونی چاہیے؛

میرے نزدیک رسول مقبولؐ کا اسوہ حسنہ قبل از نبوت بھی سیاسی معاملات میں ہمارے رہنمائی کرتا ہے اس لیے میں نے اس وقت ہی سے جب آپؐ نے رسالت و نبوت کے منصب پر فائز ہونے کا اظہار کیا تھا، ایسے واقعات اور حالات کا انتخاب کیا ہے جن سے کوئی نہ کوئی نتیجہ ضرور سامنے آتا ہے اور پتہ چلتا ہے کہ اسلام کا سیاسی مزاج کیا ہے۔

یہ واضح کر دینا مناسب ہوگا کہ واقعات کی ترتیب اور ان کا انتخاب ممکن ہے تاریخ دار نہ ہو لیکن ایک ماڈرن مملکت کا سیاسی ڈھانچہ نگاہوں کے سامنے رکھتے ہوئے ایسے واقعات ضرور ترتیب پاگئے ہیں جن کا مملکت کے مختلف شعبوں سے تعلق ہے۔ ہو سکتا ہے یہ احساس بھی پیدا ہو کہ واقعات میں تسلسل نہیں لیکن جب آپؐ واقعات کے نتائج کو یکجا کر کے دیکھیں گے تو ہمارے سامنے ایک مربوط اور مکمل شکل نظام حکومت اور سیاسی مزاج کی یقیناً آجائے گی

شش ایک طرح سے تحقیق کی حیثیت رکھتی ہے اور اس تحقیق کے نتیجے میں جو اہم بات سامنے آتی ہے وہ یہ کہ قرآن حکیم کے اصولوں کو سمجھنے کے لیے جتنی ضرورت اخلاق نبوی (سنت رسول) کی ہے وہی سیاست کو پیش آتی ہے زندگی کے دوسرے شعبوں میں شاید یہی کسی اور شعبے کو پیش آئے۔

نزولِ وحی

موضوع زیر بحث کے سلسلے میں سب سے پہلے وہ موقع اور وہ بات آتی ہے جو سیدہ خدیجہؓ نے اس وقت کہی جب رسول مقبولؐ پہلی نزولِ وحی کے بعد اضطراب کی حالت میں گھر پہنچے تھے۔ سیدہ خدیجہؓ نے اس وقت جو باتیں آپ سے کہیں ان کی حیثیت اور اہمیت یوں وقعت پاجاتی ہے کہ خود رسول مقبولؐ اس وقت پریشان تھے اور یہ فیصلہ نہ کر پائے تھے کہ اس واقعے کی اصلیت کیا ہے؟ آپ نے اپنے اضطراب کا اظہار کیا تھا اور اس موقع پر حضرت خدیجہؓ نے اس سلسلے میں جو کچھ عرض کیا۔ میں اسے اپنی گفتگو کا موضوع بناتے ہوئے اس میں سے صرف انہی باتوں کو منتخب کر کے پیش کر رہا ہوں جن کا تعلق سیاست کے سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ سیدہ خدیجہؓ نے اس موقع پر یہ عرض کیا تھا کہ آپؐ غریبوں، مسکینوں اور محتاجوں کو کھانا کھلاتے ہیں۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ آپؐ لوگوں کا بوجھ اٹھاتے ہیں۔ پھر عرض کیا ہمیشہ سے سچی بات کہنا آپؐ کا شیوہ ہے۔ پھر عرض کیا آپؐ حق و صداقت کی راہ میں مصائب و آلام کا مردانہ وار مقابلہ کرتے ہیں۔ اس کے بعد ایک نتیجہ اخذ کرنے کے انداز میں سیدہ خدیجہؓ نے اس طرح عرض کیا لہذا جو کچھ آپؐ نے دیکھا اور سنا ہے وہ آپؐ کے حق میں مفید ہی ثابت ہوگا۔

سیاست و قیادت

اگر غور کیا جائے تو اس گفتگو میں اسلامی سیاست کے قائدین کے اوصاف اور ان کے خصائص بیان کیے گئے اور ایک طرح سے اس سے اسلامی ریاست کا منشور بھی واضح ہو جاتا ہے۔ قائدین کو ایسا ہونا چاہیے کہ وہ غریبوں اور محتاجوں کا بوجھ اٹھا سکیں۔ اجتماعی زندگی میں جب انہیں اثر و اقتدار ملے تو ایسا نظام ان میں جس سے جلد ہی عزت و انکسار کا خاتمہ ہو سکے۔ سوشل ویلفیئر ریاست کی بنیاد یہاں سے ہی مل جاتی ہے۔

دوسری صفت جو ایک قائد میں تلاش کی جاتی ہے وہ یہ ہے کہ وہ صادق اور امین ہو، یعنی جو بات کہے سچ کہے۔ سچ کہنا، سچ بولنا اس کا شیوہ ہو بلکہ اس کی عادت میں داخل ہو جیسا کہ ہماری جدوجہد آزادی اور تحریک پاکستان کی تاریخ میں قائد اعظم محمد علی جناح کا نام ایک روشن مثال ہے۔ لوگ کہتے ہیں قائد اعظم نہ صرف سچے تھے بلکہ عادتاً سچے تھے جسے انگریزی میں INTELLECTUALLY HONEST کہتے ہیں۔ یعنی قیادت ایسی ہونی چاہیے کہ اس پر عوام کا یقین و اعتماد ہو۔ اور یہ کہ

ابتدائی سے اس کا کریڈٹ درست ہو۔ CREDIBILITY کی شرط ایک اچھی اور صحیح قیادت کے لیے بے حد ضروری ہے۔

تیسری بات یہ کہ حقوق کے تحفظ اور اس کے حصول کے لیے نامساعد حالات کا مقابلہ کرنے کی بنیادی ضرورت کا ذکر ہے اور یہ واضح کر دیا گیا ہے کہ حق کی بات کرنے والے بے باک مخلص اور اٹھارہ پرور ہونے چاہئیں۔ یعنی لانگ مارچ اور مسلسل کوشش کے بعد ہی معاشرے کے درست ہونے کی ضمانت دی گئی ہے۔

اعلانِ نبوت

میرے نزدیک دوسرا ہم واقعہ نبوت کا اعلان ہے جب آپ نے کوہ صفا پر کھڑے ہو کر اہل مکہ کو پکارا اور ان سے پوچھا کہ اگر میں تمہیں یہ خبر دوں کہ اس پہاڑ کے دامن میں ایک لشکر پڑاؤ ڈالے پڑا ہے اور موقع پا کر چاہتا ہے کہ تم پر حملہ کرے تو کیا تم میری بات مان لو گے۔ اہل مکہ نے یک زبان ہو کر کہا: آپ امین ہیں ہم نے آج تک آپ کی زبان سے کوئی بات غلط نہیں سنی اس لیے آپ جو کچھ کہیں گے ہم اس کو سچ مانیں گے۔

اگرچہ اس سے پہلے بھی آپ حضرت خدیجہ کی زبان سے یہی بات سن چکے تھے تاہم وہ اپنے گلہ رانی کی بات تھی۔ قیادت کے لیے یہ ضروری تھا کہ اس پر اعتماد کا اعلان عوام بھی کرتے۔ کیونکہ قیادت کا مقصد عوام کی رہنمائی کرنا ہے۔ اگر ابتداء ہی میں قیادت پر عوام کا اعتبار قائم نہ ہو تو پھر قیادت بے کار ثابت ہوتی ہے۔

صفاتِ قیادت

ہمارے ملک کی سیاست میں بد قسمتی سے یہی کچھ ہوتا رہا ہے کہ قیادت نتیجہ خیز ثابت نہیں ہوتی ہیں ایسے قائد تو ضرور ملتے رہے جو سیاسی تدبیر اور فہم و فراست کی دولت سے مالا مال تھے، مگر انہوں نے اپنی سیاسی زندگی کا آغاز کچھ ایسے انداز سے کیا کہ اس پر عوام اعتماد نہ کر سکے، جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اچھے کام بھی انجام نہ پاسکے جن کی عوام کو قائد سے توقع تھی۔

جب اسلام جیسی قوت اور تحریک کو بھی عوام تک پہنچانے کے لیے یہ لازم ہوا کہ اس کے قائد کی ذات ہر شک و شبہ سے بالاتر ہو تو اسلامی سیاست کے بنیادی اصولوں میں یہ پہلا اصول از خود طے پا جاتا ہے کہ اس کا قائد قول و فعل کے تضاد سے بالکل پاک ہو۔

اسلامی سیاست اس بات کی اعجازت نہیں دیتی کہ اس کے لیڈر یونہی نعروں پر عوام کو خوش کر کے اپنا مطلب نکالیں بلکہ جو کچھ کہیں وہ کر کے دکھائیں۔ اس طرح اسلام نے قیادت کے لیے عمل کی بہت کڑی شرط عائد کر دی ہے۔

اسلام اس قول کو تسلیم نہیں کرتا کہ محبت اور جنگ میں ہر شے جائز ہے۔ بلکہ مقصد کے حصول کے لیے اسلام نے یہ لازم کر دیا ہے کہ سیاسی میدان میں بھی حق و صداقت کا دامن کبھی ہاتھ سے نہ دیں اور صداقت کی تائید اور تصدیق سارے عوام سے حاصل کی جائے اور یہ مافی ہوائی بات ہے کہ حق و صداقت اور سچائی کا اثر اذہان پر خود بخود مرتب ہوتا ہے اور عوام سچے قائد کو پہچان سکتے ہیں۔ مختصراً اس واقعے سے یہ دو بڑی باتیں اخذ ہوتی ہیں۔

ایک یہ کہ قیادت پاک صاف اور بے باک ہو، اس میں کوئی تضاد نہ ہو دوسرے یہ کہ قیادت کے لیے عوام کی تائید براہ راست حاصل کی جائے جیسا کہ پورے ملکے والوں کو دعوت دی گئی کہ تم بتاؤ۔ کسی مختصر سی محفل یا اپنی طرف سے بلائے گئے لوگوں سے تائید حاصل نہیں کی گئی تھی۔

قائد اور عوام

اس سے یہ ظاہر ہوا کہ قیادت کے لیے قائد اور عوام کے درمیان کوئی واسطہ ضروری نہیں بلکہ اس کے لیے خود قائد کا عوام تک پہنچنا بے حد ضروری ہے اور ایک سچا قائد جس کے قول و فعل میں کوئی تضاد نہیں اہل مکہ جیسے جاہل اور گنوار عوام سے بھی اپنی قیادت منوا سکتا ہے۔ اسی سے یہ اصول بھی واضح ہوا کہ قائد کے لیے عوام سے رابطہ پیدا کرنا بے حد ضروری ہے۔

مکی زندگی سے سبق

نبوت کے بعد کی مکی زندگی سے جس میں آپ نے بڑے صبر و تحمل اور استقامت سے تبلیغ کی حضرت خدیجہ کی اس بات کا کہ آپ نڈر اور مخلص ہیں قطعی ثبوت مل جاتا ہے۔ لہذا میں مکی زندگی پر تفصیل سے کچھ نہیں کہوں گا صرف دو باتوں کا ذکر کروں گا۔

اول یہ کہ جب سردارانِ قریش نے یہ فیصلہ کیا کہ آپ کو مکے کی سرداری پیش کر دی جائے تو اس وقت آپ نے یہ ارشاد فرمایا کہ میں بادشاہت قائم کرنے کے لیے نہیں آیا۔ اگر آپ اس وقت سردارانِ قریش کی بات مان لیتے تو وہ یقیناً آپ کو سردار بنا لیتے۔ لیکن مقصد چونکہ ایک فلاحی مملکت کے قیام کا تھا اس لیے آپ سردارانِ قریش کے مرہونِ منت نہ ہوئے اور یہ بات سیاستدانوں کے

یہ واضح کر گئے کہ اقتدار کا مقصد صرف اقتدار کا حصول نہیں بلکہ اس سے عوام کو فائدہ پہنچانا اور کیے گئے وعدوں کو پورا کرنا مقصود ہے۔

اس قسم کی ایک سرداری انگریزوں نے محمد علی جناح کو بھی یہ کہہ کر پیش کی تھی کہ وہ دونوں ملکوں (بھارت پاکستان) کے گورنر جنرل بن جائیں۔ چونکہ ایسی سرداری سے نظریہ پاکستان کو نقصان پہنچتا تھا اس لیے قائد اعظم نے اس پیش کش کو ٹھکرا دیا۔ دراصل مخصوص مفادات کا حامل طبقہ اپنے مقصد کو پانے کے لیے عام طور پر یہی طریقہ ایجاد کرتا ہے کہ وہ انقلابی لیڈر کو سرداری کی پیش کش کر کے اپنے راستے سے ہٹانے کے لیے ایک چال چلتا ہے۔ اس سے بچنا اور صحیح اور نادرست قیادت کے درمیان فرق محسوس کرنا ایک سچے اور مخلص قائد کا فرض منصبی ہے۔ دوسرا واقعہ یہ کہ جب آپ نے یہ فیصلہ کر لیا کہ خود بھی نکلے سے ہجرت کرنی ہے تو آپ نے حضرت ابوبکر صدیق سے ارشاد فرمایا کہ وہ شام کو تیار ہو کر آجائیں۔ ہمیں بھی نکلے سے ہجرت کرنی ہے۔ حضرت ابوبکر تو اسی ساعت کے منتظر تھے انہوں نے تو پہلے ہی سے دل ہی دل میں تیاریاں مکمل کر رکھی تھیں۔ چنانچہ جونہی شام ہوئی وہ سواری کے لیے دو اونٹنیاں لے کر آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ یہ دو اونٹنیاں ہیں ان میں سے ایک آپ اپنے لئے منتخب فرمائیں۔ آپ نے ایک اونٹنی کو اپنے لئے چن لیا۔ خوشی سے حضرت ابوبکر کا چہرہ دکھا تھا اور عرض کیا مجھے اب آپ اس اونٹنی پر سوار ہو جائیں مگر آپ نے سوار ہونے سے پہلے حضرت ابوبکر صدیق سے دریافت فرمایا کہ اس کی قیمت کیا ہے پھر جب اصرار کر کے آپ نے قیمت پوچھی اور حضرت ابوبکر کو مجبوراً وہی کوئی پٹہ ہی تب آپ سوار ہوئے۔ اب ذرا ہمارے زمانے کی سیاست سے اس کا موازنہ کریں ہمارے رہنما اپنے دوستوں سے اکثر یہی کہتے ہیں کہ پہلے ہمیں اقتدار حاصل کر لینے دو اور ہماری ضرورت کے لیے اپنی کاریں اور دیگر وسائل ہماری تحویلی میں دیدو ایک صاحب نے تو اس مطالبے پر پورا بینک ہی لے لیا تھا) پھر جب ہم اقتدار حاصل کر لیں گے کئی گنا زیادہ نفع کے ساتھ تمہارا تمام حساب چکا دیں گے۔ کہیں بذریعہ روٹ پرمنٹ اور کہیں لائسنسوں کی بھرمار سے تمہارے دلوں کے تمام مشوق پورے کر دیں گے۔

ابن اسحاق کا بیان ہے کہ آنحضرت نے ایک مرتبہ منیٰ میں بلاد عرب کے نمائندوں کے سامنے ایک تقریر کی اور اسلام کی طرف آنے کی دعوت دی۔ ایک قبائلی عرب بحیرہ بن فراس نے سمجھا کہ آپ اپنی شہنشاہیت کے لیے جدوجہد کر رہے ہیں۔ اس نے پوچھا:

”اگر ہم تمہاری رعایا بن جائیں اور آپ اپنے دشمنوں پر غلبہ پا جائیں تو کیا یہ ممکن ہے کہ آپ ہمیں حکومت کا جانشین مقرر کر دیں؟“ آپ نے جواب دیا:

”حکومت کا معاملہ مختلف ہے وہ خدا کے ہاتھ میں ہے۔“

غرض کہ کسی قسم کی غلط امید بھی نہ دلائی۔
 اور اس مثال اور اس سے پہلے کی مثال سے یہ بھی ثابت ہوا کہ اسلامی مملکت شخصی اور شخصیت
 میں ہے بلکہ یہ عوامی اور REPUBLIC ہے۔

واقعہ ہجرت سے رہنمائی

ہجرت کا واقعہ کئی طرح کی اہمیت کا حامل ہے۔ دراصل ملکی زندگی سے خفیہ انجمنوں کو کس
 رخ ملایا جائے اور آغاز میں کامیابی کتنی مشکل ہوتی ہے۔ وغیرہ قسم کی سیاسی تربیت کے لیے بے حد
 مواد ملتا ہے۔ لیکن ان تفصیل سے گزرتے ہوئے ہم ہجرت کی اس اہمیت کی طرف توجہ کرتے ہیں کہ
 سلام کی تاریخ کا آغاز ہی ہجرت سے کیا گیا۔ یہ آغاز آپ کی پیدائش کے دن سے کیا جاسکتا تھا۔ یا اعلان
 بوت کے دن کی اہمیت کے پیش نظر اس دن سے کیا جاسکتا تھا۔ لیکن سنہ ہجری یعنی آپ کی ہجرت
 سے کیوں اسلامی سال کا آغاز ہوا؟

میرے تجزیہ میں اس کی وجہ یہ ہے کہ مسلمان پہلی بار ایک آزاد قوم کی حیثیت میں اپنی زندگی
 کا آغاز اسی وقت سے شروع کرتے ہیں اور اسلام کی پہلی مملکت یعنی ریاست مدینہ کی بنیاد پڑتی ہے اس
 سے اہم سیاسی اصول مرتب ہوتا ہے اور اسلامی سیاسی مزاج کی نشاندہی ہوتی ہے۔
 جیسا کہ علامہ ابوالنصر فارابی نے کہا اور شاہ ولی اللہ اور سید احمد شہید نے تائید کی۔ یہ اسلامی
 مزاج کا خاصا ہے کہ مسلمان آزاد ہو۔ غلامی مسلمان کے مزاج کے مطابق نہیں ہے۔ اسلام کا یہی
 مزاج پاکستان کے وجود کا باعث بنا۔ اسلام کے اس مزاج نے مشرق وسطیٰ کے مسلمانوں کو آزادی
 کی خواہش سے مضطرب رکھا۔ اور مغربی مفکرین تسلیم کرتے ہیں کہ COLONIALISM کی لعنت سے
 جلد چھٹکارے کی ایک وجہ مسلمانوں کی آزادی کی خواہش تھی۔

غرض اسلام کے مطابق زندگی بسر کرنے کے لیے یہ لازم ہے کہ ایک آزاد مملکت بھی ہو۔
 اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ ایک ماڈرن مملکت کی کما حقہ مزوریات اسلام ہتیا کرتا ہے۔
 اب ذرا اس معاہدے کے الفاظ پر غور کریں جو آپ نے مدینہ کے مسلمانوں اور غیر مسلمانوں کے
 درمیان کیا۔ اس میں ایک شق یہ ہے کہ معاہدہ میں شامل ہونے والے تمام فریق ایک ملت واحدہ قرار
 دیئے جاتے ہیں۔

آج کسی بھی بڑے سے بڑے جمہوری ملک کا آئین اٹھا کر دیکھ لیں یا بڑے مغربی سیاسی مفکر کا
 مملکت کے متعلق تصور لے لیجیے۔ ملت واحدہ کے تصور سے آگے نہ جمہوری مملکت نہ سیکولر حکومتیں

کوئی تصور دے سکیں ہیں۔

ایک بار ایک مملکت میں شہولیت ہو گئی تو پھر ایک ملت کا حصہ بن گئے۔ شاید ایسی ہی بات تھی جو قائد اعظم نے دستور ساز اسمبلی میں کہا تھا کہ اب پاکستان بن گیا ہے اور مسلمان اور غیر مسلم برابر کے شہری بن گئے ہیں۔ "اسلام کا سیاسی مزاج" ایک اسلامی ریاست میں ملتِ واحدہ کے تصور کو اجاگر کرتا ہے۔

صلح حدیبیہ کا واقعہ تو سب جانتے ہیں۔ مسلمان اس معاہدہ کو اپنی کمزوری سمجھتے تھے۔ چنانچہ حضرت عمرؓ نے باقی مسلمانوں کے جذبات کی ترجمانی کرتے ہوئے آپؐ سے کہا: "اے اللہ کے رسول! کیا آپ رسول نہیں؟ کیا آپ نبی برحق نہیں؟" آپؐ نے فرمایا: بیشک میں نبی ہوں۔" حضرت عمرؓ نے فرمایا: کیا ہم مسلمان نہیں؟ ارشاد فرمایا: کیوں نہیں۔ حضرت عمرؓ نے کہا: کیا وہ لوگ مشرک نہیں؟ فرمایا: مشرک ہیں۔

حضرت عمرؓ نے عرض کی: پھر ہم دین کے معاملے میں یہ ذلت کیوں گوارا کریں۔

آپؐ نے فرمایا: میں اللہ کا رسول ہوں اللہ مجھے ہرگز خوار نہ کرے گا۔

آپؐ نے حضرت عمرؓ کے سوالات کے جوابات خوش دلی اور صاف گوئی سے دیے۔ لیکن پھر بھی مسلمان افسردہ تھے۔ اور قربانی کے لیے جو جانور لائے ہوئے تھے وہ قربان نہیں کر رہے تھے۔ آپؐ نے نبی عائشہؓ سے ذکر کیا اور پھر ان کی رائے کے مطابق مسلمانوں سے کوئی گلہ کیے بغیر پہلے خود اپنے جانوروں کی قربانی دی۔ آپؐ کو دیکھ کر باقی مسلمانوں نے بھی قربانی دینا شروع کر دی اور فضا سے کھچاؤ اور مالوسی دور ہو گئی۔

اس ذکر سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اسلام کے سیاسی مزاج میں تنقید برداشت کرنے کی گنجائش ہے۔ عوام اپنے خیالات کا اظہار کر سکتے ہیں۔ اور قائد پر فرض ہے کہ وہ ان کی تسلی کرے۔ البتہ عوام نے ایک بار کسی کو اپنا لیڈر چن لیا ہے تو ان پر بھی فرض ہے کہ اپنے خیالات کا اظہار کرنے کے بعد اطاعت میں کمی نہ کریں

یہی مزاج تھا جو کہ اخلاق نبیؐ سے اسلام کی سرشت میں شامل ہو گیا کہ لوگوں نے حضرت عمرؓ سے ان کے کرتے کا حساب مانگ لیا تھا۔

احساب، آزادی رائے

اسلام کی سیاست CORNER STONE احتساب ہے اور اس کے لیے آپ کی تمام زندگی ایک نمونہ ہے۔ صلح حدیبیہ کا یہ واقعہ ہی چونکہ بڑا ہی SENSITIVE واقعہ تھا اور اس دن جذبات بڑے مختلف تھے اس لیے اس دن آپ نے جو اخلاق کا نمونہ پیش کیا اور ماننے والوں کو اپنے جذبات کے اظہار کا جو موقع دیا وہ ایسی مثال ہے کہ اس سے اظہار رائے کی آزادی کا پورا چارٹر مرتب ہو سکتا ہے۔ آزادی اظہار اور احتساب کا چولی دامن کا ساتھ اسلام کے مزاج میں شامل ہے۔ جو اسلامی ریاست آزادی اظہار کو روکتی ہے اور احتساب کا مکمل انتظام نہیں کرتی وہ ابھی اسلام کے سیاسی نفاک کے ابجد سے بھی واقف نہیں ہے۔

فتح مکہ

واقعات تو بہت سے ہیں اور ایک ایک واقعہ نئے زاویے سے سیاسی مزاج کی تدوین کرتا ہے۔ لیکن آج تو خدو و خال ہی پیش کیے جا سکتے ہیں اس لیے میں اب فتح مکہ کی بات کرتا ہوں۔ اس روز آنحضرت نے کعبہ کے دروازے پر کھڑے ہو کر تین اہم اعلان کیے تھے۔ پہلا اعلان تو حرمتِ مکہ کے متعلق تھا، دوسرا عام معافی ہے اور تیسرا اعلان سیاست کا سنگِ میل ہے۔

آپ نے اعلان کیا؟

”آج جاہلیت کے خاندانی اور نسلی غرور کا خاتمہ کر دیا گیا ہے۔ تمام انسان آدم سے ہیں اور آدم مٹی سے بنا تھا۔“

یہ اعلان مساوات آج کے دساتیر میں RIGHT OF EQUALITY کے نام سے مشہور ہے۔ اس اعلان نے ظاہر کر دیا کہ اسلامی حکومت عمومیت کی اساس پر قائم ہو سکتی ہے۔ اور حسب نسب کے جھگڑے اور حسب نسب کے شجروں سے پاک ہے۔ جو یہ کہے کہ وہ اچھے اور ایک بہت معزز خاندان کا رکن ہے اس لیے افضل ہے۔ وہ اسلام کے مزاج کے خلاف بات کرتا ہے۔ خاندانی شجروں کو علاوہ تاریخی فتنہ کے اور اسلام میں کوئی اہمیت نہیں ہے۔ اس قسم کا بیان کراہل رائے لوگوں کو حسب نسب اور خاندانی تعلق کو مد نظر رکھ کر چنا گیا ہے یا چنا جائے گا۔ نوکر شاہی کی ترجمانی کرتا ہے اور اسلامی مزاج کے مطابق نہیں ہے۔

خاتمہ کلام

اب آخر میں ایک عجب مثال پیش کرنی ہے اور یہ آخری بات ہے۔ اخلاق نبی کی کیاشان ہے۔ آپ اپنے ساتھی تیار کرتے ہیں، انہیں رشد و ہدایت دیتے ہیں، ان کی تربیت کرتے ہیں، لیکن اپنے بعد کسی کو نامزد نہیں کرتے اور معاملہ عوام پر چھوڑ دیتے ہیں۔

میں نے اپنی کتاب "عوام، پارلیمنٹ، اسلام" میں اسے "سکوت حکیمانہ" کا نام دیا ہے۔ اگر آپ حکم دے جاتے تو تعمیل کرنا فرض ہو جاتا، آپ نے یہ بات جمہور پر چھوڑ دی، نامزدگی سے اجتناب کیا۔

اپنی قوت اور اختیارات کا استعمال نہ کرنا اور جمہور کے اختیارات کو ترجیح دینا، ایسی مثال ہے کہ اسے جمہوریت کا میگڈا ٹارٹا کہنا ہی صحیح اور افضل ہے۔

اخلاق نبی کی روشنی میں آپ نے دیکھا کہ کیسا اسلامی سیاسی مزاج ابھرتا ہے۔ اول تو سیاسی شعور اس مزاج کا ایک حصہ دکھائی دیتا ہے۔ مسلمان کے خون میں سیاست ہے۔ پھر یہ عمومی اور جمہوری ہے۔ مساوات کی تعلیم دیتی ہے اور قائد سے تقاضا کرتی ہے کہ اس کے قول و فعل میں فرق نہ ہو۔ اور نظام حکومت کا مقصد عوام کی بھلائی چاہنا ہے دنیا کا کوئی دستور اس سے لگا نہیں کھا سکتا۔

اسلام کا نظام عدل

جناب محترم جسٹس (ریٹائرڈ) محمد افضل چیمہ

ان اللہ یامر بالعدل والاحسان وایتاؤدی القربی
وینہی عن الفحشاء والمنکر والبغی یعظکم لعلکم
تذکرون ۵

”بے شک اللہ تعالیٰ اعتدال اور احسان اور اہل قربت کو دینے کا حکم فرماتے
ہیں، اور کھلی بُرائی اور مطلق بُرائی اور ظلم کرنے سے منع فرماتے ہیں، اللہ تعالیٰ
تم کو اس لیے نصیحت فرماتے ہیں کہ تم نصیحت قبول کرو!“

مغرب کے محدود تصورِ مذہب کے برعکس جو محض چند رسوم و عبادات سے عبارت
ہے اسلام ایک جامع ضابطہ حیات اور مکمل نظامِ زندگی کی حیثیت رکھتا ہے جس کے لیے
قرآن مجید میں ”دین“ کی اصطلاح استعمال فرمائی گئی ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

ان الدین عند اللہ الاسلام ۵

”بلاشبہ دین اللہ تعالیٰ کے نزدیک صرف اسلام ہی ہے“

وَمَنْ يُتَّبِعْ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِينًا فَلَنْ يُقْبَلَ مِنْهُ ۵

”اور جو شخص اسلام کے سوا کسی دوسرے دین کو طلب کرے گا تو وہ

اس سے مقبول نہ ہوگا“

اور حجۃ الوداع کے موقع پر حضور پر جو آخری آیتِ کریمہ نازل ہوئی، ”الیوم اکملت
لکم دینکم“ اس میں بھی تکمیلِ دین کا ذکر فرمایا گیا۔ چنانچہ دینِ اسلام ہماری انفرادی اور
اجتماعی زندگی کے ہر شعبے میں ہدایت اور رہنمائی کے وہ ابدی اور اساسی اصول مہیا کرتا ہے
جو اللہ تعالیٰ نے قرآنِ کریم کی صورت میں وحیِ الہی کے ذریعے خاتم المرسلین ورحمۃ للعالمین
صاحبِ خلقِ عظیم کی وساطت سے ہم تک پہنچائے۔ پھر حضورِ اکرمؐ کی حیاتِ طیبہ کے ایک
مقدس لمحے سے ان اصولوں کی عملی تعبیر و تفسیر کا بہترین نمونہ میسر آتا ہے جو سیرت و سنتِ نبوی

یعنی حضورؐ کے افعال و اقوال کی صورت میں کتب حدیث میں پوری صحت کے ساتھ محفوظ ہے۔ حضورؐ قرآن مجسم تھے۔ حضرت عائشہ صدیقہؓ نے ایک استفسار کے جواب میں ارشاد فرمایا:

كَانَ خُلُقَهُ الْقُرْآنُ

”آپ قرآن مجسم تھے“

قرآن کریم کا ارشاد ہے:-

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَن كَانَ يَرْجُوا اللَّهَ

وَالْيَوْمَ الْآخِرَ وَذَكَرَ اللَّهَ كَثِيرًا ۝

”تم لوگوں کے لیے یعنی ایسے شخص کے لیے جو اللہ سے اور روزِ آخرت سے

ڈرتا ہو اور کثرت سے ذکرِ الہی کرتا ہو رسول اللہ کا ایک عمدہ نمونہ موجود ہے“

اسلام میں انفرادی اور اجتماعی زندگی کے فرائض کی انجام دہی اور واجبات کی ادائیگی کے

لیے انسان کے تربیتی پروگرام میں اخلاقی اقدار و محاسن مثلاً محبت، رحم، ہمدردی، ایثار، دیانت

امانت، ایقانے عمد، عدل و احسان وغیرہ پر سب سے زیادہ زور دیا گیا ہے۔ اس نظامِ تربیت

میں یومِ حساب، مسئولیت اور جزا و سزا کے عقیدے کو بنیادی حیثیت حاصل ہے جو راسخ الایمان

لوگوں کے لیے سب سے بڑا محتسب اور منکرات و نجاست سے پرہیز اور جنات و معروفات کی

طرف میلان و رجحان کا ضامن ہے۔ انفرادی ذمہ داری کے علاوہ کوئی شخص بھی اجتماعی مسئولیت

سے مستثنیٰ نہیں ہے خواہ اس کا دائرہ کتنا ہی محدود کیوں نہ ہو۔ ارشادِ نبویؐ ہے:

الْأَكْلَمُ رَاعٍ وَكُلُّكُمْ مَسْتَوِلٌ عِن رِعْتِهِ

قرآن کریم میں عدل و احسان کا ذکر متعدد آیاتِ کریمہ میں فرمایا گیا ہے اور اس کی

تلقین فرمائی گئی ہے،

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا أَوْامِينَ بِالْقِسْطِ شَهِدُوا لِلَّهِ وَلِوٰ

عَلَىٰ الْفُسْكَمَ أَوْ الْوَالِدِينَ وَالْأَقْسَبِينَ ۝

”اے ایمان والو! انصاف پر خوب قائم رہنے، اللہ کے لیے گواہی دینے والے

رہو، اگرچہ اپنی ہی ذات پر ہو یا کہ والدین اور دوسرے رشتے داروں کے مقابلے

میں ہو“ ایک اور جگہ ارشاد ہوا:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا أَوْامِينَ لِلَّهِ شَهِدُوا بِالْقِسْطِ

ولايجز منكم شنان قوم على ان لا تعدلوا اعدلوا هو

اقرب للتقوى ۵

”اے ایمان والو اللہ تعالیٰ کے لیے پوری پابندی کرنے والے انصاف کے ساتھ شہادت ادا کرنے والے رہو اور کسی خاص لوگوں کی عداوت تم کو اس پر باعث نہ ہو جاوے کہ تم عدل نہ کرو۔ عدل کیا کرو کہ وہ تقویٰ سے زیادہ قریب ہے“ تیز ارشاد ہے:

واذا حکمتم بین الناس ان تحکموا بالعدل ۵

”اور یہ کہ جب لوگوں کا تصفیہ کیا کرو تو عدل سے تصفیہ کیا کرو“ ہمارے ہاں عدل کی اصطلاح تین مختلف معروف معنوں میں مستعمل ہے۔

توازن واعتدال

ایک مفہوم سے مراد توازن اور اعتدال، افراط و تفریط سے احتراز اور امر متوسط لی جاتی ہے۔ ارشادِ ربّانی ہے۔

وکذلك جعلناکم امة وسطا لتکونوا شهداء علی الناس ۵

”اور ہم نے تم کو ایسی ہی ایک جماعت بنا دی ہے جو اعتدال پر ہے تاکہ تم لوگوں میں مقابلہ میں گواہ ہو“

یا کہا گیا ہے: ”خیس الامور اوسطها۔“

مساوات

دوسرے مفہوم کے مطابق عدل مساوات کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔

انصاف

محدود معنوں میں عدل انصاف سے بھی عبارت ہے جس میں نظام قانون و عدالت کی مختلف صورتیں شامل ہیں۔ اگر عدل کو توازن و اعتدال کے وسیع تر مفہوم کے نقطہ نگاہ سے دیکھا جائے تو اسلام میں اس کی مندرجہ ذیل صورتیں پائی جاتی ہیں۔

(الف) فرد یا معاشرے میں جسم اور روح کی نشوونما اور بالیدگی کو یکساں طور پر ملحوظ رکھا گیا ہے۔ جبلی اور فطری تقاضوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے انتہائی حقیقت پسندی سے اسلام نے جسمانی اور مادی ضروریات کو بہ یک وقت پورا کرنا نہ صرف جائز بلکہ واجب قرار دیا ہے۔ چنانچہ

رزقِ حلال کا کمانا، کھانا پینا، شادی کرنا، بال بچوں کی پرورش، دنیوی زندگی کے ایسے وظائف ہیں جو روحانی ارتقا اور تجارتِ اخروی میں کسی طرح حائل یا مزاحم نہیں بلکہ بہ منزلہ عبادات عیسائیت یا بدھ متزہیب کی طرح اسلام میں ترک دنیا یا رہبانیت کسی طرح جائز نہیں ہے۔ آں حضرات کا ارشاد ہے: "لا رہبانیۃ فی الاسلام" حضورؐ نے صحابہ کرامؓ کو ترک دنیا اور ازدواج کنارہ کشی سے سختی سے منع فرمایا، اور اس طرزِ عمل کو خلاف سنت قرار دیا۔
حدیث میں آیا ہے۔

ان نصر امن اصحاب النبی سألوا ازواج النبی عن عملہ فی البس فقال بعضهم لا اتزوج النساء وقال بعضهم لا اکل اللحم وقال بعضهم لا انا م علی فراش فحمد اللہ واثنی علیہ فقال ما بال اقوام قالوا کذا وکذا الکنی ا صلی وانا م واصوم و ا فطر و اتزوج النساء فمن رغب عن سنتی فلیس منی،

(مسلم عن انس کتاب النکاح)

”چند صحابہ رضی اللہ عنہم نے نبیؐ کی بیویوں سے آپ کے پوشیدہ معمولات کے بارے میں پوچھا، جب انھیں بتایا گیا تو ان میں سے ایک نے کہا: میں شادی نہیں کروں گا۔ دوسرے نے کہا، میں گوشت نہ کھاؤں گا، تیسرا بولا: میں فرش پر نہیں سوؤں گا، آں جنابؐ کو جب اس واقعہ کی اطلاع ہوئی تو آپؐ نے اللہ کی حمد و ثنا کے بعد فرمایا: لوگوں کو کیا ہو گیا ہے کہ وہ اس طرح کی باتیں کرتے ہیں۔ میں (رات میں) نفل پڑھتا ہوں اور سوتا ہوں، میں کبھی (نفل) روزے رکھتا ہوں اور کبھی نہیں رکھتا، میں بیویاں رکھتا ہوں پس جو میرے طریقے سے منہ موڑے گا وہ مجھ سے نہیں،“

نیز ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

قل من حرم زینۃ اللہ الّتی اخرج لعبادہ والطیبات من الرزق ۝

”آپ فرمائیے کہ اللہ تعالیٰ کے پیدا کیے ہوئے کپڑوں کو جن کو اُس نے اپنے بندوں کے واسطے بنایا اور کھانے پینے کی حلال چیزوں کو کس شخص نے حرام کیا ہے،“
البتہ دنیوی زندگی کے ان تمام وظائف کے لیے معقول اور معتدل حدود اور طریقہ ہائے مقرر کردیے گئے ہیں جن سے تجاوز کرنا ممنوع ہے۔

(ب) اسلام انسانی زندگی میں دین و دنیا کی تقسیم و تفریق کا قائل نہیں ہے حتیٰ کہ دین و سیاست کی علاحدگی کا مغربی تصور بھی سراسر غیر اسلامی ہے۔ زندگی ایک جامع اور ناقابلِ تقسیم وحدت ہے۔ فرض عبادات اور ذکر و فکر کے علاوہ اللہ تعالیٰ کی مقرر کردہ حدود کے اندر دنیاوی زندگی کے تمام فرائض کی ادائیگی اور لذات سے لطف اندوزی بہترین عبادت قرار دی گئی ہے۔

(ج) اس نوعِ عدل کی ایک صورت فرد اور معاشرے کے مابین باہمی ربط و ضبط میں اعتدال و توازن کی ہے۔ اسلامی تعلیمات کی روشنی میں دیکھا جائے تو اسلامی معاشرے میں جہاں ایک طرف فرد کی آزادانہ نشوونما اور ارتقا کے تمام معقول مواقع میسر آتے ہیں، وہاں امتِ مسلمہ کے رکن کی حیثیت سے اُس کے ذمے کچھ اجتماعی فرائض بھی ہیں۔ اس کے برعکس اشتراکی نظام میں فرد کی حیثیت محض ایک بے جان اور بے بس پُرزے کی رہ جاتی ہے جو اجتماعیت کی آہنی گرفت میں بُری طرح جکڑا ہوا ہے۔ اسی طرح سرمایہ دارانہ نظام میں دولت مند اور طاقت ور افراد کو معاشرے پر زبردست سیاسی غلبہ اور تسلط حاصل ہے اور وہ اپنی مرضی کے مطابق اس کا استحصال کرتے رہتے ہیں۔ غرض یہ کہ یہ دونوں صورتیں افراط و تفریط کی ہیں جن کے مُضر اثرات و نتائج روزمرہ سلنے آرہے ہیں۔ مگر اسلام میں عائلی زندگی کے فرائض، صدقات و زکوٰۃ کی تاکید، جہاد میں شرکت وغیرہ کے علاوہ پانچ وقت نماز باجماعت، صلوٰۃ جمعہ اور عیدین کے اجتماعات اور حج کے موقع پر مسلمانانِ عالم کا اجتماع، اسلام کی اجتماعیت اور مرکزیت کی چند مثالیں ہیں۔ جن سے فرد اور معاشرے کے مابین غیر استحالی معیشت، توازن اور تعمیری اعتدال کی وضاحت ہوتی ہے۔

فرد قائم ربطِ ملت سے ہے تھا کچھ نہیں

موج ہے دریا میں اور بیرونِ دریا کچھ نہیں

(د) اسلام میں عدلِ اجتماعی کا اصول محض عقیدے کے طور پر ہی تسلیم نہیں کیا جاتا بلکہ پیغمبر اسلام نے اس کا عملی نفاذ فرما کر دنیا کے سامنے اجتماعی مساوات کی بہترین مثالیں پیش کیں۔ چنانچہ جب میثاقِ مدینہ کی رو سے پہلی اسلامی مملکت کی بنیاد رکھی گئی تو یہودیوں سے عدل و مساوات کی بنیاد پر معاہدہ کیا گیا۔ "لا اکراہ فی الدین" کے اصول کو ملحوظ رکھتے ہوئے انھیں مکمل مذہبی اور ثقافتی آزادی عطا کی گئی۔ احوالِ شخصیت میں انھیں اپنے مسائل اور معاملات اپنے مذہب کے مطابق طے کرنے کی اجازت دی گئی، ان کی جان و مال،

عزت و آبرو کے تحفظ کی ضمانت دی گئی اور ”ان دماءکم و اموالکم و اعراضکم حرام علیکم کحرمة یومکمذہبنا فی شہرکمذہبنا فی بلدکمذہبنا“ کا اطلاق صرف مسلمانوں پر ہی نہیں کیا گیا بلکہ اسے اسلامی مملکت میں رعایا کے تمام مسلم اور غیر مسلم شہریوں پر یکساں طور پر نافذ کیا گیا۔ اگرچہ یہ ارشاد نبوی حجۃ الوداع کے موقع پر خطاب فرمایا گیا تاہم بنیادی حقوق کے تحفظ کی ضمانت اور اس کا عملی نفاذ حیاتِ طیبہ کے ہر لمحے اور ہر لمحے سے عیاں ہے۔

مساوات

دوسرے مفہوم کی رو سے عدل مساوات کے مترادف ہے۔

(۱) اسلام کا بنیادی عقیدہ توحید و الوہیت بہ جلئے خود عدل و مساواتِ اجتماعی کی سب سے بڑی ضمانت ہے، ”لا الہ الا اللہ“ اور ”ایاک نعبد و ایاک نستعین“ کا مفہوم کچھ یہ ہے کہ مستحق عبادت و سزا اور بندگی وہی ایک ذاتِ باری تعالیٰ ہے۔ اس اعلان و اقرار سے تمام دنیاوی خداؤں، فرماں رواؤں، مذہبی اور روحانی پیشواؤں کی بندگی یکسر ختم ہو جاتی ہے۔ جہاں اور روحانی غلامی کے تمام بندھن یک لخت ٹوٹ جاتے ہیں۔ ”وَنَزَّلْنَا الْحَکْمَ وَاللَّیْلَہُ“ اور ”اَلَا اِلٰہَ اِلَّا الْخَلْقُ وَالْاٰمِسُ“ پر ایمان لاتے ہوئے ساری کائنات پر اللہ کی حاکمیت تسلیم کرنے سے مطلق العنانیت، شخصی حکومت، موروثی ملوکیت، پاپائیت اور بادشاہت کے خدائی حق سے **DIVINE RIGHT OF KINGSHIP** کے تمام نظریات یک قلم باطل ہو جاتے ہیں۔

سروری زریبا فقط اُس ذات بے ہمتا کو ہے

حکم راں ہے اک دُہی باقی بُتانِ آذری!

(ب) ”وَ اَمْسُوْهُمْ شُوْرٰی بَیْنَهُمْ“ کے اصول کے ذریعے اور خود نبی اکرم ص کو ”وَشَاوِرْهُمْ فِی الْاَمْرِ“ سے مشاورت کا حکم دے کر اسلام نے جمہوریت کی مضبوط بنیاد استوار کر دی۔ عالم گیر اخوت اور بنی نوع انسان کے مساوات کا تصور اسلام نے آج سے ۱۴۰۰ سال پہلے دنیا کے سامنے مندرجہ ذیل قرآنی آیت میں پیش کیا۔

یا ایہا الناس انا خلقکم من ذکس و انثی و جعلکم شعوبًا

و قبائل لتعارفوا ان اکی مکم عند اللہ اتکم ۵

”اے لوگو ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا، اور تم کو مختلف قومیں اور مختلف خاندان بنایا تاکہ ایک دوسرے کو شناخت کر سکو، اللہ تعالیٰ کے نزدیک تم

سب میں بڑا شریف و ہی ہے جو سب سے زیادہ پرہیزگار ہے۔“

(ج) چودہ سو سال بعد آج اقوام متحدہ کے منشور میں بنی نوع انسان کے ایک کنبہ ہونے کا تصور محض اقرار باللسان کی حد تک پیش کیا گیا ہے۔ اس کی تصدیق بالقلب کا کوئی عملی ثبوت کمپن نظر نہیں آتا بلکہ روزمرہ اس کی صریح خلاف ورزی کے مظاہر اور شواہد سامنے آرہے ہیں اور اس کی پامالی اسرائیل، جنوبی افریقہ، ہندستان اور روس وغیرہ کے ہاتھوں مسلسل ہو رہی ہے۔ یہ عادلانہ اصول مساوات و امن اسلام کے بنیادی عقائد میں سے ہے جس سے ہر قسم کے نسلی، لسانی اور جغرافیائی امتیازات باطل ہو جاتے ہیں۔ قرآن کریم نے عزت و فضیلت کا واحد معیار تقویٰ اور خدا خوفی کو قرار دیا ہے اور اس طرح نسلی تفوق کی بنیادیں یکسر منہدم کر دی ہیں۔

بمخالف اللہ اب تو معقول سائنسی دلائل کی بنا پر بھی یہ امر مسلم الثبوت ہے کہ شکل و صورت، قد و قامت، لون و لسان کے شدید اختلافات کے باوجود نسل انسانی ایک مرد اور ایک عورت کی اولاد ہے جس سے ”ڈارون“ کے نظریہ ارتقا کا ابطال ہوتا ہے۔ حضور نبی اکرمؐ نے خطبہ حجۃ الوداع میں جو انسانی حقوق کا جامع اور مکمل ترین چارٹر یا منشور ہے ارشاد فرمایا:

”لَا فَضْلَ لِعَرَبِيٍّ عَلٰی عَجَبِيٍّ وَلَا لِعَبْطِيٍّ عَلٰی اَسْوَدٍ اِلَّا بِالْتَّقْوٰی
كُلُّكُمْ لَادَمٍ وَاَدَمٌ مِّنْ تَرَابٍ“۔

عدل اجتماعی

اسلام میں اجتماعی عدل کی ایک صورت یہ بھی ہے جو عدل عمرانی یا *Justice sociale* کی اصطلاح سے معروف ہے۔

(۲) اسلام نے مرد اور عورت کے مابین حقوق و فرائض کی ایک نہایت فطری اور عادلانہ تقسیم کر دی ہے۔ تاریخ انسانی میں سب سے پہلے اسلام نے ہی معاشرے میں عورت کو ایک قابل احترام مقام عطا کیا ہے۔ کسب مال، حق ملکیت، حق نکاح میں اسے پوری آزادی حاصل ہے۔ اگر بچے کی رضاعت کا فرض عورت پر عائد کیا گیا ہے تو بیوی بچے دونوں کی کفالت مرد پر واجب ہے۔ اگرچہ ہندستان میں سستی کا قانون صدیوں سے منسوخ ہو چکا ہے تاہم ہندو معاشرے میں آج بھی بیوہ کی زندگی سخت اجیرن ہے اور وہ بے چاری زندہ درگور کے مترادف ہے۔ اس کے برعکس اسلام نے وانکھوا الایامیٰ منکم کا حکم دے کر نکاح بیوگان کو ایک مستحسن امر قرار دیا ہے۔ عائلی زندگی میں مرد اور عورت کے درمیان حدود و کار بھی متعین کر دی

گتی ہیں۔ یہ تقسیم بھی عدل و انصاف پر مبنی ہے۔ غرض یہ کہ اسلام فرد، خاندان، جماعت اور قوم میں ایک عادلانہ ربط اور نظم پیدا کرتا ہے۔ ترقی یافتہ مغربی ممالک میں عائلی زندگی کا وجود سرے سے ختم ہو چکا ہے جس سے کئی مفسد تے جنم لیا ہے۔ مگر اسلام اس کو ایک تقدس عطا فرماتا ہے۔ افرادِ کنبہ میں میاں بیوی کے علاوہ والدین اور اولاد دونوں شامل ہیں۔ والدین کے حقوق کی پاس داری، ان کی خدمت و اطاعت پر اس قدر زور دیا گیا ہے کہ گفتگو میں بھی ان سے سخت کلامی کی ممانعت کی گئی ہے۔ ارشادِ ربّانی ہے:

فَلَا تَقُلْ لِلْهَيْهَاتَ وَلَا تَنْهَرْ هَهَا وَقُلْ لَهَا قَوْلًا كَرِيمًا
 ”کبھی ہاں سے ہوں بھی مت کرنا، اور نہ اُن کو جھڑکنا اور اُن سے خوب ادب سے بات کرنا“

وَإِخْفِضْ لَهَا جَنَاحَ الذَّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ وَقُلْ رَبِّ ارْحَمْهَا
 کہارِ تینٹی صغیراں

”اور ان کے سامنے شفقت سے انکساری کے ساتھ جھکے رہنا اور یوں دعا کرتے رہنا کہ میرے پروردگار ان دونوں پر رحمت فرمائیے؛ جیسا انھوں نے مجھ کو بچپن میں پالا پرورش کیا ہے“

مغرب میں عورت کو مساواتِ مطلقہ کی بنیاد پر اس قدر ذلیل و خوار کیا گیا ہے کہ فطری تقاضوں کی اس خلاف ورزی سے معاشرہ طوح طرح کے مصائب میں گرفتار ہو گیا ہے۔ بالخصوص بچوں میں ہر طرح کے جرائم کا اضافہ ہو رہا ہے۔ روز افزوں شرحِ طلاق سے عائلی زندگی برباد ہو رہی ہے۔

(ب) اسلام کے معاشی نظام میں حقِ ملکیت کو نہ صرف جائز قرار دیا گیا ہے بلکہ اُسے پورا قانونی تحفظ عطا کیا گیا ہے۔ فقہی اصول ہے، ”لیس للامیس ان یاخذ من احدٍ شیئاً الا بحق ثابتٍ معروفٍ“، مگر یہ تحفظ غیر محدود یا غیر مشروط نہیں ہے۔ اللہ کریم کے عطا کردہ جان و مال پر انسان کا تصرف کُلّی اور قطعی ہرگز نہیں ہے بلکہ اس کی حیثیت امین اور ٹرسٹی کی سی ہے۔ ارشادِ باری ہے:

ان الله اشترى من المؤمنين انفسهم واموالهم بان لهم
 الجنة

بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں سے اُن کی جانوں کو اور ان کے مالوں کو اس بات

کے عوض خرید لیا ہے کہ اُن کو جنت ملے گی“
 اگر جان و مال کا تحفظ لازم ہے تو کبھی کبھی اس کا شمار اور قربان کر دینا بھی واجب ہو
 جاتا ہے: ع

ہے کبھی جاں اور کبھی تسلیم جاں ہے زندگی“
 اسلام نے اصحابِ ثروت کے مال و دولت میں غربا و مساکین کا حصہ مقرر فرمایا ہے۔
 صدقات و زکوٰۃ کی ادائیگی ہرگز کسی پر احسان نہیں ہے بلکہ غربا کو اُن کا حق لوٹا دیا جاتا ہے۔ ارشاد
 ہے:

وَفِي أَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلْمَسْكِينِ وَ الْمَحْرُومِ

”اور ان کے مال میں سوائی اور غیر سوائی کا حق ہے“

معاشرے میں زرپرستی اور استحصال کو روکنے اور ذمہ خدمتِ خلق، ہم دردی اور ایثار
 کے جذبات کو پروان چڑھانے کے لیے اسلام نے سود کی شدید مذمت اور قطعی ممانعت کر دی
 ہے۔ اور بلاسود لین دین، مشارکت اور مضاربت پر مبنی بنکاری، اسلامی معاشیات کا اہم اصول
 ہے۔ اسراف و تبذیر اور نمود و نمائش کی ممانعت کی گئی ہے۔ اور اتفاق فی سبیل اللہ کی تلقین فرمائی
 گئی ہے۔

(ج) رعایا کے ہر فرد کی بنیادی ضرورت مہیا کرنا اسلامی حکومت کا اولین فرض ہے جس
 کی ادائیگی کے لیے مال و دولت پر محاصل عائد کیے جاسکتے ہیں۔ صدقات کے متعلق ارشادِ نبویؐ
 ہے، ”تَوَخَّذْ مِنْ اَغْنِيَا تِهِمْ وَ تَرَدَّ اِلَى فُقَرَا تِهِمْ“ حتیٰ کہ دولت کے چند ہاتھوں میں ناجائز
 ارتکاز کو روکنے کے لیے نیز امراء اور غرباء کے مابین فاصلہ کم کرنے کے لیے مصلحتِ عامہ کے پیش
 نظر اگر حکومت نجی ملکیت پر تحدید عائد کرنا ناگزیر تصور کرتی ہو تو ”ابن حزم“ اور بعض دیگر فقہائے
 کرام کی نگاہ میں ایسا کرنا نہ صرف جائز ہے بلکہ بعض صورتوں میں واجب ہے۔

اب عدل کے محدود مفہوم کے متعلق جو انصاف کا مترادف ہے کچھ عرض کیا جاتا ہے۔

عدل انصاف کے معنی میں

اس ضمن میں اسلامی نظامِ عدل و انصاف کے بعض اہم اصولوں کا ذکر بے محل نہیں

ہوگا۔

(۱) اگرچہ تمام مہذب ممالک کے دساتیر میں قانون کی حکم رانی اور بالادستی کا خاص طور

پر ذکر کیا گیا ہے تاہم ہر دستور میں سربراہ مملکت کو یہ اختیار دیا گیا ہے کہ وہ کسی قاتل، ڈاکو، خاتن چور کے عدالتی حکم سزا یا بی کو موقوف کر دے، اس کی سزا معاف کر دے یا اس میں تخفیف کر دے یہ دراصل دورِ ملوکیت کے ”حقِ سلطانی“ کی ایک متغیر صورت اور اس کے باقیات التیثات میں سے ہے۔ شریعت کی رو سے سربراہ مملکت یا کسی اور با اختیار شخصیت کو ایسا کوئی حق حاصل نہیں ہے۔ البتہ قتل کے جرم میں جس کا تعلق حقوق العباد سے ہے، مقتول کے ورثہ کو یہ حق ہے کہ وہ کسی مرحلے پر بھی مجرم سے مصالحت کا معاملہ کر لیں یا اسے معاف کر دیں۔

(ب) اسی نوعیت کی ایک دوسری شق جو دنیا کے ہر دستور میں پائی جاتی ہے وہ سربراہ مملکت کا قانونی عمل داری سے استثناء ہے۔ یہ بھی دورِ ملوکیت کی باقیات التیثات میں سے ہے جس کی بنیاد اس قول پر ہے کہ:

”King can do no wrong“

”بادشاہ معصوم ہے اور اس سے کوئی جرم سرزد نہیں ہو سکتا“ شریعت میں بادشاہ یا سربراہ مملکت یا کسی با اختیار شخص کو اس قسم کی کوئی استثنائی رعایت حاصل نہیں ہے۔ اسلامی تاریخ میں ایسے متعدد واقعات پائے جاتے ہیں جہاں سربراہ مملکت کو مدعی یا مدعی علیہ یا ملزم کی حیثیت سے عدالت میں ایک عام آدمی کے ساتھ کھڑا ہونا پڑا۔ اس قسم کے ایک واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے علامہ اقبال نے فرمایا:

عبد مسلم کمتر از حرار نیست
خون شر رنگیں تراز معار نیست

(ج) عدلیہ کی حریت اور انتظامیہ سے اس کی علاحدگی کا اصول بھی اسلام نے ہی پہلے پہل دنیا کو عطا کیا۔ اگرچہ عدلیہ کے ارکان کا انتخاب اور تقرری صدر مملکت کے حکم سے ہوتی ہے تاہم قضا کے معاملے میں وہ ان کے فیصلوں میں کسی طرح بھی دخل انداز ہونے کا مجاز نہیں ہے اور ارکان عدلیہ اپنے فیصلے احکام شریعت کی روشنی میں اللہ تعالیٰ کے حضور جواب دہی اور مسئولیت کے نقطہ نظر سے صادر کرنے کے مکلف ہوتے ہیں۔

قرآن کریم میں عدل و احسان کا ذکر متعدد مرتبہ ایک ساتھ آیا ہے۔ ارشاد ہے:
وَإِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ أَنْ تَحْكُمُوا بِالْعَدْلِ ۝
”اور یہ کہ جب لوگوں کا تصفیہ کیا کرو تو عدل سے تصفیہ کیا کرو“

(۲) عدالت میں سچی گواہی دینے کی تاکید فرمائی گئی ہے خواہ اعزہ واقربا کے خلاف ہی کیوں

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا قَوَّامِينَ بِالْقِسْطِ شُهَدَاءَ لِلَّهِ وَلَوْ عَلَىٰ
انفُسِكُمْ أَوِ الْوَالِدِينَ وَالْأَقْرَبِينَ ۝

”اے ایمان والو! انصاف پر خوب قائم رہنے والے اللہ کے لیے گواہی دینے
والے رہو۔ اگرچہ اپنی ہی ذات پر ہو یا کہ والدین اور دوسرے رشتہ داروں کے
مقابلہ میں ہو“

اور کتمانِ شہادت سے منع فرمایا گیا ہے، ارشادِ باری ہے:
وَلَا تَكْتُمُوا الشَّهَادَةَ وَمَنْ يَكْتُمْهَا فَإِنَّهُ آثَمُ قَلْبِهِ ۝
”اور شہادت کا اخفامت کرو، اور جو شخص اس کا اخفا کرے اُس کا
قلب گنہگار ہوگا“

دب، عدل و انصاف کے معاملے میں اسلام اس قدر حساس ہے کہ تاکیداً یہ حکم دیا گیا ہے
کہ دشمنوں کے ساتھ بھی کسی حالت میں، کسی قسم کی ناانصافی روا نہیں رکھنی چاہیے۔ ارشادِ باری
تعالیٰ ہے:

وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنِ قَوْمٍ عَلَىٰ اَنْ لَا تَعْدِلُوْا ۝
”اور کسی خاص لوگوں کی عداوت تم کو اس پر باعث نہ ہو جاوے
کہ تم عدل نہ کرو“

(ج) اسلام میں قصاص نہ صرف جائز ہے بلکہ فرمایا گیا ہے کہ ہمارے لیے قصاص میں
زندگی ہے۔ وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ

لیکن اس کے ساتھ ہی احسان اور عفو و درگزر کی بھی تلقین فرمائی گئی ہے۔ ارشاد ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلِ الْحَرْبِ بِالْحَرْبِ
وَالْعَبْدَ بِالْعَبْدِ وَالْأَنْثَىٰ بِالْأَنْثَىٰ فَمَنْ عُفِيَ لَهُ مِنْ أَخِيهِ شَيْءٌ
فَاتَّبَعْ بِالْمَعْرُوفِ وَأَدَاءِ إِلَيْهِ بِإِحْسَانٍ ۝

”اے ایمان والو تم پر قصاص فرض کیا جا تا ہے، مقتولین کے بارے میں آزاد
آدمی آزاد آدمی کے عوض میں، اور غلام، غلام کے عوض میں، اور عورت، عورت
کے عوض میں۔ ہاں جس کو اس کے فریق کی طرف سے کچھ معافی ہو جائے تو محقول
طور پر خوں بہا کا مطالبہ کرنا اور خوبی کے ساتھ اُس کے پاس پہنچا دینا“

(د) معاشرے میں امن و سکون باہمی محبت، صلح اور آشتی کی فضا پیدا کرنے کے لیے بعض معمولی باتیں بھی اہم کردار ادا کرتی ہیں۔ عام سلوک اور برتاؤ میں بھی احسان کی تلقین فرمائی گئی ہے حتیٰ کہ سلام کا جواب دینے کے متعلق بھی جو بہ ظاہر معمولی سی بات ہے۔ ارشاد ہے:

وَإِذَا حِيلْتُمْ بِتَحِيَّةٍ فَعِيَوا بِأَحْسَنِ مِنْهَا أَوْ رُوَاهَا
 ”اور جب تم کو کوئی سلام کرے تو تم اُس سے اچھے الفاظ میں سلام کرو
 یا ویسے ہی الفاظ کہ دو“

”بُرائی کے بدلے میں انتقام کے بہ جگے دینا“

روزمرہ کے معاملات میں حسن سلوک اور احسان کی تلقین فرمائی گئی ہے۔ ارشاد ہے:

وَلَا تَسْتَوِي الْحَسَنَةُ وَلَا السَّيِّئَةُ ادْفَعْ بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ
 ”اور نیکی اور بدی برابر نہیں ہوتی آپ نیک برتاؤ سے بدی کو ٹال
 دیا کیجیے“

فتح مکہ کے موقع پر ”لا تشریب علیکم الیوم“ فرما کر جس طرح حضور ﷺ نے دشمنانِ اسلام کی جان بخشی کا اعلان عام فرمایا اُس کی نظیر دنیا کی تاریخ میں ڈھونڈنے سے نہیں ملتی۔ مستشرقین نے خاص طور پر اس واقعہ کا ذکر کیا ہے کہ تاریخ عالم میں کوئی فاتح اس انداز سے مفتوحہ شہر میں داخل نہیں ہوا۔

(۱) اسلام انفرادی ارتکابِ جرم کے معاملے میں بھی اجتماعی ذمہ داری کے اصول کو اپناتا ہے۔ ثبوتِ جرم کی صورت میں جب مجرم پر دیت واجب ہو جاتی ہے تو اس کی ادائیگی فقط اس کی ذات پر ہی عائد نہیں ہوتی بلکہ اُس کی ”عاقلہ“ کی مشترکہ ذمہ داری ہوتی ہے ”عاقلہ“ سے مراد وہ افراد کنبہ یا برادری یا ارکانِ گروہ یا تنظیم ہیں جن سے مجرم کا تعلق اس نوعیت کا ہو کہ اسے ارتکابِ جرم کے سلسلے میں ان کی ہمدردی یا اخلاقی مدد حاصل ہو سکتی ہو۔

(ب) اسی طرح عدم پتہ واردات قتل کے سلسلے میں ”قسامہ“ کا طریق کار بھی مشترکہ ذمہ داری کے حکیمانہ اصول پر مبنی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ خاندان یا معاشرے کا ہر فرد اصلاحِ معاشرہ اور انسدادِ جرم میں اپنی ذاتی ذمہ داری کو پوری طرح محسوس کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

(ج) معروف قول ہے کہ امتناع السداد سے بہتر ہے اور پرہیز علاج سے بہتر ہے۔ فتنہ کے سدباب کے لیے اسلام نے مسلمانوں پر یہ حیثیتِ مجموعی مصالحتہ مدراخلت اور مساعی واجب

قراردی ہیں۔ انہما اہلومنون اخوة فاصلحوا بین اخویکم
 اسلام نے دوران جنگ بھی مخالفین سے عدل و انصاف اور احسان و مروت کے ساتھ
 پیش آنے کی تاکید کی ہے۔ ارشاد ہے:

وقاتلوا فی سبیل اللہ الذین یقاتلونکم ولا تعدوا ان اللہ لایحب

المعتدین ۰

”اور تم لڑو اللہ کی راہ میں ان لوگوں کے ساتھ جو تمہارے ساتھ لڑنے لگیں اور حد
 سے نہ نکلو۔ واقعی اللہ تعالیٰ حد سے نکلنے والوں کو پسند نہیں کرتے“

حتیٰ کہ یہ حکم بھی دیا گیا ہے کہ اگر دشمنان اسلام خلوص سے صلح جوئی پر آمادہ ہوں تو تم بھی

صلح کے لیے اتنا ہی جھکاؤ پیدا کرو۔ ارشادِ ربانی ہے:

وَ اِنْ یَجْتَمِعُوا لِیَسْلَمَ فَاَجْعَلْ لِّہَا وَ تَوَكَّلْ عَلَی اللّٰہِ ۰

”اگر وہ صلح کی طرف جھکیں تو آپ بھی اس طرف جھک جاتیے۔

اور اللہ پر بھروسہ رکھیے۔

اسلام کے نظام اخلاقیات میں اجتماعی عدل کے حصول کا ایک اہم تقاضا یہ بھی ہے کہ ہر

حال میں عہد کی پابندی کی جائے۔ چنانچہ حضورؐ نے اپنے بدترین دشمنوں کے ساتھ شدید ضرورت

اور تکلیف کے وقت بھی اپنے عہد کی پابندی اور ایقانے عہد کا پورا ثبوت دیا۔

(الف) آنحضورؐ ہجرت کر کے مدینہ چلے آئے تو بہت سے صحابہ مکہ ہی میں رہ گئے ان میں

حضرت حذیفہؓ ابن الیمان اور ابو جہلؓ مکہ سے آرہے تھے کہ کفار نے انہیں پکڑ لیا اور بالآخر اس شرط

پر چھوڑا کہ وہ دونوں جنگ میں آپؐ کا ساتھ نہیں دیں گے۔ یہ لوگ مقام بدر میں آپؐ کی خدمت میں

پہنچے اور خود حضورؐ کو اس جنگ میں مصروف دیکھ کر اس سعادت میں حصہ لینے کی آرزو کی تو

آنحضرتؐ نے حالات کی نزاکت کے باوجود فرمایا تم دونوں واپس جاؤ تم معاہدہ کر چکے ہو اس کی

پابندی ضروری ہے۔ ہم ہر حال میں وعدہ وفا کریں گے۔ ہمیں صرف خدا کی مدد درکار ہے۔

(ب) صلح حدیبیہ میں حضرت ابو جندلؓ پایہ زنجیر آئے اور بدن کے داغ دکھائے کہ قولش مجھ

کو قید کر کے اس طرح ستاتے ہیں، تمام مسلمان اس درد انگیز منظر کو دیکھ کر تڑپ اٹھے۔ لیکن حضورؐ

نے فرمایا: اے ابو جندل، صبر کرو! ہم بد عہدی نہیں کر سکتے۔ اللہ تعالیٰ تمہارے لیے عنقریب کوئی رستہ

نکالیں گے۔

وَ اٰخِرُ دَعْوَانَا اِنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ

آخر و اجیر

اخلاقیاتِ نبوی کی روشنی میں روابط

جناب محترم ڈاکٹر بشیر احمد صدیقی

آج دنیا عالمی سطح پر جن اہم مسائل سے دوچار ہے ان میں ایک اہم مسئلہ یہ بھی ہے کہ آخر و اجیر کے روابط کو سازگار اور خوشگوار کیسے بنایا جاسکتا ہے۔ اس سلسلے میں مختلف حکومتیں اپنی اپنی سطح پر اور عالمی ادارہ محنت بین الاقوامی سطح پر، درپیش مسائل کو حل کرنے کے لیے جوتنگ و دو کہ رہے ہیں اس سے بھی اس مسئلے کی اہمیت واضح ہو جاتی ہے۔ لیکن اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ عصر حاضر کے تمام ترقوی اور بین الاقوامی ماسعی مسئلے کو بطریق احسن حل کرنے سے قاصر رہی ہیں۔ دوسری طرف تاریخ اس امر پر شاہد عادل ہے کہ اس مسئلے کو آج سے چودہ سو برس پہلے جس انداز سے رسول عربی صلی اللہ علیہ وسلم نے حل فرمایا اس کی نظیر ڈھونڈنے سے نہیں ملتی۔ اور اخلاقیاتِ نبوی میں پیش کردہ نثریں اور رہنما اصول نے اسے جس مقام پہ لاکھڑا کیا ہے قیامت تک آنے والی نسل انسانی میں آخر و اجیر کے باہمی روابط کی خوشگوار ہی کا اس سے بڑھ کر تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔

یہاں ذہنوں میں فطری طور پر یہ سوال ابھرتا ہے کہ ہم یہ دعوا شاید اس عقیدت کی بنا پر کر رہے ہیں جو ہمیں رسول عربی سے ہے اور ذہنوں میں یہ سوال اس لئے ابھرتا ہے کہ ہم نے اپنے ادراک و شعور کی آنکھ ایک ایسے ماحول میں کھولی جبکہ تہذیب مغرب کی چکا چونڈنے ہمارے اذنان و قلوب کو مرعوب کر رکھا تھا۔ اور ہمیں ہر بھلائی مغرب کے پیش کردہ افکار و تصورات میں نظر آتی تھی۔ اور اسلام، مادی اسلام اور اسلامی اصول و تعلیمات کا ذکر کرتے ہوئے معذرت آمیز (APOLOGETIC) رویہ اختیار کرنا ہماری عادت میں داخل ہو چکا تھا۔ الحمد للہ کہ چودھویں صدی ہجری نے جہاں مسلمانوں کے عروج و زوال کی بہت سی داستانیں پیچھے چھوڑی ہیں وہاں عالم اسلام میں بیداری کی ایک لہر دوڑا دی ہے۔ اور مسلمانوں میں ملی شعور اور ملی تشخص کو بھی یک گونہ ابھارا ہے۔ اور اب ملتِ اسلامیہ ایک بار پھر قرآن حکیم کے حکمت و بصیرت سے معمور نثرانوں اور اخلاقیاتِ نبوی کے نثریں اصول کی طرف ملتفت ہو رہی ہے۔ عالم اسلام کی اس بیداری کے ساتھ ایک خوشگوار پہلو یہ بھی

ہے کہ عصر حاضر میں مستشرقین جن کی آنکھوں میں اسلام کا گل شاداب کانٹے کی طرح چبھتا ہے اور وہ اسلام، باوٹی اسلام اور اسلامی تعلیمات کے بارے میں نہ برا گلنے میں مصروف رہے ہیں اور اب بھی ہیں، کہیں کہیں ان سے بھی حرف اعتراف بے ساختہ سرزد ہو جاتا ہے چنانچہ ہارٹ (HART) نے حال ہی میں پوری تاریخ عالم میں سے جن سو مشاہیر کا انتخاب کیا ہے ان میں رسولِ عربیؐ کو سرفہرست رکھا ہے اور اس کی توجیہ یہ پیش کی ہے:

MY CHOICE OF MUHAMMAD TO LEAD THE LIST OF THE WORLD'S MOST INFLUENTIAL PERSONS MAY SURPRISE SOME READERS AND MAY BE QUESTIONED, BUT HE WAS THE ONLY MAN IN HISTORY WHO WAS SUPREMEY SUCCESSFUL ON BOTH THE RELIGIOUS AND SECULAR LEVELS.

(THE 100, NEW YORK 1978, PP 33)

اس اقتباس سے رسالتِ مآب کی شان و عظمت کا بیان مقصود نہیں۔ مہلا جسے اس وسیع و بیکراں کائنات کے خالق و مالک نے رحمة للعالمین، خاتم النبیین کا فہم للناس، للعالمین نذیرا، سرا بجا منیرا اور انک لعلی خلق عظیم کے پر عظمت الفاظ سے نوازا ہوا ہے کسی اور ستائش کی ضرورت ہی کیا رہ جاتی ہے۔ میرا اس حوالے کو پیش کرنے سے اصل مقصود یہ ہے کہ حضورؐ کی تعلیمات کا تابناک جوہر یہ ہے کہ آپؐ نے مادی اور روحانی دونوں تقاضوں کی بطریق احسن تکمیل فرمائی۔

مغرب کی روشنی میں

اخلاقیات نبویؐ کی روشنی میں آجروا جبر کے خوشگوار روابط کا تقابلی جائزہ لینے کے لیے مناسب ہوگا کہ مغرب کی متمدن دنیا میں آجروا جبر کے تعلقات پر تاریخ کے آئینے میں ایک نظر ڈال لی جائے۔ علامہ اقبالؒ نے بجا طور پر مزدور کے اوقات تلخ ہونے اور سرمایہ دار کے ماحقوں انتہائی سادگی سے مات کھانے کی نشان دہی فرمائی تھی۔ چنانچہ مغرب کے سرمایہ دارانہ نظام میں مزدور سے پودہ

۱۶ سے لے کر سولہ سترہ گھنٹے اور بعض اہم مواقع پر مسلسل بیس گھنٹے یا اس سے بھی
 زائد عرصے تک کام لیا جاتا، انہیں اجرت کم دی جاتی، ان کے رہنے کے لیے چھوٹی
 سی کوٹھری دی جاتی جو غلاطت و عفونت کی وجہ سے جہنم زادہ ہوتی (دیکھئے محفوظ
 الرحمن سیوہاروی: اسلام کا اقتصادی نظام، ملتان، ۱۹۵۱ء ص ۴۲۶)

اب سے قریباً دو صدیاں پہلے ۱۷۷۶ء میں آدم سمٹھ نے مزدوروں کے لیے
 MOTIVATIONAL TECHNIQUES کے طور پر تنخواہوں کے سلسلے میں
 حوصلہ افزائی (WAGE INCENTIVE) نفع میں حصہ داری، ٹیکسٹری کے چلانے میں
 ملازمین سے مشاورت طرز کی اصلاحات کو متعارف کرایا۔ اٹھارویں صدی عیسوی
 میں ہی رابرٹ اوون (ROBERT OWEN) نے جس کا تعلق اسکاٹ لینڈ سے تھا محنت
 کشوں کی معاشی اور معاشرتی بہبود کے لیے دلچسپی لی۔ اس نے یہ اعلان کیا کہ مزدوروں
 کو ایک کموڈٹی (COMMODITY) تصور نہ کیا جائے۔ گویا محنت کشوں کو انسان کے بجائے
 عام اشیا گردانے کے تصور کو اٹھارویں صدی کے اواخر میں چیلنج کیا گیا۔

۱۸۳۲ء میں چارلس بیچ (C. BABBAQE) نے پیداواری صلاحیت میں
 اضافہ کرنے کے لیے آجروا جیر کے باہمی مفادات کے تحفظ اور اشتراک و تعاون کی آواز
 بلند کی۔ ۱۸۸۰ء میں مغرب میں ٹریڈ یونین نے یہ واضح پایا۔ لیکن امریکا میں اس کے خلاف
 خاصی مہم جاری رہی تھی کہ ۱۹۳۵ء میں دیگر ایکٹ (WAGNER ACT) میں اسے کچھ
 مثبت حوصلہ افزائی مل سکی۔ ۱۹۴۰ء میں اجیروں کے ساتھ روابط کو اور زیادہ اہمیت
 حاصل ہو گئی۔ حال ہی میں یعنی ۱۹۶۲ء میں امریکہ کے صدر کنیڈی نے ایک آرڈر کے ذریعہ
 سے اجتماعی سودا کاری (COLLECTIVE BARGAINING AGENTS) کے
 منتخب نمائندے کو امور حکومت میں شریک کیا۔ ۱۹۶۴ء میں (CIVIL RIGHTS ACT)
 نے اجیروں کی اہمیت کو مزید استحکام بخشا، اور اب مغربی دنیا میں جہاں مزدوروں کو بے جان
 مشینوں کی سی حیثیت حاصل تھی اب یہ احساس ابھرنے لگا ہے کہ انسان مشین سے زیادہ اہم
 ہے۔ یہ تو تھا مغربی دنیا میں آجروا جیر کے روابط کا مختصر نقشہ جس پر اہل مغرب اور مغربی
 تہذیب سے مرعوب حضرات نازاں ہیں اور بعض نے تو یہاں تک کہ ڈالا کہ مزدوروں کی نلاج
 و بہبود میں پروٹسٹنٹ اخلاقیات نے اہم کردار ادا کیا ہے۔

اسلام کی روشنی میں

اب ہم اخلاقیات نبوی کی روشنی میں آجرو و اجیر کے روابط کا جائزہ لیتے ہیں۔ آجرو و اجیر کے الفاظ کا مفہوم بے حد وسیع ہے۔ اجروں میں سرکاری، نیم سرکاری، غیر سرکاری اداروں میں کام کرنے والے جملہ ملازمین، افسروں سے کلرکوں بلکہ نائب قاصدوں تک، تجارتی اداروں میں کام کرنے والے کارکن، ملوں اور فیکٹریوں کے مزدور، چند دنوں بلکہ چند ساعتوں کے لیے اجارے پر کام کرنے والے سبھی لوگ شامل ہیں۔ اگرچہ ہر ایک کا دائرہ کار مختلف ہوتا ہے، بعض کو قیادت و سیادت، نگرانی اور تنظیم کے فرائض انجام دینا ہوتے ہیں بعض لوگوں میں فنی مہارت و دسترس مطلوب ہوتی ہے، بعض کو دماغی کاوش سے کام لینا ہوتا ہے، بعض سے جسمانی مشقت کا کام لیا جانا مقصود ہوتا ہے۔ اخلاقیات نبوی میں عمومی طور پر وہ اساسی رہنما زریں اصول دیے گئے ہیں جن کی روشنی میں حالات و زمانہ کی رعایت سے، کام کی نوعیت اور اجیر کی صلاحیت کو ملحوظ رکھتے ہوئے تمام درجات کے مسائل کو حل کیا جاسکتا ہے۔ آجرو و اجیر کے روابط کے بے شمار متنوع مسائل کی گراٹیوں میں جانا مقصود نہیں اور نہ یہ مختصر وقت اس کا متحمل ہو سکتا ہے۔ لہذا ان مسائل کی پانچ بڑی صورتوں کا ذکر کیا جاتا ہے۔

۱۔ اجیر کی تقرری (سلیکشن کے معیار اور انٹرویو) کے مسائل۔

۲۔ اجیر کے حقوق و مراعات کے مسائل۔

۳۔ آجرو کے حقوق کے مسائل۔

۴۔ آجرو و اجیر میں تنازعہ پیدا ہونے کی صورت میں مسائل۔

۵۔ آجرو و اجیر کے تعلقات کو خوشگوار بنانے کے اساسی اصول۔

سب سے پہلے ہم اجیر کی تقرری کو زیر بحث لاتے ہیں۔ قرآن حکیم میں حضرت موسیٰ اور

شیخ مدین کے باہمی معاملے کو ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے:

قَالَتْ اٰحَدًا هٰمًا يٰ اَبَتِ اسْتَا جِرُكَ لَانِ خَيْرٌ مِّنْ اسْتَا جِرْتِ
 الْقَوِيُّ الْاَلَمِيْنُ ه قَالَ اِنِي اُرِيْدُ اَنْ اُنْكِحَكَ اِحْدَى ابْنَتِي
 هَلْتِيْنِ عَلٰى اَنْ تَا جِرْتِيْ ثَمَنِيْ حَبَجٍ فَاِنْ اَتَمَمْتِ عَشْرًا
 فَمِنْ عِنْدِكَ وَمَا اُرِيْدُ اَنْ اَشُقَّ عَلَيْكَ سَتَجِدُنِيْ
 اِنْ شَاءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰحِحِيْنَ ه قَالَ ذٰلِكَ بَيْنِيْ وَبَيْنَكَ
 اَيُّهَا الْاَجَلِيْنِ بَضِيْتُ فَلَاعْدُوْا نِ عَلٰى وَاللّٰهُ عَلٰى مَا لِقَوْلِ وَاكِيْلٌ ه

اس ارشاد خداوندی میں مندرجہ ذیل پانچ بڑے رہنما اصولوں کی طرف رہنمائی کی گئی ہے:

۱ - اجیر جسمانی اعتبار سے قوی ہو (PHYSICAL FITNESS)
 ۲ - اس میں دیانت و امانت کا جو ہر موجود ہو (ہمارے ان کیرکٹرٹسٹیکٹ کا رواج تو ہے لیکن وہ محض ایک رسم (FORMALITY) ہے اسلام اسے عملی اور حقیقی صورت دینا چاہتا ہے -

۳ - اجیر کو کام کی نوعیت اور مدت کارہ کو واضح طور پر بیان کر دے -

۴ - اجیر کو اس امر کی یقین دہانی کرادے کہ کام اس کی ہمت سے بڑھ کر نہیں لیا جائے گا - جیسا کہ وَ مَا ارید ان اَشُقَّ عَلَیْکَ سے واضح ہے -

۵ - اجیر اور اجیر دونوں ایک دوسرے سے اخلاص اور حسن عمل کا یقین دلائیں جیسا کہ شیخ مدین نے ستجدنی انشاء اللہ من الصالحین اور حضرت موسیٰ نے واللہ علی ما نقول وکیل کہہ کر یقین دلایا - دور حاضر میں مقاصد کے ساتھ وابستگی اور خلوص کے اظہار کے لیے اسے حلف برداری کا نام دیا جاسکتا ہے -

اسی طرح قرآن حکیم نے حضرت یوسف علیہ السلام اور عزیز مصر کے باہمی معاملے کو ذکر کیا ہے :

قَالَ اجْعَلْنِي عَلَىٰ خَزَائِنِ الْأَرْضِ اِنِّي حَفِيظٌ عَلِيمٌ ۝

(۵۵ : ۱۲)

اس سے یہ موٹی ٹسی بات واضح طور پر مستنبط ہوتی ہے کہ کسی شخص کی تقرری کے وقت بالخصوص ناظم، قائد، نگران، وزیر، سیر، پروفیشنل مینجر کی تقرری کے موقع پر، اس کی فنی مہارت اور خصوصی صلاحیت کو پیش نظر رکھنا چاہیے تاکہ وہ اپنے دائرہ عمل میں تمام تر خداداد صلاحیتوں کو بروئے کار لاسکے -

سورہ بقرہ میں طالوت کی بحیثیت سپہ سالار و جرنیل تقرری پر جب لوگوں نے یہ اعتراض کیا کہ وہ لینڈ لارڈ اور بنک بیلنس رکھنے والے خاندان کا فرد نہیں تو تقرر کرنے والے نبی نے فرمایا :

اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰهُ عَلَيْكُمْ وَاَزَادَ لَهٗ بَسْمَةً فِی الْعِلْمِ وَاَلْجِسْمِ ،

(۲ : ۲۴)

مختصر یہ کہ مہتمول طبقے سے تعلق رکھنے کی بنا پر نہیں بلکہ تقرری کے وقت کام کی نوعیت کے مطابق اس کی جسمانی اور فنی و علمی صلاحیتوں کو ملحوظ رکھا جائے۔

علامہ ماوردی نے الاحکام السلطانیہ میں اور ابو نصر الفارابی نے کتاب آراء اهل البدینۃ الفاضلہ میں ایک حکمران اور امام کی جن خصوصیات کا مفصل ذکر کیا ہے ان کا تجزیہ کیا جائے تو ان کا مدار یہی آیات کہ ہمہ ہیں۔ یہاں اس امر کا ذکر بھی سجد ضروری ہے کہ تقرری کے وقت قرآن حکیم اور ارشادات نبویؐ کی روشنی میں عمومی طور پر امیدوار کی صلاحیت، ملک و ملت سے اس کی وفاداری اور مقصد سے وابستگی کو بھی پیش نظر رکھا جائے۔ یعنی قابلیت (ABILITY) کے ساتھ ساتھ شرافت (NOBILITY) بھی ملحوظ رہے۔

اجیر کے حقوق

اب ہم شریعت اسلامیہ میں اجیر کے حقوق و مراعات کے مسائل کا جائزہ لیتے ہیں تو یہ امر واضح ہوتا ہے کہ :

۱۔ اجیر کا پہلا حق یہ ہے کہ اس سے اجرت اور کام کی نوعیت کا واضح تعین کر دیا جائے (القرآن ۱۲۸، ۲۲۷)

۲۔ اجیر کا دوسرا حق یہ ہے کہ اس کی مزدوری پسینہ خشک ہونے سے پہلے ادا کر دی جائے۔ مقصود یہ ہے کہ اس میں فوری ادائیگی (PROMPT PAYMENT) کا طریق ملحوظ ہو۔ (مشکاۃ المصابیح طبع دمشق ج ۲ ص ۱۳۱)

۳۔ اجیر کا تیسرا حق یہ ہے کہ خواہ مخواہ حیلوں بہانوں سے کام لیتے ہوئے اس پر مختلف ذمہ داریوں کا تاوان ڈالتے ہوئے اسے اجرت سے محروم نہ کیا جائے۔ صحیح بخاری میں ہے کہ :

ان تین اشخاص سے جن پر خداوند قدوس قیامت کے روز عتاب فرمائیں گے ایک شخص وہ بھی ہوگا جو اجیر سے پورا کام لے اور پھر اس کی اجرت ادا نہ کرے۔

«إِسْتَأْجَرَ نَاسًا فَوَافَى مِنْهُ وَلَمْ يُعْطِهِ أَجْرَهُ»

(صحیح بخاری، طبع مصر، الجزء الثالث ص ۱۱۸)

۴۔ حضور نے مملوک و ماتحت کو جسمانی ایذا (PHYSICAL TORTURE) سے سختی

سے منع فرمایا۔ صحیح مسلم میں اس سلسلے میں متعدد احادیث مروی ہیں۔

۵۔ حضورؐ نے موجودہ دور کے (SUBSISTENCE WAGES) کے تصور کو بہت

پہلے پیش فرمایا اور فرمایا:

”اسے کھانا اور لباس فراہم کیا جائے۔ اور ان سے وہی کام لیا جائے جس کی وہ استطاعت رکھتے ہوں۔“ صحیح مسلم میں حضورؐ کا یہ ارشاد ان الفاظ میں ذکر کیا گیا ہے:

لِلْمَسْكُوكِ طَعَامُهُ وَكِسْوَتُهُ وَكَأَيُّكُفِّ مِنَ الْعَمَلِ إِكْلًا مَا يَطِيقُ۔

امام نوویؒ نے صحیح مسلم کی شرح میں کھانے اور لباس سے اس کی جملہ ضروریات مراد لی

ہیں۔ وَنِيَّهَ بِالطَّعَامِ وَالْكِسْوَةِ عَلَى سَائِرِ الْمَسْكُونِ الَّتِي يَحْتَاجُ إِلَيْهَا۔

۶۔ اگر اجیر سے معمول سے زیادہ کام لیا جائے تو اس کی معمول سے زیادہ اعانت کی جائے۔

مثلاً اور ٹائم بونس، انعام وغیرہ کی صورت میں، اضافی معاوضہ دیا جائے۔ صحیح بخاری

میں ہے:

فَمَنْ كَانَ أَخُوهُ تَحْتَ يَدِهِ فَلْيُطْعِمْهُ مِمَّا يَأْكُلُ وَلْيَلْبِسْهُ
مِمَّا يَلْبَسُ وَلَا تَكْفُرْهُمْ مَا يَغْلِبُهُمْ فَإِنْ كَلَّفْتُمُوهُمْ
مَا يَغْلِبُهُمْ فَأَعْيَتُوهُمْ (صحیح بخاری، طبع مصر، جلد ۳ ص ۱۹۵)

علاوہ ازیں اجیر کو نفع میں بھی شریک کیا جاسکتا ہے۔

۷۔ اجیر کا یہ بھی حق ہے کہ اسے اضافی معاوضے، منصبی ترقی (PROMOTION) سے

بہرہ ور کیا جائے۔ اور اسے اس کے کام کی نوعیت کے مطابق طبی، رہائشی اور سواری کی

سہولتیں بھی فراہم کی جائیں۔

۸۔ اجیر سے کام اسے مسلمان بھائی سمجھ کر لیا جائے۔ مزدور سمجھ کر اس سے تحقیر آمیز رویہ

اختیار کر کے اس کے وقار اور عزت نفس کو مجروح نہ کیا جائے۔

اخلاقیات نبویؐ میں اس ضمن میں متعدد ارشادات ہیں جن میں سے میں نے صرف چند

ایک کا ذکر نمونہ کیا ہے۔

اجیر کے حقوق

اسلام دین فطرت ہے۔ اعتدال و توازن سے کام لینے کی تاکید کرتا ہے اس لیے جہاں

اخلاقیات نبوی میں اجیر کے حقوق کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔ وہاں آجیر کے حقوق کو بھی پیش نظر رکھنے کی تلقین فرمائی گئی ہے۔ چنانچہ مصلح اعظم نے فرمایا ملاپ کا یہ ارشاد صحیح مسلم میں ان الفاظ میں نقل کیا گیا ہے۔

إِنَّ الْعَبْدَ إِذَا نَصَحَ لِسَيِّدِهِ وَأَحْسَنَ عِبَادَةَ اللَّهِ فَلَهُ أَجْرُهُ
مَرَّتَيْنِ۔

ایک اور ارشاد ہے: لِلْعَبْدِ الْمَمْلُوكِ الْمُصْلِحِ أَجْرَانِ۔

قرآن حکیم اور صاحب قرآن صلی اللہ علیہ وسلم کے متعدد عمومی ارشادات سے یہ امر واضح ہوتا ہے کہ اجیر کو آجر کا کام پوری محنت و کاوش اور خوش اسلوبی سے انجام دینا چاہیے اور اس کے مال کو لاپرواہی سے ضائع کرنے یا تغافل و تساہل برتنے سے گریز کرنا چاہیے۔ یہاں اس امر کا ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہو گا کہ سوشلسٹ نظام میں شدت اور سختی پر مبنی سخت گیر ڈسپلن پایا جاتا ہے تو سرمایہ دارانہ نظام میں اجیر سے کام لینے کے لیے دام ستر لیں پھیلا یا جاتا ہے۔ گویا دونوں نظاموں میں محرک و عامل خارج سے عائد کیا جاتا ہے جبکہ اسلام نے افراط و تفریط سے ہٹ کر، نظم و ضبط کے ساتھ ساتھ نیرے کی نوک سے نہیں بلکہ دلوں پر دستک دیکر اندر کے انسان کو بیدار کرنے کی کوشش کی ہے چنانچہ آجر و اجیر کے تعلقات کے لیے ہادی اسلام نے جو عمومی اور اساسی اصول دیے ہیں مثلاً ایمان و ایقان کی شمع روشن کرنے کے ساتھ ساتھ اخوت، مساوات، تعاون، ایثار، صبر، توکل، عفو و درگزر، ایک دوسرے کی مدد و اعانت، قیامت کے روز جواب دہی۔ یہ اصول باہمی خوشگوار و سازگار پیما کرنے میں بنیادی کردار ادا کرتے ہیں۔

مسلم لیبر کورٹ

اب ایک انتہائی نازک مسئلے کا ذکر کرتا ہوں کہ یہود کی پھیلائی ہوئی سازش سے جو ان کے پردہ ٹوکال کے چھپنے سے منظر عام پر آچکی ہے۔ حریت اور حقوق کے نام پر اجیر کو ہڑتال اور آجر کو تالا بندی پر لگایا گیا ہے۔ یہود کے اکابر کا مقصد یہ تھا کہ ہڑتال ہو یا تالا بندی، غیر یہود اقوام میں اس سے پیداواری صلاحیت یقیناً متاثر ہوگی۔ چنانچہ جہاں گزشتہ دور میں صرف بندہ مزدور کے اوقات کی تلخیوں کا ذکر تھا۔ اب بعض جگہ مزدور نے آجروں کے اوقات تلخ کر رکھے ہیں۔ اور ٹیڈ یونین قسم کی تنظیمیں بعض دفعہ جائز

حق منوانے کے بجائے آج کے استحصال پر اتر آتی ہیں اور ناجائزہ مطالبات کی فہرست پیش کر کے
 یہود کی سازش کی عملی معاونت کرتی ہیں۔ اسلام نے نہ تو آج کو اجیر کے استحصال کی اجازت
 دی ہے اور نہ ہی اجیر کو آج کے استحصال کا حق دیا ہے۔ بلکہ اسلام تو عدل و انصاف پر
 مبنی رویے کو ابھارتا ہے، باہمی تعاون اور انصاف پر مبنی یہی رویہ آج کو اجیر کے تعلقات
 کو خوشگوار اور سادہ بنا سکتا ہے۔ یہاں اس امر کا ذکر بجز ضروری ہے کہ اسلام فلاحی
 انجمنوں کے قیام کی ترغیب دیتا ہے، لیکن کسی کے استحصال کی ہرگز نہ ہرگز اجازت نہیں دیتا
 لہذا آج کو اجیر کے مابین سنگین پیدا شدہ مسائل اور تنازعوں کو حل کرنے کے لیے،
 ہادی اسلام کی تعلیمات کی روشنی میں بہترین صورت ایک مسلم لیبر کورٹ کا قیام ہے جس
 میں ایسے منصف و قاضی کا تقرر عمل میں لایا جائے جو نہ صرف عادل ہو بلکہ اجارے
 کے معاملات میں پوری طرح مہارت رکھتا ہو۔ اور شریعت کے تقاضوں سے پوری
 طرح آگاہ ہو۔ اور یہ کورٹ فریقین کے دلائل کو سن کر اعلیٰ اسلامی عدل کی روایات
 کے مطابق منصفانہ فیصلہ دے۔

میں اپنا مقالہ اس تجویز پر ختم کرتا ہوں کہ آج جب کہ عالم اسلام میں اسلامی نظام
 حیات کو نافذ کرنے کی مساعی جمیلہ عمل میں لائی جا رہی ہیں ہمیں ملکی سطح پر اور عالم اسلام
 کی سطح پر علماء، وکلاء اور ماہرین پر مشتمل ایسے تحقیقی بورڈ قائم کرنے چاہئیں جو عصر
 حاضر کے پیدا کردہ مختلف مسائل پر غور و فکر کر کے اخلاقیات نبوی کی روشنی میں ان کا
 حل پیش کریں۔ مجھے کام میں مشکلات اور رکاوٹوں کا پورا پورا احساس ہے۔ لیکن یہ
 عزم رسولِ عربیؐ کا اسوہ ہمیں دعوت فکر و عمل دے رہا ہے اور بقول علامہ اقبالؒ

مثلِ کلیم ہو اگر معرکہ آزا کوئی
 اب بھی درختِ طور سے آتی ہے بانگِ لائخف

عدل اجتماعی اور اسلام

جناب محترم مولانا محمد حنیف ندوی

انسانی معاشرے میں عدل و انصاف کی حکایت شیریں کا تصور اتنا ہی پُرانا اور قدیم ہے جتنا کہ ستم و جور کی داستانِ حوں چکاں کا۔ جب کچھ زبردستوں نے، قوت و اقتدار کے بل پر زیر دستوں کو اپنی حرص و آرزو کا شکار بنایا۔ اُن کی آزادی کو چھینا، اُن کے شرفِ انسانی کو مجروح کیا اور چاہا کہ زندگی کی تمام آسائشوں کو اپنے ہی دامنِ طلب میں سمیٹ لیں تو، اُس کے ردِ عمل کی صورت میں، زیر دستوں نے عدل و انصاف کی دُہائی دی، اور ایسے دستورِ حیات کی ضرورت محسوس کی جس سے استحصال کی زنجیریں کٹ جائیں اور ہر انسان نسبتاً آزاد فضا میں سانس لے سکے۔

کم زور اور طاقت ور کی یہ آویزش انسانی تاریخ کے اوراق پر اس طرح پھیلی ہوئی ہے کہ آج بھی فکر و تحقیق سے بہرہ مند حضرات مذاہب و سیر کی کتابوں میں اُس کی جھلکیاں بہ خوبی دیکھ سکتے ہیں۔

ظاہر ہے اس جھگڑے میں پہل اُن لوگوں کی طرف سے ہوئی جو دولت و اقتدار کی مسندوں پر قابض رہے اور ہمیشہ اس پوزیشن میں رہے کہ اپنی بالادستی کو دوسروں سے منوا سکیں۔

تقویٰ و برتری کے اس نشے میں یہ لوگ اس حقیقت کو بھول گئے کہ زندگی کی نشاطِ آفرینیوں میں سب کا حصہ ہے اور کسی فرد یا گروہ کو یہ حق نہیں کہ وہ دوسروں کو گرا اور پچھاڑ کر آگے بڑھے اور تمام وسائلِ حیات پر قابض و مسلط ہو کر بیٹھ جائے۔ عدل و انصاف کی طرف اُنھی لوگوں نے توجہ دلائی جو زمانے کے ہاتھوں زخمِ رسیدہ تھے اور جن میں شرفِ انسانی کی بازیابی کا جذبہ زندہ اور بیدار تھا، اور جو اس شعور سے بہرہ ور تھے کہ انسان کائنات ہی کا جزوِ لاینفک ہے اور کائنات کا پورا نظام چوں کہ توازن و عدل کی کار فرمائیوں پر منحصر ہے اس لیے ضروری ہے کہ انسانی معاشرہ بھی قدرت کے اس اصول پر استوار ہو۔

عدل و انصاف کی یہ آواز دھیمے سُردوں میں ہر عہد میں بلند ہوتی رہی اور درد مند دلوں کو متاثر کرتی رہی۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ اسی آواز کی بنا پر مختلف ادوار میں فقر و تفتق کے دساتیر مدون ہوتے رہے جن میں سچائی، دیانت، انسان دوستی اور عدل و انصاف کی برابر تلقین کی گئی۔ اس لیے یہ کہنا قطعی غلط ہے کہ گزشتہ صدیوں میں جتنے بھی رہبر و راہ نما آئے سب نے زبردستوں کے فلسفہ حیات کی تائید کی اور شرع و قوانین کے ذریعے گھوم پھر کر اُنھی لوگوں کی ہم نوائی کی جنہوں نے پہلے سے قوت و اقتدار کی فراوانیوں پر قبضہ کر رکھا تھا۔

یہ مفروضہ شدتِ احساس کا نتیجہ ہے ورنہ حقیقتِ حال اس سے بالکل مختلف مختلف ہے۔

کیا آپ نے کنفیوشس کی حکیمانہ تعلیمات کا مطالعہ کیا ہے؟ حمورابی کے قوانین کا جائزہ لیا ہے؟ بدھ کی ہدایات کو دیکھنے کی زحمت فرمائی ہے؟ افلاطون کے مکالمات پر غور کیا ہے؟ اور سب سے آخر میں مادیت و تعصب کی عینک کو اتار کر کبھی آپ نے انبیاء علیہم السلام کے پیغام و دعوت کی رُوح کو جاننے اور اُس میں مذکور اُن تعلیمات کو فکر و نظر کا ہدف بنانے کی کوشش کی ہے جن کا ایک ایک لفظ نہ صرف سچائی، دیانت اور رشد و ہدایت پر مبنی ہے بلکہ کھلے بندوں انسان دوستی اور عدل و انصاف کے جذبوں کا آئینہ دار ہے؟

ان ماخذ سے صاف عیاں ہے کہ ہر عہد میں ظلم و تعدی، غرور و استکبار اور دوسری معاشرتی برائیوں کے خلاف احتجاج کیا گیا ہے، اور یہ کوشش کی گئی ہے کہ قوانین و شرائع کے دھاروں کو ہم دردی و محبت سے معمور خوش آئند و ادیبوں کی جانب موڑا جائے اور تفرقہ و امتیاز کے اُن فاصلوں کو کم کیا جائے جن کو اختیار و اقتدار یا سرمایہ و دولت کی فراوانیوں نے خواہ مخواہ بڑھا رکھا تھا۔

اس حقیقت سے قطع نظر اس سلسلے میں سوچنے کی بات یہ ہے کہ ماضی میں طرح طرح کے ظلم ہوتے رہے۔ اور زبردستوں نے ہر جانب سے زبردستوں کا عرصہ حیات تنگ کتے رکھا۔ لوگوں سے زمینیں چھینی گئیں۔ آسائشیں ہتھیائی گئیں۔ مارا پیٹا گیا۔ غلام بنایا گیا۔ ہر طرح ذلیل و خوار کیا گیا، لیکن اس پر نہ تو کوئی دل پسجاء نہ کسی آنکھ سے آسویچکا اور نہ کسی حکیم، دانش ور اور پیغمبر کی زبان سے کوئی حرفِ شکایت ہی نکلا۔

کیا یہ بات ملنے کے لائق ہے کہ ماضی میں دل احساسات سے یک قلم تھی ہو گئے تھے اور دیدہ بینا نے واقعات کی سنگینی کو دائرہ ادراک میں لانے سے انکار کر دیا تھا، ات یوں کمنا البتہ قرین عقل و صواب ہے کہ ہر دور میں عدل و انصاف کے پیمانے مختلف رہے۔ اور اکثر ایسا ہوا کہ گناہ کو ثواب سمجھا گیا اور نا انصافیوں پر انصاف کی چھاپ لگا دی گئی۔

اختلاف کی یہ نوعیت یکسر تعبیر اور اطلاق کے دائرے میں شمار ہوتی ہے جس کا زیادہ تر تعلق ہر دور کے معاشرتی حالات اور تاریخ کی مجبوریوں اور کردوٹوں سے ہے، چنانچہ تاریخ انسانی میں اس طرح کی کئی مثالیں ملتی ہیں کہ آج جو چیزیں پہلی نظر میں ہیں غیر انسانی، ظالمانہ اور عدل و انصاف کے منافی نظر آتی ہیں ان کو ماضی کے چوکھٹے میں عین عدل و انصاف جان کر اختیار کیا گیا۔

ارسطو کتاب بڑا حکیم تھا اور عقلی اعتبار سے اُس کا دور کس درجہ روشن اور تاب ناک تھا۔ اس کے باوصف غلام اور عورت کے بارے میں اس کی یہ دو ٹوک رائے تھی کہ یہ کسی ہم دردی کے مستحق نہیں۔ اُس کا کہنا تھا کہ عورت، گھوڑا اور غلام صرف چابک کی زبان سمجھتے ہیں۔ افلاطون نے "ریپبلک" میں یہ کوشش کی کہ ایسے منصفانہ اور اور حکیمانہ معاشرے کی تشکیل کی جائے جس میں کوئی اونچ نیچ نہ پائی جاتے، اور جس میں زن، زر اور زمین کی وجہ سے ابھرنے والے تمام مفاسد کا اس طرح قلع قمع کر دیا جائے کہ ان چیزوں سے سرے سے کوئی دل چسپی ہی باقی نہ رہے۔ اور اس کی صورت یہ تجویز کی کہ ان تمام چیزوں کو قومی ملکیت کے دائرے میں داخل کر دیا جائے۔ عورت زمین اور تمام پیداواری عناصر کے حصول و استفادہ میں سب شریک ہوں اور کوئی شخص کسی چیز کا مالک نہ رہے۔ تاکہ اُن کی وجہ سے جو نا انصافیاں ہوتی ہیں وہ آپ سے آپ دُور ہو جاتیں۔ معاشرتی انصاف کا یہ غالبانہ تصور اُن حالات و ظروف کا قدرتی ردِ عمل تھا۔ جن میں رشوت، استحصال اور اقربا پروری کا مرض یونانی معاشرے کی رگ و پے میں سرایت کر چکا تھا اور نیچے سے لے کر اوپر تک ہر شخص ان جرائم کا عادی بن چکا تھا۔ اس پر ارسطو نے جو کڑی تنقید کی، فلسفے کا ہر طالبِ علم اس سے آگاہ ہے۔ گل برٹ (GILBERT) نے عدل و انصاف کے اس حکیمانہ مرقع میں فرد سے جو نا انصافی روار کھی گئی، اُس کی نشان دہی ان الفاظ میں کی کہ جس معاشرے میں کوئی شخص کسی بھی

چیز کا مالک نہیں اُس معاشرے میں گویا کوئی مکمل شخص پایا ہی نہیں جاتا۔

اجتماعی عدل (SOCIAL JUSTICE) کی اصطلاح کا اول اول استعمال ایک صوفی فلسفی سائمن (SIMON) نے کیا، اور اس سے اُس کی مراد یہ تھی کہ سرمایہ کے ارتکاز نے انسانیت کو جو دو مستقل طبقوں میں بانٹ رکھا ہے اور اس کے نتیجے میں غریب اور زیادہ غریب اور دولت مند اور زیادہ دولت مند ہوتا جا رہا ہے اس کے ازالے کے لیے کوئی ایسی تدبیر اختیار کی جائے جس سے معاشرے میں ابھرنے والی ناہمواریاں دور ہو جائیں اور ہر شخص اپنی محنت اور ذاتی سعی و کوشش کے ثمر سے براہِ راست استفادہ کر سکے۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ فرد زندگی کی ضروری آسائشوں سے محروم نہ رہے اور کوئی گروہ یا فرد اس لائق نہ ہو کہ دوسروں کی محنت و عرق ریزی کا استحصال کر سکے اور محض اپنے جیب و داماں کو بھرنے کی خاطر اُس طبقے کو مفلس اور اور کنگلا کر دے جو اپنی جان کو جو کھوں میں ڈال کر وطن و قوم کے معیار زندگی کو بلند کرتا ہے اور تہذیب و تمدن کے چہرہ زیبا کو تابش و ضو عطا کرتا ہے۔ سائمن نے اس غرض کی تکمیل کے لیے یہ سادہ سا اصول وضع کیا کہ اقتصادیات کو اس طرح سے ترتیب دینا چاہیے کہ معاشرے کا ہر فرد اپنے عمل اور مقدرت کے مطابق معاوضہ وصول کر سکے۔ سائمن کے بعد اُس کے شاگرد لی راکس (LE RAUX) نے اسے سوشل ازم کے قالب میں ڈھال دیا جس کا ترجمہ ازراہِ عمہل انکاری اشتراکیت کیا جاتا ہے حال آن کہ اس کا صحیح ترجمہ اشتراکیت نہیں اجتماعیت ہے، لیکن یہ ترجمہ چوں کہ چل نکلا ہے اس لیے ہم آئندہ سطور میں اسی کو استعمال کریں گے۔

اجتماعی عدل کی اصطلاح اگرچہ اٹھارویں صدی عیسوی کی پیداوار ہے تاہم یہ ایک حقیقت ہے جس کا احساس ہر دور میں رہا اور ہر زمانے میں غربت و محرومی کی شدتوں کو دور کرنے اور آسائش و کشادگی رزق کے امکانات کو بڑھانے کی تدبیریں بہ رُوئے کار لائی گئیں اور اس کے قیام و فروغ پر خصوصیت سے زور دیا گیا۔ یہی وجہ ہے کہ تمام ادیان سماوی میں عدل و انصاف کی قدروں کی تبلیغ کی گئی اور قرآن حکیم کے نزدیک تو اس کا رشتہ روحانیت کے اس مقام بلند سے جوڑا گیا جسے لفظ تقویٰ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

إِعْدِلُوا هُوَ اقْرَبُ لِلتَّقْوَىٰ

جس کے معنی یہ ہیں کہ کوئی معاشرہ اُس وقت تک تقربِ الہی کی سرحدوں کو نہیں چھو سکتا جب تک وہ اجتماعی رشتوں کو عدل و انصاف کی بنیادوں پر قائم کرنے کی سعی نہیں کرتا۔

یوں تو عدلِ اجتماعی کا دائرہ وسیع تر ہے اور اس میں خاندان، قبیلہ، گروہ، وطن، قوم اور عالمِ انسانیت سمیت زندگی کے تمام شعبے شامل ہیں جو باہمی تعلقات میں مربوط ہیں، تاہم خصوصیت سے ایک مسئلہ ایسا ہے جس کے حل و کشود کے سلسلے میں آج ہم چند معروضات پیش کرنا چاہتے ہیں۔ یعنی یہ کہ اسلامی نقطہ نظر سے وہ کون سے اصول اور پیمانے ہیں جن کو ملحوظ و مرعی رکھنے سے دولت کی منصفانہ تقسیم کو بہ رُوئے کار لایا جاسکتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں اختصار کے ساتھ ہم اسلام کے اقتصادی نظام کی نشان دہی کرنا چاہتے ہیں۔

اسلام کا اقتصادی نظام

اسلام کے اقتصادی نظام کے خد و خال کیا ہیں، یہ کس طرح دولت کے ارتکاز کو روکتا ہے اور کیوں کہ زندگی کی نشاٹِ آفرینوں کو معاشرے کے تمام افراد پر پھیلاتا اور عام کرتا ہے، ان تفصیلات کو بیان کرنے سے پہلے ہم اسلام کے چند بنیادی اصولوں کو واضح کر دینا مناسب سمجھتے ہیں۔

(۱) اسلام چُوں کہ زندگی کو ایک وحدت اور کُل (WHOLE) تصور کرتا ہے اور کسی بھی اشکال کو اُس کے کُل اور اُس کے منطقی لوازم سے علاحدہ کر کے دیکھنے کا عادی نہیں، اس بنا پر وہ اقتصادیات کو محض اقتصادیات قرار دے کر اُس کے حل و کشود کی راہیں متعین نہیں کرتا بلکہ مسئلے کے تمام پہلوؤں پر نظر ڈالتا ہے اور ان تمام رُوحانی و عقائدی لوازم کو ملحوظ و مرعی رکھ کر اُس کے تسلی بخش حل کی جانب تحقیق و تفتحص کے قدم بڑھاتا ہے جن سے اس سلسلے میں کوئی موثر مدد مل سکتی ہے۔

(۲) اس بنا پر اس کے نزدیک زندگی کے تمام گوشوں کو سنوارنے اور سجانے کے لیے از بس ضروری ہے کہ اس ربِّ کائنات پر ایمان لایا جائے جس نے زندگی کے اس دیستان کی تخلیق کی ہے۔ اس رُوحِ کائنات سے محبت و شیفتگی کے رشتوں کو استوار کیا جائے اور اس عقیدے کو حرزِ جاں بنایا جائے کہ ہمارا ہر عمل اُس کی نگاہِ احتساب کے رُوبہ رُو

(۳) آخرت کے تصور کو نہ صرف ماننا ضروری ہے بلکہ اُس کو اس طرح دل کی گہرائیوں میں اتارنا چاہیے کہ وہ روزمرہ کی زندگی میں ایک موقف، ایک اندازِ سلوک اور ایک متعین اسلوب کی شکل میں ڈھل جائے۔ اس تصور سے یقین و اذعان کن یہ کیفیت قلب و ذہن کی لوح پر ابھرنا چاہیے کہ ایک دن حضرت حق کا سامنا کرنا اور اپنے ایک ایک عمل کا حساب دینا ہے۔

(۴) دین کی جڑ اور رُوح کے بارے میں اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے کہ اس کا تعلق تاثر و گداز کے اُن احوال سے ہے جو انسان کے باطن میں درد مندی، احسان اور خدمت ایسے جذبات و احساساتِ لطیفہ کو بیدار کر دیں کہ یہی بیداری دراصل دین ہے اور یہی سچی نیکی ہے۔ قرآن حکیم میں ہے:-

لَيْسَ الْبِرَّ أَنْ تُولُوا وَجُوهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ
وَلَكِنَّ الْبِرَّ مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَالْمَلَائِكَةِ
وَالْكِتَابِ وَالنَّبِيِّينَ وَآتَى الْمَالَ عَلَى حُبِّهِ ذَوِي الْقُرْبَىٰ
وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسْكِينِ وَابْنَ السَّبِيلِ وَالسَّائِلِينَ وَفِي
الرِّقَابِ ۝

اس کا ترجمہ یہ ہے:

”نیکی یہی نہیں کہ تم مشرق یا مغرب کی طرف مُنہ کر لو بلکہ نیکی یہ ہے کہ لوگ اللہ پر اور روزِ آخرت پر، اور فرشتوں پر، اور اللہ کی کتاب پر، اور پیغمبروں پر ایمان لائیں، اور مال باوجود عزیز رکھنے کے رشتے داروں اور یتیموں اور محتاجوں کو اور مسافروں اور مانگنے والوں کو دیں اور گردنوں کو چڑھانے میں خرچ کریں“

ہم کسی خارجی دباؤ اور ظاہری پابندیوں سے کہیں زیادہ موثر و فعال اس باطنی کیفیت کو قرار دیتے ہیں جو ایمانیات سے عبارت ہے، کیوں کہ یہی وہ شے ہے جو دلوں کو بدلتی ہے، اور عمل و کردار میں اخلاص کی رُوح پھونکتی ہے۔ اور یہی وہ چیز ہے جو احساسِ فرض کے داعیوں کو اگساتی اور بڑے بڑے مقاصد اور منصوبوں کو پروان چڑھانے کی ضامن ہے۔ نیز یہی وہ حقیقت ہے جو انسانوں کو مجبور کرتی ہے کہ بغیر کئے

سننے یہ آپ سے آپ اپنے کام اور عمل کی قدر و قیمت کو پہچانیں اور اپنی مغفوضہ خدمات کو حسن و خوبی کے ساتھ انجام دیں۔ قوانین و ضابطے اور بیرونی نظام کی حکمرانی صرف جسم کی حد تک وسعت پذیر ہے دل کی حد تک نہیں، اور جسم کے بارے میں یہ معلوم ہے کہ یہ پر لے درجے کا حیلہ جو ہے۔ دل کی دنیا میں قاعدے اور قانون کی حکمرانی نہیں چلتی، اس اقلیم میں صرف اللہ ہی کی حکمرانی کا سکہ رواں ہے۔ ہم کہنا یہ چاہتے ہیں کہ جب تک دلوں میں اللہ کی محبت، انسان دوستی اور اندیشہ عاقبت کا جذبہ کار فرمانہ ہو: ممکن ہے کہ لوگوں میں دیانت، احساس فرض، اور ایثار و محبت ایسے لطیف جذبات کو فروغ دیا جاسکے، جن کے ذریعے سے کام سے لگن اور محنت سے لگاؤ پیدا ہوتا ہے، لیکن اگر نہاں خانہ دل میں ایمان کی مشعلیں روشن ہیں تو پھر بغیر کسی محرضِ مادی (INCENTIVE) کے احساسِ فرض کا وہ داعیہ دلوں میں بیدار ہو جاتا ہے جسے کانٹ (KANT) اصل نیکی قرار دیتا ہے۔

صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کے خوارقِ ایثار کو دیکھیے کہ انہوں نے اپنے بھائیوں کے لیے محض رضائے الہی کے حصول کی خاطر اور کسی لگے بندھے فلسفہ معاشیات کو جانے بوجھے بنا کیا کچھ نہیں کیا۔ انصار نے کس طرح مہاجرین کو اپنے مال و دولت اور کار بار میں شریک کیا اور کس طرح ان کے لیے اپنے گھروں کے دروازے کھول دیے! پھر کیوں کر باہم مل جُمل کر انہوں نے مواخات اور بھائی چارے کی خوش گوار فضا پیدا کی۔ اور اُس کے نتیجے میں ماں جاتے بھائیوں کی طرح ایک دوسرے کے غم گسار اور ہمدرد بن گئے۔ یہ صورتِ حال کسی نظام سے زیادہ اُس کیفیت کی رہنِ منت تھی جو ایمانیات اور صرف ایمانیات کی بہ دولت معرضِ ظہور میں آتی ہے۔ اور دلوں میں تاثر و گداز کے حسین و جمیل شگوفوں کی پرورش کا اہتمام کرتی ہے۔

صحابہ رضی کے ایثار و ہمدردی کے اُن خوارق کو دیکھیے اور بتائیے کہ اللہ تعالیٰ کو ملنے بغیر اور اُس سے محبت کیے بنا انسان دوستی کے یہ لطیف جذبات قلب و باطن کی سطح پر کسی صورت میں ابھر سکتے ہیں؟ حضرت ابو بکرؓ کی زندگی پر نظر ڈالیے۔ اسلام لانے سے پہلے یہ چالیس ہزار درہم کے مالک تھے، لیکن ہجرت کے بعد اُن کے پاس پانچ ہزار درہم سے زیادہ اندوختہ نہ تھا۔ اُن کی تمام آمدنی، جو تجارت سے حاصل ہوتی، کم زور اور حاجت مند مسلمانوں پر خرچ ہوتی رہی۔

حضرت عمرؓ ابتدا ہی سے مالدار تھے۔ خیبر میں البتہ تھوڑی سی زمین تھی جس پر اُن کی گزر بسر کا دار و مدار تھا۔ لیکن اس کی آمدنی کو بھی انہوں نے غلاموں اور کم زور مسلمانوں کی فلاح و بہبود کی خاطر وقف کر دیا۔

حضرت عثمانؓ بے شک غنی تھے، مسندِ خلافت پر فائز ہونے سے پہلے اُن کے جو دوسخا کا یہ عالم تھا کہ ایک ہزار اونٹ اور اُن پر لدا ہوا کھانے پینے کا سامان، سب مسلمانوں پر بچھا کر دیا۔ یہ اُس وقت کی بات ہے جب مسلمان سخت قحط سے دوچار تھے۔ ان حالات میں اگر حضرت عثمانؓ چاہتے تو اُن کو اس مال کے منہ مانگے دام مل سکتے تھے۔

اسی طرح حضرت علیؓ اور اہل بیت کے ہاں انسان دوستی اور غربا پروری کا کیا عالم تھا، اس کا اندازہ اس سے کیجیے کہ یہ اپنے اور اپنے گھر والوں کے تغذیہ کے لیے صرف تین روٹیاں پاتے تھے اور بسا اوقات ان تین روٹیوں کو بھی حاجت مندوں اور ساتلوں میں بانٹ دیتے تھے۔

فیاضی، ایثار اور نوعِ انسانی سے گہری محبت کے یہ عظیم مظاہر اس بنا پر تھے کہ باطن میں موجِ زن اللہ کی محبت کے جذبے نے اُن کے دلوں میں تاثر و گداز کے اُن سرچشموں کو رواں دواں اور جاری کر دیا تھا جن کے فیوض سے غریب و نادار مسلمانوں کی کشتِ مراد بھی سرسبز و شاداب رہی۔ کہنا یہ ہے کہ کسی معاشی تنظیم سے پہلے یہ ضمانت ضروری ہے کہ معاشرے میں اللہ پر ایمان، ادب و اندیشہ عاقبت کے جذبات و عواطف کی پرورش کی جائے، کہ یہی وہ پہلی اینٹ اور اساس ہے جس پر ہماری زندگی کی پوری عمارت استوار ہے۔

اسلامی نقطہ نظر سے اقتصادیات کے دائرہ بحث میں ایک معاکسیا دوسری مشکل (DILEMMA) یہ رونما ہے کہ اگر حصولِ سرمایہ پر کوئی قدغن عائد نہ کی جائے اور کار بار کو حریتِ تصرف (Laissez Faire) کے اصول کے مطابق بغیر کسی روک ٹوک کے پھلنے پھولنے کے مواقع فراہم کیے جائیں تو اُس کا منطقی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ آخر کار سرمایہ گھوم پھر کر چند ہاتھوں میں مرکوز ہو کر رہ جاتا ہے، جس سے طرح طرح کی اجتماعی بُرائیاں اور مفسدے اُبھرتے ہیں اور معاشرہ امیر و غریب کے دو حریفانہ کیمپوں میں بٹ جانے کی وجہ سے مستقل طبقاتی آویزش اور گروہی اختلافات کا ہدف بن کر رہ جاتا ہے۔ اور اگر

اس کے برعکس سرمائے کو انفرادی ملکیت کی تنگ نائے سے نکال کر قومی ملکیت کے وسیع تر قبضے میں دے دیا جائے تو اس سے نہ صرف وہ ذاتی محرص (INCENTIVE) ختم ہو جاتا ہے جو افراد کو ملت کے معاشی مفادات کے پیش نظر محنت اور سخت کوشی پر ابھار سکتا ہے بلکہ اس سے فرد اپنے عمرانی شخص ہی کو کھو بیٹھتا ہے، کیوں کہ اگر کوئی شخص اپنے معاشرے میں اپنی زمین کا مالک نہیں، اپنے گھر کا مالک نہیں، پیداواری ذرائع سے استفادے کا حجاز نہیں اور اپنے ہی سرمائے کو اپنے مقصد کے ماتحت خرچ نہیں کر سکتا تو اُس کے معنی یہ ہیں کہ معاشرے میں اُس کا سرے سے کوئی رول ہی نہیں، اور وہ محض جان دار اور ذی شعور گوشت پوست کا ایک کل پُرزہ ہے جو اجتماعی مشین میں فٹ کر دیا گیا ہے! اسے یہ حق نہیں کہ خود اپنے لیے اور اپنے خاندان اور اپنے بال بچوں کے لیے راحت و آسائش کا کوئی بندوبست کر سکے۔

اس معاکس زیادہ ہری مصیبت سے بچ نکلنے کی ایک ہی راہ ہے جسے ہم بیچ کی راہ کہہ سکتے ہیں، اور وہ راہ وہ ہے جسے اسلام پیش کرتا ہے، یعنی اقتصادیات میں نہ تو سرمایہ دار کو کھلی چھٹی دی جاتے کہ وہ صبح و مسا اپنی تجوریاں بھرتا رہے اور دولت کے ڈھیر اور انبار جمع کرتا رہے جب کہ ملک کے عوام افلاس اور جہالت ایسے جاں گسل مصائب سے دوچار ہوں اور نہ ذرائع پیداوار کو کلیتاً بیورد کر لیں اور ہشیت حاکم کو اس طرح سپرد کر دیا جائے کہ وہ حاکم مطلق کے رُوپ میں بنی نوعِ انساں کے مقدر سے کھیلنے لگیں جو اس کے نتیجے میں مفلس اور بے دست و پا ہو کر رہ جائیں۔

قرآن حکیم کا اعجاز ملاحظہ ہو کہ مارکس اور انقلابِ فرانس سے صدیوں پہلے، یہ کتابِ ہدیٰ ارتکازِ دولت کے اس خطرے سے یہ کہہ کر نوعِ انسانی کو متنبہ کرتی ہے کہ زہار کبھی دولت و سرمایہ کو معاشرے کے کسی طبقے میں مرکز نہ ہونے دینا۔

كِي لَا يَكُوْنَ دَوْلَةً بَيْنَ الْاَغْنِيَاءِ مِيْكُمْ

اس کا ترجمہ یہ ہے کہ:

”تا کہ مال اُن لوگوں کے ہاتھ میں گردش نہ کرتا رہے جو تم میں دولت مند ہیں“
مال و دولت کو، خون کی طرح، جسمِ اجتماعی کی ہر رگ و پے میں جاری و ساری رہنا چاہیے۔ اس کے ساتھ ساتھ قرآن جانتے تجارت، دیانت دارانہ کار بار، اور اسلام کے حدودِ اخلاق کے اندر رہ کر زیادہ سرمایہ کی کوششوں کو سراہتا ہے۔

وَإِذَا قُضِيَتِ الصَّلَاةُ فَانْتَشِرُوا فِي الْأَرْضِ وَابْتَغُوا
مِنْ فَضْلِ اللَّهِ

”پھر جب نماز ہو چکے تو اپنی اپنی راہ لو اور خدا کا فضل تلاش کرو“

یہ تو اصول ہوا، اسلام نے دونوں نقطہ ہائے نظر میں تطبیق دینے، باہم توازن و
توافق پیدا کرنے اور افراط و تفریط کے مابین اُس درمیانی راہ کو اختیار کرنے کی تلقین کی
جس پر چلنے سے نہ فرد کی نشاط آفرینیوں پر کوئی حرف آتا ہے اور نہ سرمایہ چند ہاتھوں
میں سکرپتا اور سمٹتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ اس سلسلے میں اسلام نے وہ کیا تدابیر اختیار
کیں جن کو اپنانے اور معاشرے میں سمونے سے ہم دو گونہ خطرات سے نہ صرف بچ سکتے
میں کام نیا ب ہوتے ہیں بلکہ ایک صحت مند، ترقی یافتہ اور معتدل معاشرے کی تعمیر بھی
کر سکتے ہیں۔ یہ تدابیر یہ ہیں۔

(۱) سُود کی حرمت کا دو ٹوک اعلان۔

(۲) احتکار یا ذخیرہ اندوزی کی ممانعت۔

(۳) باطل اور ناجائز ذرائع آمدنی کا سدباب۔

(۴) اصول وراثت کی تلقین۔

(۵) ذاتی ملکیت کی حوصلہ افزائی۔

(۶) زکوٰۃ اور تبرعات کی تنظیم۔

(۷) عمل اور جدوجہد کی تقدیس و احترام۔

(۸) اقتصادیات کی اس نہج پر تنظیم و تشکیل کہ جس سے فلاحی مملکت کے نقوش معاشرے
کے کینوس پر نمایاں اور صاف طور سے نظر آنے لگیں۔

یہاں چند نکتوں کی وضاحت بہت ضروری ہے۔ ذاتی ملکیت کی حوصلہ افزائی سے

مقصود یہ ہے کہ اس کے ذریعہ سے فرد کو معاشرے میں اپنا مقام اور تشخص متعین کرنے

میں مدد ملتی ہے اور وہ بھی اس شرط کے ساتھ کہ اُس کی ملکیت کے دائرے اتنے نہ

پھیل جائیں کہ اس سے ملت کے اجتماعی مفادات خطرے میں پڑ جائیں۔

زکوٰۃ و صدقات کا نظام اُس مکمل اقتصادی نظام کے مترادف نہیں جس کے

نفاذ سے فوراً فلاحی مملکت معرضِ ظہور میں آجائے۔ اس نظام کے خدو خال کو ابھی اور

نکھارنا، اور واضح کرنا ہے۔ اور محولہ بالا اصولوں کی روشنی میں ابھی ترتیب دینا ہے۔

صدقات، تبرعات اور زکوٰۃ کی حیثیت محض اشارہ نما (POINTER) کی ہے۔ جس سے اسلامی نظام کی جہت اور رخ کا تعین ہوتا ہے۔ غرض یہ ہے کہ ان کے نفاذ سے ہم بہ تدریج سخا و جود کی اُس منزل تک پہنچ جائیں جہاں کوئی شخص مستحق زکوٰۃ نہ رہے، کوئی سائل اور مانگنے والا نہ رہے اور کوئی ایسا نہ ہو جسے اپنے مستقبل کی فکر و تشویش لاحق ہو۔

فلاحی مملکت سے ہماری مراد ایسے معاشرے کی تشکیل ہے جس میں ہر شخص کو مناسب ٹھکانا ملے، مناسب غذا ملے، اور جس میں ایسے حالات و ظروف کی کار فرمائی ہو کہ روزگار، صحت اور تعلیم کے دروازے ہر شخص پر کھلے ہوں۔ یہی نہیں ہر شخص کو ایسی فراغت حاصل ہو کہ وہ اپنے علمی اور روحانی افق کو چمکاسکے اور بہ حیثیت انسان کے اپنے تمام مضمرات ارتقا کو تباہ حد امکان کماں تک پہنچاسکے۔

عمل کی تقدیس کے ایک معنی یہ ہیں کہ ہر شخص اپنے کو شرعاً اس بات کا مکلف گردانے کہ اُسے کام کرنا اور ملی دولت میں اضافہ کرنا ہے۔ قرآن حکیم میں ہے:

وَأَنْ نُّبَيِّنَ لِلْإِنْسَانِ مَا سَعَىٰ

”اور انسان کو وہی کچھ ملتا ہے جس کی وہ کوشش کرتا ہے“

گویا سعی، محنت اور حتی المقدور تگ و دو ہر مسلمان پر فرض ہے۔ اس کے بغیر کوئی معاشرہ ترقی و کام رانی کی راہ پر گام فرسا نہیں ہو سکتا۔

اس کے دوسرے معنی یہ ہیں کہ اسلامی نقطہ نگاہ سے نہ صرف کوئی بھی پیشہ بُرا نہیں بلکہ ایک طرح کی تقدیس و احترام کا مستحق ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے ہاں اکابر اہل علم میں بہت سے قابلِ صدا احترام حضرات ایسے ہیں جو اپنے جرنیل کی طرف منسوب ہوتے۔ امام ابوحنیفہ بزاز کو ملاتے، احمد بن عمر خفاف کے لقب سے ملقب ہوتے جس کے معنی جو تا گانٹھنے والے کے ہوتے ہیں۔ اسی عرفی نامی ایک، قفال، جصاص، صفار، الصیدلانی، دقاق، سابونی اور حلوانی ایسے نام اس بات پر دلالت کرتا ہیں کہ اسلامی معاشرے میں ان تمام جرنیلوں کو عزت و احترام کی نظر سے دیکھا جاتا تھا:

یہ نفسِ مضمون کا سرسری جائزہ تھا۔ ہماری تجویز یہ ہے کہ آگے کے اہل فکر، علمائے کرام اور قانون دان حضرات کہیں سر جوڑ کر بیٹھیں اور اقتصہ دیاتِ اسلامی کو اس طرح نکھار کر تفصیل سے پیش کریں کہ یہ اشتراکیت اور سرمایہ داری کے مقابلے میں ایک مستقل بالذات تیسرا اقتصادی نظام ثابت ہو۔ آمین

اسلامی تعلیم و تربیت کی خصوصیات

جناب محترم قاضی مجیب الرحمن

نحمدہ و نصلی علی رسولہ الکریم و بعد فاعوذ باللہ من الشیطان الرجیم

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

هُوَ الَّذِي يَعْثُرُ فِي الْأَمْثَلِ مَرَسُولًا مِنْهُمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ
آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَ
أَنْ كَانُوا مِنْ قَبْلُ لَفِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ ۚ وَ آخِرِينَ مِنْهُمْ
لَمَّا يَأْتِ الْحَقُّ أَيْمَانًا وَهُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ۝ ذٰلِكَ
فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيهِ مَنْ يَّشَاءُ ۗ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ
الْعَظِيمِ ۝ (الجمعه ۲-۴)

ترجمہ، وہی (اللہ تعالیٰ) تو ہے جس نے امی لوگوں میں انہیں میں سے ایک پیغمبر
بھیجا جو ان کو آیات الہیہ پڑھ کر سنانا ہے، اور انہیں پاک کرتا ہے، اور
انہیں کتاب و حکمت کی باتیں سکھاتا ہے۔ درانحالیکہ یہ لوگ پہلے سے کھلی
ہوئی گمراہی میں تھے، اور دوسروں کے لیے بھی ان میں سے آپ کو بھیجا ہوا بھی
ان میں شامل نہیں ہوئے اور وہ (اللہ تعالیٰ) بڑا نہ بر دست ہے حکمت
والا ہے اور یہ رسالت و فرائض رسالت اکتسابی نہیں بلکہ فضل الہی ہے۔ اللہ
جسے چاہتا ہے عطا کرتا ہے اور اللہ بڑے فضل والا ہے۔

ان آیات کریمہ سے بعثتِ محمدی کے متقاضیہ لبعہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
کے بنیادی فرائض منصبی پر روشنی پڑتی ہے :

۱۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا پہلا کام قاصد و مبلغ کی حیثیت سے لوگوں کے
سامنے آیات الہیہ کی تلاوت اور کلام الہی کا بلا کم و کاست ٹھیک ٹھیک پہنچانا

تھا۔

ب۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا دوسرا کام مُزکی اور مُصلح کی حیثیت سے لوگوں کے قلوب و اذنان کو عقائدِ باطلہ اور ان کے نفوس و اجسام کو اخلاقِ ذمیرہ سے پاک کرنا تھا۔

ج۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا تیسرا کام معلم و مدرس کی حیثیت سے کتابِ الہی کی تفسیر، تشریح، ترجمانی اور عملی تفہیم کا فرض ادا کرنا تھا۔

د۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا چوتھا کام مرشد و متقین کی حیثیت سے لوگوں کو حکمت و دانائی کی تلقین کرنا تھا۔ احکام و مسائلِ دین کے قاعدے اور آداب، عوام و خواص سب کو سکھانے تھے اور خواص کی رہنمائی، اسرارِ شریعت، آدابِ طریقت اور رموزِ مملکت میں فرمائی تھی۔

ظہورِ اسلام کے وقت دنیائے بشری میں اخلاقی انحطاط، حیوانی ہوس رانی اور بہیمی تعیش کا ایسا زہرہ دست سیلاب آیا تھا جس نے نوعِ انسانی کے جملہ اعلیٰ اقدار و بلند محاسن کو خس و خاشاک کی طرح بہا کر اجتماع و معاشرت کی عمارت کو متزلزل کر دیا تھا۔ ایرانی، رومی، بہمنی، کلیسانی اور یہودی اور دیگر مروجہ نظامہائے تعلیم و تربیت اور اصولی تمدن و معاشرت میں آسمانی ہدایت و روشنی اور انبیاء کی عملی سیرتوں کے نمونے یا تو کلی طرز پر مفقود تھے اور یا ان میں کتمان، تحریف اور حق فریابی کی وجہ سے انسانی افکار و خیالات اور حیوانی طرق و تدابیر کا اضافہ کیا گیا تھا جس کے نتیجے میں روئے زمین پر کسی قوم کے پاس اللہ تعالیٰ کا پیغام اور نبی و نبت کی عملی سیرت اپنی اصل الہامی شکل و صورت میں موجود نہ تھی۔ پھر ستم بالا۔ ستم یہ کہ اس مزوج و مرکب علم پر چند افراد یا خاندانوں اور طبقوں کا قبضہ کلی اور ناقابلِ شکست اجارہ داری تھی جس کا نتیجہ یہ تھا کہ نوعِ انسانی کی عظیم اکثریت جہل و نادانی اور ناخواندگی کی شکار ہو چکیوں کی کسی زندگی بے زکر رہی تھی۔

روم میں عیسائی تسلط کے بعد علم اور اہل علم پر جو تباہی گزری وہ تاریخِ انسانی کا انتہائی بدناما حصہ ہے۔ دین کے نام پر علمی بات کو غیر مسیحی قرار دیکر فنا کر دیا گیا۔ مجالسِ تفتیش و احتساب قائم ہوئیں اور جس شخص پر بھی اہل علم ہونے کا الزام لگتا وہ جو رواستبہاد کی چکی میں پس جاتا۔ محکمہ احتساب نے لاکھوں آدمیوں کو سزائیں دیں جن میں سے ۳۲ ہزار صرف وہ بد نصیب تھے جنہیں زندہ آگ میں جلا دیا گیا۔

یہودیوں میں اجبار و رہبان (علماء اور مذہبی پیشواؤں) نے علم پر اپنی اجارہ داری قائم کر رکھی تھی اور عوام کو "امی" قرار دیکر تعلیم و تعلم کو ان کے لیے شجرِ مہذّب عنہ قرار دیدیا گیا تھا۔

ہندوستان میں علم صرف برہمنوں کے لیے مخصوص تھا۔ شودروں کے لیے حکم یہ تھا کہ وہ راستہ چلتے ہوئے لکڑی سے ٹھک ٹھک کی آواز پیدا کرتے ہوئے بنائیں تاکہ اگر کوئی برہمن دیدہ کی تعلیم میں مصروف ہو تو وہ خاموش ہو جائے۔ ورنہ اگر لڑائی شودروں کی آواز نہ سن لیتا تو اس کے کانوں میں پگھلا ہوا سیسہ ڈال دیا جاتا۔

ان تاریخی حقائق سے یہ بات کھل کر سامنے آتی ہے کہ اسلام سے پہلے علم پر مخصوص طبقوں کی اجارہ داری قائم تھی اور مٹھی بھر لوگ علم کے ذریعے اپنی برتری قائم کر کے اسے عام لوگوں کے استحصال کا ذریعہ بنائے ہوئے تھے۔

۱۔ اسلام دینِ علم

تاریخِ عالم میں اسلام کو یہ منفرد مقام حاصل ہے کہ وہ سراپا علم بن کر آیا اور جہاں پہنچا وہاں سے جہالت کے اندھیرے بھاگ اٹھے اور علم و حکمت کے نئے روشن ہو گئے۔

پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم پہ نازل ہونے والی پہلی وحی علم اور اسلام کے ربط کو

بہت اچھی طرح واضح کرتی ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

اقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِي خَلَقَ ه نَخْلَقَ الْإِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ۝
اقْرَأْ وَرَبُّكَ الْأَكْرَمُ ۝ الَّذِي عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ۝

ترجمہ: پڑھیے اپنے پروردگار کا نام لے کر جس نے پیدا کیا۔ جس نے انسان کو خون کے لوتھڑے سے پیدا کیا۔ پڑھیے اور آپ کا پروردگار بڑا کریم ہے جس نے قلم کے ذریعہ سے تعلیم دی ہے۔

ان آیاتِ مبارکہ میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کریم کا اولین نازل شدہ لفظ "اقْرَأْ" (پڑھیے) ہے۔ اور اسی اولین وحی میں تعلیم بالقرآن کو رب کریم کی بہت بڑی نعمت قرار دیا گیا ہے۔ گویا یہ بات واضح کر دی گئی کہ اس دینِ مبین میں جہالت اور اویام کی کوئی گنجائش نہیں۔ اس کی بنیاد قرأت اور تعلیم بالقرآن (پڑھنے اور لکھنے) پر ہے۔ اور یہ حقیقت ہے کہ تاریخ نے انسانوں کے لیے جو علمی ورثہ محفوظ رکھا ہے

وہ انہی دو بنیادی ذرائع لتعلیم کامرہون منت ہے۔
 حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے معلم کتاب و حکمت بنا کر بھیجا۔ آپ نے اپنی
 اولین توجہ اشاعت علم پر دی جس کی وجہ سے دیکھتے ہی دیکھتے عرب کے صحرا میں
 بکھرے ہوئے خانہ جنگیوں میں مصروف بدو علم و حکمت کے پاسبان اور حصول علم کے
 لیے مربع الخلاق بن گئے۔

غیر مسلم مؤرخین اس بات پر حیران ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم جو خود امی تھے،
 کس طرح ایسی اور اتنی زبردست علمی تحریک کے محرک ثابت ہوئے جس کی بدولت دنیا
 بھر کا علمی نغمہ انہ ایک صدی سے بھی کم عرصے میں عربی زبان میں منتقل ہو گیا۔ اور پھر
 صدیوں تک دنیا اسلام کی پھیلائی ہوئی علمی روشنی سے منور رہی۔ درحقیقت یہ حضور
 صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک زندہ معجزہ تھا۔

علم کی اشاعت اور اس پر سے اجارہ داری ختم کرنے کے سلسلے میں اسلام نے
 دنیا کو جن زریں اصولوں سے روشناس کیا ان میں سے چند درج ذیل ہیں :

۱۔ تعلیم و تعلم کی ترغیب اور جہالت کی مذمت :۔
 قرآن پاک کی متعدد آیات علم اور علما کی فضیلت اور جہالت کی مذمت میں وارد
 ہیں۔ سورہ زمر میں فرمایا گیا ہے :

قل هل یستوی الذین یعلمون والذین لا یعلمون
 آپ کہہ دیجیے (یا محمد) کیا اہل علم اور جاہل (بھی کبھی) برابر ہو سکتے ہیں۔

سورہ مجادلہ میں ارشاد باری تعالیٰ ہے :
 یَرْفَعُ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنْكُمْ وَالَّذِينَ أُوتُوا الْعِلْمَ دَرَجَاتٍ ط
 ترجمہ : اللہ تم میں ایمان والوں اور ان لوگوں کے جن کو علم ملا ہے ، درجے بلند
 کرے گا۔

اسی طرح احادیث نبوی کا ایک بڑا ذخیرہ علم کی ترغیب اور فضائل پر مشتمل ہے یہ ترغیبات
 لوگوں میں علم کا شوق اور جذبہ پیدا کرنے کا کامیاب ترین ذریعہ ہیں۔

۲۔ علمی اجارہ داری کا خاتمہ

اسلام میں برہمن، پادری یا کسی اور شکل میں علمی اور مذہبی اجارہ داری کا کوئی تصور

نہیں۔ بلکہ ہر شخص کے لیے علم کا راستہ کھلا ہے۔ علم حاصل کر کے وہ خلق خدا کی خدمت کر سکتا ہے۔

قرآن مجید نے مال و دولت کی طرح علمی ذخیرہ اندوزی پر بھی کاری ضرب لگائی۔ اور فرماتا ہے:

إِنَّا الَّذِينَ يَكْتُمُونَ مَا أَنْزَلْنَا مِنَ الْبَيِّنَاتِ وَالْهُدَىٰ مِنْ بَعْدِ مَا بَيَّنَّاهُ لِلنَّاسِ فِي الْكُتُبِ ۗ أُولَٰئِكَ يَلْعَنُهُمُ اللَّهُ وَيَلْعَنُهُمُ اللَّعْنُونَ ۝

ترجمہ: بیشک جو لوگ چھپتے ہیں اس چیز کو جو ہم کھلی ہوئی نشانیوں اور ہدایت میں نازل کر چکے ہیں۔ بعد اس کے کہ ہم اسے لوگوں کے لیے کتاب (الہی) میں واضح کر چکے ہیں۔ تو یہ وہ لوگ ہیں کہ اللہ ان پر لعنت کرتا ہے۔ اور لعنت کرنے والے ان پر لعنت کرتے ہیں۔

اسی طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

مَنْ سَأَلَ عَنِّ عِلْمِي عَلِمَهُ ثُمَّ كَتَمَهُ أُجِرَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ بِبِجَامٍ مِثْنِ نَاسٍ

ترجمہ: جس شخص سے کسی ایسی بات کے بارے میں پوچھا جائے جسے وہ جانتا ہو، اور پھر وہ نہ بتائے۔ قیامت کے دن اسے آگ کی لگام پہنائی جائے گی۔

گویا اسلام نے علم حاصل کرنے والوں پر یہ بھی لازم کر دیا کہ وہ علم کو محض خدا کی امانت سمجھتے ہوئے اسے دوسروں کو پہنچائیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم تو یہاں تک فرمایا کہ:

بَلِّغُوا عَنِّي وَلَوْ آيَةً -

ترجمہ: میری طرف سے پہنچا دو خواہ وہ ایک آیت ہی ہو۔

اس طرح علم کے معاملے میں رنگ و نسل، عمر اور جنس کی قیود کو بھی نختہ کیا۔ اور غلام، آزاد، گورے، کالے، مرد و عورت سب کے لئے علم ضروری قرار دیا۔

۱۔ غلاموں کی تعلیم

اسلام نے اولین کوشش تو یہ کی کہ کوئی شخص اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کا

غلام نہ رہے۔ یہ اسی ہمہ جو لوگ اس زمانے میں غلامی کی زندگی بسر کر رہے تھے انہیں بھی زبورِ علم سے محروم نہیں رکھا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک مرتبہ گورنر مکہ سے پوچھا کہ تم نے جنگلات کا افسر کسے مقرر کیا ہے؟ انھوں نے جواب دیا ابن ابزریؓ کو جو ایک غلام تھے۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے غلام کو امیر اور افسر مقرر کرنے کی وجہ پوچھی تو انھوں نے جواب دیا کہ وہ کتاب اللہ کا عالم ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نے اپنے غلام اور خادم عکرمہؓ کی ایسی تعلیم و تربیت فرمائی کہ وہ بعد میں ”سبر الامتہ“ (امت کا عالم) کے لقب سے پکارے جاتے تھے۔

ب۔۔ بچوں کی تعلیم

اسلام نے ماں باپ پر اولاد کے جو حقوق عائد کیے ہیں ان میں بہترین تعلیم و تربیت کو اولین حیثیت حاصل ہے۔ جنگ بدر میں کفار کے قیدیوں میں سے جو لوگ لکھنا پڑھنا جانتے تھے ان سے جہانہ یا بیگار لینے کے بجائے انھیں دس دس بچوں کو کتابت سکھانے پر مامور کر دیا گیا۔ مساجد میں بچوں کی تعلیم کا انتظام ایک لازمی چیز تھی۔ علامہ ذہبی طبقات القراء میں لکھتے ہیں کہ حضرت ابوالدرداءؓ کے حلقہٴ درس میں سینکڑوں طلبہ ہوتے تھے۔ ایک مرتبہ حاضری لی تو سولہ سو کے قریب تھے۔ آپ دس دس طلبہ کی جماعتیں بنا کر ایک ایک استاد کے سپرد کر دیتے اور خود مسجد میں سہلتے ہوئے ان کی آوازوں پر کان لگائے رکھتے۔ قرأت و کتابت کے علاوہ بچوں کو شہنشاہی اور پیراکی کی تعلیم بھی دیا جاتی تھی۔ بعد میں اموی اور عباسی خلفاء کے عہد میں عصری تقاضوں کے تحت حساب، جغرافیہ اور دیگر علوم بھی نصاب میں شامل کر دیے گئے۔

ج۔ تعلیم نسواں

چھوٹی بچیوں کے لیے گھریلو مدرسے قائم کیے گئے۔ حضرت عائشہؓ کا گھر انہی مدارس میں سے ایک تھا۔

بڑی عمر کی عورتوں کی تعلیم و تربیت گھر کے مردوں کے ذمہ تھی۔ قرآن کریم نے عورتوں کو اپنے گھر کے مردوں سے علم حاصل کرنے کا حکم دیا ہے۔ ارشاد

باری تعالیٰ ہے۔

وَاذْكُرْنَ مَا يُتْلَىٰ فِي بُيُوتِكُنَّ مِنْ آيَاتِ اللَّهِ وَالْحِكْمَةِ
ترجمہ: اور تم اللہ کی ان آیتوں اور حکمت کی باتوں کو یاد رکھو جو تمہارے گھروں
میں پڑھ کر سنائی جاتی ہیں۔

مردوں کے ذمے اپنے گھر کی عورتوں بلکہ خادماؤں اور کنیزوں تک کی تعلیم و
ترتیب کا کام لگایا گیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تین قسم کے لوگوں کے لیے دوہرے
اجرہ کی خوشخبری دی ہے۔ ان میں سے ایک شخص وہ ہے جو اپنی کنیز کی تعلیم و ترتیب
کے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

وَمَنْ جَلَّ كَانَتْ عِنْدَهُ أُمَّةٌ فَأَدَّبَهَا فَحَسَنَ تَأْدِيبَهَا وَ
عَلَّمَهَا فَحَسَنَ تَعْلِيمِهَا ثُمَّ أَعْتَقَهَا فَتَزَوَّجَهَا فَلَهُ
أَجْرَانِ - (صحیح بخاری کتاب العلم)

ترجمہ: (اور ان تین میں سے) ایک شخص وہ ہے جس کے پاس کنیز ہو پھر اسے
اچھی طرح ادب سکھائے اور اچھی طرح تعلیم دے اور پھر اسے آزاد کر کے اپنے
نکاح میں لے آئے۔ اس کے لیے بھی دوہرا اجر ہے۔

اس کے علاوہ بعض اوقات خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم عورتوں کی تعلیم کے لیے
خاص دن مقرر فرمایا کرتے تھے۔

د - تعلیم بالغان

جو لوگ بچپن میں تعلیم و تعلم سے بے بہرہ رہ جائیں ان کو بھی اسلام نے علم سے
محروم رہنے نہیں دیا۔ حضور کا ارشاد ہے:

أَطْلَبُوا الْعِلْمَ مِنَ الْمَهْدِ إِلَى التَّحَدِّ

ترجمہ: پنگھوڑے (بچپن) سے لے کر لحد موت تک علم طلب کرتے رہو۔
ہجرت کے بعد حضور نے مسجد نبوی میں ایک مکتب قائم کر دیا تھا۔ جسے "صفہ"
کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ یہ ایک چبوترہ سا تھا جہاں اطراف ملک سے مشتاقانِ علم آکر
مقیم ہوتے تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان کے معلم تھے۔ یہ لوگ محنت و مزدوری
کے روزی کھاتے اور پھر زیادہ وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت میں گزارتے۔

سے بند تھا تاکہ تم یہ نہ کہہ سکو کہ ہمارے پاس کوئی بشارت دینے والا اور
ڈرانے والا نہیں آیا۔ سو دیکھو اب وہ بشارت دینے اور ڈرانے والا آگیا
اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔“ (المائدہ - ۱۹)

”وہ اللہ ہی ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ بھیجا ہے
تاکہ اس کو پوری جنس دین پر غالب کر دے اور اس حقیقت پر اللہ کی گواہی
کافی ہے۔“ (الفتح - ۲۸)

آپ کے اخلاق اور آپ کی شخصیت سے متعلق جو احادیث موجود ہیں ان سے بھی ظاہر
ہوتا ہے کہ آپ ہی مسلمانوں کے لیے نمونہ عمل رہے ہیں۔ حضرت عائشہ فرماتی ہیں:
”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی گفتگو میں اعتدال سے نہیں بڑھتے تھے۔ آپ
مٹروں پر بلند آواز سے بات نہیں کرتے تھے اور نہ برائی کا جواب برائی سے
دیتے تھے۔“

ایک اور حدیث میں حضرت عائشہ فرماتی ہیں:

”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے جوتے گاٹھ لیتے تھے اور اپنے کپڑے سی
لیتے تھے اور ہر کام بالکل اسی طرح کیا کرتے تھے جیسا تم لوگ کرتے ہو۔ وہ
لوگوں سے خندہ پیشانی سے پیش آتے تھے۔“ (مشکوٰۃ المصابیح)

یہ نمونہ تھا ایسی شخصیت کا جس کی پیروی تمام مسلمانوں پر لازم تھی۔ سیوطی نے الجامع الصغیر
میں یہ بتاتے ہوئے کہ مسلمانوں کو کیا کرنا چاہیے اور کیا نہیں کرنا چاہیے۔ آنحضرت کی مثال کو
ہمت واضح طور پر پیش کیا ہے؟

”بابرکت ہیں وہ لوگ جو اللہ کی پیروی میں ایک دوسرے سے بڑھنے کی کوشش
کرتے ہیں، جب ان کو کوئی جائز چیز دی جاتی ہے اس کو قبول کرتے ہیں، اور
جب ان سے کسی جائز چیز کو طلب کیا جاتا ہے تو وہ اس کو دے دیتے ہیں اور
جو اپنا احتساب خود کرتے ہیں۔“

نیکی اور اچھائی کی ترغیب دینے والی ان احادیث میں بشارت دینے کے ساتھ
ساتھ انتباہ بھی ہے:

”بدبخت ہے وہ شخص جو مقدمہ کے دوران رشوت دیتا ہے اور رشوت قبول
کرتا ہے۔“

ایک مغربی مصنف ایف۔ شون (F. SCHUON) نے، جنہوں نے آنحضرتؐ کی سیرت اور مسلمانوں کی زندگی میں آپؐ کے کردار کا مطالعہ کیا تھا، ایک اخلاقی رہبر کی حیثیت سے آپؐ کی شخصیت کو بڑی خوبی سے پیش کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

”رسول اللہ کی پیروی میں یہ سبق مضمون ہے کہ خود طاقت و رتبہ، دوسروں کے ساتھ نیافتی سے پیش آؤ اور اللہ پر بھروسہ کرو۔“

(UNDERSTANDING ISLAM P. 93)

ایک مسلمان کی زندگی کی تشکیل میں آنحضرتؐ کا جو کردار ہے اس کا مشاہدہ صرف احادیث کی ابتدائی تدوین کے مراحل میں ہی نہیں کیا جاسکتا۔ بلکہ قانون شریعت کی تدوین میں بھی مشاہدہ کیا جاسکتا ہے کیوں کہ جیسا کہ بتایا جا چکا ہے کہ یہ قرآن اور سنت ہیں جو اسلامی قانون کی تدوین کے لیے ماخذ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ شریعت کا سرچشمہ اللہ کی ذات ہے اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اس میں ایک واسطے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ صدر اسلام کے مسلم معاشرے میں آپؐ کو رہنما اور حج کی حیثیت سے جو مقام حاصل تھا وہ قوانین کی تشکیل کے سلسلے میں سنت رسول کی حیثیت اختیار کر گیا۔ وہ اس معاملے میں بھی مثالی نمونہ اور رہبر قرار پائے۔ جب بعض مسلمان اس حقیقت کو فراموش کر گئے تو بخاری نے (حضرت عائشہؓ سے روایت بیان کی): ”حضورؐ نے کوئی کام کیا اور دوسروں کے لیے اس کو جائز قرار دیا، لیکن کچھ لوگ ہیں کہ اب تک اس کام سے احتراز کرتے ہیں۔۔۔۔۔ آپؐ نے فرمایا ”ان لوگوں کو کیا ہو گیا ہے جو ایسے کام سے اجتناب کرتے ہیں جسے میں نے کیا؟ خدا کی قسم میں خدا کو ان سے زیادہ جانتا ہوں اور میں ان سے زیادہ خدا کو ناراض کرنے سے ڈرتا ہوں۔“

ایک اور جگہ آپؐ نے فرمایا:

”جو کوئی میری سنت سے انحراف کرتا ہے وہ میرا کوئی نہیں۔“

جب ہم فقہ پر نظر ڈالتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ عبادت اور معاملات دونوں میں ائمہ فقہاء سنت کی اہمیت پر زور دیتے ہیں۔ ابن حنبل جب وضو کا بیان کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ وضو نیت کے بعد ہی جائز ہو سکتا ہے تو اپنے بیان کی تائید میں یہ حدیث پیش کرتے ہیں کہ: تمام اعمال کا انحصار نیت پر ہے۔ ہر شخص کو وہی ملے گا جس کی اس نے نیت کی ہو۔

اس طرح صلوٰۃ کے بیان میں ابن قدامہ کتاب العمرة میں عبادہ بن صامت سے یہ

حدیث بیان کرتے ہیں: ”پانچ وقت کی نمازیں ہیں جن کو خدا نے دن اور رات میں اپنے بندوں کو

حضور اکرم کا عطا کردہ نظام تعلیم و تربیت

جناب محترم محمد صلاح الدین

ہمسامی معاشرے نے بلا امتیاز مذہب و عقیدہ علم کی اہمیت و فضیلت کو تسلیم کیا ہے اور دنیا میں عز و وقار اور ترقی و خوشحالی کی زندگی بسر کرنے کے لیے فروغِ علم کی ضرورت محسوس کی ہے ہر تمدن اور مذہب معاشرے نے اپنے مخصوص افکار و نظریات اور مقاصد زندگی کے مطابق کوئی نہ کوئی نظام تعلیم و تربیت بھی وضع کیا ہے اور پھر اسی نظام تعلیم کے اثرات و نتائج کی بنیاد پر اس نے دنیا میں اپنا مقام حاصل کیا ہے۔

کسی نظام تعلیم کے مزاج و کردار اور اس کے ثمرات کا انحصار اس نصب العین پر ہے جس کے حصول کے لیے اس کی صورت گری اور منصوبہ بندی کی گئی ہے۔ مقصد اگر عیش و عشرت کی زندگی ہے تو نظام تعلیم کا پورا زور اسبابِ عیش کی تیاری و فراوانی نت نئے سامانِ نشاط کی ایجاد اس کے حصول کے لیے ہر نوعیت کی جدوجہد، کمزوریوں پر دست درازی، مزاحم قوتوں سے لڑنے کے لیے اسلحہ بندی، اپنے غلبے اور تسلط کے لیے جارحانہ اقدامات اور افرادِ معاشرہ میں مادہ پرستانہ رجحانات کی آبیاری پہ ہوگا۔ اور زندگی کا اخلاقی اور روحانی پہلو یا تو قطعی نظر انداز کر دیا جائے گا، یا اسے ثانوی حیثیت دی جائے گی۔ اس طرح اگر مقصدِ حیات محض رُوح کی بالیدگی اور ترکِ دنیا ہوگا، تو پھر نظام تعلیم بودھ بھکشو اور عینی راہب تیار کرے گا۔ اور اس کی تیار کردہ کھینچ دُنیا کے معاملات چلانے کی اہلیت سے عاری ہوگی۔

اس سلسلے میں جب ہم اسلامی نظام تعلیم و تربیت کا جائزہ لیتے ہیں اور اس کا موازنہ دوسرے نظام ہائے تعلیم سے کرتے ہیں تو پہلی چیز جو سب سے نمایاں اور ممتاز و منفرد ہے وہ اسلام کا مخصوص تصورِ علم ہے اور پھر حصولِ علم کی ضرورت و اہمیت پر جس قدر زور قرآن کریم اور احادیثِ نبوی میں ملتا ہے اس کی بھی کوئی نظیر دُنیا کے کسی فلسفہ تعلیم میں نہیں ملتی۔

علم کے بارے میں ایک عام تصور یہ ہے کہ انسان نے اس کرۂ ارض پر اپنی زندگی کا آغاز جہل کی تاریکیوں سے کیا تھا۔ اور پھر رفتہ رفتہ وہ اپنے تجربے، مشاہدے اور مطالعہ کے ذریعہ سے علم کی طرف

پیش رفت کرتا گیا۔ یہ بات مادی مسائل کی تحقیق، ان کی صفات کے تعارف، طبعی قوانین کی دریافت اور ان کے سہارے نئی ایجادات کی مدد تک تو درست ہے لیکن خود انسان کے مابعد الطبیعیات مسائل کے سلسلے میں قرآن اس تصور علم کو جہل قرار دیتا ہے۔ انسان کا اور اس کائنات کا خالق کون ہے، انسان کی تخلیق کا مقصد کیا ہے۔ وہ اس دنیا میں کیوں بھیجا گیا ہے، اُسے یہاں کیا کام انجام دینا ہے، اور پھر یہاں سے اپنی متعین عمر پوری کر لینے کے بعد کہاں جانا ہے، وہاں اس کے ساتھ کیا معاملہ پیش آتا ہے اور احتساب کے بعد جزا و سزا کی منزلوں سے گزر کر اُس کا آخری ٹھکانا کہاں بنتا ہے۔ یہ ایسے سوالات ہیں جن کا واضح ترین جواب اس دنیا میں آنے والے اولین انسان کو بخوبی معلوم تھا۔ اس نے جہل کے اندھیرے میں نہیں علم کی روشنی میں اپنی زندگی کا آخری سفر کیا تھا اور اس علم ہی کی بنا پر وہ فرشتوں سے بلند مقام پر فائز ہوا اور اشرف المخلوقات قرار پایا تھا۔

انسان کے خالق و مالک نے جس طرح اس کی طبعی زندگی کے لیے ہوا، پانی، نور، گرمی اور دوسرے بے شمار اسباب مہیا کئے تھے، اسی طرح اسے معاشرتی زندگی بسر کرنے کے لیے ایک ضابطہ حیات بھی آغاز زندگی کے ساتھ ہی عطا کر دیا تھا۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

وَعَلَّمَ آدَمَ الْأَسْمَاءَ كُلَّهَا (البقرہ - ۳۱) اور اللہ نے آدم کو ساری چیزوں کے نام سکھائے یہاں لفظ کُلُّهَا پر غور کیجیے۔ یہ علم ادھورا اور ناقص نہیں، کامل تھا۔ نام سکھانے کا مطلب یہ نہیں کہ محض اشیا کو گنوا دیا ہو، بلکہ ان کے آثار و خواص، نافع اور مضر پہلو، ان کے استعمال کے طریقے اور ان کے ساتھ انسان کے تعلق کی نوعیت کو پوری طرح واضح کر دیا گیا۔ اسی بنیادی علم اور تحقیق و تجسس کی جبلت کے سہارے انسان علم الاشیا کا دائرہ وسیع کرتا گیا اور ارتقا کا یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے۔

قرآن کے پیش کردہ تصور علم کے مطابق علم کا سرچشمہ اللہ کی ذات ہے، جو اس عقل اور تجربہ پر ذرائع علم ہیں منع علم نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے زندگی کی بڑھی ہوئی پیچیدگیوں اور ضرورتوں کے مطابق انسان کی تعلیم و تربیت کے لئے نزولِ کتاب اور بعثتِ انبیاء کے سلسلے کا اہتمام کیا اور انسانیت جب لغولیت اور بلوغت کے مراحل طے کرتی ہوئی پختگی و شعور و ادراک کی سطح پر پہنچی تو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ختم نبوت یعنی تکمیلِ تعلیم و تربیت کا اعلان کر کے سلسلہ وحی بند کر دیا گیا اور قیامت تک کے لیے اس آخری معلم اور اس کی تعلیم کو سرچشمہ ہدایت و رہنمائی قرار دیدیا گیا۔

اسلام میں علم کی اہمیت کا اندازہ اس حقیقت سے کیجیے کہ اولین انسان اور سلسلہ نبوت کے بانی حضرت آدم کی تخلیق اور ان کی فصیلت و خلقت کا ذکر علم کے ساتھ ہوا۔ اور سلسلہ نبوت

کے مختتم حضرت محمد پر آولیں وحی نازل ہوئی تو وہ بھی علم اور قلم ہی سے متعلق تھی۔ سورہ علق میں یہ
ارشاد ہوا:

پڑھو (تو) اللہ نے اپنے رب کے نام کے ساتھ، جس نے پیدا کیا، جسے ہوئے خون کے ایک ٹوٹے
سے انسان کی تخلیق کی، پڑھو، اور تمہارا رب بڑا کریم ہے جس نے قلم کے ذریعہ سے علم
سکھایا۔ اور انسان کو وہ علم دیا جسے وہ جانتا نہ تھا۔ (ترجمہ آیت اتا ۵)

یہ درحقیقت پڑھنے کا حکم نہ تھا بلکہ منبع علم کی جانب سے ایک امی لقب کو معلم انسانیت
بنانے کے لیے براہ راست اس کی تعلیم کا آقانہ تھا۔ اس نے اب تک قلم کو ذریعہ علم بنایا تھا۔ اب
وہ واسطہ قلم کے بغیر علم پہنچا رہا تھا اور ایسا کامل علم جو اس سے قبل انسان کو کبھی میسر نہ آسکا تھا۔
اس علم کی ایک اور نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ یہ اول روز سے بے مقصد اور کسی سمت و منزل کے شعور سے عاری
نہ تھا۔ اس کا مقصد انسان کو خلافت کے اس عظیم منصب کی ذمہ داریوں کا اہل بنانا تھا جس پر اسے فائز
کیا گیا تھا۔ انسان جس عظیم و کبیرہستی کی نیابت پر مامور کیا گیا تھا اس کی صفات کا ایک ادنا سا مشابہ
اس کے کردار و اعمال میں جھلکنا ضروری تھا۔ اسے العظیم سے محض علم ہی کی روشنی درکار نہ تھی صفت رحمت
عدل، احسان، عفو و درگزر، علم، صداقت، سخاوت، تخلیق، حکمت، تدبیر اور دوسری صفات کا پرتو
بھی مطلوب تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے انبیاء اور بالخصوص نبی آخر الزمان حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے
سے انسان کی تعلیم و تربیت کا جو اہتمام فرمایا اس میں سیرت و کردار کو انہی صفات سے ہمکنار کیا گیا۔ اور
اس طرح انسان کو اعلیٰ ترین اخلاقی وجود بننا گیا۔

اس نظام تعلیم کی روح اور اس کے مزاج و کردار کو ٹھیک ٹھیک سمجھنے کی کوشش کی جائے تو اس کا مقصد
اس دنیا میں عدل و انصاف پر مبنی انسانی معاشرے کا قیام، اس مقصد کی تکمیل کے لیے اعلیٰ ترین انسانی
کردار کی تشکیل اور اس تشکیلی کردار کے لیے اعلیٰ ترین اخلاقی اقدار پر مبنی نظام تعلیم و تربیت کا اہتمام
ہے۔ اب دیکھیے قرآن کریم میں اس کی وضاحت کس طرح ہوتی ہے۔

سورہ الحديد میں ارشاد ہوتا ہے:

ہم نے اپنے رسولوں کو صاف صاف نشانیوں اور ہدایات کے ساتھ بھیجا اور ان کے
ساتھ کتاب اور میزان نازل کی تاکہ لوگ انصاف پر قائم ہوں۔ (الحیدر - ۲۵)

گویا تمام معجزات، نشانیوں، ہدایات، کتابوں اور میزان خیر و شر کے نزول اور انبیاء کی بعثت
کا اصل مقصد اس دنیا میں انسانی معاشرے کو عدل کی بنیاد پر استوار کرنا ہے۔ یہی بات دوسرے لفظوں
میں یوں بیان کی گئی ہے:

یہ وہ لوگ ہیں جنہیں اگر ہم زمین میں اقتدار بخشیں تو وہ نماز قائم کریں گے اور زکوٰۃ دیں گے اور نیکی کا حکم دیں گے اور بدی سے روکیں گے۔ (الحج - ۴۱)

ایک اور جگہ یہی بات یوں فرمائی گئی :

”تم وہ بہترین امت ہو جسے لوگوں کی اصلاح و ہدایت کے لیے نکالا گیا ہے، تم نیکی کا حکم

دیتے ہو، بدی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔“ (آل عمران - ۱۱۰)

معروف کو پھیلانا اور منکر کو مٹانا درحقیقت ایک عادلانہ معاشرے ہی کے قیام کی ضرورت ہے۔ اس کام کے لئے جس معیار کا کردار مطلوب ہے اس کی تعمیر و تشکیل کا کام انبیاء کو سونپا گیا اور اور انہیں اس مطلوبہ معیار کا بہترین نمونہ بنایا گیا۔ ہر نبی درحقیقت معلم انسانیت تھا۔ خود حضور اکرم اپنے بارے میں ارشاد فرماتے ہیں :

انما بعثت معلما یعنی میں معلم بنا کر بھیجا گیا ہوں۔

حضرت ابراہیم اور ان کے صاحبزادے حضرت اسماعیل نے تعمیر کعبہ کے وقت دعا کی تھی کہ آے رب! ان لوگوں میں خود ان ہی کی قوم سے ایک رسول اٹھا جو انہیں تیری آیات سنائے، ان کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دے اور ان کا تزکیہ کرے۔ تو بڑا مقدر اور حکیم ہے۔ (البقرہ ۱۲۹)

اللہ تعالیٰ نے یہ دعا قبول فرمائی اور اسی سورہ میں آگے چل کر فرمایا :

”تم نے تمہارے درمیان خود تم میں سے ایک رسول بھیجا جو تمہیں ہماری آیات سناتا ہے تمہارا تزکیہ کرتا ہے اور تمہیں کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے اور تمہیں وہ باتیں سکھاتا ہے

جو تم نہیں جانتے تھے۔“ (البقرہ - ۱۵۱)

اب تخلیق آدم، تعلیم آدم، منصبِ خلافت، مقصدِ خلافت، نزولِ کتاب، بعثتِ انبیاء اور کارِ نبوت کا یہ پورا سلسلہ ذہن میں رکھ کر اسلام کے نظامِ تعلیم و تربیت کے ڈھانچے اور

اس کی روح کا جائزہ لیا جائے تو اس کا سب ذیل خاکہ ذہن میں ابھرتا ہے۔

۱۔ اسلامی نظامِ تعلیم و تربیت کسی فلسفی یا ماہرِ تعلیم کی ذہنی کاوش کا نتیجہ نہیں ہے۔ بلکہ یہ براہِ راست اللہ تعالیٰ کا عطا کردہ ہے۔ اس نے اپنے بندوں کی تعلیم و تربیت کے لیے کتابوں کی صورت میں نصابِ تعلیم مہیا کیا، انبیاء کی صورت میں معلمین بھیجے اور ان کے ذریعے خلافت کی ذمہ داریوں کو پورا کرنے کے لئے انسان کو ہدایت و رہنمائی مہیا کی۔

۲۔ حضور اکرم کے ذریعے سے ہمیں جو نظامِ تعلیم دیا گیا وہ اللہ تعالیٰ ہی کے نظامِ تعلیم و تربیت

کا ایک پر تو ہے۔ سورہ بقرہ کی مندرجہ بالا آیت میں حضور کے کام کی جو تفصیل بیان کی گئی ہے اس سے اسلامی نظام تعلیم کے چارہ بنیادی عناصر ترکیبی واضح ہوتے ہیں :

(ا) اللہ کی آیات سنانا یعنی قرآن کی تعلیم اس طرح دینا کہ اس کا متن پوری صحت کے ساتھ اس کے بندوں تک پہنچ جائے۔

(ب) تزکیہ نفس یعنی اعلیٰ ترین اخلاقی تربیت جس کے ذریعے نفس انسانی خیر کی طرف مائل اور شر سے متنفر ہو، نیکیوں کا صدور آسان اور برائیوں کا ارتکاب مشکل ہو جائے۔ اور انسانی سیرت امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا ایک جیتا جاگتا نمونہ بن جائے۔

(ج) کتاب کی تعلیم جو اس کا متن پہنچا دینے کے بعد ایک اضافی ذمہ داری ہے اس کے تحت قرآن کے منشا، مفہوم اور مطالب کو اس طرح کھول کر بیان کرنا اور عملی صورت میں ڈھال کر دکھانے سے کہ کوئی بھی الجھن باقی نہ رہے۔

(د) حکمت کی تعلیم یعنی اللہ تعالیٰ نے عقل و شعور اور فہم و ادراک کی جو عظیم قوتیں انسانی ذہن کو عطا کی ہیں انہیں صیقل کرنا، اور جو جسمانی توانائیاں اور مادی وسائل انسان کو بخشے ہیں ان کے بہترین استعمال کی استعداد پیدا کرنا، گویا اعلیٰ ترین علم کے ساتھ انسان کو حسن عمل اور حسن تدبیر کی صلاحیتوں سے بہرہ ور کرنا۔

(۴) ایسی باتوں کی تعلیم جو پہلے سے علم میں نہ ہوں یعنی عمل میں مسلسل اضافہ، تحقیق و انکشافات کے میدان میں مسلسل پیش رفت اور جمود کی جگہ پیہم تحریک۔

۳۔ حضور اکرم نے اپنی امت کے علما کو وارث انبیاء قرار دیا ہے، گویا اب علماء صرف نبی و آخر الزمان کے چھوڑے ہوئے ورثہ ہی کے امین نہیں بلکہ حضرت آدم سے لے کر حضرت محمد تک تمام انبیاء کرام نے انسان کی تعلیم و تربیت کے لئے مجموعی طور پر جو کچھ کیا ہے اس کے ثمرات کی حفاظت کرنا اور اس سلسلہ تعلیم و تربیت کو جاری رکھنا ان کی ذمہ داری ہے۔

اسلامی نظام تعلیم کے اس پورے پس منظر کو ذہن میں رکھا جائے تو ان آیات اور احادیث کی اہمیت پوری طرح واضح ہو جاتی ہے جن میں حصول علم پر غیر معمولی زور دیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے علم کو روشنی اور حیل کو تارہ کی قرار دیا ہے۔ سورہ بقرہ میں ارشاد ہوا :

جو لوگ ایمان لاتے ہیں ان کا حامی و مددگار اللہ ہے اور وہ ان کو تارہ کیوں سے نکال کر روشنی میں لاتا ہے۔ اور جو لوگ کفر کی راہ اختیار کرتے ہیں ان کے حامی و مددگار طاغوت ہیں اور وہ انہیں روشنی سے تارہ کیوں کی طرف کھینچ لے جاتے

اللہ تعالیٰ نے خود اپنی کتاب کو نور قرار دیا۔ اس نور کے بغیر اللہ تعالیٰ کی سرزمین پر خلیفۃ اللہ نے منصب کے تقاضے پورے نہیں کر سکتا اسی لئے ہر مسلمان مرد اور عورت کے لیے علم حاصل کرنا لازمی قرار دیا گیا۔ حضور اکرمؐ نے طلب علم کے لیے سفر کو عبادت، اس راہ میں موت کو شہادت، علمی تحقیق میں بحث و کلام کو جہاد، پڑھنے کو صدقہ، یاد کرنے کو تبییح، علم کو جنت کے راستوں کا نشان، دل کی روشنی، آنکھوں کا نور، تقرب الہی کا ذریعہ، مومن کا سچا دوست، مومن کی گمشدہ میراث اور بزرگی اور فضیلت کی علامت قرار دیا، مدرسے لحد تک علم حاصل کرنے پر زور دیا اور اس مقصد کے لیے چین جیسے دور دراز ملک تک کا سفر بھی اختیار کرنا پڑے تو وہاں جانے کی تلقین فرمائی۔

اب یہ دیکھیے کہ حضور اکرمؐ نے اپنے عہد مسعود میں مسجد نبوی کے بلند چبوتے پہ جو پہلا باقاعدہ مدرسہ قائم کیا اس کی خصوصیات کیا تھیں۔ خلافت راشدہ میں اسی نمونے کی بنیاد پر لوگ عرب اور مفتوحہ علاقوں میں جو نظام رائج کیا گیا اس کے خود و خال کیا تھے۔

۱۔ صفحہ کا مدرسہ اسلام کی پہلی اقامتی درسگاہ تھی اور اس کا خود مسجد نبوی کی حدود میں واقع ہونا یہ مفہوم رکھتا تھا کہ اسلام کے نظام تعلیم و تربیت میں مسجد اور مدرسہ دو جداگانہ ادارے نہیں بلکہ دونوں مل کر ایک مربوط ادارہ بنتے ہیں جو علم و عمل کی وحدت و یکجائی کا منظر ہے۔ ہمارے دینی مدارس آج بھی اسی روایت پر قائم ہیں۔ ہر دینی مدرسہ کی حدود میں ایک مسجد یا پر مسجد کے احاطہ میں ایک مدرسہ کی موجودگی مسجد نبوی اور صفحہ پر قائم مدرسہ نبوی کے باہمی رشتے کی روایت کا تسلسل ہے۔

۲۔ اس مدرسہ کی دوسری خصوصیت معلم اور متعلم کے درمیان ہم گھنٹے کی رفاقت تھی شاگردوں کو زندگی کے اعلیٰ اصول سکھائے جاتے تھے۔ جن اخلاقی اقدار کی تعلیم دی جاتی تھی اور سیرت و کردار کے جس سانچے میں ڈھلنے کی تلقین کی جاتی تھی ان کا عملی نمونہ ہر وقت ان کی نگاہوں کے سامنے تھا۔ معلم اعظم کی زندگی کا کوئی پہلو ان کی نگاہوں سے پوشیدہ نہ تھا۔ اوراقِ قرآن کی طرح اس کی زندگی بھی کھلی کتاب کی صورت ان کے سامنے تھی۔ اس کی نجی اور اجتماعی زندگی کے درمیان دبیز پردے حائل نہ تھے۔ وہ قرآن میں جو کچھ پڑھتے اسے اسوۂ حسنہ کی صورت میں رو بہ عمل پاتے۔ کتاب کے مجرد اصول انہیں معلم کتاب کی اپنی زندگی میں ایسی کٹوس، واضح اور موثر صورت میں نظر آتے کہ الفاظ اور معنی کے درمیان کوئی فاصلہ باقی نہ رہتا۔ قرآن اور معلم قرآن کے اسی تعلق کی وضاحت کرتے ہوئے ام المومنین

حضرت عائشہ صدیقہؓ نے فرمایا تھا کہ قرآن کی بہترین تفسیر حضور اکرمؐ کی سیرت مطہرہ ہے۔
 ۳۔ صفحہ کے مدرسے کی ایک اور نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ اس نے ہوا اور پانی کی طرح علم کو
 بھی نہ صرف بنیادی ضروریات میں شامل کیا بلکہ انہی کی طرح بلا قیمت سہل الحصول بنا دیا۔ مسجد
 کی طرح مدرسہ میں بھی کامل مساوات قائم کی علم پر کسی مخصوص گروہ یا طبقے کا اجارہ نہ رہا۔ اس
 مدرسے کے قیام سے قبل عرب میں علم عام نہ تھا، چند اونچے گھرانوں کی میراث تھا۔ نادار لوگ
 اور غلام تو اس کا تصور تک نہ کر سکتے تھے، لیکن مسجد نبویؐ میں صفحہ کا چشمہ علم جاری ہوا تو
 اس سے فیضیاب ہونے والوں میں نادار، بے سہارا اور غلام طبقے سے تعلق رکھنے والے افراد
 ہی پیش پیش تھے۔ اصحاب صفحہ جن کی تعداد ۶۰، ۷۰ کے قریب تھی معاشی طور پر سب سے
 پسماندہ لوگ تھے لیکن علم کے معاملے میں وہ بڑوں بڑوں کو پیچھے چھوڑ گئے اور ان کے ذریعے
 علم عربیہ کی میراث بن گیا۔ اس غیر طبقاتی نظام کی بدولت مورخین، فقہاء، ریاضی دان،
 سائنسدان، حکماء اور دیگر علوم کے ماہرین پسماندہ اور متوسط طبقے سے ابھرے اور آسمان
 علم پر آفتاب و ماہتاب بن کر چمکے۔ اسلام نے علم اور اس کے مقصود عدل کا رشتہ مال، عمدے
 منصب اور ہر دوسرے امتیاز سے یکسر منقطع کر دیا اور ان کی بلا قیمت فراہمی یقینی بنا کر محدود
 آیانہ کو ایک صف میں لا کھرا کیا۔

۴۔ صفحہ کے مدرسے نے ایک اور شاندار روایت یہ قائم کی کہ علم حاصل کرنے والوں کو نہ صرف
 ہر قسم کے مالی بارے سے نجات دلائی بلکہ خود ریاست اور خوشحال افراد معاشرہ کے اجتماعی وسائل
 سے کفالت کا ایسا انتظام کیا کہ غربت کسی صورت میں بھی حصول علم کی راہ میں مانع نہ ہو۔ مدرسہ
 غریبوں کی پناہ گاہ اور معاشرے میں انھیں باعزت مقام دلانے کا ذریعہ بنا۔ صفحہ کے ناظم مایات
 حضرت معاذ بن جبلؓ تھے جو عطیات کے ذریعے سے اس کے مصارف پورے کرتے اور خود حضور اکرمؐ
 اس کی کفالت پر خصوصی توجہ فرماتے۔ صفحہ کے علاوہ ایک اور اقامتی درسگاہ دارالقرآن تھی۔
 عند نبویؐ میں ان دو اقامتی درسگاہوں کے ساتھ ہی مدینہ متوزہ میں ۹ مساجد اور تھیں
 جو درسگاہوں کا کام دیتی تھیں۔ اس پر دوس کے بچے یہاں تعلیم حاصل کرتے آتے، ان تمام
 مساجد اور درسگاہوں کی نگرانی حضورؐ خود فرماتے۔ آپؐ ہی اساتذہ کا تقرر کرتے۔ مسجد نبویؐ
 میں آپؐ صدر معلم کے فرائض انجام دیتے۔ آپؐ کی نگرانی میں متعدد کبار صحابہؓ وہاں درس و
 تدریس کی ذمہ داری سنبھالے ہوئے تھے۔ مفت، مساوی اور یکساں نصاب کے تحت تعلیم کی
 یہ روایت اسلامی نظام تعلیم و تربیت کا ایک لازمی حصہ بن گئی۔ خلافت عثمانیہ اور سنیہ صغیرہ

میں مغلیہ عہد حکومت تک پوری مسلم دنیا میں کہیں تعلیم کی فیس نہ تھی اور عدالین بھی انصاف کے لئے کسی کورٹ فیس وغیرہ کے تصور سے بالکل نا آشنا تھیں۔ مفت اور کھالٹی تعلیم کی وہ روایت جو صفہ سے شروع ہوئی آج بھی ہمارے دینی مدارس میں جاری ہے۔ مدرسہ قائم کرنا اور معلم و متعلم دونوں کو مالی وسائل سے بے نیاز کر دینا مسلم معاشرہ کا ایک عام مزاج بن گیا تھا۔ اس کا یہ خیر میں بادشاہ، امراء، رؤسا ہی نہیں مسلمان مزدور تک حسب حیثیت حصہ لیتے اور اسے عبادت سمجھتے تھے۔ کسان اپنی پیداوار کا ایک حصہ مدرسہ کے لئے وقف کرتا، جو لانا اس کے لیے کپڑے کا ایک تھان فراہم کرتا۔ تیلی اس کے چراغوں کے لیے تیل مہیا کرتا، بڑھی رطل اور الماریاں بنا کر دیتے، چٹائی بننے والے چٹائی لاکر دیتے، راج مزدور فالٹو وقت میں اس کی تعمیر اور رنگ و روغن کا کام مفت انجام دیتے اور مسلمانوں کا ہر گھرانا طلبہ کے لیے اپنے کھانے کا ایک حصہ مزدور وقف کرتا۔ غرض معاشرے کا کوئی فرد ایسا نہ تھا جو عطیات، صدقات، ہدیہ، فطرے اور دوسری صورتوں میں مدارس کی خدمت کو ایک نیکی اور سعادت سمجھ کر انجام نہ دیتا ہو۔ خلافت راشدہ میں جب بیت المال کی آمدنی بڑھی تو ضروری مصارف میں زیر تعلیم طلبہ کا حق سب پر مقدم رکھا گیا۔ اس نظام کے تحت بچوں اور بڑوں کی تعلیم ان کے سرپرستوں کی ذمہ داری نہ رہی بلکہ ریاست اور افراد معاشرہ کی اجتماعی ذمہ داری بن گئی۔

۵۔ کفالت عامہ کے تحت کام کرنے والے نظام تعلیم کو حریتِ فکر، آزادانہ علمی تحقیق اور بے خوف و خطر اظہارِ رائے کی روح بھی میسر آگئی۔ استاد کسی کا ملازم نہ تھا سب اس کے خادم تھے، شاگرد کسی کے وظیفہ خواہ نہ تھے ایک اجتماعی فنڈ سے اپنا حق حاصل کرتے تھے۔ مدرسہ عوام کی عقیدت و محبت اور ان کی قیادت و رہنمائی کا مرکز تھا۔ دربارہ کی مجال نہ تھی کہ اپنی مدرسہ پر اپنا تسلط قائم کرتا۔ ان پر کسی کو بالادستی حاصل تھی تو وہ صرف مدرسہ تھا جو دلوں پر راج کرتا۔ علماء بادشاہوں سے زیادہ قابل احترام تھے۔ ان پر کبھی وہ بارہ کی دست درازی ہوتی تو لوہا معاشرہ ان کی پشت پر ہوتا۔ علماء کی جرأتِ کردار، حریتِ فکر اور حق گوئی و ہبیائی کی داستانوں سے ہمارے تاریخ بھری پڑی ہے۔ یہ صفات درحقیقت اس خود کفیل نظامِ تعلیم کا جوہر تھیں جس میں مدرسہ اپنے وجود کے لیے دربارہ کی سرپرستی کا محتاج نہ تھا۔

۶۔ اس نظامِ تعلیم کا ایک اور بنیادی وصف یہ تھا کہ اس کو اعلیٰ ترین اخلاقی بنیادوں پر استوار کیا گیا تھا۔ حضور اکرمؐ نے اپنی بعثت کا مقصد ہی یہ بتایا تھا کہ:

میں صرف اخلاق کی تکمیل کے لیے بھیجا گیا ہوں۔ (موطا - امام مالک)

ایک اور جگہ ارشاد ہوا:

میں تو اسی لیے بھیجا گیا ہوں کہ مکارم اخلاق کی تکمیل کروں (مسند احمد - بیہقی، ابن سعد)۔
آپ کے قائم کردہ نظام تعلیم و تربیت کی روح اخلاقِ حسنہ تھی۔ اس نظام نے سیرت و کردار کے اعتبار سے جیسی پاکیزہ اور بلند و بالا ہستیاں اپنی آغوشِ تربیت میں ڈھالیں ان کا مشاہدہ انسانی تاریخ نے پہلے کبھی نہ کیا تھا۔ اسلام نے اسی نظامِ تعلیم و تربیت کے ذریعے نصف صدی کے اندر اندر ایسا عظیم اخلاقی انقلاب برپا کیا کہ دنیا جنت کا نمونہ بن گئی۔ عدل، احسان، اخوت، مساوات، ایثار، ہمدردی، غمگساری، تعاون، اعتماد، سچائی اور نیکی کی ایک ایسی عمومی فضا نصف کرہ ارض پر چھا گئی جس میں انسان کو پہلی بار حقیقی امن، سکون اور اطمینان کی لذت نصیب ہوئی۔

۷۔ اسلامی نظامِ تعلیم کو صرف مساجد اور مدارس تک محدود نہ رکھا گیا بلکہ اس کا دائرہ خاندان، معاشرے اور اس کے ہر ادارے تک وسیع کیا گیا۔ مدرسے اور معاشرے کے درمیان تضادات اور منافقت کی کوئی گنجائش نہ چھوڑی گئی، جو کچھ مدرسے میں پڑھایا جاتا، پورا معاشرہ اس کی عملی تصویر پیش کرتا۔ جو چیز مدرسے میں معروف کے طور پر پڑھائی جاتی وہی معاشرے میں معروف نظر آتی اور جن چیزوں کی نشاندہی بطور نکرہ کرائی جاتی وہ گھر سے لے کر ایوانِ حکومت تک نکرہ ہی کی صورت میں قابلِ نفرت پائی جاتی۔ گویا مدرسہ ایک مکمل معاشرے کا چھوٹا سا نمونہ اور اس کا حقیقی آئینہ دار تھا۔

۸۔ حضور اکرم کے عطا کردہ نظامِ تعلیم نے علم کو ایک وحدت قرار دیا اور اسے گرد ہی، لسانی، نسلی اور قومی تعصبات سے پاک کیا۔ اس اندازہ فکر نے دنیا بھر کے علوم کے دروازے مسلمانوں پر کھول دیئے۔ انھوں نے یونانی، رومی، فارسی، فرانسیسی، اسپینی اور افریقی زبانیں سیکھیں، ان کے علوم کو عربی زبان میں منتقل کیا اور خود ان زبانوں کو اپنے علوم کے ترازوں سے مالا مال کیا۔ اس نظامِ تعلیم میں دینی اور دنیوی علوم کی کوئی حد بندی نہ تھی۔ تمام مروجہ علوم جن میں ادب، فلسفہ، منطق، تاریخ، جغرافیہ، ریاضی، فلکیات، طب، کیمیا، طبیعیات، فن سپہ گری اور دوسرے علوم شامل تھے، اسلامی نظامِ تعلیم کا حصہ بنے اور خود مسلمانوں نے سینکڑوں نئے علوم کی داغ بیل ڈالی۔ اس نظامِ تعلیم نے مسلمانوں کو دنیا میں بھی عزت و عظمت و وقار و افتخار اور قوت و شوکت عطا کی اور انھیں آخرت میں

اپنے رب کے حضور سرخروئی کے قابل بھی بنایا، اس نے امت کے کسی خاص طبقے اور گروہ کو نہیں پوری امت کو بحیثیت مجموعی اوپر اٹھایا اور علوم و فنون کو سب سے دیا کی طرح سب کے لیے قابل حصول بنا دیا۔

حضور اکرمؐ کے معجزات بے شمار ہیں لیکن میرے نزدیک ان کا سب سے بڑا معجزہ یہی ہے کہ امتی ہونے کے باوجود اُسٹھوں نے اس دنیا کو علوم کے خزانوں سے بھر دیا اور یہ علوم بھی محض فلسفیوں کے افکار و نظریات کی طرح نہ تھے کہ جن کا انسان کی سیرت سے کوئی تعلق نہ ہو۔ علم اور کردار کو اس طرح یکجا کیا گیا کہ یہ آپس میں مل کر ایک وحدت بن گئے۔ کردار کے بغیر اسلامی معاشرے میں علم کی کوئی وقعت نہ رہی اور علم کے بغیر کردار بقدر حسن عمل معتبر تو ٹھہرا مگر مقبول نہ بن سکا، قیادت و رہنمائی کا تاج صرف اسی کے سر پہ رکھا گیا جسے ابتداً خلافتی کردار اور علم کی قابل اعتماد مقدار نصیب ہوئی۔

یہ نظام نوآبادیاتی دور میں استعماری قوتوں کے ہاتھوں تباہ ہوا۔ مدرسے کی وحدت اور اس کی مساوات ختم ہوئی دین اور دنیا کی غلامی کے تصور نے مدرسے کو بھی دینی اور دنیوی بنیاد پر تقسیم کیا۔ پھر دنیوی بنیاد پر قائم ہونے والے مدارس بھی طبقات کی بناء پر تقسیم ہوئے۔ اہل متوسط طبقات اور غریبوں کے لئے الگ ذریعہ تعلیم، الگ نصاب اور الگ معیار کے مدارس قائم ہوئے اور یوں ملت کی وحدت کو پارہ پارہ کر دیا گیا۔ تعلیم کی اونچی اور نیچی جنس نے علم کو بلا حیت و اہلیت کے بجائے معاشی حیثیت سے منسلک کر دیا اور دیکھتے ہی دیکھتے ایک ہی قوم کے اندر اپنی تہذیب، ثقافت، زبان، اندازِ فکر، لباس، بود و باش، ذہنی رجحانات و میلانات، مقاصد زندگی اور اقدار و روایات کے لحاظ سے درجنوں طبقات وجود میں آگئے جن کی زندگی علاحدہ علاحدہ طبقات کے جزیروں میں بند ہو کر ایک دوسرے سے منقطع ہو گئی۔ باہمی تعاون کے بجائے ان کے درمیان مفادات کے تقادم کا سلسلہ اُبھر آیا۔ یوں پوری قوم متحد ہونے اور صبغۃ اللہ کے رنگ میں رنگنے کے بجائے تعلیم و تربیت کے جداگانہ اور رنگ برنگے نظام کی وجہ سے شدید انتشارِ فکر کا شکار ہو گئی۔ ایک گروہ اسے اپنے افکار کی سمت کھینچ کر لے جانا چاہتا ہے اور دوسرا اس کی مخالف سمت۔

یہ المناک صورت حال اس وقت تک ختم نہ ہوگی جب تک ہم پوری قوم کے لیے مفت اسکول اور کیمیاں نصاب و ذریعہ تعلیم پر مشتمل ایک غیر طبقاتی اور قومی نظام تعلیم وجود میں نہیں لاتے، طبقاتی مفادات کی زنجیروں کو توڑ کر پوری قوم کے بچوں کو کم از کم درس گاہ کی حدود میں مساوی

حیثیت کا نہیں بناتے۔ صفحہ کی روایت کے مطابق امیر اور عزیز کے بچوں کو ایک ہی چھت کے نیچے بنیاد بھاتے، ہمارا نظام تعلیم کبھی اسلامی نہیں بن سکتا۔

خدا کا نبی مکارم اخلاق کی تکمیل اور قیام عدل کے لئے دنیا میں بھیجا گیا تھا۔ اس نے مدرسے کی مساوات کے ذریعے سے پورے اسلامی معاشرے کو عدل کی بنیاد پر استوار کیا تھا۔ اب یہ بات اخلاق اور عدل دونوں کے منافی ہے کہ ہم امت کے نو نہالوں کو امیر اور عزیز کے گروہی طبقات میں تقسیم کر کے ان کی مائی حیثیت کے مطابق درس لگائیں قائم کریں۔ اور ان کے لیے حسب حیثیت علاحدہ علاحدہ نصاب اور سہولتیں مہیا کریں۔ تقسیم ملت کی یہ روایت غیر ملکی آقاؤں نے قائم کی تھی۔ ہم نے اس کی کافی سزا بھگتی ہے۔ انگریزوں کی آمد سے قبل برصغیر میں شرح خواندگی ۸۵ فیصد تھی آج پاکستان میں صرف دستخط کی اہلیت اور ناظرہ قرآن کی سطح تک علمیت رکھنے والوں کو شامل کر کے یہ شرح ۲۲ فیصد ہے۔ گویا نو آبادیاتی اور طبقاتی بنیادوں پر قائم نظام تعلیم نے جہل کی تارہ کی پھیلائی، علم کے دیئے بجھائے اور قوم کے ٹکڑے اڑائے۔

ہمدرد فاؤنڈیشن کے صدر محترم حکیم محمد سعید صاحب نے آواز اخلاق بلند کی ہے۔ خدا کرے یہ ہر پاکستانی کی آواز بن جائے۔ اسے اگر ہوا میں تحلیل ہو کر راڈگاں نہیں جانے دینا تو میری گزارش ہے کہ اخلاق کی اس آواز کو یکساں قومی نظام تعلیم کی تحریک کا ذریعہ بنائیے۔ مدرسہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی روایات پر قائم ہو گیا تو میں خدا کو گواہ بنا کر اس امر کی ضمانت دیتا ہوں کہ پورا معاشرہ عدل و مساوات کی بنیادوں پر استوار ہو کر رہے گا۔ اور اخلاق کا پرچم بلند ہوگا۔ خدا ہم سب کو اپنی اپنی قوت، صلاحیت اور وسائل کے مطابق اسلامی نظام تعلیم کے لیے جدوجہد کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین!

اخلاقی انحطاط کا حقیقی سبب

جناب محترم مولانا غلام مصطفیٰ تاسمی

حضرت امام ابو منین عاتقہ صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی مشہور حدیث کے مطابق نسبہ اربعہ صل اللہ

علیہ وآلہ وسلم کے اخلاقی حسن کی کامل کتاب قرآن مجید ہے۔ قرآن حکیم کی ایک مختصر نوردہ "واللہ اعلم" میں اس اخلاق کا ایک اجمالی خاکہ یوں پیش کیا گیا ہے۔

”انسانی تاریخ اس بات پر شاہد ہے کہ انسان ہمیشہ گھٹاٹے اور نقصان میں رہا ہے سوائے ان کے جو اللہ پر ایمان لائے، انہوں نے نیک کام کیے۔ ایک دوسرے کو نیک کام کی صلاح دی اور اس راہ میں جو مشکلات پیش آئیں انہیں برداشت کیا“

ایمان باللہ، اعمالِ صالحہ، تو اسی بالمحق اور تو اسی بالصبر۔ انسانی تاریخ اور اخلاق کی یہ چار صداقتیں ہیں جنہوں نے اس پر عمل کیا وہ فاتر و کامران ہوتے اور جنہوں نے ان سے بے پردائی برتی وہ ناکام و خاسر رہے۔ یہ بنیادی صداقتیں اتنی ہی قدیم ہیں جتنی خود انسانیت۔

اخلاقِ حسنہ جن سے تہذیبِ نفس ہوتی ہے اور انسانیت کا ایک مہذب اور صالح معاشرہ وجود میں آتا ہے، حضرت شاہ ولی اللہ صاحب نے ان کے چار اصول بتائے ہیں اور ان کے الفاظ میں ہر مہذب اور شریعت ان کو پورا کرنا اپنا فرض سمجھتی رہی ہے۔ ان اخلاق کی ہر مہذب میں اگرچہ صورتیں مختلف رہیں، لیکن روح سب کی ایک تھی۔ شاہ صاحب نے اپنی فارسی تالیف ”ہمعات“ میں فرماتے ہیں: (ترجمہ) فقیر پر یہ بات روشن کی گئی ہے کہ تہذیبِ نفس کے سلسلے میں جو چیز شریعت میں مطلوب ہے وہ چار خصلتیں ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انبیاء علیہم السلام کو انہی چار خصلتوں کے لیے بھیجا۔ تمام ملل حقہ میں انہی چار اخلاق کا ارشاد اور ان کے حاصل کرنے کی ترغیب موجود ہے۔ اور برتر یا نیکی انہی چار اخلاق اور خصلتوں کا نام ہے اور برتر کے بالمقابل اثم یا گناہ سے مراد وہ عقائد اعمال اور اخلاق ہیں جو انہی چار خصلتوں کی ضد ہیں۔

ان چار اخلاق میں سے ایک طہارت ہے۔ اس کی طرف میلان ہر سلیم الفطرت انسان کے اندر ودیعت رکھا گیا ہے اور طہارت صرف ظاہری صفائی کا نام نہیں ہے، لیکن شریعت نے جو اس کے اقسام بتائے ہیں ان پر صحیح طور پر عمل پیرا ہونے سے جو وجدانی کیفیت پیدا ہوتی ہے وہ طہارت کا حاصل ہے جس

کو اُس اور نُور سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔

دومِ اخبات یا خداوندِ قدّوس کے لیے انتہائی درجہ کی عجز و نیاز مندی ہے جس کی تفصیل میرے استاذِ مکرم علامہ عبید اللہ سندھی نے اس طرح فرمائی ہے کہ ایک سلیم الفطرت شخص جب طبعی اور خارجی تشویش سے فراغت کے بعد، اُس کے جلال اور اُس کی کبریائی میں غور کرتا ہے تو اُس پر ایک حیرت اور دہشت کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے، یہی حیرت اور دہشت خشوع، خضوع، اخبات یعنی نیاز مندی کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ اس میں تمام عبادات آجاتی ہیں۔

سوم سماحت اور فیاضی ہے۔ اس کا یہ مطلب ہے کہ نفس بُرے خصائل اور بُرے اخلاق سے مغلوب نہ ہو مثلاً طلبِ لذت، حبِ انتقام، حسد، غیبت، بخل اور حرص وغیرہ سے اپنے آپ کو بچائے رکھے اس میں عفتِ دِپاک (دامنی)، جدوجہد، صبر و عفو، سخاوت، قناعت اور تقویٰ تمام آجاتے ہیں۔ شکم اور قُرح کی خواہش قبول نہ کرنے کا نام عفت اور پاکِ دامنی ہے۔ آسائش اور ترکِ عمل کی خواہش قبول نہ کرنے کا نام جدوجہد ہے۔ جزع و فزع اور بے صبری کو روکنا صبر ہے۔ انتقام اور بدلہ لینے کی خواہش کو دبا نا عفو ہے۔ خواہش بخل کو چھوڑ دینے کا نام سخاوت ہے اور حرص و ہوا کو قبول نہ کرنے کا نام قناعت ہے۔ شریعت کی بتائی ہوئی حدوں سے تجاوز نہ کرنا تقویٰ ہے۔

چہارم عدالت ہے۔ سیاسی اور معاشرتی نظاموں کی رُوح رواں یہی خصلت اور خلق ہے۔ ادب، کفایت، حریت، سیاستِ مدنیہ اور حُسنِ معاشرت وغیرہ سب عدالت کی شاخیں ہیں۔ اپنی حرکات و سکنات پر نگاہ رکھنا، عمدہ اور بہتر وضع اختیار کرنا اور دل کو ہمیشہ اس طرف متوجہ رکھنا ادب ہے۔ جمع و خراج، خرید و فروخت اور تمام معاملات میں عقل و تدبیر سے کام لینا کفایت ہے۔ خانہ داری کے کاموں کو بہ خوبی انجام دینا حریت ہے اور شہروں اور لشکروں کا اچھا انتظام کرنا سیاستِ مدنیہ ہے۔ بھائیوں اور دوستوں میں نیک زندگی بسر کرنا، ہر ایک کے حق کو پہچاننا اور ان سے الفت و لاشائت سے پیش آنا حُسنِ معاشرت ہے۔

یہی چار اخلاق ہیں جن کی تکمیل سے انسانیت کو ترقی حاصل ہوتی ہے اور اُن کو چھوڑنے سے انسانِ قعرِ مذلت اور خواری میں گرتا ہے۔ شاہِ صاحبؒ کی نظر میں تمام انبیاءِ علیہم السلام ان چار اخلاق کی تعلیم کے لیے مبعوث ہوئے۔ یہ ایسے اصول ہیں کہ ان میں شریعت کے عقائد اور اعمال سب آجاتے ہیں۔ اور سورۃ العھر میں انسانیت کی کامیابی اور ترقی کے جو اعمال بتائے گئے ہیں حضرت شاہِ ولی اللہ صاحبؒ کی اخلاق اور خصائل انسانی کے سلسلے میں یہ تحقیق گویا اُن کے لیے تفسیر کی حیثیت رکھتی ہے۔

اخلاقِ حسنة کے محقر نہ کرنے کے بعد اب ہم اخلاقی انحطاط کے اسباب کی طرف آتے ہیں۔
ویسے تو اخلاقی انحطاط کے فلسفہ اخلاق میں کئی اسباب بتائے گئے ہیں، لیکن قرآنِ حکیم کی تعلیمات،

قصص الانبیاء کے مطالعہ اور حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کی کتب اور قیصر کے دور حکومت سے متعلق بتائی ہوئی تحقیق سے جس کی تفصیل ازالۃ الخفا اور حجۃ اللہ بالذم میں موجود ہے، یہ بات ملتی ہے کہ اخلاقی انحطاط کا حقیقی سبب انسانیت میں اجتماعی شرک کا رائج ہونا ہے۔ اور یہ بے جا سرمایہ داری اور رقابیت بالذم سے پیدا ہوتا ہے۔ اس لیے قرآن حکیم میں خاتم الانبیاء محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اعدا میں سے ابولہب کا نام لایا گیا اور ابو جہل کو چھوڑ دیا گیا، کیوں کہ ابولہب مکہ کا بڑا سرمایہ دار تھا، مال اور دولت کے نشے میں اس کی اخلاقی گراؤ کا یہ عالم تھا کہ وہ گھل کر آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو آزار پہنچانے کے درپے تھا۔ حضورؐ کے راستے میں کانٹے بچھائے جاتے تھے۔ چوں کہ وہ حضورؐ کا چچا تھا اور مکان بھی قریب تھا تو پڑوس کا خیال بھی چھوڑ کر غلاطت پھینکتا تھا۔ یہاں اہل مکہ کی بُری معاشرت اور بُری اقتصادی حالت کا ایک بُرا نمونہ دکھا کر اخلاقی انحطاط کی طرف اشارہ کیا اور اُس پر بددعا کی گئی۔ اس کا اصلی مطلب اصلاح ہے کہ اہل مکہ کی یہ حالت نہ رہے بلکہ اصلاح پذیر ہو کر یہ معاشرہ قرآن حکیم کی تعلیم پر آجائے۔

قرآن حکیم میں نوح علیہ السلام، لوط علیہ السلام اور شعیب علیہ السلام کا ذکر متعدد مقامات پر آیا ہے۔ حضرت شعیبؑ بھی حضرت نوح اور حضرت لوط علیہما السلام کی طرح دعوت دیتے تھے۔ حضرت لوط علیہ السلام کی قوم ایک معاشرتی مسئلہ نکاح میں زیادتی کرتی تھی اور شعیب علیہ السلام کی قوم بھی اسی طرح معاشرتی مسئلہ ماپ تول میں کمی کرتی تھی۔ قرآن کریم کی سورۃ ہود میں بتایا گیا ہے کہ حضرت شعیب علیہ السلام کی قوم کے افراد میں دو ناجائز خصلتیں پائی جاتی تھیں: ایک تو وہ خدا کے لیے شریک بناتے تھے اور دوسرے ماپ تول میں ظلم کرتے تھے۔ چوں کہ انہوں نے اپنے نبی کی دعوت کو رد کر دیا تھا، اس لیے انہیں برباد کر دیا گیا۔ کچھ اہل علم یہاں شرک کا ذکر دیکھ کر عذاب کا مدار صرف اسی بات پر رکھتے ہیں کہ وہ شرک کرنے کے باعث برباد کر دیے گئے، لیکن قرآن حکیم کے واضح الفاظ کی رُو سے اُن کی تباہی کے دونوں ہی اسباب ہیں۔

اس سلسلے میں تحقیق یہ ہے کہ دنیا میں دو قسم کے حکما ہوتے رہے ہیں: ایک وہ جو انبیاء کی تعلیم دیتے رہے، جنہیں حکمائے الہی کہا جاتا ہے۔ دوسرے اجتماعی حکما، ہیں یعنی فقہاء وغیرہم، اور یہ انسانی اجتماع کو چلانے والے ہوتے ہیں۔ اس اجتماع کا حقیقی چلانے والا اللہ تعالیٰ ہے اور اس میں دنیا کا کوئی بادشاہ، حاکم اور حکیم حقدار نہیں ہے۔ اجتماعی حکیم کی نظر میں جو شرک ہے اسی شرک کو قرآن حکیم میں جاہر جاہر ممنوع قرار دیا گیا ہے۔ قوم شعیب علیہ السلام کے متعلق قرآن مجید میں یہی بتایا گیا ہے کہ وہ اجتماعی شرک میں مبتلا تھے، جیسے ماپ تول میں کمی کیا کرتے تھے، اسی وجہ سے اُن کو برباد کیا گیا۔ عدل

الاسلام" میں اس کی بڑی داد دیتے ہیں۔ توحید کا شرک کفر ہے، دوسرا قانونی شرک جس میں قریش مکہ مبتلا تھے اس کی سزا ضرور ملنی چاہیے۔ تیسرا درجہ عام جرائم کا ہے جو بخشنے جا سکتے ہیں۔

حکیم الامت حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کے نزدیک انسانوں کی اجتماعی زندگی کے لیے اقتصادی توازن ایک ضروری امر ہے اور ہر انسانی جماعت کو ایک ایسے اقتصادی نظام کی ضرورت ہے جو اس کی ضروریات زندگی کا کفیل ہو۔ جب لوگوں کو اپنی معاشی ضرورتوں سے فراغت نصیب ہوتی ہے تو پھر وہ اپنے خالی وقت میں جو ان کے پاس کسب معاش کے بعد بچ جاتا ہے زندگی کے ان شعبوں کی ترقی اور ترقی میں صرف منسوب ہو سکتے ہیں جو انسانیت کا اصل جوہر ہیں، لیکن ان کی اگر اقتصادی ضروریات بھی فراہم نہ ہوں اور ان کو وہ سے انسان کی جدوجہد اس کی حیوانی ضرورتوں تک محدود ہو جائے تو انسانیت کے اعلا مقلمات کا کسے ہوش رہے گا! اقتصادی نظام کے درست اور متوازن ہونے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ حیاتِ ذمیوی میں انسانیت کے اخلاق تکمیل پذیر ہوتے ہیں۔

شیراز کے حکیم شیخ سعدی علیہ الرحمۃ نے اس سلسلے میں کیا خوب فرمایا ہے:

شب چوں عقد نماز می بندم

چہ خورد بامداد فرزندم

اخلاقیاتِ نبوی
مقالات مذاکرۃ ملی اخلاقیاتِ نبوی
کراچی ۱۴۰۲ ہجری

ترتیب حکیم محمد سعید

ہمدرد فاؤنڈیشن پریس